ھو المستعان

رجسٹرڈ نمبر ل ۴۷۸

الناظر

ایڈیٹر — ظفر الملک علوی

الناظر پریس لکھنؤ میں باہتمام اسحاق علی علوی چھپا

قیمت سالانہ للعہ ر

قیمت فی پرچہ ۸ر

فہرست مضامین بابت ماہ جولائی ۱۹۲۶ء

نمبر ۱ جلد ۳۳

مصنفین اُردو

نئی کتابیں

تاریخ فلسفہ اسلام

مترجمہ

ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے۔ پی ایچ ڈی (برلن)

ہالینڈ کے مشہور مستشرق ٹی۔ جے دی بوئر نے یورپ کے دوسرے مشہور و معروف مستشرقوں کے اُن متفرق مضامین سے یہ کتاب مرتب کی ہے جو اُنھوں نے وقتاً فوقتاً مسلمانوں کے فلسفہ سے متعلق لکھے تھے۔ جس کے ملاحظہ سے اندازہ ہو سکے گا کہ فلسفہ و حکمت میں عربوں اور مسلمانوں نے کیا کیا موشگافیاں کی تھیں۔

قیمت عہ

حکایات و احساسات

مشہور ادیب سید سجاد حیدر صاحب بی اے کے مختصر افسانوں اور متفرق مضامین کا دوسرا مجموعہ۔ جس میں سفر بغداد و قسطنطنیہ کے دلچسپ حالات بھی شامل ہیں۔

قیمت عہ

نوٹ :- سید سجاد حیدر صاحب کے افسانوں اور مضامین کا پہلا مجموعہ **خیالستان** کئی بار شائع ہو کر قبولیتِ عام حاصل کر چکا ہے۔ جن اصحاب نے نہ ملاحظہ کیا ہو اب منگا لیں۔

قیمت عہ

ملنے کا پتہ :- الناظر بک ایجنسی۔ لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۱ جلد ۳۳ — ماہ جولائی سنہ ۱۹۲۶ء

فلسفہ کی غایت

افلاطون نے ایک مکالمہ میں کہا ہے کہ "حیرت کا احساس فلسفی کی اصلی و حقیقی نشانی ہے کیونکہ فلسفہ حیرت ہی سے پیدا ہوتا ہے" افلاطون کا یہ قول صحیح مانا جا سکتا ہے، کیونکہ فلسفی کو فی الواقع حیرت ہوتی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے، کہ اشیاء کے متعلق یہ حیرت صرف فلسفی ہی کو نہیں ہوتی۔ یہ کہنا تو شاید مبالغہ ہوگا، کہ اس احساس کا ہر شخص کو تجربہ ہوتا ہے، کیونکہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں، جو اپنے روزمرہ کے کاموں میں اس طرح منہمک و مصروف رہتے ہیں، کہ ان کو کسی چیز پر تعجب ہوتا ہے، نہ حیرت۔ پھر بعض لوگ ایسے ہیں جن کی زندگی نہایت امن چین، آرام و آسایش سے گذرتی ہے، لہذا وہ ہر چیز کو فرض کر لیتے ہیں، اور حقائق اشیا کو شاذ و نادر تعجب ہوتا ہے، یا بالکل تعجب نہیں ہوتا، تو اسکا یہ مطلب نہیں، کہ یہ استعجاب کسی کو بھی نہیں ہوتا۔ اکثر لوگ ایسے ہیں، جنکو حیرت ہوتی ہے۔ یہ لوگ راز جو متجسس و متلاشی طبائع رکھتے ہیں۔ ان کو علم حاصل کرنے کی خواہش ہوتی ہے، اور یہ خواہش حیرت و استعجاب ہی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ارسطو نے بالکل صحیح کہا ہے کہ "تمام انسان علم حاصل کرنے کے بالطبع خواہشمند ہوتے ہیں۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر تمام انسانوں کو اشیا کے متعلق حیرت ہوتی ہے، اگر ان کو اشیا و واقعات پر تعجب ہوتا ہے، اگر یہ سب راز جبیعت رکھتے ہیں، اور اگر وہ ان اشیا کے متعلق مزید معلومات مہیا کرنے کی خواہش رکھتے ہیں، تب یا تو تمام انسان فلسفی ہیں، یا پھر یہ کہ جو حیرت "فلسفی کی نشانی" ہے وہ کسی نہ کسی طرح اس ہ کو معلوم کرنے کی تکلیف گوارا ہی نہیں کرتے۔ ان کو کسی چیز پر تعجب کرنے کا خیال ہی نہیں آتا لیکن اگر بعض اشخاص کو

حیرت سے مختلف ہے، جس کے ہوتے ہوئے بھی انسان فلسفی نہیں بنتا۔ اس حالت میں جس علم کی فلسفی کو تلاش ہوتی ہے، وہ اس علم سے مختلف ہوگا، جس کا غیر فلسفی جویاں رہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے، کہ ہر شخص فلسفی نہیں، اگرچہ ہر شخص، اور کوئی شخص فلسفی بن سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ جو لوگ فلسفی ہیں، اور جو لوگ فلسفی نہیں، اُن میں آخر فرق کیا ہے؟ اس مسئلہ پر ہم کو ایک دوسرے پہلو سے غور کرنا چاہیے۔ جب ایک بچہ ریاضی کے کسی سوال کو حل کرنے بیٹھتا ہے، تو گویا اسکے پیش نظر ایک ایسا مسئلہ ہوتا ہے، جس کا حل اسکو معلوم نہیں۔ لیکن اس کا خیال ہے کہ وہ اس حل کو معلوم کر سکتا ہے، اور اسی واسطے وہ کوشش کرتا ہے۔ اگر یہ حل دریافت ہو جاتا ہے تو مسئلہ ہی کا خاتمہ ہو جاتا ہے، یعنی یہ کہ علم کو حاصل کرنے کی جو خواہش وہ رکھتا تھا، وہ پوری ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر اسکو اس حل کے دریافت کرنے میں کامیابی نہیں ہوتی، تو اسکی مشکل ویسی کی ویسی ہی باقی رہتی ہے، اور اگر باوجود سخت کوشش کے بھی وہ کامیاب نہیں ہوتا، تو وہ اسکو بالکل ترک کرکے کسی اور چیز یا کام کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں وہ یہ سمجھتا ہے، کہ مسئلہ اس قسم کا ہے جسکو وہ حل نہیں کر سکتا، اور اس لیے (کم از کم اسکے لیے) وہ ناقابل حل ہے۔ اب اگر وہ اسکو ناقابل حل سمجھ کر دستکش ہو جاتا ہے، تو کوئی شخص طبع آزمائی شروع کرتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ مسئلہ جو ابھی تک حل نہیں ہوا، کسی اور کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص کسی مسئلہ کو بالکل ناقابل حل سمجھتا ہے، وہ اسکو حل کرنے کی کبھی کوشش نہ کریگا۔ اب اگر وہ اسکو حل کرنے کی کوشش شروع کرتا ہے، تو اسکا صریحاً مطلب یہ ہے کہ وہ اسکو قابلِ حل سمجھتا ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ اُسکا یہ خیال صحیح ہے یا غلط۔ ہمارا مطلب صرف اسقدر ہے کہ جب تک ایسا خیال نہ ہو، اُسوقت تک اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کبھی نہیں کی جاتی۔

بعض مسائل تو ایسے ہوتے ہیں کہ جنکا حل کرنا مرنے اور فنا ہونے سے بچنے کے لیے ضروری ہوا کرتا ہے۔ بدل ما یتحلل کا مہیا کرنا، گرمی و سردی سے محفوظ رہنے کے لیے پناہ کی تلاش، مختصر یہ کہ جسم کی حرارتِ غریزی کی تجدید، اور اُس کا تحفظ، ایسے مسائل کی مثالیں ہیں۔ یہ مسائل عرفِ عام میں "عملی" کہلاتے ہیں۔ جب یہ مسائل پیدا ہوتے ہیں تو آدمی سوچنا شروع کرتا ہے کہ انکو کس طرح حل کرے۔ وحشی انسان ایک جانور کو اپنے کام و دہن کی ضیافت کے لیے تاکتا ہے، لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسکو قابو میں کس طرح لائے۔ اس نے اسکو قابو میں کرنے کے وسائل کی تلاش شروع کی، اور انجام کار پتھروں اور ڈنڈوں کو اسکے لیے مفید پایا۔ بعد میں معلوم ہوا، کہ

پتھر اور زیادہ قوت اور شدت کے ساتھ پھینکے جا سکتے ہیں۔ اسکے لیے غلیل ایجاد ہوئی۔ پھر کسی عقلمند اور فطین وحشی کو خیال آیا کہ شکار مارنے کے لیے تیر اور کمان بہترین حربہ ہے۔ لیکن یہ تمام ترقی یہیں پر ختم نہ ہوئی، بلکہ ایک اور بزرگ اُٹھے اور دعویٰ کیا کہ پتھروں کو پھینکنے کے لیے بہترین چیز بارود ہے۔ یہاں سے منجنیق کی بنیاد پڑی جس نے رفتہ رفتہ بندوق، توپ اور ہاوٹزر کی صورت اختیار کی۔ اور نہ معلوم ابھی اور کیا کیا ترامیم اس میں ہونے والی ہیں! مختصر یہ کہ جب کسی علمی مسئلہ کا ایک حل دریافت ہو جاتا ہے، تو پھر کوئی اور شخص اس سے بہتر آسان تر اور مختصر تر حل دریافت کرنے کے درپے ہوتا ہے۔

وحشی انسان شروع شروع میں نہیں جانتا تھا کہ درخت بیج سے اُگتا ہے۔ وہ قدآور درختوں کی شاخہائے ثمرور اپنے سامنے دیکھتا تھا۔ اثمارِ اشجار سے اپنا پیٹ بھرتا تھا اور بےفکری کی نیند سوتا تھا۔ اسکو صرف "آم کھانے" سے مطلب تھا، نہ کہ "آم کے درخت گننے" سے، یا انکی اصل و نسل کا پتہ چلانے سے۔ لیکن اسکے کسی بھائی بند کو حیرت ہوئی، کہ اتنا بڑا درخت، جو زمین پر عمودی حالت میں اس مضبوطی سے پاؤں جمائے کھڑا ہے، جو ہر سال مقررہ اوقات میں پُرانا لباس اُتار کر نیا برگ و بار پیدا کرتا ہے، جو دھوپ کی حدت سے مرجھا جاتا ہے اور ٹھنڈک سے پھر ہرا ہو جاتا ہے آخر کہاں سے آتا ہے، کیونکر پیدا ہوتا ہے اور بڑھتا ہے؟ یہ حیرت غور و فکر، مشاہدہ و مطالعہ کا ایک سلسلہ آغاز کرتی ہے۔ بالآخر انکشاف ہوتا ہے کہ یہ تناور درخت ایک ننھے سے بیج سے پیدا ہوتا ہے۔ اس انکشاف کے بعد ہی وہ وحشی انسان تمدن کے دوسرے دَور میں قدم رکھتا ہے۔ اس انکشاف سے قبل وہ جانوروں کا شکار کرتا تھا اور پیٹ کی دوزخ بھرتا تھا، اب وہ زراعت شروع کرتا ہے۔ اس زراعتی دور میں وہ زمین کو بیج کے لیے تیار کرتا ہے، اور اسی میں وہ مختلف انکشافات و ایجادات کرتا جاتا ہے۔ چنانچہ ابتداءً وہ اس کام کے لیے ایک لکڑی استعمال کرتا ہے، جس سے زمین میں سوراخ کر کے بیج ڈال دیتا ہے۔ اسکے بعد کسی کو خیال آیا کہ کیا بیج بونے کا اس سے آسان کوئی اور طریقہ نہیں؟ اس حیرت کا نتیجہ ہل کی ایجاد کی صورت میں ظاہر ہوا۔ پھر اس ہل میں تبدیلیاں ہوئیں۔ پہلے اس کو بیل کھینچتے تھے، پھر گھوڑے کھینچنے لگے۔ کچھ ہی دنوں بعد معلوم ہوا کہ بھاپ اس کام کے لیے بہترین چیز ہے، لہذا بھاپ نے گھوڑے کی جگہ لی۔ بھاپ بھی بہت دنوں قائم نہ رہ سکی۔ بجلی نے آکر اس کا قلع قمع کیا، چنانچہ آجکل ہل برقی قوت سے چلائے جاتے ہیں۔ آیندہ خدا جانے اور کون سی قوت پیدا ہوگی! ہل کی اس ترقی کے

ساتھ ساتھ دوسری سمت میں بھی ترقی ہوئی۔ بیج کی ساخت، خاص خاص بیج کے لیے خاص خاص زمین کی ضرورت، زمین کی نگاہداشت و پرداخت، یہ تمام باتیں منکشف ہوئیں۔ مختصر یہ کہ علم زراعت اور نباتیات کی بنا پڑی۔ اور یہ تمام ترقی نتیجہ تھی اس حیرت کا جس سے اس سلسلہ کا آغاز ہوا۔

ماحصل یہ کہ زندگی کے عملی مسائل، یعنی یہ کہ انسان کس طرح زندہ رہ سکتا ہے، اور آرام و آسایش سے زندہ رہ سکتا ہے، ہمیشہ سے پیدا ہوتے رہے ہیں، اور غالباً ہمیشہ پیدا ہوتے رہینگے۔ انسان انکو ایک حد تک حل بھی کر لیتا ہے، کیونکہ اگر حل نہ کرے، تو زندہ نہیں رہ سکتا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے، کہ ایک طرف علم میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور دوسری طرف تہذیب و تمدن میں ترقی ہوتی ہے۔ لیکن اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ "علم کی زیادتی" سے ہماری مراد "علم کا جمع ہونا" ہے۔ یہ علم کا یہ ہمیشہ بڑھنے والا ذخیرہ ایک نسل سے دوسری میں منتقل ہوتا ہے، اور ہر ایک نسل اپنے اسلاف کے ذخیرۂ علم میں اضافہ کرتی ہے۔ اسکی صورت بعینہ ایسی ہوتی ہے جیسے دولت ایک ہاتھ سے دوسرے میں جاتی ہے، اور ہر قدم پر اس میں زیادتی ہوتی جاتی ہے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ موجودہ نسل کے افراد گذشتہ نسل کے افراد پر بلحاظ عقل و فہم فراست و ذکاوت فوق ہیں، اگر بادی النظر میں ایسا معلوم ہوتا ہے، تو اسکی وجہ یہ ہے، کہ یہ نسل گذشتہ نسلوں کے مقابلہ میں زیادہ بڑے ذخیرۂ علم کی مالک ہے، اور جو ذخیرۂ علم اسکو ورثہ میں ملتا ہے، اُس پر یہ اضافہ کرتی ہے۔ ایک شخص روپیہ جمع کر کے اپنے بیٹے کے لیے چھوڑ مرتا ہے، بیٹا اُسکو کاروبار میں لگا کر نفع اٹھاتا ہے، اور اس طرح باپ کے اندوختہ میں اضافہ کرتا ہے۔ بعینہ یہی حال ذخیرۂ علم کا ہے۔ قصہ اصل میں یہ ہے کہ اسلاف دولت اور علم جمع کرتے ہیں، اور اخلاف کا کام سوائے اسکے اور کچھ نہیں ہوتا کہ وہ اس اندوختہ پر اضافہ کریں۔ لیکن مادی دولت میں اضافہ کرنے کی ایک ترکیب یہ ہے، کہ پرانی اور فرسودہ مشینوں کو نکال کر نئی مشینیں نصب کی جائیں۔ اس سے دو فائدے مترتب ہوتے ہیں۔ اول تو یہ کہ پرانی مشینیں گھس چکی تھیں، اُنکے پرزے بیکار ہو چکے تھے، اُنکے ٹوٹنے کا ہر وقت اندیشہ تھا۔ نئی مشین ان تمام نقائص سے پاک ہوتی ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہوتا ہے، کہ پرانی مشینیں اسلاف کی ساختہ تھیں، جن کا ذخیرۂ علم موجودہ ذخیرۂ علم سے بہت کم تھا، لہذا انکی ساختہ مشینیں لازماً ناقص تھیں۔ ان میں وقت اور محنت زیادہ صرف ہوتی تھی، اور پیداوار کم تھی۔ نئی مشین چونکہ اخلاف کی ایجاد ہوتی ہے، لہذا ان میں نقص کم ہوتا ہے۔

برخلاف پرانی مشینوں کے ان میں وقت اور محنت کم صرف ہوتی ہے، اور پیداوار زیادہ۔ بہترین مثال اسکی طباعت کی مشین ہے۔ دستی پریس، اسٹیم پریس، برقی پریس، اور اوڑی پریس کو یا چھاپ کی مشین کے ارتقا کے مختلف مدارج ہیں۔ غور تو کیجیے کہ ان میں سے ہر ایک اپنے ماقبل کی مشین پر کتنی حیثیتوں سے فائق ہے۔ یہ تمام مشینیں ذہن انسانی کی ایجادات ہیں۔ طرفہ تماشہ یہ کہ بعینہ یہی حال اُس علم کا ہے، جسکو ذہن انسانی منکشف کرتا ہے۔ جس طرح دستی پریس نے ایک ایسے پریس کے لیے جگہ خالی کی جو زیادہ طاقتور، زیادہ کامیاب اور زیادہ فائدہ مند تھا، اسی طرح علمی نظریات دیگر نظریات کے لیے جگہ خالی کرتے جاتے ہیں۔ اسکی مثال ہم علم ہیئت سے دیتے ہیں۔ اجرام سماوی کی ظاہری حرکت کی توجیہ کے لیے ذہن انسانی نے مختلف قیاسات قائم کیے اور ہر ایک قیاس بعد کے صحیح تر قیاس کی وجہ سے فنا ہوا۔ چنانچہ سب سے پہلے عقیدہ تھا کہ زمین ساکن ہے، اور سورج مشرق سے مغرب کی طرف حرکت کرتا ہے۔ اسکے بعد یہ قیاس قائم ہوا کہ فی الواقع سورج ساکن ہے، اور زمین اُسکے اردگرد حرکت کرتی ہے، اور یہ کہ اسکا مدار دائری ہے۔ لیکن تھوڑی ہی مدت بعد نظریہ ادوار نے اسکی جگہ لی اور سب سے آخر میں اس نظریہ نے بھی سجادہ خالی کیا، اور یہ قیاس مقبول عام ہوا کہ زمین کا مدار اہلیجی ہے۔ بعینہ یہی حال ہر علم کے نظریات کا ہوتا ہے۔ اسی بنا پر کہا گیا ہے، کہ علوم کی ترقی کا راستہ متروکہ قیاسات کے کھنڈرات سے پٹا پڑا ہے۔ زمانہ ماضی میں ایسا ہی ہوا، اور زمانہ آیندہ میں بھی ایسا ہی ہوگا۔ سائنس کے مختلف شعبے مختلف نئے واقعات منکشف کرتے ہیں۔ ان نئے واقعات کی توجیہ کے لیے کہیں تو پرانے قیاسات میں ترمیم کرنی پڑتی ہے، اور کہیں انکو ترک کر کے نئے قیاسات قائم کرنے پڑتے ہیں۔ یہ نئے قیاسات ممکن ہے، کہ پرانے قیاسات کے مقابلہ میں زیادہ سادہ ہوں، اور یہ بھی ہو سکتا ہے، کہ ان سے ایسے واقعات کی توجیہ ہوتی ہو جن کی توجیہ گذشتہ قیاسات سے نہ ہوتی تھی۔ لیکن باوصف اسکے قیاسات ہی رہتے ہیں۔

لیکن اگرچہ زندگی کے عملی مسائل کو حل کرنے کی خواہش، یا شاید یہ کہنا موزوں تر ہوگا، کہ انکو حل کرنے کی اشد ضرورت، انسان کو علم حاصل، جمع، اور نسلاً بعد نسلٍ منتقل کرنے کی ترغیب دلاتی ہے۔ یہ علم بعض صورتوں میں تو سائنٹفک ہوتا ہے، اور بعض حالتوں میں ایسا ہوتا تو نہیں، لیکن ایسا بنایا جا سکتا ہے۔ ایک وقت ایسا آتا ہے، جب یہ علم بالارادہ حاصل کیا جاتا ہے، اور سائنس کو سائنس کی خاطر ترقی دی جاتی ہے۔ اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے، کیونکہ ہم پہلے

دیکھ چکے ہیں، کہ اکتساب علم کا شوق نتیجہ ہوتا ہے اُس حیرت اور رازجوئی کا، جو انسان اور حیوان میں مشترک ہے۔ اسی رازجوئی اور تجسس کی بنا پر ارسطو کا مقولہ بالکل صحیح ہے کہ "تمام انسان بالطبع علم کے خواہشمند ہوتے ہیں"۔ انسان اور ادنیٰ حیوانات، اور مہذب و متمدن انسان اور وحشی انسان میں فرق صرف اس قدر ہوتا ہے کہ ادنیٰ نوع کی تشفی بہت جلد ہو جاتی ہے، برخلاف اسکے اعلیٰ نوع کی تشفی بہت مشکل سے ہوتی ہے۔ نفسیات پوری طرح ثابت کر چکی ہے، کہ بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جنکی خواہش ابتداءً تو کسی غایت کے وسیلہ کی حیثیت سے ہوتی ہے، لیکن بعد میں یہی چیزیں خود غایت بن جاتی ہیں۔ اور انکی خواہش بھی بحیثیت وسیلہ کے نہیں، بلکہ بطور غایت کے ہونے لگتی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ روپیہ کی اصلی قیمت اس وجہ سے ہوتی ہے، کہ ہم اس سے اپنے آرام و آسایش کی اشیا خرید سکتے ہیں، اور یہ کہ اسکی خواہش بھی اسی وجہ سے ہوتی ہے۔ لیکن کنجوس روپیہ جوڑتا ہے نہ اس لیے کہ اپنی ضروریات، اور یا محتاج زندگی پر صرف کرے۔ بلکہ صرف اس غرض سے کہ اسکے پاس روپیہ رہے، وہ کھانے تک کے لیے تو روپیہ خرچ کرنا گوارا نہیں کرتا۔ روپیہ اسکے لیے مقصود بالذات ہے۔ شکار کا اصلی مقصد تو یہ تھا، کہ وہ حیوانات ہلاک کیے جائیں، جو انسانوں کے لیے باعث ضرر ہیں۔ دوسرے الفاظ میں شکار دراصل ایک وسیلہ تھا مہلک و موذی حیوانات کے ہلاک کرنے کا۔ لیکن اب حال یہ ہے، کہ جنگلوں میں شیر، چیتے، ہاتھی، ہرن وغیرہ پالے جاتے ہیں، انکی باحتیاط تمام حفاظت کی جاتی ہے۔ لیکن کس لیے؟ صرف اس لیے کہ انکا شکار کیا جا سکے! اب یہ شکار وسیلہ نہیں، بلکہ بذات خود ایک غایت ہے۔ کیا ایک عام واقعہ نہیں کہ ایک شخص شراب دواءً استعمال کرتا ہے جس سے مطلب یہ ہے، کہ اُسکی صحت برقرار رہے، لیکن بعد میں وہ شراب پیتا ہے، صحت کو برقرار رکھنے کے لیے نہیں، بلکہ محض شراب پینے کی خاطر، حالانکہ اس کو بخوبی علم ہے، کہ اب یہ شراب صحت کو برقرار رکھنے کے بجاے صحت کو تباہ کر رہی ہے۔ بعینہٖ یہی حال علم کا بھی ہے۔ شروع شروع میں تو یہ علم محض ایک ذریعہ تھا زندگی کے عملی مسائل کو حل کرنے کا، لیکن رفتہ رفتہ یہ مقصود بالذات بن گیا۔ جس مجموعہ معلومات کو اصطلاحاً "علم نظری" کہتے ہیں، وہ اسی سے تعلق رکھتا ہے، اس کا اکتساب خود اسی کی خاطر ہوتا ہے۔ بعض لوگ البتہ ایسے ہوتے ہیں، جن کے سروں میں اس مجموعہ معلومات کا سودا ہوتا ہے، جسکو "علم عملی" کہتے ہیں۔ یہ لوگ علم نظری کو عملی مقاصد کے لیے مفید اور بارآور بناتے ہیں۔ انکو اس بات کی ضرورت نہیں، کہ وہ اپنے مشاغل کے جواز میں کوئی حجت پیش کریں۔ لیکن جو لوگ علم نظری کو اپنا مطمح نظر

قرار دیتے ہیں، انکو اسکے جواز کو ثابت کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ وہ اپنی شفاعت میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں، کہ ہم نہیں جانتے کہ کس وقت اور کس عملی مقصد کے لیے ہمارا یہ نظری علم مفید ثابت ہو، لہذا بہتر یہی ہے، کہ اس علم کو ہر ممکن سمت میں ترقی دی جائے، تاکہ "عند الضرورت اکار آید" نہیں ممکن ہے، کہ عملی شخص کے لیے تشفی بخش یا مسکت ہو، کہ اکتساب علم اسکے لیے ایک وسیلہ ہو لیکن عالمان و متعلمان علم نظری اسکو اپنی شفاعت میں پیش کرنے کے مجاز نہیں، وہ یہ پیشگوئی نہیں کر سکتے کہ علم نظری کے کسی انکشاف سے کیا کیا عملی نتائج مترتب ہونگے۔ ایسی صورت میں وہ اپنی تسلی صرف اس خیال سے کر سکتے ہیں، کہ علم نظری کا اکتساب نتائج و عواقب کیلیے نہیں ہوتا، بلکہ اس کا مقصود و مراد افزائش علم، اور محض افزائش علم ہے۔

اُن ادنیٰ حیوانات کو بھی بسا اوقات حیرت ہوتی ہے۔ ان کی حالت میں یہ راز جوئی کی صورت اختیار کرتی ہے، جو جاننے کی خواہش کا مظہر ہے۔ جو حیوان کسی نئی، یا غیر معمولی چیز پر تعجب کرتا ہے، وہ دراصل اسکے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے اس حیوان میں یہ تعجب یا جاننے کی خواہش، اتنی ہی حقیقی ہوتی ہے، جتنی کہ خوراک کی خواہش۔ لیکن اسکی تشفی بہت جلد ہو جاتی ہے، یا یوں کہیے، کہ یہ آسانی کے ساتھ کسی اور طرف منتقل ہو سکتی ہے۔ اسکی خواہش علم ایک ابتدائی اور خام خواہش ہوتی ہے۔ انسان کا حال اس سے جداگانہ ہے۔ تجسس، راز جوئی، حقیقت کشائی، جسقدر اسکے حصہ میں آئی ہے، اس قدر کسی اور حیوان کو نہیں ملی۔ یہ صحیح ہے کہ اسکی خواہش علم پوری ہوتی رہتی ہے، لیکن اسکی تشفی ہمیشہ کے لیے اور مختتم طور پر کبھی نہیں ہوتی۔ یہ خواہش نسلاً بعد نسلٍ چلی جاتی ہے۔ پھر صرف یہی نہیں کہ اسکی خواہش غیر فانی اور دائمی ہوتی ہے، بلکہ یہ دیگر حیوانات پر اس خصوص میں بھی فائق ہے، کہ یہ تحریر و تقریر کے ذریعہ اپنا ذخیرہ علم اخلاف کے حوالہ کر جاتا ہے۔ تعجب پر تعجب یہ کہ خواہش کو پورا کرنے کے لیے جو قدم وہ اُٹھاتا ہے وہ اسکے توسن شوق کے لیے مہمیز بنجاتا ہے۔ علم کی "ہفت اقلیم" کو قبضہ میں لانے کے بعد بھی وہ "در بند اقلیم دگر" رہتا ہے۔ اسکی معلومات میں ہر اضافہ اور زیادہ اضافہ کی ترغیب دلاتا ہے، اور ہر قدم پر اسکے ذرائع و وسائل علم بہتر اور کامیاب تر ہوتے جاتے ہیں۔ یعنی بعد میں وہ زیادہ سیکھتا ہے اور بہتر سیکھتا ہے، تاآنکہ وہ پکار اُٹھتا ہے کہ "علم قوت ہے"، ان معنوں میں کہ وہ اپنی غایات کے حصول کی قدرت، فطرت کو اسی علم کے ذریعہ سے مسخر کر سکتا ہے جب وہ یہ سبق سیکھ لیتا ہے تو علم کا حجابِ اکبر اسکی عقل کی آنکھوں پر پڑ جاتا ہے۔ اسکا نتیجہ سوائے

گمراہی اور بے راہ روی کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ وہ اس سے یہ نتیجہ اور غلط نتیجہ نکالتا ہے، کہ اکتسابِ علم کی غایتِ وحیدہ یہ ہے، کہ انسانی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے قدرت و فطرت کو مسخر کیا جائے۔ اس نتیجہ میں غلطی دوگونہ ہے۔ علم بعض عملی مقاصد کے لیے نہ شروع میں حاصل کیا جاتا تھا۔ نہ اب حاصل کیا جاتا ہے۔ علم کی وہ "طلب" جو حیرت کا نتیجہ ہوتی ہے، اکتسابِ علم کی مستقل محرک شروع میں بھی تھی اور اب بھی ہے۔ اسکی بہترین مثال ریاضیات میں ملتی ہے۔ اتفاق سے یہی وہ علم ہے، جو سب سے پہلے صورت بند ہوا، اور جو دیگر علوم کے لیے بمنزلہ بنیادی پتھر کے ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ روزمرہ زندگی میں یہ عملی مقاصد کے حصول کے لیے استعمال ہو سکتا ہے، مثلاً فنِ تعمیر وغیرہ میں۔ لیکن جن لوگوں کے ہاتھوں میں اس نے برگ و بار پیدا کیے ہیں، اور جن لوگوں نے اسکو زمین سے اُٹھا کر آسمان پر پہونچایا ہے، وہ لوگ تھے، جو ریاضیات نظری کے متعلم تھے۔ ہماری مراد یہ ہے، کہ یہ لوگ اشیاء کے قابلِ شمار ہونے کی خاصیت، اور اس خاصیت کے ریاضیاتی نتائج سے دلچسپی رکھتے تھے، اس علم کے نتائج ایسے مکان (Space) کے لیے بھی صحیح ہیں جنکی ابعاد تین سے زائد یا کم ہیں۔ اس کے اصول اس ذی ابعادِ ثلاثہ مکان کے تابع نہیں، جن میں انسان موجود ہے، یا کم از کم جس میں وہ خیال کرتا ہے، کہ وہ ہے۔ ریاضیاتِ نظری کا اکتساب عملی مقاصد سے بالکل بے نیاز ہے۔ یہ نتیجہ ہے علم کی "طلب" اور غیر ممکن التشفی حیرت کا۔ ریاضیات دیگر علوم کا بنیادی پتھر ہی نہیں، بلکہ یہ ایک ایسا نصب العین بھی ہے، جسکو حاصل کرنے کے لیے باقی تمام علوم کوشاں ہیں۔

ہم نے اس مضمون کو افلاطون کے اس قول سے شروع کیا تھا کہ "حیرت کا احساس فلسفی کی اصلی نشانی ہے۔ کیونکہ فلسفہ حیرت ہی سے شروع ہوتا ہے"۔ لیکن ہم اوپر دیکھ آئے ہیں کہ حیرت کم و بیش ہر شخص کو ہوتی ہے۔ اسی پر ہم نے پوچھا تھا، کہ جب صورتِ حال یہ ہے، تو فلسفی اور غیر فلسفی میں آخر مابہ الامتیاز کیا ہے؟ ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں، کہ زندگی کے عملی مسائل انسان پر دباؤ ڈالتے ہیں، اور وہ انکو حل کرنے کے لیے پریشان ہوتا ہے۔ وہ یہ فرض کر لیتا ہے، کہ مسائل قابلِ حل ہیں۔ ان میں سے بعض کو تو وہ حل کرنا سیکھ بھی لیتا ہے، اور اس طرح جو کچھ معلومات وہ حاصل کرتا ہے، اُنکو وہ اپنے اخلاف کے لیے بطور ورثہ چھوڑ جاتا ہے۔ پھر یہ کہ اس توارث میں یہ علم برابر بڑھتا رہتا ہے۔ اکتسابِ علم مزید علم کی خواہش پیدا کرتا ہے۔ کیونکہ جس قدر زیادہ علم ہمارے پاس ہوتا ہے اُسی قدر ہم کو اس کی زیادہ خواہش بھی ہوتی ہے۔ شروع شروع میں

تو علم کی خواہش صرف عملی مقاصد کی خاطر، یا زندگی کے عملی مسائل کی تحلیل کے لیے ہوتی ہے، لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد یہ مقصود بالذات بن جاتا ہے۔ یہیں سے "علم نظری" اور "علم عملی" مفترق ہوتے ہیں۔ ان میں سے مقدم الذکر کو تو صرف اعلیٰ ترین اذہان اختیار کر لیتے ہیں، نہ اسلیے کہ اسکو عملی مقاصد میں استعمال کریں، بلکہ محض اس غرض سے کہ سائنٹفک علم کے حدود وسیع ہو جائیں۔ اس میں وہ حیرت محرک کا کام دیتی ہے، جو فطرت و قدرت پر تدبر و تامل سے پیدا ہوتی ہے اور جو علم کی بدولت قدرت کے ہر راز کے ساتھ بڑھتی جاتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ علم کی خواہش آفرینش سے اسوقت تک عملی ضروریات کو پورا کرنا مطالعہ فطرت کی غایت نہیں رہا۔ شروع ہی سے انسان کی حالت یہ رہی ہے، کہ وہ قدرت کو دیکھتا ہے اس پر حیرت کرتا ہے اور اس وجہ سے اسکو علم کی خواہش ہوتی ہے۔ کتنا سچ ہے ارسطو کا قول کہ "انسان بالطبع علم کا خواہشمند ہے"۔

اس تمام تقریر کا ماحصل یہ ہے، کہ سائنس کا آغاز حیرت سے ہوتا ہے، اور اسی حیرت سے بقول افلاطون، فلسفہ پیدا ہوتا ہے۔ اگر صورت یہ ہے، تو فلسفہ اور سائنس میں کیا فرق ہے؟ جب سائنس کا کام پورا ہو جاتا ہے، تو کسی فلسفہ کی ضرورت، یا گنجایش باقی رہتی بھی ہے؟ بعض سائنس دانوں کا خیال ہے، کہ اس حالت میں فلسفہ کی نہ ضرورت ہے نہ گنجایش۔ ہر وہ چیز جو قدرت، تدبر و تامل کے لیے انسان کے سامنے پیش کرتی ہے، باقاعدہ اور سائنٹفک طور پر مطالعہ کی جا سکتی ہے، بلکہ کہنا چاہیے کہ اسکا مطالعہ سائنٹفک طریق سے ہونا چاہیے۔ ہمارے پاس علوم ان گنت ہیں۔ قدرت کا کوئی حصہ ایسا نہیں جو کسی نہ کسی سائنس کے احاطہ میں نہ ہو۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ فلسفہ کے لیے باقی ہی کچھ نہیں رہتا۔ آخر وہ کونسا کام ہے جسکو سائنس نے ادھورا چھوڑ دیا ہے اور جسکو پورا کرنے کے لیے فلسفہ کی ضرورت پڑتی ہے؟ جواب ہو سکتا ہے کہ یہ تو مسلم ہے کہ علوم ان گنت ہیں، اور ہر ایک علم ایک مخصوص موضوع پر بحث کرتا ہے، مثلاً طبیعیات، عضویات، حیاتیات، نفسیات وغیرہ، لیکن ممکن ہے کہ انکے نتائج کو تطبیق و توحید کی ضرورت ہو۔ اور یہی کام فلسفہ کا ہے۔ چنانچہ فرانسیسی فلسفی کومٹ نے سائنٹفک علم کی توحید ہی کا نام فلسفہ رکھا ہے۔ لیکن اگر اسکی یہ کوشش کامیاب بھی ہوتی، تب بھی اسکو فلسفہ کہنا بجا نہ ہوتا۔ کیونکہ سائنس کے نتائج کو اگر تطبیق دی جائے اور انکو ایک ہی عنوان کے تحت جمع کر دیا جائے تب یہ سائنٹفک ہی رہیگا، فلسفہ نہ بن جائے گا۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ اسکو

فلسفہ کہنا در پردہ اعتراف ہے اس امر کا کہ فلسفہ کا درحقیقت وجود ہی نہیں، بلکہ جو کچھ ہے سائنس ہے۔
اس بنا پر سائنس سے علحدہ، اور اس سے بے نیاز، فلسفہ کی ہستی سے انکار لازم آتا ہے۔ فلسفہ کو
"علم العلوم" کہنا بہترین مدح ہے، جو ایک سائنس داں فلسفہ کی کر سکتا ہے، لیکن بنظر تعمق دیکھیے،
تو یہ ہجو ملیح ہے۔ یہ گویا فلسفہ کی ہستی سے انکار کے مترادف ہے، کیونکہ "علم العلوم" لازماً علم (سائنس)
ہی ہو گا۔ اسکو سن کر کوئی صاحب ہوش فلسفی، جو فلسفہ کو سائنس سے علحدہ سمجھتا ہے، خوش نہ ہو گا
لیکن سائنس داں کا اصرار ہے، کہ بتاؤ تو سہی کہ فلسفہ آخر ہے کیا؟ اس کا کام کیا ہے؟ سائنس
کے ہوتے ہوئے اسکی کیا ضرورت ہے؟ اسکا جواب فلسفہ کا ایک نامور زعیم پروفیسر ہنری سجوک، یہ
دیتا ہے، کہ فلسفہ کی غایت یہ ہے، کہ علم کے مختلف حصوں کو جمع کر کے ایک منتظم "کل" کی صورت میں لے
آئے۔ لیکن اس پر سائنس اعتراض کرتا ہے، کہ اگر یہ جواب صحیح ہے، تو "علم کے حصول" کا وجود
نفس علم سے قبل ہونا چاہیے، کیونکہ اگر ان کا وجود نفس علم سے قبل نہیں تو فلسفی جمع کس چیز کو کرتا
ہے؟ سائنس کے مختلف شعبہ جات فلسفہ کے وجود میں آنے سے قبل موجود تھے۔ لیکن ایک تاریخی
واقعہ ہے، کہ فلسفہ اور سائنس دونوں توام ہیں، بلکہ فلسفہ (ارسطو و افلاطون کا) تو علوم طبیعیہ کی پیدائش
سے بہت پہلے موجود تھا۔ اسکا مطلب یہ ہے، کہ ہم یہ نہیں کہہ سکتے، کہ فلسفہ علم کے مختلف حصوں
ہماری معلومات کے گویا مختلف حصے ہیں۔ اسکا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ سائنس کے مختلف شعبہ جات
کو جمع کرتا ہے۔ اس اعتراض کی وقعت و صحت کو تسلیم نہ کرنا فلسفی کی شان حق پرستی کے خلاف
ہے۔ تعجب یہ ہے، کہ سجوک جیسا معتمد علیہ زعیم اس قدر بے سروپا بیان دیتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سجوک
یہ دعویٰ کرتے وقت اس بات کو بھول گیا، کہ کل کے اجزاء کا اس کل سے قبل وجود نہیں ہو سکتا۔ یہ
کس طرح ممکن ہے کہ علم کے اجزاء، نفس علم سے قبل موجود ہوں؟ یہ کہنا اتنا ہی بے معنی اور مہمل ہے،
جتنا یہ دعویٰ کہ گائے کا سر، چاروں ٹانگیں، دھڑ، کان، ناک، دُم وغیرہ تو پہلے ہی سے علحدہ علحدہ
موجود تھیں۔ بعد میں ان سب کو جوڑ کر گائے بنا دی گئی۔ اصلیت یہ ہے کہ گائے (بلکہ کہنا چاہیے کہ
کہ ہر جسم نامی و غیر نامی) شروع ہی سے ایک کل ہوتی ہے۔ اسکے حصوں کا اسکے بغیر وجود ہی نہیں
ہو سکتا اور نہ کل بغیر اجزا کے باقی رہ سکتا ہے۔ بعینہ یہی حال علم کا ہے۔ اس میں کلام نہیں، کہ
اجزاء علم کے بھی ہوتے ہیں، لیکن بہرحال اجزاء تو علم ہی کے ہیں۔ یعنی یہ کہ اگر علم غیر موجود ہے
تو اجزاء بالضرورت غیر موجود ہونگے۔ علم ایک کل ہے، کیونکہ اگر یہ کل نہ ہوتا، تو اسکے اجزاء بھی
نہ ہو سکتے تھے۔ اب اگر یہ کل ہے تو نہ تو یہ اجزا سے علحدہ کیا جا سکتا ہے، نہ اجزاء کو اس سے۔ پھر صرف
یہی نہیں کہ یہ ایک کل ہے، بلکہ ایک وسعت پذیر کل ہے، اور اسکی توسیع، اجسام نامیہ کی طرح خود

اسکے اندر سے ہوتی ہے، نہ بیرونی و خارجی ایزادات سے - مطلب یہ ہے کہ اسکی توسیع و ترقی کے لیے اس میں کسی اور چیز کا پیوند لگانے کی ضرورت نہیں پڑتی - اسکے ساتھ ہی یہ بھی ذہن نشین کر لینا چاہیے، کہ علم کی ترقی اجزاء علم کے ماننے سے بھی نہیں ہوتی، کیونکہ ہم پہلے کہہ آئے ہیں کہ یہ اجزاء نفس علم سے قبل موجود ہی نہیں ہوتے -

مختصر یہ کہ ہیجوک کا یہ خیال کسی طرح بھی درست نہیں ہو سکتا، کہ "اجزاء علم کو ایک منتظم کُل کی صورت میں جمع کرنا فلسفہ کی غایت ہے"- وجہ اسکی یہ ہے، کہ اس قول کی ایک دلالت یہ ہے کہ ایک وقت ایسا تھا، کہ جب علم کُل نہ تھا، لیکن اسکے اجزا موجود تھے - ان ہی اجزاء پریشاں کی شیرازہ بندی کے لیے فلسفہ کی پیدائش ہوئی - اب صرف دو صورتیں ممکن ہیں، یا تو یہ کہ شروع میں یہ اجزاء اجزاء ہی کی صورت میں موجود تھے، یا پھر یہ کہ اس صورت میں موجود نہ تھے - اب اگر یہ اجزاء تھے، تو لازمی ہے، کہ کسی کُل کے اجزاء ہونگے، اور یہ علم کے اجزاء ہونگے اور یہ علم کے اجزاء نہ تھے، تو علم ہی تھے - اس صورت میں فلسفہ کی کوئی کوشش بھی اسکو علم نہیں بنا سکتی -

اس کا مطلب یہ ہے کہ سائنس داں کا یہ سوال ویسا کا ویسا ہی باقی رہ جاتا ہے، کہ اگر ہیجوک کا قول قول فیصل نہیں، تو یہ عجیب و غریب چیز، جسکو فلسفہ کہتے ہیں کس کام آتی ہے؟ اس فطری اور بالکل بجا سوال کے جواب میں معلم اول افلاطون الٰہی لب کشا ہوتا ہے، سنیے وہ کیا کہتا ہے :- یہ نہ ہیجوک کا ہم آہنگ ہے، نہ کومٹ کا - اسکے نزدیک فلسفہ نہ اسلیے پیدا ہوا ہے کہ اجزاء علم کو جوڑ کر علم بہیئتِ کُل پیدا کرے - نہ وہ اس بات کا قائل ہے، کہ فلسفہ کا ظہور سائنس کے تمام شعبہ جات کی توحید کے بعد ہوا - ایک غیر موجود کُل کو پیدا کرنا فلسفہ کا مقصد یا کام نہیں، بلکہ یوں کہنا چاہیے، کہ فلسفہ کا کام "اشیاء کے کُل" کو پیدا کرنا نہیں، بلکہ اسکو دیکھنا ہے - اور ظاہر ہے کہ یہی وہ کُل ہے، جس پر اشیاء کی ہستی موقوف ہے، اور خود یہ اپنے وجود کے لیے اشیاء کا رہینِ منت ہے - مختصر یہ کہ فلسفہ گویا "دیکھنا" بالبصیرت یا وجدان ہے - لیکن کہا جا سکتا ہے، کہ سائنس بھی اشیا کو "دیکھتی" ہے - یہ صحیح ہے، لیکن سائنس کے "دیکھنے" اور فلسفہ کے دیکھنے میں فرق ہے - سائنس اشیاء کو پہلے مختلف حصوں اور شعبوں میں تقسیم کرتی ہے اور ہر ایک حصہ یا شعبہ اپنے ایک خاص شعبہ کے سپرد کرتی ہے فلسفہ اس تفرقہ و جماعت بندی کو روا نہیں رکھتا یہ ان تمام اشیاء پر مجموعاً نظر ڈالتا ہے، کیونکہ صرف اسی طرح نظر ڈالنے سے وہ کُل معلوم کیا جا سکتا ہے

جو اپنے وجود کے لیے اُن اشیاء کا محتاج ہے، اور جس پر ان تمام اشیاء کا وجود موقوف ہے صرف وہی شخص فلسفی بننے کی قابلیت رکھتا ہے جو اِن اشیاء کو اس طرح دیکھ سکتا ہے۔ اس قابلیت کا شخص نہایت آسانی سے معلوم کرسکتا ہے کہ مختلف علوم (سائنس) ایک طرف تو باہمی تعلقات رکھتے ہیں، اور دوسری طرف سب کے سب نفس وجود سے بھی متعلق ہیں۔ دوسرے الفاظ میں فلسفی وہ شخص ہے جو کثرت میں وحدت کو دیکھتا ہے۔ وہ ایک وجدان، ایک ہمہ گیر نظر، کا مالک ہوتا ہے، جس کی مدد سے وہ تمام اشیاء میں حقیقت کو دیکھتا ہے، اور یہی حقیقت وہ چیز ہے جسکے بغیر ان اشیاء کا وجود ممکن ہی نہیں۔ لیکن اسکے ساتھ ہی یہ یاد رکھنا چاہیے، کہ فلسفہ اس حقیقت کو پیدا نہیں کرتا، وہ صرف اسکو دیکھتا یا اس پر غور و فکر کرتا ہے۔ یہ کل جو فلسفہ کا موضوع ہے، ٹکڑوں کے جوڑنے سے صورت پذیر نہیں ہوتا، بلکہ یہ پہلے ہی موجود ہوتا ہے، اور صرف صاحب نظر اسکو معلوم کرتا ہے۔

مختصر یہ کہ سائنس داں کے سوال کا جواب افلاطون اس طرح دیتا ہے، کہ فلسفہ اشیاء کو علیحدہ علیحدہ دیکھنے کی کوشش نہیں کرتا، جس طرح کہ سائنس کے مختلف شعبہ جات دیکھتے اور بحث کرتے ہیں۔ برخلاف اسکے وہ کل، یا حقیقت جسکے بغیر اشیاء کا وجود ہی نہیں ہوسکتا فلسفہ کا موضوع ہے۔ اس تلاشِ حقیقت کی ترغیب حیرت کی وجہ سے ہوتی ہے، کیونکہ "فلسفہ کا آغاز حیرت سے ہوتا ہے"۔ اشیاء کماہی کا علم عسیر الحصول ہے۔ اشیاء جیسی کہ ہمکو دکھائی دیتی ہیں ہمیشہ ویسی نہیں ہوتیں۔ اگر یہ واقعہ ہے، تو طبعی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے، کہ "پھر درحقیقت یہ کیسی ہیں؟" یہی حیرت و تعجب فلسفہ کا سرچشمہ ہے۔

ارسطو بھی اس باب میں اصولاً اپنے اُستاد کا ہمزبان ہے۔ لیکن اس نے "فلسفہ" اور "جدلیات" میں وہ فرق بیان کیا ہے، جو افلاطون کے ذہن میں نہ آیا۔ ارسطو کا خیال ہے کہ فلسفہ تو گویا علم ہے، اور جدلیات اس علم کے حصول کی کوشش۔ فلسفی وہ شخص ہے جو تمام اشیاء پر غور و فکر کرتا ہے۔ اب "وجود تمام اشیاء میں مشترک ہے"، اس کا مطلب یہ ہے کہ جدلیات وجود یا حقیقت کی تلاش کرتی ہے۔ جب یہ دریافت ہوجاتی ہے، تو فلسفی اسکو تمام اشیاء میں دیکھتا ہے۔ افلاطون اور ارسطو کے جوابات میں فرق اصول کا نہیں۔ فرق صرف اس قدر ہے، کہ وہ دونوں مختلف حصوں پر زور دیتے ہیں۔ افلاطون، وجود، یا حقیقت کی تلاش پر زور دیتا ہے، اور ارسطو فلسفہ پر۔ فلسفہ سے حقیقت پر تدبر و تامل مراد لیتا ہے۔ اسکا نتیجہ یہ ہے کہ افلاطون

نے اپنی تمام عمر تلاشِ حقیقت میں ختم کردی۔ اور ارسطو خود اپنے متعلق کہا کرتا تھا، کہ وہ پہلا شخص ہے جس نے حقیقت پر غور و فکر کرنا شروع کیا ہے۔ اسی بنا پر اسکے تلامذہ و متبعین اُس کو "استاذ العلماء" کہتے تھے۔ قرونِ وسطیٰ تک ارسطو کا قول قولِ فیصل، اور اسکا فیصلہ ناطق سمجھا جاتا تھا۔ اسکی بات آیت و حدیث تھی کہ اسکے آگے کوئی دم نہ مار سکتا تھا۔ دوسرے الفاظ میں ارسطو کی تعلیمات گویا مجسم ادعا و تحکم تھیں۔ لیکن ادعا و تحکم دیر یا سویر ارتیابیت پیدا کرتا ہے۔ یہ کہنا کہ "زمین گول ہے" اور کوئی دلیل بیان نہ کرنا سننے والے کے دل میں طبعی طور پر سوال پیدا کرتا ہے، کہ "آخر کیسے معلوم ہوا کہ زمین گول ہے؟" یہی سوال ارتیابیت کا نقطۂ آغاز ہے۔ کیونکہ اس سے ایک شبہ پیدا ہوتا ہے کہ فی الواقع اسکی کوئی دلیل ہے ہی نہیں۔ جب ایک دفعہ یہ شبہ پیدا ہو جائے اور اسکی کُرید لگ جائے، تو پھر سوائے اسکے چارہ نہیں ہوتا کہ اس پر بحث کی جائے، شرط صرف یہ ہے کہ ہم حقیقتِ اشیا کے متلاشی ہوں، اور طلبِ علم کا سودا ہمارے سروں میں ہو۔ دوسرے الفاظ میں ہماری "حیرت" بے جان نہ ہوئی ہو کہ دنیا و مافیہا کی کوئی چیز بھی اسکو بیدار نہ کرسکے۔

معتضد ولی الرحمٰن ایم اے

کب تک؟

ستم شعار! یہ اندازِ ساحری کب تک؟ / رہے گی رونقِ بازارِ ساحری کب تک؟
یہ درسِ امن کی ابلہ فریبیاں تا چند / یہ اشتہارِ کرم کی فسونگری کب تک
یہ بزمِ عیش و مزامیرِ خسروی تا کے / یہ تاج و تخت، یہ گلبانگِ قیصری کب تک
یہ فخرِ تیغ و علم کی نمائشیں تا چند / یہ شانِ طرۂ دستارِ سروری کب تک
یہ زور و شور تمہارے رہزنی کے دن / یہ ادعائے خوش آہنگِ رہبری کب تک
یہ طنطنے، یہ تحکم، یہ دبدبے تا کے / زبوں خصال! یہ جھوٹی سپہگری کب تک
یہ شیطنت میں نمودِ پیمبری کیسی؟ / پیمبری میں یہ اندازِ داوری کب تک
یہ چیرہ دستیِ تثلیثِ ناروا تا چند / یہ فتنہ خیزیِ توحیدِ آذری کب تک
یہ شغلِ ظلم، یہ آئینِ دلدہی تا کے / یہ عشقِ جور، یہ اندازِ دلبری کب تک
ٹھہر کہ چرخ نئی چال چلنے والا ہے / سنبھل سنبھل! کہ زمانہ بدلنے والا ہے

شبیر حسن خاں جوش

موجودہ باطنی تحریک

قارئین کرام شاید اس عنوان سے چونک اٹھیں گے اور ان چند سطور میں کسی گہری سیاسی سازش کے انکشاف کے متوقع ہوں گے۔ لیکن انکو ابھی سے مایوس ہو جانا چاہیے کیونکہ اس مضمون میں کسی ملکی مسئلہ سے بحث مقصود نہیں۔ اسی طرح فرقۂ باطنیہ کی موجودہ سرگرمیاں بھی جنکے سرپرست یا پیشوا ہز ہائنس سر آغا خاں ہیں ہمارا موضوع بحث نہیں۔ ہمارا مقصد آج کی صحبت میں صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ جس طرح اب سے تقریباً ایک ہزار سال پہلے مسلمانوں میں باطنی تحریک پیدا ہوئی تھی ٹھیک اسی طرح اب بھی موجود ہے۔ فرق اتنا ہے کہ قدیم تحریک کے داعیات سیاسی تھے اور جدید کے اسباب مذہبی ہیں۔ اسی سلسلہ میں دونوں کے اسباب و نتائج کی مختصر کیفیت پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی جس سے ارباب نظر یہ اندازہ کر سکیں گے کہ عہد حاضر میں اسلام کو کتنا بڑا خطرہ درپیش ہے۔

پیشتر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اجمالی طور پر فرقہ باطنیہ کی ابتدا اور انکے امہات اصول بیان کیے جائیں۔

فرقۂ باطنیہ اسمٰعیلیہ کی ابتدا اور وجہ تسمیہ

اہل قبلہ تمام اصول مذہب میں تقریباً متفق ہیں۔ انکی تعبیر یا جزئیات میں ضرور اختلافات ہیں۔ مسلمانوں کے دونوں فرقے سنی اور شیعہ توحید، نبوت، معاد پر اعتقاد لازمی جانتے ہیں۔ صرف امامت کا مسئلہ ایسا ہے جو دونوں میں مابہ النزاع ہے۔ اس میں بھی نفس امامت دونوں کے نزدیک مسلّم ہے۔ بحث صرف نوعیت و تعیین میں ہے۔ شیعۂ امامیہ پھر دو شاخوں میں منقسم ہو جاتے ہیں۔ اثنا عشریہ اور سبعیہ۔ اسکی ابتدا یوں ہوتی ہے کہ امام سادس حضرت جعفر صادق اپنے بعد اپنے بڑے بیٹے اسمٰعیل کو ولیعہد قرار دیتے ہیں۔ بعد ازاں انتخاب سابق سے رجوع فرماتے ہیں اور حسب فرمان ایزدی چھوٹے صاحبزادے موسیٰ کاظم کو منصب امامت تفویض کرتے ہیں۔ حضرت امام جعفر صادق تک دونوں فریق متفق ہیں، لیکن یہاں سے اختلاف شروع ہوتا ہے۔ یعنی اثنا عشریہ حضرت موسیٰ کاظم کو ساتواں امام اور انکے بعد انکے فرزند حضرت علی رضا کو آٹھواں امام مانتے ہیں۔ یہاں تک کہ بارھویں امام حضرت مہدی علیہ و علیٰ آبائہ السلام پر سلسلۂ امامت ختم کرتے ہیں۔

گروہ سبعیہ (باطنیہ) حضرت اسمٰعیل کو ساتواں اور آخری امام قرار دیتے ہیں۔ یہ آخرالذکر گروہ اپنے آپ کو سبعیہ کہتا ہے جسکی ایک وجہ اور برگزیدی۔ تفصیل بعد کو آئے گی۔ دوسرا نام جس سے یہ فرقہ اپنے کو موسوم کرتا ہے اسمٰعیلیہ ہے کیونکہ اس فرقہ کا آغاز اسمٰعیل بن جعفر الصادق کے ولیعہدی کے مسئلے سے ہوتا ہے۔ مورخین اسلام نے تاریخوں میں انکو ملاحدہ اور باطنیہ کے ناموں سے یاد کیا ہے۔ باطنیہ کی وجہ تسمیہ یا تو یہ ہے کہ یہ لوگ پوشیدہ طور پر دعوت دیتے تھے یا اس لیے کہ انکا عقیدہ تھا کہ ہر ظاہر کا ایک باطن ہے۔

انگریزی میں ایک لفظ اساسن (Assassin) بمعنی قاتل ہے۔ جسکی تاریخ حروب صلیبی کے زمانہ سے آغاز ہوتی ہے۔ اب تک اس لفظ کا ماخذ اہل لغت میں غیر محقق تھا بعض کا گمان تھا کہ یہ انگلوسیکسنی مادہ (Sean) سے مشتق ہے جسکے معنی چھرے کے ہیں۔ دوسروں کا خیال تھا فارسی لفظ شاہنشاہ سے ماخوذ ہے۔ جن لوگوں کی نظر تاریخ پر وسیع تھی انکا فیصلہ تھا کہ سفیوں (پیروان حسن بن صباح) کو بگاڑ کر اساسن بولنے لگے ہیں۔ حال کی تحقیق اس لفظ کو حشاشین یا حشیشین سے مشتق قرار دیتی ہے۔ کیونکہ اسماعیلی پیروان حسن جو اپنے سردار کی طرف سے مختلف بڑے آدمیوں کے قتل پر مامور ہوتے تھے حشیش (بھنگ) کا استعمال کرتے تھے۔ میری ناچیز رائے یہ ہے کہ (Assassin) اساسن کا لفظ حساسین کا بگاڑا ہوا ہے جسکے معنی قاتلوں کے ہیں۔

باطنیہ کے عقائد

اس فرقہ کی افتادیوں پڑی کہ غالیۃ اس میں کثرت سے داخل ہوگئے جو الوہیت ائمہ اور حلول اور تناسخ وغیرہ کے قائل تھے۔ باطنیوں کی تاریخی اہمیت کی ابتدا فاطمئین (۹۰۹ء) کے عہد سے ہوتی ہے جو مصر اور شمالی افریقیہ پر حکمراں تھے فاطمئین سادات ہونے کے مدعی تھے اور خلافت بغداد کے رقیب سمجھے جاتے تھے۔ اقتدار کی ہوس نے انکو مجبور کیا کہ ایران میں اپنی مذہبی اور سیاسی دعوت (پروپاگنڈا) داعیوں کے ذریعہ سے پھیلائیں۔ اس کام کے لیے اسماعیلیوں سے بہتر کوئی آلہ کار نہ تھا۔ یہ اسماعیلی داعی زمین کے طول و عرض میں سیاحت کرتے تھے اور جب خلائق کو اپنے علم و تقدس سے رام کرلیتے تھے تو ان سے مخفی طور پر خلفائے مصر کی بیعت لیتے تھے۔ وہ لوگوں کو بتاتے تھے کہ مذہب کی بنیاد تاویل پر ہے جسکو بجز امام کوئی نہیں جانتا۔ ہر ظاہر کا ایک باطن ہوتا ہے جس تک رسائی بغیر امام کے محال ہے۔ مثلاً حج اہل ظاہر کے نزدیک زیارت کعبہ سے عبادت ہے لیکن اہل

مقصود حج سے زیارت امام ہے ۔ اسی طریقہ سے صوم، صلوٰۃ، زکوٰۃ کا صحیح مفہوم وہ نہیں ہے جو فقہا بتاتے ہیں ۔ ان تاویلات سے مذہب تمام تر مسخ ہو گیا ۔ اور شریعت سے امان اُٹھ گئی ۔ آزادی پسند اور راحت طلب طبائع نے ان عقائد کو بڑی خوشی سے لبیک کہا اور کثرت سے لوگ سلسلۂ بیعت میں داخل ہونے لگے ۔

اس گروہ میں سات کا عدد نہایت پُراسرار اور معنی خیز تھا ۔ وہ سات دور رسالت کے مانتے تھے ترتیب اس طرح ہے ۔ حضرت آدمؑ، حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ، حضرت محمد رسول اللہ ۔ اور حضرت محمد بن اسمٰعیل ۔ ان میں سے ہر ایک کے تابع ذیابعہ سات امام ہوتے تھے جن میں سے پہلا اپنے ناطق پیشوا کا صامت رازدار ہوتا تھا ۔ جیسے حضرت علیؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صامت خلیفہ تھے ۔ ہر ساتویں امام کے بعد بارہ نقیب ، نبی آخر زمان (یا) آنے جن پر وہ سلسلہ ختم ہو جاتا اور نئے دور کا آغاز ہوتا ۔

ان دعوتوں کے مختلف مدارج تھے ۔ سب کا پیشوا داعی الدعاۃ کہلاتا تھا جس کا نائب داعی کبیر کے خطاب سے مخاطب ہوتا تھا ۔ اسکے ماتحت دوسرے داعی ہوتے تھے ۔ ان لوگوں کا کام تبلیغ و دعوت اور تعلیم تھا ۔ عملی اور خطرناک خدمات ادنیٰ ماتحتوں سے لی جاتی تھیں جن کو رفیق، لصیق، اور فدائی کہتے تھے ۔ فدائی کا لفظ اس عہد میں یورپ اور ایشیا میں بڑے سے بڑے سلاطین اور مشاہیر کو لرزہ براندام کرنے کے لیے کافی تھا ۔ یہ فدائی حشیش کے استعمال کے بعد حالت مدہوشی میں فرقۂ باطنیہ کی بنائی ہوئی "فردوس بریں" میں لیجائے جاتے تھے جہاں پہونچکر "حوروں" کی نظر فریب ادائیں، باغ کی دلکشا ہوائیں، فضا کی طلسم نما کیفیت، بہار کی کیف فزا حالت انکو مبہوت کر دیتی اور انکو سچ مچ جنت کا گمان گذرتا ۔ اسکے بعد پھر نشہ پلا کر انکو وہاں سے منتقل کر دیا جاتا جس سے انکی بیقراری اور جنت کا اشتیاق اور بڑھ جاتا ۔ یہ حالت دیکھ کر داعی الدعاۃ (شیخ الجبل) انکو جنت کے وعدہ پر کسی خطرناک مہم کے سرانجام دینے کے لیے روانہ کرتا اور یہ فدائی دیوانہ وار اسکی تعمیل حکم کرتے ۔ بڑے بڑے سردار اور علما جن کو باطنیہ اپنے مشن کی راہ میں مزاحم سمجھتے فدائیوں کے ذریعہ سے تلوار کے گھاٹ اتار دیے جاتے تھے ۔ یہی وجہ تھی کہ تمام ایشیا میں اور حروب صلیبیہ کی بدولت یورپ میں باطنیوں اور فدائیوں کا نام عرصے تک قتل اور خونریزی کا مترادف سمجھا جاتا رہا ۔

باطنیہ کا تاریخی عروج و زوال

جیسا کہ اوپر گذرا باطنیہ یا اسمٰعیلیہ کی تاریخی اہمیت فاطمیین مصر کے عہ

کی رہینِ منت ہے۔ ۱۰۹۴ء تک آٹھواں فاطمی خلیفہ المستنصر باللہ اسمٰعیلیوں کا سردار رہا لیکن آخر میں اُسکے دونوں بیٹوں مستعلی اور نزار کی باہمی کشمکش نے اس فرقہ میں تفریق پیدا کردی مغربی مستعلی کے طرفدار ہوے اور ایران والے نزار کے۔ ناصر خسرو جو شاعر، فلسفی، مشنری اور سیاح کی مختلف حیثیتوں کا جامع تھا۔ نزار ہی کا داعی تھا اور حجتِ خراسان کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ مشہور حسن ابن صباح (متوفی ۵۱۸ھ) جسکے متعلق نظام الملک طوسی اور عمر خیام کی ہم مکتبی کا بے بنیاد افسانہ زبان زدِ عوام ہے ایک کوفی الاصل اثنا عشری تھا جو نوجوانی ہی میں ناصر خسرو کے اثر میں آکر اسمٰعیلی ہوگیا۔ مصر جاکر حسن نے بچشم خود وہاں کے حالات کا مشاہدہ کیا اور وہاں سے ایران واپس آکر وہ قلعہ الموت پر قابض ہوگیا۔ اور بالآخر ایسی حکومت قائم کرگیا جو ملک شاہ سلجوقی اور صلاح الدین ایوبی جیسے قابل اور زبردست فرمانرواؤں سے بھی مغلوب نہ ہوسکی۔

آخرکار تیرھویں صدی عیسوی کے وسط میں جبکہ ہلاکو کے تاتاری وحشیوں نے تمام ممالک اسلامی کو ویران کردیا۔ اسمٰعیلیوں کی حکومت بھی ہمیشہ کے لیے فنا ہوگئی اور جہاں ایک طرف مغلوں کے سیلاب میں خلافۂ بغداد کا فلک بوس قصر زمین پر آرہا دوسری طرف یہ "فرمین لاج" بھی طوفان کی نذر ہوگیا۔ حال میں اس فرقہ کے لوگ شام، ایران، مشرقی افریقہ اور ہند میں پائے جاتے ہیں اور نہایت امن اور خاموشی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

اس اجمالی تذکرہ سے واضح ہوا ہوگا کہ فرقہ باطنیہ نے ایک زمانہ میں کس قدر خطرناک صورت اختیار کرلی تھی۔ ٹھیک اسی طرح مسلمانوں میں آج بھی فرقۂ باطنیہ موجود ہے۔ اس فرقہ کا آغاز سیاسی اغراض سے ہوا تھا۔ انکی تہ میں مذہبی اسباب پوشیدہ ہیں۔ وہ حکومت اسلام کے لیے خطرہ تھا یہ خود مذہب اسلام کے لیے۔ میری مراد مذہبی خطرہ سے وہ مذہبی اعتزال اور آزادی کی روح ہے جو ہماری نئی تعلیم یافتہ جماعت میں ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ میں انکو باطنی اس لحاظ سے کہتا ہوں کہ یہ بھی مذہب کی بنیاد تاویل پر رکھتے ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ پہلے لوگ اُس تاویل کا محرم صرف امام کو قرار دیتے تھے۔ حال کے اہل نظر خود ساختہ تاویل کا اہل خود اپنی ذات کو سمجھتے ہیں۔ وہ لوگ بھی ہر ظاہر کے لیے ایک باطن کے قائل تھے۔ آج بھی محکمات قرآن کو Allegories یا متشابہات کہ کر بدلنے والے بکثرت ہیں۔ جس طرح بیشتر صوم و صلوٰۃ وغیرہ کو بغیر صارفِ قطعی صرف عن الظاہر کرکے اُنکا مفہوم مسخ کردیا گیا تھا۔ اسی طرح اب بھی نصوص کی تحریف معنوی کرنے میں حدیث، اجماع، لغت و محاورۂ عرب سب کو

بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے۔ آخر اس بے قیدی اور آزادی کے اسباب کیا ہیں؟

مسلمانوں پر ایک اعتزال اور آزادی کا دور پہلے بھی آچکا ہے جبکہ علوم یونانیہ کا عربی میں ترجمہ کیا گیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ مسلمان غیر علوم سے نئے نئے واقف ہوئے اور فلسفہ کی مسموم فضا میں پہلی سانس لی۔ اس وقت علمائے حق کو ضرورت محسوس ہوئی کہ نئے علوم کے عاشقوں کو انہیں علوم کے اصول سے مغلوب کیا جائے۔ چنانچہ کلام علام کی بنیاد پڑی جس نے منطق اور فلسفہ کے حربوں سے مذہب کے حملوں کو دفع کیا۔ ہندوستان میں جب سے مغربی علوم و فنون کی روشنی آئی مسلمانوں کی نگاہیں خیرہ ہو گئیں۔ انھوں نے ہر چیز کو اسی روشنی میں دیکھنا شروع کر دیا۔ جس چیز کو مطابق پایا فبہا ورنہ یا تاویل کر لی یا رد کر دیا۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو اس موجودہ ذہنیت کی تہ میں چند نقائص ہیں:-

(۱) ہم اکثر اس امر کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ عقل و مذہب دونوں کے حدود اس قدر متباین ہیں کہ ان میں نزاع ہو ہی نہیں سکتا۔ ایک بزرگ نے اس کے متعلق نہایت دلچسپ تمثیل بیان کی کہ جس طرح ایک ریل گاڑی اور ہوائی جہاز میں تصادم ناممکن ہے اسی طرح عقل و مذہب میں مخالفت ہو ہی نہیں سکتی۔ کیونکہ مذہب سراسر مابعد الطبیعۃ امور سے متعلق ہے اور عقل (سائنس) طبیعی حوادث کے علاوہ نفیاً یا اثباتاً کوئی دعویٰ نہیں کرتی (دیکھو مذہب و عقلیات مولوی عبد الباری ندوی)۔ اگرچہ مولانا نے عقل کو ایک حد تک معطل قرار دیا ہے مگر اس میں شک نہیں کہ عقل فی نفسہ مذہب کے رد و قبول میں حکم نہیں ہو سکتی۔

(۲) ہم جس وقت مذہب پر عقلی اعتراض کرتے ہیں اس وقت یہ فرض کر لیتے ہیں کہ ہماری عقل غلطی نہیں کر سکتی۔ اور یہ کہ موجودہ سائنس نے تمام قوانین کائنات کا احاطہ کر لیا ہے۔

(۳) قوانین فطرت کے متعلق ہم اسکے سوا کیا دعوے کر سکتے ہیں کہ حال میں بعض حوادث کو ہم نے یکے بعد دیگرے اس ترتیب سے دیکھے ہیں کہ سہولت کے واسطے ہم پہلے کو علت اور دوسرے کو معلول کہدیں۔ اگر زمانہ ماضی میں اسکے خلاف ہوا ہو یا مستقبل میں خلاف ہو عقلاً ہمارے پاس نفی کی کوئی دلیل نہیں۔

(۴) حاکم کی ہر چیز محکوم کو اچھی معلوم ہوتی ہے۔ یہ عام قاعدہ ہے۔ اور انسان کی پستی فطرت اسکی ذمہ دار ہے۔ ہم یورپ کے محکوم ہیں اور نہ صرف ہم، بلکہ ہماری ذہنیت

غلاموں کی طرح مرعوب اور مغلوب ہے۔ جسکا اثر یہ ہے کہ اگر کسی انگریزی میگزین میں ہم پڑھتے ہیں کہ فلاں یورپین یا امریکن ڈاکٹر نے ایک مُردہ پر اپنا عمل کیا جس سے وہ جی اُٹھا، ہم بے تامل مان لیتے ہیں اور بیل و حجت نہیں چاہتے ۔ درایت اور روایت کے تمام اصول جرح و تعدیل بالائے طاق رکھ کر ہم اُس خبر پر اعتقاد لے آتے ہیں اور ہماری عقلیت کی حس کو ذرا بھی ٹھیس نہیں لگتی۔ لیکن اگر کوئی مخبر صادق ہم کو بتاتا ہے کہ فلاں مقبول بارگاہ الٰہی نے مُردوں کو زندہ کر دیا تھا، اُس پر ہم ہزاروں طرح سے جرح کرتے ہیں۔

(۵) ہر قوم کے ادب (لٹریچر) کے سمجھنے کے لیے اُس قوم کے اہل لغت کی شہادت اور اہل زبان کے قواعد و محاورات کی معرفت ہم ضروری سمجھتے ہیں، مگر بڑے غضب کی بات ہے کہ قرآن کے بارے میں ہم اس قاعدہ کلیہ کو فراموش کر دیتے ہیں۔ کیا سبب ہے کہ شکسپیر اور ملٹن کے مطالعہ کے لیے تو ہم ڈاوڈن DOWDEN اور مارک پیٹیسن MARK PATTISON کی رائے کو رفیع تصور کریں، اور کتاب الٰہی کے مطالب کے بارے میں ابن عباس رضؓ اور ابن مسعودؓ کے قول کو بے اعتبار جانیں۔

(۶) ہم لوگ ذرا بیمار پڑتے ہیں تو کوشش کرتے ہیں کہ بہترین طبی مشورہ حاصل کریں۔ اگر کوئی قانونی مشکل پیش آتی ہے تو ماہر سے ماہر وکیل سے رجوع کرتے ہیں۔ لیکن مذہب کے بارے میں خود رائے قائم کرنے یا تاویل گھڑنے میں ہم کو ذرا باک نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ہم مذہب کو اپنی صحت یا قانونی مسئلہ کے برابر بھی اہمیت نہیں دیتے۔

(۷) موجودہ نقطۂ نظر میں ایک نقص یہ ہے کہ جب کبھی علوم انسانی کے نظریات بدلیں گے ہمیں بھی مذہب کی تعبیر بدلنی پڑیگی۔ اور اس طرح دین برحق ایک بازیچہ بنکر رہ جائے گا۔

(۸) ہم اپنے طرزِ عمل سے دنیا کو یہ باور کرا رہے ہیں کہ ہمارا مذہب عقلِ انسانی کو گمراہ کرنے آیا ہے کہ اب تک اسکی تعبیر تمام دنیا ایک طریقہ پر کرتی تھی، اور اب جدید تحقیقات میں اُس نے دوسرا پیرایہ اختیار کر لیا۔

(۹) دنیا کا کوئی مذہب (لامذہبی کا ذکر نہیں) ایسا نہیں جس میں کم و بیش کچھ مسائل فہم انسانی سے بالاتر نہ ہوں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ مسلمان چند معجزات اور مسائل معاد وغیرہ کی بنا پر دوسرے مذاہب سے شرمائیں۔

اس ذہنیت کے اسباب وغیرہ جو کچھ ہوں، نتیجہ بہرحال یہ ہے کہ ذہنیت عام بُرائے پر

غالب آتی جاتی ہے۔ نئی تعلیم یافتہ جماعت ہر جگہ اور ہر موقع پر تقریر میں تحریر میں، صحائف و جرائد میں، عام جلسوں اور خاص صحبتوں میں انھیں خیالات کی داعی اور دوسروں کو اپنا ہمخیال بنانے میں ساعی نظر آتی ہے۔ ان شکوک و تاویلات کا دائرہ نہ صرف فروع تک محدود ہے، بلکہ اصول مذہب بھی اُنکی زد سے محفوظ نہیں۔ اور وہ زمانہ دور نہیں جب کہ نبوت اور معاد اوہام، اور صوم و صلوٰۃ ڈھکوسلا بنکر رہ جائیں گے۔ مجھے خود ایک ذی علم مسلم مشنری سے ملنے کا اتفاق ہوا، جنکے خیال میں حشر اور بعث بعد الموت کا رتبہ تمثیلات سے زیادہ نہیں اور جنکے نزدیک نماز عارضی و وقتی تنظیم قومی کی غرض سے قائم کی گئی تھی اور بس۔ للہ انصاف! کیا یہی عقائد و خیالات اُن بزرگوں کے بھی تھے جو قرآن و اسلام کے مخاطب اول تھے اور کیا ان اعتقادات کو رکھتے ہوئے اسلام اور خدمت اسلام کا دعوے ایک ایک کھیل نہیں؟ کہیں رہ کہ تو میروی بترکستان است۔

مرض کا علاج اس مرض کے علاج کی طرف حال میں بہت توجہ کی گئی مگر ابھی بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ وقت آگیا ہے کہ حکمائے امت اس بیماری کے تدارک کی موثر تدابیر پر غور کریں۔ جس طرح قدیم اعتزال کے مقابلہ کے لیے علمائے اسلام نے علم کلام کی بنیاد ڈالی تھی اسی طرح جدید اعتزال کے حملوں کی مدافعت کے لیے بھی ایک علم کلام کی ضرورت ہے۔ اسوقت نہ تو ایسے علما درکار ہیں جو خود آزادی پر عامل اور مذہب کے درد سے غافل ہوں، نہ ایسے جو فروعات و جزئیات سے اختلاف یا اعتراض پر تکفیر کے لیے آمادہ رہیں۔ بلکہ اُن نفوس قدسی کی ضرورت ہے جو ایک طرف علم و عمل کا نمونہ اور صداقت و اخلاص کا مجسمہ ہوں اور دوسری طرف علوم جدیدہ سے آگاہ اور ضروریات زمانہ سے باخبر ہوں۔ تحریک ترک موالات سے پیشتر علمائے کرام کی جماعت اور نئے تعلیم یافتہ طبقہ میں جس قدر بیگانگی تھی محتاج بیان نہیں اس بیگانگی کی ذمہ دار کوئی جماعت سہی، مگر اس سے انکار نہیں کہ اس سے مسلمانوں کو من حیث القوم نقصان پہونچا۔ جب خدا خدا کرکے وہ غیریت رفع ہوئی تو سیاسیات کی مصروفیتوں نے اس طرف توجہ کرنے کا موقع نہ دیا۔ اُس سے ذرا مہلت ملی تھی کہ شریفی و سعودی کے مباحث چھڑ گئے۔ مگر افسوس کہ اس سے زیادہ اہم مسائل ہمارے سامنے ہیں۔ کاش ہمارے ارباب فکر و نظر اس طرف توجہ کریں۔

اس مختصر سے خشک مضمون میں، جو اگرچہ مخلصانہ دردمندی کے ساتھ لکھا گیا ہے کہیں کہیں

مجبوراً تلخ نوائی سے کام لینا پڑا ہے جسکے لیے ہم غالب کی زبان سے معذرت خواہ ہیں
رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

"منی"

"جام سفال"

ہوا فاش رازِ الفت مرے نالہ و فغاں سے
سراج ...... ہوئی بات وہ پرائی جو نکل گئی زباں سے
کیے میں نے نالے ہاں ہاں بھری میں نے آہ بیشک
منظر .... گرائے بگڑ نہ والے اسی بے اثر زباں سے
مرے آشیاں پہ گرنے کو ہزار بجلیاں تھیں
گوہر ..... مری قبر پر نہ ٹوٹا کوئی تارا آسماں سے
سنے ذلتوں کے شکوے تو وہ مسکرا کے بولے
تبلیغ ..... کوئی اُن سے یہ تو پوچھے ملی آبرو کہاں سے
ہیں مناظر اتنے پیدا جو زمین و آسماں سے
عزیز ..... یہ ورق اُڑا لیے ہیں مرے دل کی داستاں سے
شبِ ہجر وائے قسمت مری آنکھ بھی لگی کب
ثروت ..... مرا دل سنبھل گیا جب مرے غم کی داستاں سے
دمِ نزع ناتوانی نہیں ہاتھ اُٹھنے دیتی
ہادی ...... کوئی اشک پونچھ دیتا مری چشم خوں فشاں سے
یہ چراغ اندھے اندھے یہ ستارے دُھندلے دُھندلے
ثروت ...... ہیں اُنھیں کی شاید آنکھیں جو گزر گئے جہاں سے
کیا میرے دل پہ قبضہ کس ادا سے اُسنے کیکے
سراج یہ ہمارا آئنہ ہے اسے لائے تم کہاں سے

مشیر احمد علوی کاکوروی (علیگ)

تاریخ انگلستان

ایک قابل قدر قلمی کتاب

۱۸۵۶ء میں جب واجد علی شاہ، آخری تاجدار اودھ، معزول کیے گئے، تو لکھنؤ سے کلکتہ بدیں عزم گئے کہ انگلستان جا کر برطانوی پارلیمنٹ اور ملکۂ وکٹوریہ سے انصاف کے طالب ہوں۔ کلکتہ پہونچ کر بادشاہ کی رائے بدل گئی، اور بجائے اس کے کہ وہ خود زحمتِ سفر گوارا کرتے، اپنی والدۂ ماجدہ ملکۂ کشور، اپنے بھائی مرزا سکندر حشمت اور ولیعہد مرزا حامد علی بہادر کو انگلستان روانہ کیا، اور اُن کی معیت میں ہمارے اعزائے وطن میں سے ایک بزرگ مولوی مسیح الدین خاں کو اپنا مختار بنا کر بھیجا کہ بادشاہ کی طرف سے مقدمہ کی پیروی کریں اور انگلستان کے ارباب حل و عقد کو اس ظلم و ناانصافی سے بہ تفصیل آگاہ کرکے مناسب تدارک و اصلاحِ حال کے لیے کوشش کریں۔

مولوی مسیح الدین خاں کو اس سلسلہ میں تقریباً آٹھ سال انگلستان میں رہنے کا اتفاق ہوا اور اگرچہ جس مقصد سے وہ گئے تھے اُس میں اس سبب سے کامیابی نہ ہوئی کہ نواب واجد علی شاہ نے اپنے مشیروں کی رائے سے متاثر ہو کر یا اس ملک میں غدر ہو جانے کی وجہ سے جو نئی صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی اُس سے مرعوب ہو کر حکومتِ ہند سے ایک قلیل وظیفہ پر مصالحت کر لی۔ لیکن وہاں کے قیام سے اُنھوں نے فائدہ اُٹھا کر بعض تصانیف کے لیے ضروری اطلاعات فراہم کیں اور ہندوستان واپس آنے کے بعد پہلے مذاقِ قدیم کے مطابق فارسی میں یہ تاریخِ انگلستان لکھی اور پھر زمانہ کے تغیرات کا اندازہ کرکے خود ہی اُسکو اُردو کا لباس پہنا دیا۔

"تاریخِ انگلستان"، جس کا تعارف اہل ملک سے کرانا منظور ہے، ہمارے پیش نظر ہے۔ فارسی نسخہ ابھی تک دسترس سے باہر رہا ہے، اور اُسکے متعلق یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کب اور کس وقت مصنف کے اہل خاندان کے قبضہ سے نکل گیا اور اب کہاں ہے۔

میرے پھوپھی زاد بھائی منشی احمد علی مرحوم (بی اے ایل ایل بی وکیل بارہ بنکی و مترجم "شبابِ لکھنؤ" و "تاریخِ تمدن" وغیرہ) نے انجمن اخوان الصفا کاکوری کے کتبخانہ کے لیے اُردو نسخہ کی ایک

نقل کرائی تھی مگر ۱۹۱۵ء کی طوفاں خیز بارش میں کتب خانۂ انجمن جس مکان میں تھا اس کی چھت گر گئی اور بہت سی دوسری قیمتی کتابوں کے ساتھ تاریخ انگلستان کی نقل بھی تلف ہوگئی صرف ایک جزو یعنی مصنف کی اپنی خود نوشت سوانح عمری باقی ہے جسے الناظر ہی کی وساطت سے عنقریب شایع کیا جائے گا ۔

تاریخ انگلستان کی تحریر اُردو میں غالباً ۱۷۶۹ء میں شروع ہوئی اور جیسا کہ خاتمہ کتاب پر لکھا ہے ۱۷۸۱ء میں تکمیل کو پہونچی اور شروع سے آخر تک خود مصنف کی لکھی ہوئی ہے۔ فلسکیپ کاغذ کے ۱۹ سطری مسطر پر ہے اور جوانب میں کئی انگل چوڑا حاشیہ چھوڑا گیا ہے حاشیہ پر دستور قدیم کے مطابق اکثر عنوانات لکھے گئے ہیں اور جا بجا حواشی پر چھوٹی ہوئی عبارتیں درج ہیں۔ کتاب کا مجموعی حجم ۱۵۰۰ صفحے سے زائد ہے اور اس غرض کے لیے کہ کتاب کی نوعیت اور اہمیت کا اندازہ ہو سکے ذیل میں اُس کے ہر باب کی تفصیل درج کی جاتی ہے :-

باب اول۔ جسکے شروع میں ۱۹ صفحے کا ایک مقدمہ بھی شامل ہے ۷۶ صفحے پر تمام ہوتا ہے۔ اور اس میں یونائیٹڈ کنگڈم آف گریٹ بریٹن اینڈ آئرلینڈ (سلطنت متحدہ برطانیہ عظمیٰ و آئرلینڈ) کا جغرافیہ لکھا گیا ہے۔ اس میں بارہ فصلیں ہیں جن کی تفصیل مصنف نے یوں کی ہے

فصل اول - برطانیہ اعظم وغیرہ کی شکل اور صورت کے بیان میں

فصل دوسری - انگلینڈ اور اسکی تقسیم کے بیان میں کونطیوں وغیرہ پر -

فصل تیسری - انگلینڈ اور ولس کے عمدہ شہروں اور بندروں کے ذکر میں -

فصل چوتھی - انگلینڈ اور ولس کی کونطیوں سے جو جزائر متعلق ہیں اُسکے بیان میں -

فصل پانچویں - انگلینڈ اور ولس کے عجائب آثار قدیمہ اور عجائب خلقی کے بیان میں -

فصل چھٹی - اسکاٹلانڈ کے ذکر میں اسکی تقسیم کونطیوں پر اور بیان اُس کے شہروں کا اور سمیدرات کا اور اُس کے جزائر اور عجائب آثار قدیمہ اور عجائب خلقی اُس کے سب اسی فصل میں ہے -

فصل ساتویں - جزیرۂ آئرلینڈ کے ذکر میں - اس فصل میں اُس کی شکل اور صورت اور تقسیم اُس کی کونطیوں پر اور اُس کے کوائف مذکور ہیں

فصل آٹھویں - جزیرۂ آئرلینڈ کے شہروں اور بستیوں کے ذکر میں ہے -

فصل نویں ۔ جو چھوٹے چھوٹے جزیرے آئرلینڈ سے متعلق ہیں اُسکے ذکر میں ہے اور اس فصل میں عجائب خلقی آئرلینڈ کے جس میں جزیرہ متفرد اور رکیہ وتھہا ہے مذکور ہے ۔

فصل دسویں ۔ داخل اور مخارج خاص اس سلطنت کے ممالک اربعہ کے بیان میں ہے ۔

فصل گیارہویں ۔ کیفیت قرض کے بیان میں جو اس سلطنت پر ہے اور اس کے اسباب کے بیان میں ۔

فصل بارہویں ۔ افواج بری اور بحری اور جہازات جنگی وغیرہ کے بیان میں اور اسی فصل میں کیفیت اور تعداد رعایا کے جہانات کی مذکور ہے ۔

دوسرا باب ۷۵ صفحے کا ہے ۔ اس میں سلطنت برطانیہ اعظم کی تاریخ ہے ۔ چونکہ مصنف کو "ایک تاریخ مفصل نہایت ضخیم انگلستان کی دُرُوہیڈ کے عہد سے جو سکان قدیم انگلستان کے رومیوں کی تسخیر کے قبل تھے اپنے زمانہ تک علیحدہ لکھنا" منظور تھی" اس واسطے اس کتاب میں صرف حالات مختصر ولیم فاتح کے عہد سے جو خاندان عالیہ اس سلطنت کا بانی تھا ہر بادشاہ کے وقائع عہد ملکہ معظمہ وکٹوریہ کے عہد تک مندرج کیے گئے اور تھوڑا سا مذکور رومیوں کی تسخیر کا اور قوم سکسن وغیرہ کی سلطنت کا بھی کیا گیا ۔ مگر تاریخ اسکاٹلینڈ اور آئرلینڈ اور ویلس کے سلاطین کے قبل اُن ممالک کے الحاق کی سلطنت انگلینڈ میں نہیں لکھی گئی صرف جستہ جستہ اس سلطنت کے معارک (معرکوں) کے ذکر میں جو ان ممالک کے ساتھ ابتدا میں ہوئے ہیں کچھ کچھ وہاں کے سلاطین کا بھی ذکر آگیا ہے" اس باب کی ۲۷ فصلوں کی تفصیل یہ ہے ۔

پہلی فصل میں کچھ مختصر حال رومیوں کی تسخیر کا اور سکسن اور نارمن بادشاہوں کا ذکر ہے ۔

دوسری فصل جس میں ذکر سلطنت ولیم فاتح کا ہے جو خاندان عالیہ اس سلطنت کے بانی اور جد اعلیٰ تھے ۔ شروع اُنکی سلطنت سے ایام وفات تک ۔

تیسری فصل ۔ جس میں ولیم روفس کی سلطنت کا بیان ہے جسکو ولیم دوم کہتے ہیں ۔

چوتھی فصل ۔ جس میں ہنری اول ولیم فاتح کے تیسرے بیٹے کی سلطنت کا حال ہے ۔

پانچویں فصل ۔ جس میں شاہ اسٹیون ولیم روفس کے نواسے کی سلطنت کا بیان ہے کہ باطلہ ہنری اول کی بیٹی کو سلطنت سے معزول کرکے خود بادشاہ ہوگیا ۔

چھٹی فصل ۔ جس میں ہنری دوم ہنری اول کے نواسے کی سلطنت کا بیان ہے ماطلدا اُنکی بیٹی کے بطن سے جو شاہنشاہ جرمن کی ملکہ دولھن تھیں ۔

ساتویں فصل۔ جس میں رچارڈ اول ہنری دوم کے بیٹے کی سلطنت کا بیان ہے
آٹھویں فصل۔ جس میں جان رچارڈ اول کے بھائی کی سلطنت کا بیان ہے۔
نویں فصل۔ جس میں ہنری سوم جان کے بیٹے کی سلطنت کا بیان ہے۔
دسویں فصل۔ جس میں اڈورڈ اول ہنری سیوم کے بیٹے کی سلطنت کا بیان ہے۔
گیارہویں فصل۔ جس میں اڈورڈ دوم اڈورڈ اول کے بیٹے کی سلطنت کا بیان ہے
بارہویں فصل۔ جس میں اڈورڈ سیوم اڈورڈ دوم کے بیٹے کی سلطنت کا بیان ہے۔
تیرہویں فصل۔ جس میں رچارڈ دوم اڈورڈ سیوم کے پوتے کی سلطنت کا بیان ہے۔
چودھویں فصل۔ جس میں ہنری چہارم رچارڈ دوم کے چچا کے بیٹے اور اڈورڈ سیوم کے پوتے کی سلطنت کا بیان ہے۔
پندرہویں فصل۔ جس میں ہنری پنجم ہنری چہارم کے بیٹے کی سلطنت کا بیان ہے۔
سولھویں فصل۔ جس میں ہنری ششم ہنری پنجم کے بیٹے کی سلطنت کا بیان ہے۔
سترہویں فصل۔ جس میں سلطنت اڈورڈ چہارم کا بیان ہے جو ڈیوک آف کلارنس اڈورڈ سیوم کے بیٹے کی اولاد دختری سے تھے جس وجہ سے ان کو استحقاق سلطنت ہوا اور ڈیوک آف یارک سب سے چھوٹے بیٹے اڈورڈ سیوم کی اولاد پسری سے تھے۔
اٹھارویں فصل۔ جس میں اڈورڈ چہارم کے بیٹے کی تھوڑے دنوں کی سلطنت کا بیان ہے جن کو اُنکے اپنے چچا رچارڈ نے قتل کیا۔
انیسویں فصل۔ جس میں رچارڈ سیوم اڈورڈ چہارم کے بھائی اور اڈورڈ پنجم کے چچا کی سلطنت کا بیان ہے۔
بیسویں فصل۔ جس میں ہنری ہفتم کی سلطنت کا بیان ہے جو متناسل ڈیوک آف لنکاسٹر کی اولاد دختری سے تھے اڈورڈ سیوم کے تیسرے بیٹے۔
اکیسویں فصل جس میں ہنری ہشتم ہنری ہفتم کے بیٹے کی سلطنت کا بیان ہے۔
بائیسویں فصل جس میں اڈورڈ ششم ہنری ہشتم کے بیٹے کی سلطنت کا بیان ہے۔
تئیسویں فصل جس میں ملکہ میری کی سلطنت کا بیان ہے جو ہنری ہشتم کی بیٹی اڈورڈ ششم کی سوتیلی بہن تھی۔
چوبیسویں فصل جس میں الزبتھ کی سلطنت کا بیان ہے جو ہنری ہشتم کی بیٹی اور

ملکہ میری کی سوتیلی بہن تھیں۔
پچیسویں فصل جس میں جیمس اول کی سلطنت کا بیان ہے جو ہنری ہفتم کی بیٹی کی پوتی کے بیٹے تھے اور ملکہ الزابتھ کے قرابت کے نواسے ہوے اس واسطے کہ انکے ابن عم بھائی کے نواسے تھے
چھبیسویں فصل جس میں چارلس اول جیمس اول کے بیٹے کی سلطنت کا بیان ہے۔
ستائیسویں فصل جس میں ذکر حکومت دا قرا سی کا اس سلطنت میں ہے جس کا بانی اور سردار آلیور کرامول ایک شخص اعاذ اس سے تھا اور اس حکومت کا نام کامن ولستھ رکھا تھا جس کا ترجمہ ہے دولت عامہ
اٹھائیسویں فصل جس میں چارلس دوم کی سلطنت کا بیان ہے چارلس اول کے بڑے بیٹے
اُنتیسویں فصل جس میں جیمس دوم چارلس دوم کے بھائی اور جیمس اول کے بیٹے کی سلطنت کا بیان ہے۔
تیسویں فصل۔ جس میں سلطنت مشترکہ ولیم اور میری کا بیان ہے جو دونوں بہ اشتراک بعد جیمس دوم کی معزولی کے بادشاہ مقرر ہوے مگر شرط یہ ہوئی کہ انتظام سلطنت کا منحصر ولیم پر رہے اور وہ چارلس اول کے نواسے تھے اور جیمس دوم کے داماد، انھیں میری کے شوہر جو مشترک ان کے ساتھ سلطانہ ہوئیں اور ولیم کا لقب ولیم سوم مقرر ہوا۔
اکتیسویں فصل جس میں ملکہ این کی سلطنت کا بیان جیمس دوم کی دوسری بیٹی۔
بتیسویں فصل جس میں جارج اول ہانوور کے الکٹر کی سلطنت کا بیان ہے، الکٹرس سوفیا کے بیٹے اور جیمس اول کی نواسی تھیں الزابتھ نام ان کی بیٹی کے پیٹ سے بموجب پارلمنٹ کے قانون کے الکٹرس سوفیا ملکہ این کی ولیعہد مقرر ہوئیں مگر چونکہ ملکہ این کے مرنے سے پہلے وہ مرگئی تھیں اس سبب سے بموجب اسی قانون کے انکے بیٹے بادشاہ ہوے۔
تینتیسویں فصل جس میں جارج دوم جارج اول کے بیٹے کی سلطنت کا بیان ہے۔
چونتیسویں فصل جس میں جارج سیوم جارج دوم کے پوتے کی سلطنت کا بیان ہے۔ جو فرڈرک نام ان کے بیٹے کے بیٹے تھے اور انکے باپ کا خطاب ڈیوک آف کمبرلینڈ تھا۔
پینتیسویں فصل جس میں جارج چہارم جارج سیوم کے بیٹے کی سلطنت کا بیان ہے۔
چھتیسویں فصل جس میں ولیم چہارم کی سلطنت کا بیان ہے جارج سیوم کے تیسرے بیٹے اور جارج چہارم کے حقیقی بھائی جن کا لقب ڈیوک آف کلارنس تھا۔

سینتیسویں فصل ملکہ معظمہ وکٹوریہ کی سلطنت کا بیان جو ولیم چہارم کی بھتیجی اور جارج سیوم کی پوتی ہیں اُن کے دوسرے بیٹے کی بیٹی جن کا نام ڈیوک آف کنٹ تھا۔ (۱۸۳۷ء تک)

تیسرا باب ۔ سلطنت کے نظم و نسق کے طریقوں میں ہے جو سلطنت متحدہ برطانیہ اعظم اور آئرلینڈ میں جاری ہیں۔ اور ۲۲۶ صفحہ پر تمام ہوا ہے۔ کتاب کا یہ حصہ خاص طور پر قابل قدر ہے کیونکہ اُردو میں اس وقت کوئی ایسی مفصل تاریخ عام طور پر مروج نہیں جس میں انگلستان کے نظم و نسق سے متعلق اس قدر تفصیلی معلومات فراہم ہو۔

انگریزی نظم و نسق کو پانچ حصوں پر تقسیم کیا گیا ہے۔ اگزیکٹو پاور۔ لیجسلیٹو پاور۔ جوڈیشل پاور۔ اڈمنسٹریٹو پاور۔ اور اکلسی اسٹیکل پاور۔ اور اسی مناسبت سے یہ باب مندرجہ ذیل پانچ فصلوں پر مشتمل ہے :-

پہلی فصل ۔ سربراہی (اگزیکیوٹو) کے اقتدار کے ذکر میں۔

دوسری فصل ۔ لیجسلیٹو پاور یعنی اقتدار تقنین قانون کے بیان میں۔

تیسری فصل ۔ عدالتوں کے اقتدار کے بیان میں ہے جسکو جوڈیشل پاور کہتے ہیں۔

چوتھی فصل ۔ اقتدار انتظام کے ذکر میں ہے جسکو اڈمنسٹریٹو کہتے ہیں۔

پانچویں فصل ۔ اقتدار مذہبی کے بیان میں ہے جسکو اکلسی اسٹیکل پاور کہتے ہیں۔

چوتھا باب ۔ ممالک مقبوضۂ سلطنت برطانیۂ اعظم کے ذکر میں ہے جو خارج ممالک اربعہ انگلنیڈ اور اسکاٹ لینڈ اور ویلس اور آئرلینڈ سے ہیں۔ یہ ۲۰۸ صفحے پر پھیلا ہے اور اس میں سات فصلیں ہیں

پہلی فصل ۔ بعضے مطالب تمہیدی اُن ممالک خارجہ کے ذکر میں ہے اور انکو کالونی اور سطلمنط کہتے ہیں۔

دوسری فصل اُن کالونیوں کے یعنی مقبوضات بیرونی سلطنت برطانیہ کے ذکر میں ہے جو یورپ یعنی فرنگستان میں ہیں۔

تیسری فصل ۔ اس سلطنت کے اُن ملکوں کے ذکر میں ہے جو ایشیہ میں ہیں۔

چوتھی فصل ۔ سلطنت برطانیہ کے اُن ممالک و جزائر کے بیان میں ہے جو خطۂ شطرالایشیا کے حدود میں واقع ہیں۔

پانچویں فصل ۔ سلطنت برطانیہ اعظم کے اُن ممالک مقبوضہ کے بیان میں ہے جو خطۂ افریقہ

میں واقع ہیں

چھٹی فصل۔ سلطنت برطانیہ کے اُن ممالک کے بیان میں ہے جو خطۂ امریکا میں واقع ہیں (اور جن کو مقبوضات سلطنت برطانیہ خطۂ امریکا میں کہتے ہیں)

ساتویں فصل۔ دوسری قسم خطۂ امریکا کے ممالک کی جسکو ہندوستان مغربی (West Indies) کہتے ہیں۔

پانچواں باب (۴۹ صفحہ پر تمام ہوا ہے اور یہ اقوام برطانیہ کے تمدن کے ذکر میں ہے اپنی ولایت میں اور باہر بھی اور اُن کے خصائص اور صفات کے بیان میں ہے۔ یہ باب اٹھارہ فصلوں پر تقسیم کیا گیا ہے جسکی تفصیل آگے آتی ہے

پہلی فصل میں بعضے مطالب تمہیدی اس باب کے ہیں جن کی تقدیم سب مطالب پر مناسب ہوئی

دوسری فصل تعلیم اور تعلیم جہال اور اطفال کے بیان میں ہے۔ اس فصل میں آٹھ بحث مذکور ہیں۔

(۱) تعلیم کی تعریف میں اور اُس کی تقسیم میں دو قسم پر ہے۔

(۲) اُس تعلیم کے ذکر میں ہے جو ہمارے اہل اسلام میں رائج ہیں

(۳) اُس تعلیم کے ذکر میں ہے جو سلطنت برطانیہ اعظم کے ممالک میں جاری ہے۔

(۴) بعضے تفریعات اور نتائج خیر اور شر کے ذکر میں ہے جو تعلیم مروجہ ممالک سلطنت برطانیۂ اعظم سے نکلتے ہیں۔

(۵) پچھلے علوم کے ذکر میں ہے جو اس سلطنت کے ممالک میں مہذب ہوئے اور بعضے نئے علموں کے بیان میں جو وہاں ایجاد ہوئے اور اسی بحث میں بعضے اُن علوم کا ذکر ہے جنکو اہل فرنگ نے ہمارے اہل اسلام سے اخذ کیا ہے۔

(۶) عینک کے ذکر میں ہے اور اُس کے فائدے اور نقصان اور طریقے استعمال کے اور بنانے کے اُس میں مذکور ہیں۔

(۷) گونگے، بہرے اور اندھوں کی تعلیم کے ذکر میں ہے جو سلطنت برطانیہ اعظم میں مروج ہے اور اُس میں نئے قاعدے گونگے بہروں کی تعلیم کے واسطے عربی یا فارسی یا اُردو زبان کے اور علوم کے جو نامہ نگار نے ایجاد کیے ہیں مذکور ہیں۔

(۸) مختصر نویسی کے ذکر میں ہے جو فرنگستان میں جاری ہے۔

تیسری فصل - تجارت کے ذکر میں ہے جو سلطنت برطانیہ کے ممالک میں مروج ہے۔

چوتھی فصل - درختوں سے اور سبزیوں سے نفع اُٹھانے کے ذکر میں ہے جس سے زراعت اور فلاحت کے صرفے نکلتے ہیں

پانچویں فصل - حیوانات سے نفع اُٹھانے کے ذکر میں ہے۔

چھٹی فصل - صناعت اور دستکاری سے نفع اُٹھانے کے ذکر میں ہے۔

ساتویں فصل - معادن یعنی کھانوں سے نفع اُٹھانے کے ذکر میں ہے۔

آٹھویں فصل علم تعمیر کے ذکر میں ہے جو سلطنت برطانیہ اعظم کے ممالک میں مروج ہے اس علم کو چار فن پر تقسیم کیا ہے

(۱) نہروں کے اور نابوں کے جاری کرنے کے ذکر میں ہے۔

(۲) ایک قسم کے کنوؤں کے بنانے کے ذکر میں ہے جنکو آرٹیشین ویلس Artesian wells کہتے ہیں جو زمین میں برما کر کے بہت چھوٹے منہ کے کنویں بناتے ہیں کہ اس سے پانی خود بخود جوش کر کے فواروں کی طرح سے باہر نکل پڑتا ہے۔

(۳) سڑکوں کے اور رستوں کے بنانے کے بیان میں ہے

(۴) ان تعمیرات کے ذکر میں ہے جو خاص عمارتوں کے واسطے موضوع ہیں اور اشخاص میں بعضے مشاہیر اور نامور عمارتوں کا بیان ہے جو اُن ممالک میں تیار ہیں۔

نویں فصل - دریا کے سفر کے ذکر میں ہے جو جہازوں اور کشتیوں کے ذریعہ سے ہوتا ہے اسی فصل میں بادبانی اور بخاری جہازوں کا بیان ہے۔

دسویں فصل - ریلوے یعنی لوہے کی پٹیاں بچھائی ہوئی سڑکوں کے ذکر میں ہے جن پر بخاری گاڑیاں چلتی ہیں۔

گیارہویں فصل - طبلی گراف اور سیما فور اور الکٹرک طبلی گراف کے ذکر میں ہے جس کے ذریعہ سے سیکڑوں اور ہزاروں کوس کے پیغام اور مراسلات گھڑیوں میں ہوتے ہیں - اس فصل میں بعضے قواعد سیما فور اور طبلی گراف کے جو عربی اور فارسی اور اُردو میں خبریں بھیجنے کے لیے نامہ نگار نے ایجاد کیے ہیں وہ مذکور ہوں گے۔

بارہویں فصل - کاغذات اخبار جاری ہونے کا ذکر ہے۔

تیرہویں فصل - سب قسم کے چھاپے خانوں کے ذکر میں ہے جسکے ذریعہ سے لاکھوں کتابیں تیق

دیر میں چھپتی ہیں جتنی دیر میں ایک کتاب ہاتھ سے لکھی جائے۔

چودھویں فصل۔ ڈاک خانہ کے تقرر کے ذکر میں ہے جسکے ذریعہ سے علی العموم لوگوں کے مراسلات کی آمد ورفت بہت حسن انتظام اور سرعت سے ہوتی ہے۔

پندرھویں فصل۔ دارالضرب یعنی ٹکسال کے تقرر اور حسن انتظام کے ذکر میں ہے۔

سولھویں فصل۔ ہر چیز کی مقدار معین کرنے کے ذکر میں ہے ناپنے سے اور تولنے سے اور گننے سے اور اور طریقوں سے۔ اس فصل کو سات بحثوں پر تقسیم کیا ہے۔

(۱) گنتی سے تعین کے ذکر میں ہے

(۲) ابعاد کے تعین کے ذکر میں ہے ناپنے کے ذریعہ سے۔

(۳) بادشاہی کے پیمانوں کے ذکر میں اور سیالات اور بھاری چیزوں کی مقدار معین کرنے کے ذکر میں ہے۔

(۴) ہوا کی اور ہر چیز کی حرارت اور برودت کی مقدار معین کرنے کے ذکر میں ہے جو آلہ تھرمامیٹر کے ذریعہ سے ہوتی ہے جس میں اس آلہ کی حکایت اور کیفیت ایجاد کی مذکور ہے۔

(۵) ہوا کے ثقل کی مقدار معین کرنے کے ذکر میں ہے جو بارومیٹر کے آلہ کے ذریعہ سے ہوتی ہے اور اُس میں اس آلہ کی حکایت اور کیفیت ایجاد کی مذکور ہے۔

(۶) ثقل اصلی اجسام اور اجرام کے معین کرنے کے ذکر میں ہے۔

(۷) پانی برسنے کی مقدار معین کرنے کے ذکر میں ہے جو رین گاج کے آلہ کے ذریعہ سے ہوتی ہے اور اُس میں اُس آلہ کی حکایت اور کیفیت ایجاد کی مذکور ہے۔

سترھویں فصل۔ دُوربین اور کلاں بین کے ذکر میں ہے اور اس میں ان دونوں آلات کی حکایت اور کیفیت ایجاد کی مذکور ہے۔

اٹھارویں فصل۔ اوصاف اور فضائل اور سیئات اور رذائل اقوام برطانیہ کے بیان میں ہے جو اور لوگوں کی کتابوں سے اور کچھ اپنے انتخاب اور تمیز سے لکھے گئے ہیں۔ اس فصل کو دو بحثوں پر تقسیم کیا ہے۔

(۱) جن میں بعضے اخلاق اور فضائل مستحسن اور پسندیدہ مذکور ہیں جنمیں برطانیہ کی اقوام متفرد ہیں۔

(۲) میں کردار اور رذائل ناپسندیدہ مذکور ہیں جن میں برطانیہ کی اقوام منفرد ہیں صفحہ ۳۵۷ پر یہ سب مباحث ختم ہو گئے ہیں اور اسی صفحہ سے خاتمۂ کتاب شروع ہوا ہے جس میں مصنف نے خود اپنے سوانح لکھے ہیں۔ یہ سوانح ۴۶۶ صفحہ پر تمام ہوئے ہیں۔ جس کے بعد مصنف نے اپنے جد اعلیٰ مولانا حمید الدین قدس سرہٗ کا ایک رسالہ علم اخلاق میں فارسی سے ترجمہ کرکے بطور ضمیمہ اضافہ کیا ہے۔

مصنف کا نشو و نما جس عہد میں ہوا اُس میں عام طور پر تصنیف و تالیف کا کیا ذکر معمولی مراسلت و مکاتبت تک فارسی میں ہوتی تھی۔ اسکے علاوہ خاندانی علما کے طبقہ میں تو اب تک کم ایسے بزرگ ملیں گے جو سلیس اور فصیح اُردو لکھ سکیں۔ اسی بنا پر تاریخ انگلستان میں اور مولوی مسیح الدین خاں صاحب کی ایک دوسری تصنیف تاریخ الخلفا میں جسے اُنکے خلف اکبر مولوی اکرام الدین خاں سابق تعلقدار ریاست نظام نے ۱۳۰۱ھ میں بمقام اورنگ آباد دکن طبع کرایا تھا وہ ادبیت نہیں پائی جاتی جس نے اُن کے بعض معاصر شعرا و ادبا کو بہت ممتاز کر دیا ہے۔

لیکن ایک طرف کتاب کے اہم مبحث، اسکی ماہیت اور پھر ضخامت کو دیکھا جائے اور دوسری طرف زمانۂ تالیف کی قلیل مدت اور اُنکے انداز تحریر کی صفائی و سادگی پر نظر کی جائے تو بے اختیار دل سے داد نکلتی ہے۔

کتاب کے مختلف فصول میں بکثرت اصطلاحات استعمال ہوئے ہیں اور جا بجا مصنف نے یا تو اُنکا ترجمہ کر دیا ہے یا اُنکے مفہوم کو نہایت اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زبان اُردو باوجود اپنی بے بضاعتی و کم مایگی کے اب سے بہت پیشتر اس قابل ہو گئی تھی کہ دوسری زبان کے خیالات اور سنجیدہ علمی مباحث کو صحت و صفائی کے ساتھ ادا کر سکے۔

انگلستان کی متعدد تاریخیں اُردو میں اس وقت تک لکھی گئیں اور شائع ہو چکی ہیں۔ مگر ضخامت کی بنا پر نیز اپنے مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے یہ کتاب سب پر فضیلت رکھتی ہے۔ کیونکہ جیسا ابواب و فصول کے عنوانات سے اندازہ ہوگا انگلستان کے جغرافیائی حالات کے جزئیات وہاں کے باشندوں کے تمدنی و اخلاقی حالات اور اس مملکت کے نظام و آئین کی تفصیلات پر مصنف نے خاص توجہ کی ہے جو عام تاریخوں میں یا تو بالکل نظر انداز کر دی جاتی ہیں یا نہایت اختصار و اجمال کے ساتھ مذکور ہوتی ہیں۔

ظفر الملک

تضمین بر غزل مرزا غالب

ہوں میں دنیا میں رہین درد جگر ہونے تک　　موت معلوم" مگر جی کا ضرر ہونے تک
ہے مرا خاتمہ بالخیر سحر ہونے تک　　آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

اس قدر ہجر میں آنکھوں نے بہایا خون ناب　　ہو گئے مردمک چشم بھی آخر نایاب
پہلے کرنا ہے ہمیں زیست کا اپنی اسباب　　عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب
دل کا کیا رنگ کروں خون جگر ہونے تک

حال بیمار جسے ہے مرض دل مزمن　　وہ با صلاح ہو اس میں بھی لگیں گے کچھ دن
ہیں سمجھے زہر کے ہم بزم لٹاتے ہمسن　　ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

میں نہ چھوڑوں گا کبھی تیری جفا کی تکریم　　وہ وفادار ہوں، خود تو نے وفا کی تسلیم
تو جو بھیجے تو کروں کیوں نہ قضا کی تعظیم　　پرتو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

حسن و انداز پہ پھر کس لیے بیتاب ہے دل　　دولت و حشمت دنیا پہ عبث ہے مائل
اب کوئی دم میں ہے درپیش عدم کی منزل　　یک نظر بیش نہیں فرصت ہستی غافل
گرمی بزم ہے اک رقص شرر ہونے تک

سچ تو یہ ہے کہ بلا ہوتے ہیں یہ دام نہنگ　　دم پہ بن جاتی ہے سنتے ہیں اگر نام نہنگ
ہیں بہادر وہ اٹھاتے ہیں جو آلام نہنگ　　دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

ہے اثر انکے لیے ذوق فنا میں معراج　　کل یہ سب خلد نشیں ہونگے جو پروانے ہیں آج
ہوش اعجاز مسیحی کے نہیں ہیں محتاج　　غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

سید محمد جعفر حسین اثر لکھنوی

مسلم یونیورسٹی کی حالتِ زار

(سلسلۂ ماہ گذشتہ)

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کی طولانی رپورٹ کا ضروری ملخص گذشتہ پرچہ میں دیا جا چکا ہے۔ اگر حالات واقعتہً ایسے ہی ہیں جیسے کہ اس رپورٹ سے ظاہر ہوتے ہیں تو بے شبہہ ماننا پڑے گا کہ وہ قومی درسگاہ جس پر پچاس سال سے مسلمانوں کی توجہ، قوتِ عمل اور سرمایہ کی کثیر مقدار صرف ہوتی رہی ہے حد درجہ ابتری کی حالت میں ہے اور عموماً تمام ہی خواہان قوم و ملت کو اور خصوصاً اُن اصحاب کو جنھیں اس مرکزِ تعلیم سے کسی نہ کسی نہج سے ذاتی تعلق ہے یونیورسٹی کی زبون و زار حالت کی اصلاح پر پوری توجہ صرف کرنا چاہیے۔

خوش قسمتی سے ڈاکٹر ضیاءالدین صاحب نے ایک دوسری رپورٹ موجودہ وائس چانسلر نواب سر مزمل اللہ خاں بہادر کے نام قلمبند کی ہے جس میں صاحبزادہ صاحب کے اکثر بیانات کی تردید و تغلیط کی گئی ہے یا اُن کی تشریح و تاویل کرکے ایسے نتائج کی طرف رہنمائی کی گئی ہے جو صاحبزادہ صاحب کے اخذ کردہ نتائج سے مختلف و متبائن ہیں اور یہ رپورٹ چھاپ کے تقسیم بھی کی گئی ہے اس لیے ایسے تمام اشخاص کے لیے جو صاحبزادہ صاحب یا ڈاکٹر صاحب کسی کی جماعت سے تعلق نہ رکھتے ہوں دونوں بیانات غور سے مطالعہ کرنے کے بعد صحیح نتیجے پر پہونچنا آسان ہو گیا ہے۔

صاحبزادہ صاحب کی رپورٹ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ ایک حصہ میں 'غالباً" نیازمندِ خصوصی" کی مطبوعہ چٹھیوں کو پیش نظر رکھ کر اُنھوں نے اُن تمام کارگزاریوں کا اجمالی تذکرہ کیا ہے جو اپنے سہ سالہ عہد میں وہ انجام دے سکے، اور دوسرے حصہ میں وہ نقائص اور ابتریاں بیان ہوئی ہیں جو مسلم یونیورسٹی میں موجودہ انتظام و آئین کی بدولت رونما ہیں اور جنکی اصلاح کی اشد ضرورت وہ محسوس کرتے اور دوسروں خصوصاً یونیورسٹی کی کارفرما جماعتوں کو محسوس کرانا چاہتے ہیں۔

پہلے حصہ پر کسی تبصرہ کی حاجت نہ تھی، مگر ڈاکٹر صاحب کے بیان کو پڑھ کر ضروری

معلوم ہوتا ہے کہ اسکے بعض خاص اجزا پر بھی بحث کی جائے۔

(۱) ڈاکٹر صاحب نے اس بات کی شکایت کی ہے کہ ۲۲ - دسمبر ۲۶ء کو لیجسلیٹو کونسل کا اور ۲۴ - دسمبر ۲۶ء کو کورٹ کا جلسہ ہونے والا تھا اور بجائے اسکے کہ صاحبزادہ صاحب کونسل یا کورٹ میں اپنی شکایات پیش کرتے انھوں نے گورنمنٹ کو تحقیقات کرنے کی دعوت دی - حالانکہ کونسل اور کورٹ کے جو تجربات و حالات صاحبزادہ صاحب نے بیان کیے ہیں اور جنکی تردید ڈاکٹر صاحب نے بھی نہیں کی ان کی بنا پر صاحبزادہ صاحب کو اسکی کیا توقع ہو سکتی تھی کہ کونسل یا کورٹ میں اُن کی فریاد پر کوئی توجہ کی جائے گی - اور صاحبزادہ صاحب نے اپنی رپورٹ کے شروع ہی میں جو پیشگوئی کی تھی - ڈاکٹر صاحب اور اُنکے مویدین نے اُسکو بھی پورا کر دکھایا ہے، یعنی لوگوں کو یہ باور کرانا چاہا ہے کہ صاحبزادہ صاحب نے گورنمنٹ کو تحقیقات کرنے کی دعوت دے کر یونیورسٹی کے معاملات میں مداخلت بیجا کا موقع فراہم کر دیا ہے - اول تو یہ باتیں کچھ ڈاکٹر صاحب اور اُن کے مویدین پر پھبتی نہیں کہ وہ صاحبزادہ صاحب کے مقابلہ میں سرکار دولتمدار سے عقیدت و محبت رکھنے میں کسی طرح کی کوتاہی کے ملزم نہیں قرار دیے جا سکتے، بلکہ جب یونیورسٹی بنائی جا رہی تھی تو قوم کے جذبات و مطالبات سے زیادہ حکومت کے اقتدار و اختیارات کا پاس و لحاظ سب سے بڑھ کر ڈاکٹر صاحب اور اُن کے مویدین ہی کو تھا - دوسرے یہ امر واقعہ کے بھی بالکل خلاف ہے - جس کی شہادت صاحبزادہ صاحب کی رپورٹ کے علاوہ خود ڈاکٹر صاحب کے بیان میں بھی موجود ہے -

صاحبزادہ صاحب نے لکھا ہے کہ

"گذشتہ اگست و ستمبر میں منصوری پر اور ۶ - اکتوبر کو علی گڑھ آکر افواہ سنا کہ گورنمنٹ یونیورسٹی کی جانچ کرنا چاہتی ہے - ۲۳ - اکتوبر کو مسٹر رجبی سے دہلی میں ملاقات کی گئی تو اُنھوں نے کہا کہ وہ شملہ میں ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب سے ملے تھے اور اُن سے کہہ دیا تھا کہ گورنمنٹ امتحانات کے نتائج سے مطمئن نہیں ہے اور اس کے متعلق تحقیقات کرنا چاہتی ہے - ڈاکٹر ضیاء الدین نے وعدہ کیا کہ اس قسم کی تحقیقات کی تحریک کونسل میں کی جائے گی - اور گورنمنٹ ڈاکٹر صاحب کے جواب کا انتظار کر رہی ہے" (ص ۹۳ و ۹۴ - الناظر فروری و مارچ)

اب ڈاکٹر صاحب کے بیان پر ایک نظر ڈالیے تو سب سے پہلے یہ جملہ سامنے آتا ہے:-

"ناظم تعلیمات صوبجات متحدہ نے اپنی رپورٹ میں جو رائے ظاہر کی اور اخبار لیڈر میں جو مضامین نکلے، معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی وجہ سے (حکومت کے) اعلیٰ طبقوں میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ مسلم یونیورسٹی کے امتحانات کا معیار پست ہے۔ مئی ۲۵ء میں جبکہ میں نینی تال میں تھا اس امر کی طرف میری توجہ مبذول کرائی گئی اور ایک تحقیقاتی کمیٹی قائم کرنے کا مشورہ دیا گیا"

(ص ۲۵ و ۲۶ بیان ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب)

اس کے بعد وہ تحریر فرماتے ہیں کہ

"اگست ۲۶ء میں میں اسکین کمیٹی کی شرکت کے لیے شملہ گیا اور وہاں مسٹر رچی سے اس مسئلہ پر گفتگو ہوئی۔ اُن کی علالت کے باعث زیادہ تفصیلی گفتگو نہیں کیجا سکی ناظم تعلیمات صوبجات متحدہ کی رپورٹ میں جو رائے ظاہر کی گئی تھی انھوں نے اس پر میری توجہ منعطف کرائی اور میں نے اپنی ذاتی رائے یہ ظاہر کی کہ یونیورسٹی اور ہمارے موجودہ طلبا کے مفاد کے لحاظ سے ضروری ہے کہ ہم گورنمنٹ کو اس بات کا اطمینان دلائیں کہ ہمارا معیار اعلیٰ ہے۔ مگر انکو کوئی قطعی جواب نہیں دے سکتا تھا کہ اس بارے میں مناسب کارروائی کرنا یونیورسٹی کی ایگزیکٹیو کونسل کے اختیار میں تھا۔ مسٹر رچی نے ۶۔ دسمبر ۲۶ء کو مجھے ایک تحریر بھیجی اور خواہش کی کہ اس معاملہ کو اکتوبر کے پہلے جلسہ میں یونیورسٹی کے عہدہ داروں کے روبرو پیش کیا جائے"

(ص ۲۷ و ۲۸ ایضاً)

اقتباسات بالا سے صاف عیاں ہے کہ تحقیقات کا خیال خود حکومت کے اعلیٰ طبقوں میں، ناظم تعلیمات صوبجات متحدہ کی رائے مندرجہ رپورٹ کو دیکھ کر پیدا ہوا۔ مسٹر رچی نے ڈاکٹر صاحب کو تحقیقات کی ضرورت جتائی، ڈاکٹر صاحب نے اس ضرورت کا اعتراف کیا اور مسٹر رچی نے اُنھیں سے خواہش کی کہ وہ اس معاملہ کو کونسل کے روبرو پیش کریں۔

ڈاکٹر صاحب نے کونسل یا کورٹ کسی کے روبرو مسٹر رچی کا خط نہ رکھا، ورنہ زبانی ہی اس معاملہ کو پیش کیا۔ اور بجائے اسکے صاحبزادہ صاحب کو موردِ الزام قرار دینے کے لیے یہ واقعہ تصنیف فرما دیا ہے کہ

"میں نے صاحبزادہ صاحب کو مسٹر رچی کے خط کا مفہوم سمجھا دیا مگر خط اس سبب

سے نہیں دکھا سکا کہ وہ تعطیلات کے خطوط میں مل گیا تھا اور خطوط اس قدر جمع ہو گئے تھے کہ جلد اُن سے فراغت نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ سارا عملہ نئے داخلوں کی وجہ سے انتہائی محنت سے مصروف کار تھا۔ صاحبزادہ صاحب نے معاملہ کو اپنے ہاتھوں میں لینے کا فیصلہ کیا اور مسٹر رچی سے جا کر ملے جسکے بعد میں نے اس مسئلہ کو نظر انداز کر دیا۔" (صفحہ ۲۸ ایضاً)

ڈاکٹر صاحب کو سطور بالا کی تحریر کے وقت یہ یاد نہیں رہا کہ صاحبزادہ صاحب مسٹر رچی سے ۲۳ اکتوبر کو ملے تھے اور اُسوقت تک ڈاکٹر صاحب نے اُن سے مسٹر رچی کے خط کا ذکر نہیں کیا تھا۔ انھیں تو سب سے پہلے اس تحریر کا علم خود مسٹر رچی کے بیان سے ہوا۔ ایسی صورت میں یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ صاحبزادہ صاحب نے معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اس سبب سے ڈاکٹر صاحب نے فریدکاروائی نہیں کی۔ چنانچہ اپنے اس بیان کی تردید ڈاکٹر صاحب نے خود ہی ایک دوسرے جملہ میں کر دی ہے جس میں انھوں نے مسٹر رچی کے خط کو کونسل کے روبرو پیش نہ کرنے کی یہ وجہ بتائی ہے:۔

"چونکہ وائس چانسلر کا انتخاب سر پر آ گیا تھا، مجھے مناسب نہیں معلوم ہوا، کہ حکومت ہند یا مقامی حکومت کو اس جدوجہد کے میدان میں گھسیٹا جائے۔" (ص ۲۹ ایضاً)

ڈاکٹر صاحب کی یہ عبارت قابل حیرت ہے کہ ایسے صاف اور کھلے ہوئے معاملہ کو جس کے ایک ایک جزو کی تصدیق خود اُنھیں کی تحریر سے ہو رہی ہے خواہ مخواہ پیچیدہ بنانے کی کوشش فرماتے ہیں کہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب پر گورنمنٹ کو مداخلت کی دعوت دینے کا الزام عائد ہو جائے۔ اور اس سے زیادہ تاسف انگیز اُن لوگوں کی حالت ہے جو ڈاکٹر صاحب کے بیان کو غور سے پڑھے بغیر محض اُنکی تائید کے خیال سے یا اُنکی پھیلائی ہوئی خبر کو باور کر کے .... صاحبزادہ صاحب کو موردِ الزام بنا رہے اور قوم میں مطعون کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے بیان میں ناظرین کو مغالطہ میں مبتلا کرنے کے لیے ایک اور تماشہ کیا ہے، وہ یہ کہ جون ۱۹۲۶ء میں شیخ عبداللہ صاحب کی صدارت میں جو اصلاحی کمیٹی صاحبزادہ صاحب کی نے مقرر کی تھی اس کی تفصیلات ایسے طریقہ پر بیان کی ہیں کہ پڑھنے والا یہ سمجھے کہ یہ کمیٹی گورنمنٹ کے اطمینان کے لیے بٹھائی گئی تھی اور ڈاکٹر صاحب ہی کے ایما سے مقرر

ہوئی تھی۔ حالانکہ اگر ایسا ہوا ہوتا تو نہ صرف یہ کہ اُس کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق جو ہدایتیں صاحبزادہ صاحب نے اُن کو دی تھیں اُنکی تعمیل میں وہ اس قدر چون و چرا نہ کرتے بلکہ جب اگست کے مہینہ میں مسٹر رچی سے شملہ میں ملاقات ہوئی ہے تو وہ اُنکو یہ کہہ کر مطمئن کر دیتے کہ ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کر دی گئی ہے اور وہ کام کر رہی ہے۔

حکومت ہند کے ذمہ دار تعلیمی عہدہ دار کا اہم مراسلہ یونیورسٹی کے اعلیٰ کارکن (وائس چانسلر) کو صرف اس عذر کی بنا پر نہ دینا کہ دفتر میں کام بہت ہے اور باوجود اُس اعلیٰ عہدہ دار کی خواہش کے کہ معاملہ ایگزیکٹیو کونسل کے روبرو ۲۶ اکتوبر کے جلسہ میں پیش کیا جائے محض ممبر یں ہونے والے انتخاب کے خیال سے اُس معاملہ کو دبا دینا، دونوں باتوں کا خود ڈاکٹر صاحب کو اعتراف ہے اور انھیں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یونیورسٹی کو انھوں نے کیسا کھلونا بنا رکھا ہے۔

(۲) ڈاکٹر صاحب نے اس بات پر اعتراض کیا ہے کہ صاحبزادہ صاحب نے یونیورسٹی کے چندہ کا جہاں ذکر کیا ہے وہاں پانچ لاکھ کی اُس رقم کا تو ذکر کیا ہے جو گورنمنٹ نے سائنس کالج کے لیے دینے کا وعدہ کیا ہے مگر اُن کے وائس چانسلر منتخب ہونے سے بارہ سال پیشتر تیس لاکھ روپیہ جو یونیورسٹی قائم کرنے کے لیے فراہم کیا گیا یا سر جیمس مسٹن کے عہد میں جو دو لاکھ کا اسکول کے اور پندرہ ہزار کا تیراکی کے حوض کے لیے وعدہ ہوا اور سنہ ۱۹۲۶ء میں جو پچاس ہزار کا اضافہ یونیورسٹی کی مستقل امداد میں ہوا اُن رقوم کا کیوں ذکر نہیں کیا گیا۔

مسلم یونیورسٹی کے لیے جو سرمایہ فراہم کیا گیا اُس سے قطع نظر کرنا کسی طرح قابل اعتراض نہیں ہو سکتا کہ وہ قوم کے تمام سربرآوردہ اصحاب کی متحدہ مساعی کا نتیجہ تھا۔ محض علی گڈھ یا ایک دو مخصوص کارکنوں کو اس کا ذمہ دار نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اسی طرح یونیورسٹی کی مستقل سرکاری امداد میں جو اضافہ ہوا اُس کا تذکرہ بھی غیر ضروری تھا کہ یہ علی گڈھ کالج کے یونیورسٹی کا لازمی نتیجہ تھا جو ڈاکٹر صاحب یا کسی دوسرے کارکن کی جد و جہد کا ثمرہ نہیں خیال کیا جا سکتا۔ صاحبزادہ صاحب نے غالبًا اسی نقطۂ نظر سے حساب میں پچیس ہزار کے جدید اضافہ کو بھی نہیں دکھایا۔ البتہ اسکول اور تیراکی کے حوض کی رقوم کا درج نہ ہونا ضرور اُنکی فروگذاشت کہی جا سکتی ہے۔ اگرچہ اسکے اندراج کے بعد بھی صاحبزادہ صاحب کے عہد کار میں جس قدر مالی اعانت حکومت اور قوم سے حاصل ہوئی وہ سابقہ دس سال کے مقابلہ میں تقریبًا چہار گنی ہے

اور اگر پانچ لاکھ کی رقم برائے سائنس کالج اور دو لاکھ کی امداد برائے عمارت مدرسہ دونوں موعود ہونے کی بنا پر خارج از حساب ہو جائیں تو اُسوقت دونوں میعادوں میں فراہم شدہ سرمایہ کی نسبت ایک اور پانچ کی ہو جائے گی۔

بے شبہہ جوبلی فنڈ اور دوسری رقوم کے حصول میں طلبہ، اساتذہ اور دوسرے ارباب کار کی بھی شرکت ضرور ہوئی ہوگی۔ جس طرح کہ درسگاہ کے تمام کاموں میں اُنکی شرکت ہوتی ہے، لیکن اس سے صاحبزادہ صاحب کی حسنِ کارگزاری میں فرق نہیں آسکتا۔ وہ اس تعلیمی فوج کے جتنے دنوں سپہ سالار رہے اُس مدت کی کامیابیوں اور ناکامیابیوں دونوں کے بہت کچھ وہی ذمہ دار قرار پائیں گے —— خصوصًا ایسے تمام کاموں کے جن میں اُن کی تحریک وہ نمائی کو براہِ راست دخل ہو۔

صاحبزادہ صاحب کی رپورٹ کے دوسرے حصہ میں جن نقائص پر توجہ دلائی گئی ہے اُن میں سے ایک اہم مسئلہ شعبۂ علوم اسلامی کا ہے جس کی تفصیلات الناظر جنوری نمبر میں باب ششم کے تحت صفحات ۶۶-۶۷ و ۶۸ پر ملاحظہ سے گذری ہوں گی۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے جواب کے ابواب نمبر ۵ و ۶ میں صاحبزادہ صاحب کے بیان کی تردید فرمانے کی کوشش کی ہے لیکن جیسا کہ سطور ذیل سے اندازہ ہو جائیگا، ڈاکٹر صاحب کی یہ کوشش بالکل کامیاب نہیں ہوئی۔ صاحبزادہ صاحب نے شکایت کی تھی کہ

"سنہ ۲۳-۱۹۲۴ء کی مطبوعہ فہرست نصاب میں اس محکمہ کا ذکر گیارھویں نمبر پر موجود تھا اور مولانا سلیمان اشرف صاحب اسکے معلم اعلیٰ و صدر ظاہر کیے گئے تھے۔ اسطرح پبلک کو باور ... کرایا گیا کہ دوسرے شعبہ جات کی طرح اسلامی علوم کا شعبہ بھی اس یونیورسٹی میں ہے اور پرو وائس چانسلر صاحب کی اس سفارش پر کہ مولانا سلیمان اشرف جو انکے خیال میں اسلامی علوم کے مضمون کیلیے موزوں ترین شخص ہیں اس شعبہ کے معلم اعلیٰ مقرر کیے جائیں انکی تنخواہ ۳۰۰ سے ۵۰۰ تک کے بجائے ۴۰۰ سے ۵۰۰ تک کر دیگئی اور غالبًا اپنے اس عہدہ کی بنا پر وہ مجلس تعلیم کے بھی رکن بنگئے۔ فی الحقیقت جہاں تک کہ مولانا کی تنخواہ اور انکے صدر محکمہ کی حیثیت کا تعلق ہے اسلامی علوم کا شعبہ وجود میں ہے مگر جہاں تک کہ تعلیمی کام کا تعلق ہے اس محکمہ کا عدم و وجود برابر ہے نہ تو اس شعبہ کی تعلیم پانے والے طلبا ہی ہیں، اور نہ اب تک اس کا .... نصاب ہی ....

متعین ہوا ہے"۔ (صـ۶۷ سطر ۶ لغایت ۱۴۔ الناظر ماہ جنوری ۱۹۲۸ء)

یہ عبارت اُس تحریر سے لی گئی ہے جو صاحبزادہ صاحب نے ۵ اپریل ۱۹۲۸ء کو نواب سر مُزمّل اللہ خاں صاحب کے نام بھیجی تھی۔

ڈاکٹر صاحب نے مولانا سلیمان اشرف صاحب کے اضافہ کو تو اس بنیاد پر حق بجانب ٹھہرایا ہے کہ

"ترکِ موالات کے نازک ایام میں وہ اُن معدودے چند علما میں سے ایک تھے جنھوں نے اس بات کی جسارت کی کہ اُس وقت کے مقبولِ عام معتقدات کے خلاف کھڑے ہوں اور ایسا کرنے میں اپنی شہرت بلکہ جان تک انھوں نے معرضِ خطر میں ڈال دی اور کئی بیش قیمت رسائل تصنیف کیے جن میں سے ۲۵۰ صفحہ کا رسالہ النور خاص اہمیت رکھتا تھا"۔ (صـ۶ جواب ڈاکٹر صاحب)

بے شبہہ مولانا سلیمان اشرف صاحب کی یہ خدمات عظیمہ اسی قابل تھیں کہ مسلم یونیورسٹی کے اربابِ کار انکی قدر افزائی فرماتے۔ اور جہاں تک ہمیں صاحبزادہ صاحب کے خیالات و عقائدِ سیاسی کا اندازہ ہے، ہم بے خوفِ تردید کہہ سکتے ہیں کہ اگر صاحبزادہ صاحب کے علم میں یہ خدمات لائی جاتیں تو وہ بھی ڈاکٹر صاحب کی اس رائے کی دل سے تائید فرماتے کہ ایسے قابلِ قدر بزرگ کی حوصلہ افزائی میں کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھا جائے۔ ڈاکٹر صاحب اور صاحبزادہ صاحب کے عقائد و خیالات اور نصب العین میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ اختلاف جو کچھ نظر آتا ہے وہ طریقۂ کار میں ہے۔ صاحبزادہ صاحب چاہتے ہیں کہ مسلمہ قوانینِ اخلاق اور خود یونیورسٹی کے آئین و ضوابط کے حدود میں رہ کر تمام کارروائیاں کیجائیں۔ ڈاکٹر صاحب کسی قسم کے اخلاقی یا آئینی ضوابط کے حدود کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ اُنکا مسلک شاید یہ ہے کہ انگریزی مثل کے مطابق "ذرائعِ عمل اور طریقِ کار کو نتائج و ثمرات حق بجانب بنا دیتے ہیں"۔

صاحبزادہ صاحب کے سامنے مولانا سلیمان اشرف صاحب کی خدمات کے اعتراف کا سوال ہوتا تو وہ غالبًا ایک طرف حکومت میں تحریک فرماتے کہ حضرت مولانا کی عظیم الشان خدمات کے صلہ میں شمس العلما یا خاں صاحب کا خطاب مرحمت فرمایا جائے۔ اور دوسری طرف کورٹ یا ایگزیکیوٹو کونسل سے سفارش کرتے کہ جس طرح گورنمنٹ برطانیہ نے ارل ہیگ اور لارڈ ایلنبائی وغیرہ کو لاکھوں پونڈ کی رقم بطور انعام عطا کی ہے، یونیورسٹی کی طرف سے مولانا کو یکمشت دس بیس ہزار روپئے بدیہ دیئے جائیں یا تنخواہ سے الگ کوئی رقم بطور سالانہ وظیفہ کے مقرر کر دی جائے۔

شعبۂ اسلامی علوم کے متعلق ڈاکٹر صاحب کا بیان یہ ہے کہ

"دنیا میں کوئی نمونہ ایسا موجود نہیں جسکے مطابق مسلم یونیورسٹی کے لیے نصاب تعلیم معین کیا جاتا - اس لیے ایک ایسے نئے مضمون کا نصاب مرتب کرنے میں جس کا طرز مخصوص وضع کا ہو رفتار قدرتاً سست ہونا چاہیے تھی - دو سال ہوے کہ مولانا سلیمان اشرف صاحب کی رہنمائی میں یونیورسٹی نے اسلامی علوم کا نصاب مرتب کر لیا ہے - ہم اس مضمون کی تعلیم گذشتہ دو سال سے دے رہے ہیں اور اسلامی علوم کے شعبہ کا امتحان طلبا ۲۶ء میں دیں گے - نصاب میں ترمیم و اصلاح کی بہت گنجائش ہے - نواب صدر یار جنگ مولانا سلیمان اشرف اور میری مسلسل درخواست پر سید سلیمان صاحب ندوی، مولوی مناظر احسن صاحب مولانا امجد علی صاحب، مولانا اکرام اللہ صاحب ندوی، عبد العزیز میمن صاحب، شمس العلما مولوی عباس حسین مرحوم اور مولانا سلیمان اشرف صاحب (طلب کنندۂ مجلس) کی ایک مجلس اسلامی علوم کا نصاب بنانے کے لیے مقرر ہوئی تھی اور عربی اور دینیات بھی اُنکے دائرۂ تحقیقات میں شامل تھی - یہ مجلس تقریباً ایک ہفتہ تک علی گڑھ میں نشست کرتی رہی اور اسکی رپورٹ ۲۳ - فروری ۲۶ء کو وائس چانسلر کی خدمت میں پیش ہوئی مگر انھوں نے اس پر کوئی کارروائی نہیں کی - رپورٹ اب اُنکے یہاں سے لے لی گئی ہے اور اسلامی علوم، عربی و دینیات کے محکمہ جات کی مشترکہ مجلس کے روبرو عنقریب پیش ہوگی" (ص ۸ رپورٹ ڈاکٹر صاحب)

صاحبزادہ صاحب کے بیان کے بموجب ایگزیکیٹو کونسل (مجلس انتظامی) کے جلسہ منعقدہ ۱۷ دسمبر ۲۳ء میں ڈاکٹر صاحب کی تجویز پر یہ طے پایا تھا کہ یکم جنوری ۲۴ء سے مولانا سلیمان اشرف کا اسلامی علوم کے مشاہرہ یاب معلم اعلیٰ مقرر ہوے مگر ۲۳-۲۴ء و ۲۴-۲۵ء میں مولانا سے موصوف کے پاس اس شعبہ کا نہ کوئی معینہ نصاب تھا اور نہ طالب علم - ڈاکٹر صاحب کے بیان سے اس اعتراض کی تردید نہیں ہوتی اور صاف نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یکم جنوری ۲۴ء سے لیکر یکم اکتوبر ۲۵ء تک جبکہ یونیورسٹی کا تعلیمی سال شروع ہوتا ہے یعنی ایک سال آٹھ مہینے تک مولانا سلیمان اشرف صاحب کو شعبۂ اسلامی علوم کے طلبا کو کسی قسم کی تعلیم دیے بغیر ترقی یافتہ درجہ کی تنخواہ ملتی رہی - کیونکہ جن طلبا کا پہلی بار ۲۶ء میں امتحان ہوگا اُن کی دو سال کی خواندگی اکتوبر ۲۵ء سے قبل

نہیں شروع ہو سکتی تھی -

اکتوبر ۲۵ سنہ ۶ سے جس نصاب کی تعلیم شروع ہونے کا ذکر ڈاکٹر صاحب کے بیان میں پایا جاتا ہے اُسکے متعلق ڈاکٹر صاحب کو بتانا چاہیے تھا کہ اکیڈمک کونسل نے کب اسے منظور کیا۔ ایسا تو نہیں ہے کہ صاحبزادہ صاحب کے اعتراضات کی بنا پر ڈاکٹر صاحب اور مولانا سلیمان اشرف صاحب نے باہمی مشورہ سے محض دفع الوقتی کے طور پر کوئی نصاب تصنیف کر دیا ہو اور اُسی کی تعلیم دی جا رہی ہو -

بہرحال خواہ کوئی صورت بھی ہو ڈاکٹر صاحب ان الزامات سے اپنی براءت نہیں کر سکتے کہ

(۱) اسٹیچوٹس کی دفعہ ۱۹ - الف کے بموجب جن پندرہ علوم کی تعلیم کا انتظام یونیورسٹی کے لیے لازمی تھا اُن میں سے شعبۂ اسلامی علوم کی تعلیم کا انتظام یونیورسٹی قائم ہونے کے بعد سے ۱۹۲۵ء تک نہیں کیا گیا -

(۲) یکم جنوری ۲۴ سنہ ۶ سے آخر ستمبر ۲۵ سنہ ۶ تک کامل ایک سال آٹھ مہینے، بغیر نصاب معین ہوئے اور کسی طالب علم کو اُسکی تعلیم دیے ہوئے، مولانا سلیمان اشرف صاحب کو بحیثیت شعبۂ اسلامی علوم کے معلم اعلیٰ کے عہدہ اور تنخواہ کی ترقی حاصل رہی

اور اگر واقعی اکیڈمک کونسل کی منظوری کے بغیر کوئی نصاب تعلیم محض قانون کی تعمیل پڑھایا گیا ہے جیسا کہ ڈاکٹر صاحب کے بیان سے اندیشہ ہوتا ہے تو یہ بجاے خود ایک نیا الزام ڈاکٹر صاحب پر عائد ہو گا -

ہمارے پاس اکیڈمک کونسل کے جلسوں کی کارروائیاں نہیں ہیں جنکو دیکھکر ہم تحقیق کے ساتھ بتا سکتے کہ وہ نصاب تعلیم جو ڈاکٹر صاحب کے بیان کے بموجب گذشتہ دو سال سے پڑھایا جا رہا ہے اُسکا منظور کردہ ہے یا نہیں - اور ہم شکرگزار ہوں گے اگر کوئی صاحب جنھوں نے ان کارروائیوں کا مطالعہ کیا ہو یا جنکے پاس اکیڈمک کونسل کی مطبوعہ رودادیں موجود ہوں اس بارے میں ہمارے شکوک کو رفع کر دیں -

(نوٹ) ڈاکٹر صاحب کی رپورٹ کا ترجمہ بالاقساط اخبار حقیقت میں شائع ہونے لگا ہے - جو صاحب مزید اطمینان کے لیے دیکھنا چاہیں دیکھ لیں -

ظفر الملک

پچھلے مہینے کے رسالے

معارف جون نمبر میں مولوی سید ریاست علی ندوی نے مصر کے مشہور انشا پرداز شیخ محب الدین الخطیب مدیر الزہراء کے مضمون کا خلاصہ "ترکی ادبیات کے تین دَور" کے عنوان سے پیش کیا ہے جو تمام ادب دوست اصحاب کی دلچسپی کا موجب ہوگا۔ اسی میں ادب ترکی پر یورپ کی بیداری کا اثر اور دَورِ اسلامی کے زوال پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا گیا ہے:-

"یورپ کی عام بیداری، صنعت و حرفت، علم و فن اور آداب و معاشرت میں اسکی عہد بہ عہد کی ترقی اور ادھر ترکی ادبیات میں دورِ اسلامی کا انحطاط دونوں بیک وقت شروع ہوے۔ کیونکہ ادب قوموں کی زندگی کا آئینہ ہوتا ہے۔ اس لیے جس دَور میں اس کے جو خط و خال ہوں گے وہی اس میں نمایاں ہوتے ہیں۔ یورپ کی حیرت انگیز ترقی نے ترکوں کی نگاہیں خیرہ کر دیں اس لیے رفتہ رفتہ اُن کی دلچسپیاں اُن تمام چیزوں سے ختم ہو گئیں جن میں قدامت کا کوئی ادنیٰ شائبہ موجود تھا۔

لیکن اس کا خطرناک اثر یہ مترتب ہوا کہ سرے سے ترکی شعر و شاعری ماند پڑ گئی اور قریب تھا کہ ترکی ادبیات کا سلسلہ منقطع ہو جائے۔ سلطان سلیم ثالث نے ۱۲۰۳ھ میں اس خطرے کو محسوس کرکے اصلاح کی کوشش کی اور اعیانِ حکومت کو طلب کرکے ایک مجلسِ شوریٰ منعقد کی اور شعراء کو اپنا دلچسپ مشغلہ جاری کرنے کی ترغیب دی، لیکن یہ جد و جہد بہ وجوہ یورپ کی طرف ترکوں کے بڑھتے ہوے شوق کا سدباب نہ کرسکی، اور نہ شاعری میں کوئی زندگی پیدا ہوئی۔ اس لیے سلطان محمود ثانی نے ۱۲۴۱ھ میں ایک دوسری تدبیر اختیار کی اور نوجوانانِ ترک کو یورپ کی نظموں کو ترکی میں منتقل کرنے کی طرف مائل کیا اور پھر ۱۲۵۵ھ تک یہ تحریک حکومتِ عثمانیہ کا ایک خاص مشن بن گئی، چنانچہ سلطان عبدالمجید نے مصطفےٰ رشید پاشا صدرِ اعظم کے مساعیِ جمیلہ سے نوجوانانِ ترک کے درمیان اس تحریک کی فرمانِ سلطانی کے ذریعہ عام اشاعت کی کہ وہ یورپ کی بہترین نظمیں ترکی زبان میں منتقل کریں جسمیں خاطر خواہ کامیابی ہوئی

چنانچہ اسی فرمانِ سلطانی سے ترکی ادبیات کا دوسرا دَور شروع ہوتا ہے جسمیں نوجوانانِ ترک یورپ کی ادبی دنیا کی طرف مائل ہوتے ہیں۔"

ہمایوں "عربی اربابِ قلم" کے زیرِ عنوان، مولوی عبدالحمید نعمانی نے ہمایوں کے جون نمبر میں ایک مضمون لکھا ہے جو اشہر مشاہیر ادباء الشرق سے ماخوذ اور دراصل محمد کرد علی کے مضمون "الانشاء و المنشؤن" کا ترجمہ ہے۔ اس میں ابتدا سے لیکر آٹھویں صدی ہجری تک

کے ادیبوں اور انشا پردازوں کی تصنیفات و تالیفات کا اجمالی تذکرہ کیا گیا ہے۔ اقتباسِ ذیل سے مضمون کی نوعیت کا کسی قدر اندازہ ہو سکے گا۔ جو عربی داں طبقہ کے لیے خاص طور پر دلچسپی کا موجب ہو گا :-

"عہد آغاز اسلام میں جسے بلاغت و انشا کا دور اول کہنا چاہیے، فصاحت و بلاغت کی ریاست بلا چون و چرا حضرت علی کرّم اللہ وجہہ کے زیر قلم تھی۔ محققین اس امر میں متفق ہیں کہ قرآن مجید و احادیث نبویہ کے بعد نہج البلاغۃ ہی کا مرتبہ ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خطبات کا مجموعہ ہے جس کی تدوین شریف رضی نے کی اور شرح ابن ابوالحدید نے۔ امام ابو بکر باقلانی اور علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کے مصنفات اعجاز القرآن اتقان اور مزہر نیز اور دوسری کتابوں کا مطالعہ کرنے والوں سے مخفی نہیں کہ قرن اول کے اس دَور میں اور بھی بہت سے انشاپرداز ہیں، بقول رقاشی عربوں کے دماغ نے نظم سے زیادہ نثر کا حصہ پیدا کیا، لیکن نثر کا دسواں حصہ بھی محفوظ نہ رہ سکا۔ اور نظم کا دسواں حصہ ہی بچ سکا۔ یہ مختصر اور محفوظ حصہ طباعت کی دولت سے محروم ہے، اور زیادہ تر مغرب کی یونیورسٹیوں اور کتب خانوں میں گذشتہ خاک نشینوں کی یادگار ثابت ہو رہا ہے۔ اس دور میں جن ممتاز منشیوں کا پتہ چلتا ہے اُن میں زیاد، حجاج، قطری، عمران وغیرہ قابل ذکر افراد ہیں۔ اس بزم کی آخری شمع حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ تعالی عنہ ہیں۔ ابن سعد نے طبقات میں اور ابن جوزی نے مناقب میں آپکے جو خطبات اور مختصر رسائل نقل کیے ہیں وہ فصاحت اور بلاغت میں آیات کبریٰ کا مرتبہ رکھتے ہیں اور اُن کے پڑھنے سے نہ صرف آپ کے انشا پردازانہ اقتدار کا پتہ چلتا ہے بلکہ آپ کی سلطنت رانی اور سیاست دانی کے حالات و واقعات بھی آئینہ ہو جاتے ہیں۔"

جامعہ

گذشتہ سال امپیریل کانفرنس (لندن) کی اس قرارداد نے کہ نوآبادیاں سلطنت کے اندر خود مختار حکومتوں کا درجہ رکھتی ہیں، مرتبہ میں باہم مساوی اور اپنے داخلی و خارجی معاملات میں کسی طرح بھی ایک دوسری کی ماتحت نہیں ہیں البتہ ملک معظم کی مشترک اطاعت اُنھیں متحد کرتی ہے اور برطانیہ کی دولت متحدۂ اقوام میں بحیثیت آزاد اراکین کے شریک کی جاتی ہیں۔ برطانوی سلطنت کے مستقبل سے متعلق لوگوں کے دلوں میں امید و بیم کے متضاد خیالات پیدا کر دیے ہیں۔ چنانچہ عبدالقادر صاحب جونپوری بی اے (جامعی) کا ایک بسیط اور دلچسپ مضمون "سلطنت برطانیہ کا جدید تخیل" کے عنوان سے جون کے "جامعہ" میں شایع ہوا ہے۔ جس میں اُن تمام امکانات سے بحث کی گئی ہے جو اس قرارداد

کی بدولت رونما ہو سکتے ہیں اور آخر میں دکھایا ہے کہ حسب ذیل اسباب کے پیدا ہو جانے سے برطانوی سلطنت کے ٹوٹ جانے کا امکان ہے :-

"(۱) کسی عالمگیر سلطنت کا قیام جس کے رکن دنیا کے تمام ممالک ہوں اور جس میں سلطنت برطانیہ بھی مدغم ہو جائے۔

(۲) نو آبادیوں کا طاقت پکڑ جانا (آبادی، دولت اور فوجی قوت کی ترقی سے)

(۳) نو آبادیوں کی صنعتی آزادی (یعنی ملکی صنعت و حرفت کی ترقی۔ جس سے ملکی مصنوعات اور غیر ملکی مصنوعات برطانوی مصنوعات کا آپس میں مقابلہ شروع ہو جانے اور نو آبادیاں برطانیہ کی رقیب بن جائیں۔

(۴) دنیا کے نظام اقتصادی میں تبدیلیاں"

نیرنگ خیال کے جون نمبر میں مولانا سید محمد الیاس رضوی نے "ادب جاپان کی سرگذشت" کے عنوان سے ایک مختصر مضمون لکھا ہے جو غالباً کہیں سے ترجمہ کیا گیا ہے، اگرچہ مضمون میں کہیں اس کا ذکر نہیں۔ جس سے جاپانی علم ادب کی یہ عجیب خصوصیت معلوم ہوئی کہ اُس کا سنگ بنیاد جنس لطیف کے نازک ہاتھوں نے رکھا تھا۔ چنانچہ جاپان کی ادبی تاریخ کے متعلق یہ بیان کرنے کے بعد کہ

"ہندوستان کی طرح ازمنۂ قدیمہ میں وہاں بھی یہ دستور تھا کہ علم و ادب صرف خاندان شاہی اور مذہبی رہنماؤں تک محدود تھا اور عوام کو اس کی تحصیل کی اجازت نہ تھی"

وہ تحریر فرماتے ہیں کہ

"جاپان میں "اتی یاسو" کی صلح عام کے بعد اوائل سترہویں صدی میں یہ تفریق مٹی اور عوام میں بھی تعلیم کا اچھا رواج ہو گیا۔ اور اگلی قیود باقی نہ رہیں۔ سب سے پہلے جاپانی عورتوں نے ترقی کی طرف قدم بڑھائے۔ انھوں نے مختلف نظمیں اور بشیار افسانے لکھے۔ ان میں سے اکثر تو صرف تخیلات اور جذبات ہی کا آئینہ ہوتے تھے اور بعض میں حالات و واقعات بھی شامل ہوتے تھے۔ صنف نازک کے ادبی انہماک اور دلچسپیوں ہی کا نتیجہ تھا کہ جو رنگ اُسوقت قائم ہوا ادب جاپان کا وہی انداز ابھی تک عام طور پر مقبول ہے اور خالص ادب جاپان بھی وہی سمجھا جاتا ہے۔ حتی کہ پسند عام کے خلعت اور قبولیت کے تاج حاصل کرنے کے لیے جب مرد بھی لکھنے بیٹھتے ہیں تو اُنکو بھی لازمی طور پر انھیں عورتوں کے طرز نگارش کا اتباع کرنا پڑتا ہے۔ ادب جاپان کا وہ طفل نوخیز جسنے وہاں کی بہترین اہل قلم ماؤں کے آغوش توجہ میں پرورش پائی پائی۔ جوان ہو کر اُس نے وہ سکہ جمایا ہے کہ آج سات سو برس گذرنے پر بھی اس زمانہ کی تصانیف اُتنی ہی مقبول اور دلچسپ پائی جاتی ہیں اور یہ وہی تصانیف ہیں جو چینی زبان کے اثرات سے آزاد خالص ملکی زبان میں لکھی گئی تھیں"

اُردو رسائل کے خاص مضامین

(جون ۲۷ء)

معارف - اعظم گڈھ

(۱) مسئلہ حقوق نسواں
(۲) ترکی ادبیات پر ایک اجمالی نظر
(۳) حضرت پیر روشان اور فرقہ روشنائی
(۴) سوشیالزم کے مختلف نظریے

ہمایوں - لاہور

(۱) عربی ارباب قلم
(۲) حقیر شے کی قوت
(۳) ہندی شعرا کا تخیل

جامعہ - دہلی

(۱) ولے براؤن
(۲) عرب فرانسیسی ادبیات میں
(۳) سلطنت برطانیہ کا جدید تخیل

مرقع - لکھنؤ

(۱) سیدنا عیسیٰ علیٰ نبینا و علیہ السلام
(۲) جالستان کے راہب کی ایک فرصت
(۳) نوشیرواں

نیرنگ خیال لاہور

(۱) عادل شاہیوں اور مرہٹوں کے تعلقات
(۲) ادب جاپان کی سرگذشت
(۳) ننھا بچہ (افسانہ)

قوس قزح - لاہور

(۱) ہر ملکے و ہر رسمے
(۲) بیوی کا انتخاب (افسانہ)
(۳) جہت کعبہ

مخزن - لاہور

(۱) درشن (افسانہ)
(۲) روڈ پٹ پک
(۳) بچوں کے لیے کتابیں
(۴) حیات بعد الممات

تنظیم - امرتسر

(۱) ہماری اصلاحی پالیسی
(۲) ہندو مسلم اتحاد کی واحد صورت
(۳) ہمارے اجتماعی اخلاق

نظرے خوش گذرے

ہندوستان میں فارسی شاعری کی ایک راجدھانی پنجاب میں قائم تھی، افسوس ہے کہ ۲۶-مئی کو اُس کا آخری تاجدار گرامی بھی اس دنیا سے رحلت کر گیا-انا للہ وانا الیہ راجعون- مرحوم کی بیوہ جو خود بھی اُردو کی شاعرہ ہیں اور ترک تخلص کرتی ہیں اور اُنکے شاگردان خاص حفیظ، اقبال، و سالک وغیرہ کے ساتھ الناظر کی طرف سے دلی ہمدردی کا اظہار کیا جاتا ہے -

اہل پنجاب کی زندہ دلی و سرگرمی کو دیکھتے ہوے یہ امید بیجا نہ ہوگی کہ جلد سے جلد گرامی مرحوم کا کل کلام چھاپ کر محفوظ کر دیا جائے گا - اور خواجہ عزیز لکھنوی کی طرح شاعر کے جسم کے ساتھ اُسکی روح بھی پیوندِ زمیں نہ ہونے پائے گی -

---

مولانا شرر کے متعلق جس انعامی مقابلہ کا اعلان کیا گیا تھا، اُسکی میعاد پہلے ۳۰-جون رکھی گئی تھی، بعد میں بسبب اسکے کہ اخبارات میں اعلان بتاخیر شایع ہوا، ۳۱-جولائی تک میعاد بڑھا دی گئی تھی-اب یہ مدت بھی قریب اختتام آگئی ہے-جن اصحاب نے مضمون مقابلہ پر طبع آزمائی کی ہو، از راہ کرم اسی ماہ کے اندر اندر ارسال فرما دیں -

---

انشاپردازی کے مقابلہ کے متعدد مضامین پہلے شایع کیے جا چکے ہیں، ایک مضمون اس دفعہ ہدیۂ ناظرین ہے - جسکے بعد صرف ایک مضمون اور باقی رہ جاتا ہے - انشاء اللہ اگست نمبر میں وہ بھی شایع ہو جائیگا - ستمبر سے باالتزام مولوی مسیح الدین خاں مرحوم کی خود نوشت سوانحعمری درج کی جاسکے گی - اور کوشش کی جائیگی کہ ششماہی کے اندر ہی اندر کتاب ختم ہو جائے-خدا کی مرضی ہے تو آیندہ ہر ششماہی میں یعنی کم سے کم سال میں ایک مکمل کتاب الناظر کے اوراق پر شایع کیجائے گی - جسکے لیے ضرورت ہوگی تو موجودہ حجم ۸۰ صفحے میں اضافہ کر دیا جائے گا -

---

میں تنہا ہوں، اور اسی حال میں ہر مہینے بہت سے صفحات الناظر کے سیاہ کرنا پڑتے ہیں-کتابوں کے تنقیدیں جو ماہوار شایع ہونا چاہیے تھیں اسی باعث رکی ہوئی ہیں-مصنفین و مولفین اس معذرت کو قبول فرمائیں

ایجنسی کی بعض کتابین

اساس التعلیم مصنفہ منشی محمد عبدالحق بی اے ایل ایل بی جدید تعلیم اور مغربی تمدن کی اشاعت نے اہل ملک کے خیالات مین جو ہیجان پیدا کردیا ہی اُسکی وجہ سے یہ ضرورت عام طور پر محسوس کی جاتی ہے کہ ہندوستان مین جو طریقۂ تعلیم عام طور پر رائج ہی اس مین مناسب اصلاح و ترمیم کی جائے اِس تعلیم کا سب سے بڑا نقص یہ ہی کہ بچہ کی ابتدائی تعلیم و پرداخت پر کافی توجہ نہین کیجاتی اور والدین اور معلمین عام طور پر بچہ کے طبعی رجحان اور عام فطرت انسانی کو نظرانداز کردیتے ہین۔ یورپ و امریکہ کے تعلیمی حلقون مین بچونکی تعلیم و تربیت کے متعلق مختلف تجربات کیے گئے ہین جنمین مشہور امریکن خاتون مانٹی ساری کا طریقہ نہایت مقبول ہوا ہی۔ مصنف کتاب ہذا انھین کے تعلیمی اصول کو ہندوستانی ضروریات کے لحاظ سے مناسب تغیرات کے ساتھ ملک مین رواج دینا چاہتے ہین۔ چنانچہ اس کتاب مین پہلے تو طریقۂ تعلیم پر اصولی بحث کی ہی۔ پھر مانٹی ساری کے طریقۂ تعلیم کی تفصیل و شرح بیان کی ہی اور مطالب کتاب کو بخوبی ذہن نشین کرنے کے لیے مختلف اشیائے تعلیمی کی عکسی تصاویر بھی دی گئی ہین۔ قیمت ۶؍

انسان۔ جس مین انسان کے اندرونی و بیرونی اعضا کا حال جدید تحقیقات کی رو سے بیان کیا گیا ہی۔ قیمت ۸؍

اثرستان۔ نواب میرزا جعفر علی خانصاحب بی اے اثر لکھنوی کا دیوان، دَورِ حاضرہ مین لکھنؤ نے شاعری مین جو انقلاب پیدا کیا ہی اُسکے نمونے مقدمۂ دیوان حضرت عزیز لکھنوی کے قلم سے نکلا ہی۔ جس مین مصنف کی سوانحعمری اور ادبی کارنامے درج ہین
قیمت عصہ؍

امثال ضرب المثلون پر فلسفیانہ بحث ان کی تاریخ۔ استعمال کا موقع و محل ادب اردو مین عجیب و غریب کتاب
قیمت عہ؍

انتخاب صحاح ستہ۔ حدیث شریف کی چھ مشہور کتابون سے ۹۵ حدیثین منتخب کرکے ان کا ترجمہ شایع کیا ہی اور ایک فہرست بہ لحاظ مطالب مرتب کی ہے تاکہ جس مضمون کی حدیث درکار ہو بآسانی مل جائے آخر مین اصل عبارت حدیث بھی درج ہے اور ترجمہ و متن دونون پر یکسان اعداد شمار دیے گئے ہین قیمت عہ

التربیت الاستقلالیہ (مولفہ مولانا عبدالسلام ندوی) فرانسیسی زبان کی مشہور کتاب "انیسوی صدی کا امیل" مصر کے عربی ترجمہ کی وساطت سے اردو زبان مین منتقل ہوئی ہی اور اس مین خطوط کے ذریعہ اس امر پر بحث کی گئی ہی کہ تعلیم و تربیت کے کون سے طریقے اور اصول قابل ترویج ہین۔ لائق مترجم نے مغربی طریقون کے مقابل اپنے بسوط مقدمہ مین وہ طریقۂ تعلیم بھی درج کردیا ہے جو اسلامی طریقہ کہا جاتا ہی اور جسکی بدولت مسلمان تمام دنیا پر چھا گئے تھے۔ قیمت ۶؍

آئینۂ حقیقت نما۔ اِس لاجواب کتاب

مین ہندوؤن اور مسلمانونکے گیارہ سو سال کے تعلقات باہمی پر تاریخی واقعات کے ذریعہ روشنی ڈالی گئی ہے اور اس بات کو بہ دلائل وشہادت نمایان کیا گیا ہے کہ مسلمانون نے اپنے عہد حکومت مین ہندوؤنکے ساتھ ظلم و ناانصافی کے بجائے بہت زیادہ محبت و مروت ملحوظ رکھی۔ اور اسوقت جو ہندوؤنکے دلون مین مسلمانون کی طرف سے بدگمانیان نظر آتی ہین یہ محض غلط تاریخون کے رواج سے پیدا ہوئی ہین۔ تاریخی غلط بیانیون اور غلط فہمیون کے لیے انشاء اللہ یہ کتاب بمنزلہ تریاق ثابت ہوگی۔ قیمت جلد اول ۸/

احسن الافادۃ لارباب الارادۃ۔ مولانا حافظ شاہ علی انور قلندر نے اس رسالہ مین قرآن و حدیث کے حوالون سے ثابت کیا ہے کہ شوہر سے زوجہ کی بیعت جائز ہے مگر اسکا ترک اولی ہے۔ قیمت ۲/

الکھف والرقیم۔ اس کتاب مین حضرت شیخ عبد الکریم جیلی نے بسم اللہ الرحمن الرحیم کے ایک ایک حرف و نقطہ کی تفسیر و تشریح مین عالم عالم بیان فرمایا تھا۔ منشی سراج الدین قلندر کاکوروی نے اس لاجواب کتاب کو مع اردو ترجمہ شرح اور مقدمہ کے شایع کیا ہے۔ قیمت ۱۲/

الدرۃ البیضاء۔ اس کتاب مین حافظ شاہ علی انور قلندر نے تمام مسلمانون کے فائدہ کیلیے نکاح کے معنی، فوائد و آفات، مہر و کیفیت نکاح اور دوسرے امور متعلقہ پر کتب و سیر و فقہ سے معتبر روایات جمع فرمائی ہین اور اسی سلسلہ مین یہ بھی تحقیق فرمایا ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالی عنہا کا مہر کتنا تھا۔ اور حساب مروجہ سے اُسکی صحیح رقم کتنی ہوتی ہے۔ قیمت ۴/

الدر المنظم فی مناقب غوث الاعظم (جلد اول) مولفہ مولانا شاہ علی انور قلندر مرحوم۔ جسمین تصوف اور صوفیون کے متعلق معلومات کثیرہ فراہم کی گئی ہین اور حضرت غوث الاعظم کے متعلق بزرگان متقدمین کے اخبارات و بشارات درج کیے گئے ہین اور اُن بزرگون کے حالات لکھے گئے ہین جنھون نے حضرت غوث الاعظم کی تعریف فرمائی ہے یا جن کی خود آپنے تعریف فرمائی نیز حضرت غوث الاعظم کا حسب و نسب بیان کیا ہے۔ حجم ۲۷ جزو کتابت و طباعت اعلی قیمت ۱/

جلد دوم مین حضرت غوث الاعظم کی ولادت سے وفات تک کے حالات زندگی، آپ کی تحصیل علوم ظاہری و باطنی اور اساتذہ ظاہر و باطن کا ذکر، آپکے مواعظ و تعلیمات، اور آپکی ازواج و اولاد کا بیان، اور آپکے خلفا کے حالات لکھے گئے ہین حجم ۶۰۶ صفحہ تقطیع کلان۔ قیمت للعہ

اسلام بجواب ترک اسلام۔ آریہ سماج کے اعتراضات کا دندان شکن جواب، قرآن کے الہامی ہونے کا ثبوت قیمت ۱۲/

باغبانی (۳ جلد) یعنے "فرمینگرس مینول آف گارڈننگ" کا ترجمہ از مولوی سید مصطفی بی اے اندر سکرٹری ریاست بھوپال۔ جس مین نہایت تفصیل کے ساتھ فن باغبانی پر علمی و عملی حیثیت سے بحث کی گئی ہے اور منشی خورشید احمد صاحب مہتمم باغات ریاست بھوپال نے نہایت مفید حواشی اور ضروری تصریحات کا اضافہ کرکے بہت کارآمد بنا دیا ہے۔ قیمت للعہ

بصائر القرآن۔ قرآن مجید کے وہ قصے جو عرب جیسے ریگستان مین بیداری کی روح پھونک چکے ہین اُن کا ترجمہ عام فہم اردو مین کیا گیا ہے۔ ان مین اخلاقی، معاشرتی، تمدنی، سیاسی نکات موجود ہین۔ ہر مسلمان کا فرض ہے

ملنے کا پتہ — الناظر کتبخانہ لکھنؤ

کر اپنے بچون کو یہ قصے پڑھائے ۱۲؍

تاریخ التعلیم۔ ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب پرنسپل علی گڈھ کالج جنھون نے اپنی عمر قوم کی تعلیمی خدمات کے لیے وقف کر رکھی ہے اور بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ فن تعلیم کے متعلق مسلمانان ہندوستان مین کوئی دوسرا شخص ایسا نہین جو بقدر واقفیت اور تجربہ رکھتا ہو، یہ کتاب اُنھین کے رشحات قلم سے نکلی ہوئی ہے جو لوگ ملک و قوم کی تعلیم سے دلچسپی رکھتے ہین اسکا مطالعہ فرمائین ۱۲؍

تجرد اور ازدواج۔ جسمین علمائے یورپ وامریکہ کی شہادتون سے تجرد کے نقصانات اور شادی کے فوائد بیان کیے گئے ہین اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ہم کو کس طرح اور کس عمر تک شادی کر لینا چاہیے قیمت ۸؍

تاریخ اندور۔ نامور فرمان روایان ہلکر کے کارنامے، شہنشاہ اورنگ زیب کے آخری زمانے سے ۱۹۲۴ء تک اندور کی جدید حکومت اور فرمان روائی کے انقلابات پر نظر رکھنے والون کو اِس تاریخ کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ لائق مصنف کے سحر طراز قلم نے تاریخ کو افسانہ کی طرح پر لذت بنا دیا ہے۔ قیمت ۱۲؍

تصویر عبرت یا اسنہ لتاویوی۔ نہایت دردانگیز اخلاقی نظم۔ بنگال کے خراب رسم ورواج کا خاکہ قیمت ۴؍

تاریخ زوال روما۔ نامور انگریز مورخ ایڈورڈ گبن کی مشہور تصنیف ڈیکلائن اینڈ فال آف رومن ایمپائر کے ترجمہ کی پہلی جلد قیمت ۱۲؍

تفسیر الفرقان فی معارف القرآن

اِس نام سے خواجہ عبد الحی فاروقی معلم تفسیر جامعہ ملیہ۔ ایک تفسیر لکھ رہے ہین جس مین قدیم رنگ کے مفسرین کی طرح منطقی دلائل اور فلسفیانہ بحث کے بجائے کھلی صاف باتون کو سادہ زبان مین بیان کیا ہے۔ اور قرآن کے مطالب حقیقی ذہن نشین کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ لوگ اسلام کے اہم ترین مقاصد کو پیش نظر رکھ سکین اور حالات حاضرہ مین قرآن کی تعلیم کے مطابق عمل پیرا ہون۔ مذہب کی اصلی روح ان مین سرایت کرے اور وہ جانین کہ قومون کے عروج وزوال کے اسباب کیا ہوتے ہین اور مسلمانون کی ترقی کے لیے خدائے کریم نے کیا کیا تدبیرین بتائی ہین۔ نیز عہد رسالت اور خلفائے راشدین کے مبارک دور مین مسلمانونکا کیا نظام تھا۔ ابتک حسب ذیل حصص شایع ہوئے ہین:-

الخلافۃ الکبریٰ۔ سورۂ بقر کی تفسیر مجلد قیمت ۵؍

بیان۔ سورۂ آل عمران کی تفسیر ۱۲؍

الصراط المستقیم۔ سورۂ انفال اور سورۂ توبہ کی تفسیر قیمت ۶؍

سبیل الرشاد۔ سورۂ حجرات کی تفسیر قیمت ۱۰؍

عبرت۔ سورۂ یوسف کی تفسیر ۸؍

البصائر۔ اِس رسالہ مین خواجہ عبد الحی صاحب نے بنی اسرائیل کے وہ واقعات بیان کیے ہین جو قرآن مجید مین درج ہین کہ زمانۂ حال مین مسلمانونکے حالات بہت کچھ اسی قسم کے ہو گئے ہین قیمت ۶؍

جدید دنیائے اسلام۔ گذشتہ نصف صدی کے اندر آہستہ آہستہ اور محاربہ یورپ کے دوران مین اور اُسکے بعد سرعت اور تیزی کے ساتھ اسلامی ممالک مین جو حرکت وبیداری کے آثار نمایان ہوئے ہین، اُنکی بنا پر امریکہ کے ماہر سیاسیات ڈاکٹر سٹوڈرڈ نے یہ کتاب

[illegible]

مرتب کی ہے جسمین ممالک اسلامی کے باشندون کے حالات پر معاشرتی، مذہبی، تمدنی، سیاسی و اقتصادی پہلوؤن سے بحث کرکے اُنکے موجودہ رجحانات و مطامح نظر کے اسباب و علل کا پتہ لگانے کی کوشش کی ہے۔ کتاب کا ترجمہ مولوی جمیل الدین صاحب بی اے (علیگ) نے بڑی دیدہ ریزی و جگرکاوی سے کیا ہے۔ حجم چار سو صفحے سے زائد۔ قیمت ع۲

جور فلک۔ مشہور ناول، ایسٹ لن، کا ترجمہ از پروفیسر انعام اللہ خان ایم اے ضخیم ناول ۳ جلدون مین ترجمہ ہوا ہے اور دیکھنے کے لائق ہے۔ قیمت ۶ ر

حضرت بلھے شاہ۔ پنجاب کے مشہور درویش اور پنجابی زبان کے مشہور شاعر کی سوانح عمری۔ جن کا کلام ہمہ اوست کے رنگ مین رنگا ہوا ہے۔ قیمت ۸ ر

خیالات۔ مرزا سلطان احمد صاحب کے اُن متفرق مضامین کا مجموعہ۔ جو ملک کے موقر رسائل مین شایع ہوچکے ہین۔ قیمت عہ

دلائل الخلافت۔ جس مین مشہور مناظر مولانا عبد الحکیم بہاری مقیم لکھنؤ نے آیات قرآنیہ کی مدد سے خلفائے ثلثہ کی حقیقت و راشدیت کو نہایت مدلل طور پر ثابت کرکے معترضین کو دندان شکن جوابات دیے ہین۔ قیمت ۶ ر

دماغی تربیت۔ مسٹر جیمس ایلن کی لاجواب کتاب "ہاؤ ٹو کلٹیویٹ دی مائنڈ" کا اردو ترجمہ۔ ایک نوجوان مسلمان کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ جو ذہن، صحت جسمانی، تربیت ذاتی، اور انتخاب پیشہ کے متعلق مفید ترین معلومات سے مالا مال ہے ۸ ر

داغ جگر۔ حضرت جگر مرادآبادی کا قابل دید دیوان، جسے بزم ادب اعظم گڑھ کی طرف سے مولوی احسان احمد صاحب بی اے، ایل ایل بی، وکیل نے شایع کیا، اور شروع مین جناب جگر کی شاعری پر ایک پُرلطف مقدمہ اضافہ کیا ہے۔ جو بجائے خود دیکھنے کے قابل ہے۔ قیمت عہ ر

ریاض باسط۔ یعنی مولوی سید باسط علی صاحب رئیس متھرا کا دلچسپ کلام۔ جس مین حمد و نعت کے علاوہ قصائد منقبت سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور شہدائے کربلا کے نوحے اور سلام قابل دید ہین۔ کتاب اعلی لکھائی چھپائی کا بہترین نمونہ ہے۔ قیمت عصہ ر

روح تنقید۔ (تالیف سید غلام محی الدین قادری، زور، بی اے) سید محی الدین زور نے فن تنقید پر یہ دلچسپ اور مفید کتاب لکھی ہے۔ جس مین متعاصر اصول تنقید پر مشرقی و مغربی نقطہ ہائے نظر سے بہت اچھی بحث کی گئی ہے اور نمونہ کے طور پر مثنوی سحر البیان پر تنقید بھی پیش کی گئی ہے۔ تنقیدی مضامین لکھنے والونکے لیے بہت کارآمد ہوگی عہ

رموز فطرت۔ جسمین علم طبیعات و طبقات الارض کے ابتدائی اصول اور جغرافیہ طبعی کے بنیادی مسائل نہایت سلیس اور سادہ زبان مین بیان کیے گئے ہین قیمت ۱۲

زینت آسمان (تالیف پروفیسر برکت علی ایم اے و پروفیسر منہاج الدین ایم، ایس، سی) ستارون کی شناخت پر اردو مین پہلی کتاب ہے۔ اس کتاب مین ستارون کے بارہ نقشے ہین اور ہر نقشے کے ساتھ خاص خاص ستارونکے مختصر حالات بھی قلمبند کردیے ہین تاکہ ستارون کے پہچاننے مین کوئی دقت نہ ہو۔ قیمت عہ

من چلے۔ دل جلون کے لیے ظریفانہ یادداشت۔ ہر ورق کشت زعفران ہے۔ قیمت ۸ ر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اس زمانہ میں یہ مسئلہ زیر بحث ہے کہ انجمن ادب اردو کے جلسہ میں ان چاروں مصنفین یعنی شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی، شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد، شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی، اور شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد میں کون صدر اعظم مقرر کیا جاوے، جتنا یہ انتخاب دلچسپ ہے اُتنا ہی نہایت غور و خوض کا محتاج، اس انتخاب کا انحصار ہے وسعت معلومات وان مصنفین کے کارہائے نمایاں پر، جن لوگوں نے ان مصنفین کے تصانیف کا مطالعہ بہ نظر امعان کیا ہے، وہی خوب اسکی گرہ کشائی کر سکتے ہیں، ورنہ "سبکساران ساحل" سے اس انتخاب کی توقع رکھنا تحصیل حاصل ہے، سہولت تفہیم کے لیئے شاید یہ مثال کافی ہو کہ ایک صحبت میں چند احباب کا اجتماع ہے، اُسمیں یہ مسئلہ زیر غور ہے کہ شبلی، حالی، آزاد و نذیر احمد میں سب سے بڑا انشا پرداز کون تھا، اور کس نے سب سے زیادہ اردو کی خدمت انجام دی ہے، اس صحبت احباب میں ایک شخص ایسا ہے جو صرف دنیا کے افسانہ نگاری سے دلچسپی رکھتا ہے وہ ڈاکٹر نذیر احمد کے حق مین ووٹ دیگا، دوسرا شخص وہ ہے جو عبارت آرائی، بیان کی لطافت، زبان کی سلاست، بندش کی چستی اور محاورے کی دل آویزی کو پسند کرتا ہے، وہ مولانا آزاد کا حلقہ بگوش ہو جائیگا،

تیسرا ایسا شخص وہاں موجود ہے جو نصیحت آمیز اشعار، نیچرل شاعری و تاریخی مضامین کا دلدادہ ہے وہ ضرور مولانا حالی کا اسم گرامی پیش کریگا، لیکن اب اُن میں چوتھا شخص وہ ہے جو ہر صنف کا ذوق صحیح و سلیم رکھتا ہے، یعنی دینیات سے بھی دلچسپی رکھتا ہے اور عبارت آرائی و محاورے کی دل آویزی کا بھی خواہشمند، شاعری سے بھی شغف رکھتا ہے اور تاریخ و تنقید سے بھی وہ یقیناً علامہ شبلی کی موافقت کریگا،

راقم مضمون ہذا اسی چوتھے شخص کی تائید کرتا ہے، فی الحقیقت علامہ شبلی مرحوم زمانۂ حال کے ان چند مستند افاضل میں سے ہیں جن کا وجود ادب اُردو کے لئے مایۂ ناز رہیگا، انکی متعدد تصنیفات نے آسمان علم پر اُن کو آفتاب بناکر چمکایا ہے، دور حاضرہ میں جو لوگ انشا پرداز تسلیم کئے گئے ہیں اُن میں سب سے نمایاں مولانا محمد حسین آزاد و مولانا الطاف حسین حالی و ڈاکٹر نذیر احمد وغیرہ ہیں، ان بزرگوں کی انشا پردازی و کمال سے کسکو انکار ہو سکتا ہے؟ لیکن اگر انصاف کی عینک لگاکر ان اصحاب کی انشا پردازی کا ملاحظہ فرمایئے تو ان میں سے ہر بزرگ کی تحریر میں کچھ نہ کچھ نقص یا کمی ضرور موجود پائے گا، مولانا محمد حسین آزاد کی تحریر میں زور و سادگی ہے لیکن بہت زیادہ خشک ہے اور کہیں کہیں رکیک الفاظ اور محاورے استعمال کرجاتے ہیں جو ایک انشا پرداز کے لیے نازیبا ہے مولانا حالی کا طرز تحریر بھی مولانا آزاد کی طرح سادہ اور صاف ہے لیکن عام طور پر خشک اور کمزور ہے، ڈاکٹر نذیر احمد صرف ایک قادر الکلام اہل زبان ہیں، افسانہ نگاری آپ کا خاص جوہر ہے لیکن انہیں سنجیدہ عبارت سے کوئی تعلق نہیں، فی الحقیقت من حیث المجموع اگر کسیکو کامل الفن انشا پرداز یا ادیب کہا جاسکتا ہے تو وہ صرف علامہ شبلی نعمانی مرحوم کی ذات واحد ہے، سادگی، سلاست، اختصار،

بلندیٔ خیال، رنگینی، لطافت، فقروں کا دروبست، موقع شناسی نشست الفاظ کی خوبی، ترکیب کی دل آویزی غرض علامہ موصوف کا طرز تحریر انشا پردازی کی ان تمام خصوصیات کا جامع ہے، عام طور پر مشہور ہے کہ علامہ مرحوم ایک مورخ بے ہمتا تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جسطرح شاعری نے عمر خیام نیشاپوری کے دیگر علمی کمالات پر پردہ ڈال دیا ہے اسی طرح تاریخی غلغلۂ کمال نے مولانا مرحوم کی مختلف خصوصیات کو دبا دیا ہے چنانچہ یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ الفاروق و سیرۃ نبوی کا مصنف "حسن لب بام" کی اداؤں کا بھی لذت شناس ہے مولانا اس پایہ کے شخص تھے کہ اگر صانع قدرت انکے پیدا کرنے پر ناز کرے تو چنداں ناموزوں نہ ہوگا، مولانا کی مختلف خصوصیات کو بغور ملاحظہ فرمائیے تو صاف اس حقیقت کا انکشاف ہو جائیگا کہ وہ ادیب بھی تھے اور فلسفی بھی متکلم بھی تھے اور فقیہ بھی محدث بھی تھے اور مفسر بھی مورخ بھی تھے اور انشا پرداز و شاعر بھی،

اب دیکھنا یہ ہے کہ ایک انشا پرداز کے لئے کن کن اوصاف و کمالات کا ہونا لازمی و ضروری ہے سب سے پیشتر انشا پردازی کی ہمین تعریف کر دینا لازمی ہے تاکہ اس کسوٹی پر ہم مصنفین کو پرکھ لیں، انشا پردازی ایک مستقل فن ہے جس کے مندرجہ ذیل خصوصیات ہونا چاہیین، طرز تحریر پر زور ہو، الفاظ مختصر اور جامع ہون، بلندیٔ خیال ہو، کوئی غیر فصیح و رکیک لفظ تحریر مین نہ آنے پائے، ہر لفظ و ہر فقرہ اپنی اپنی جگہ پر موزوں اور مناسب چسپاں کیا گیا ہو، جس قسم کا خیال ہو اسی کے مطابق الفاظ بھی ہون، اگر کوئی علمی یا فلسفیانہ بحث درمیان میں آگئی ہے تو الفاظ اسی کے موافق سادے اور فلسفیانہ ہونا چاہئین اگر ایسے موقع پر ظرافت یا رنگینی کا استعمال کیا جائیگا تو یہ بلاغت کے اصول کے منافی ہوگا، اگر کسی شخص کی سوانح عمری لکھنا ہے تو پیشتر یہ خیال کر لینا چاہیے کہ مخاطب

کون ہے کس رتبہ اور کس حیثیت کا ہے آیا اعلیٰ حیثیت رکھتا ہے یا کمتر درجہ، جیسی حیثیت ہو اُسی کے مطابق الفاظ بھی استعمال کرنا چاہییں، غرض جیسا موقع ہو اُسی لحاظ سے طرز تحریر میں بھی تبدیلی ہوتی رہنا چاہیئے، ظرافت، بلاغت، فصاحت و رنگینی وغیرہ کا ایک خاص موقع و محل ہوتا ہے جس کا لحاظ رکھنا ہر انشا پرداز کا اہم فرض ہے، منجملہ خصوصیات بالا کے ایک انشا پرداز کے لئے قوت ترتیب و انتخاب کی صفت بھی ہونا لازمی ہے

انشا پرداز کو یہ اپنے پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ اُسکو کیا لکھنا ہے اور کیا نہین لکھنا ہے اُسی کے مطابق ترتیب و تنظیم کا لحاظ بھی رکھنا لازمی ہونا چاہیئے یعنی کون کون سی بات کہاں لکھنا چاہیئے، لیکن اسکا احساس بجز علامہ شبلی نعمانی کے دوسرے انشا پردازوں میں کم ہے، جس سے کتاب کی وقعت کم ہو جاتی ہے مثلاً آب حیات میں جو مولانا آزاد کی تصانیف میں خیر الکتب ہے ....

اُسمیں جرارت و مصحفی کے حالات میں صفحے کے صفحے لکھ ڈالے ہیں لیکن میر انیس جیسے ہونہار شاعر جین فصاحت و بلاغت کا شہنشاہ ہے جس نے ایجاد مضامین کے دریا بہا دئے، ایک ایک مضمون کو سینکڑون نہیں ہزاروں رنگ سے ادا کیا ہے مناظر قدرت اور جذبات انسانی کی تصویرین جو اُس نے کھینچی ہیں ان کا جواب اردو زبان میں ملنا دشوار بلکہ ناممکن ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نور کا دریا بہہ رہا ہے اُسکے متعلق مولانا آزاد نے چند سطروں پر اکتفا کی ہے حالانکہ جرارت کو میر انیس سے کیا نسبت، دوسرے یہ کہ مولانا آزاد نے آب حیات میں دہلی کے قریب قریب ہر شاعر کا تذکرہ کیا ہے لیکن لکھنؤ کے شعراء میں سوائے خواجہ حیدر علی آتش و شیخ امام بخش ناسخ کے کسی دوسرے شاعر کا تذکرہ نہیں کیا، یعنی خواجہ وزیر، میر وزیر علی صبا، رند واسیر وغیرہ کو ایکدم سرے سے نیست و نابود کر دیا حالانکہ ان میں کا ہر شاعر صاحب

دیوان وپختہ مشق تھا، دورِ حاضرہ کے مصنفین میں یہ خصوصیت مولانا شبلی کی
تصنیفات میں خاص طور پر نمایاں ہے مثلاً شعر العجم کو ملاحظہ فرمایئے، اکثر لوگوں کا یہ
اعتراض ہے کہ علامہ مرحوم نے اکثر نامور شعراء مثلاً ظہیر فاریابی، قاآنی وغیرہ کے تذکرے
قلم انداز کردئے لیکن یہ لوگوں کو معلوم نہیں کہ شعر العجم ایک خاص اصول پر مبنی ہے
یعنی علامہ مرحوم نے صرف انھیں شعراء کو لیا ہے جو کسی خاص طرز کے موجد تھے یا جنھوں نے
صنفِ شاعری میں کوئی مخصوص جدّت وندرت پیدا کی چونکہ شعراء متذکرۂ بالا کسی
خاص طرزِ شاعری کے موجد نہ تھے بلکہ یہ دوسرے فارسی شعراء کے مقلد وپیرو تھے، بدیں وجہ
انکا تذکرہ لکھنا فضول سمجھا، بعض اصحاب کا یہ بھی اعتراض ہے کہ مولانا شبلی نے شعر العجم
حصہ اول میں عمر خیام نیشاپوری کے حالات بہت مختصر لکھے ہیں اُن کے حالات وسوانح
وضاحت سے لکھنا چاہیئے تھے، معترضین کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ مولانا مرحوم کا مطمح نظر
صرف عمر خیام کے شاعرانہ خصوصیات کا بیان کرنا تھا نہ کہ مکمل سوانح عمری کا لکھنا،

شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمدؒ کی معرکۃ الآرا کتاب اجتہاد ہے، اسمیں بھی ایک بڑا
نقص ہے یعنی مسائل کی بحث وتنقید میں کوئی تسلسل نہیں بلکہ اکثر خیالات غیر مربوط
وپراگندہ ہیں، مثلاً "وجود باری" کے بعد اسلام کی سہولتوں کا تذکرہ مولانا نذیر احمد
نے چھیڑ دیا ہے اور اس عنوان کے تحت میں اکثر غیر متعلق باتیں تحریر فرمادی ہیں مثلاً
ہجرت، معرکۂ بدر، اسلامی فتوحات وغیرہ کا اس عنوان سے کیا تعلق؟ بلکہ وجود باری
کے بعد اسلام کے مخصوص عقائد مثلاً توحید رسالت وغیرہ پر بحث کرنا چاہیئے تھی،
اسکی وجہ صرف یہ ہے کہ ڈپٹی نذیر احمدؒ کا دماغ فلسفیانہ نہ تھا اسلئے اُن کے خیالات
غیر مرتب شکل اختیار کرلیتے ہیں،

برعکس اس کے الکلام کو ملاحظہ فرمائے، وہ ترتیب خیال کا ایک مرقع معلوم ہوتا ہے
ہر مسئلہ کی نہایت صاف وواضح طور پر بحث کی ہے اور مطالعہ کرنے والوں کو بالکل مطمئن

محسوس نہیں ہوتی، وجود باری، توحید، نبوت، حقوق انسانی و ملاحدہ کے اعتراض وغیرہ غرض ہر موضوع و ہر مبحث پر خاص فلسفیانہ بحث کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قوت ترتیب و تنظیم ایک انشا پرداز کے لئے کس قدر لازمی ہے، وحدت، ازلیت و روح کے غیر فانی ہونے کی بحث اس طرح علامہ شبلی اپنی کتاب الکلام میں کرتے ہیں،

وحدت: "دو خدا اگر متعدد ہوں تو ضرور ہے کہ انمیں باہم کوئی جز مشترک ہو جسکی وجہ سے وہ سب خدا کہلائیں اور کوئی جزء غیر مشترک جسکی وجہ سے انمیں باہم فرق اور امتیاز ہو اس صورت میں ترکیب لازم آئیگی اور ترکیب ایک قسم کی حرکت ہے اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ خدا میں کسی قسم کی حرکت نہیں،

ازلیت۔ جو شے ازلی نہ ہوگی وہ متحرک ہوگی کیونکہ عدم سے وجود میں آنا ایک قسم کی حرکت ہے اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ خدا میں کسی قسم کی حرکت نہیں۔

روح کا غیر فانی ہونا۔ جب یہ ثابت ہو چکا کہ روح جوہر ہے اور جسمانی نہیں ہے تو خود ثابت ہو گیا کہ وہ فانی نہیں کیونکہ فانی ہونا اجسام کا خاصہ ہے جو چیز جسمانیت سے بالکل بری ہے وہ کیونکر فنا ہو سکتی ہے اور چونکہ روح مرکب نہیں ہے بلکہ بسیط ہے تو نہ اُسکی تحلیل ہو سکتی ہے نہ اُسکے اجزاء بدل سکتے ہیں اسلئے اُسکا فنا ہونا غیر ممکن ہے"

علامہ شبلی شاعری کی تعریف اس طرح پر کرتے ہیں ملاحظہ ہو شعر العجم حصہ چہارم۔

"شاعری اُسی چیز کا نام ہے جسکو صلہ و انعام سے تعلق نہیں وہ ایک آگ ہے جو خود مشتعل ہوتی ہے ایک چشمہ ہے جو خود اُبلتا ہے ایک برق ہے جو خود کوندتی ہے، صلہ و انعام داد و دہش تحسین و آفریں سے کوئی علاقہ نہیں طبیعات میں تمام مسائل کی بنیاد محسوسات پر رکھی جاتی ہے اس لئے اُسمیں زیادہ مصروف ہونے سے محسوسات کا اسقدر دل پر اثر چھا جاتا ہے کہ یقین ہو جاتا ہے

کہ جو چیز محسوس نہیں وہ خیالی اور وہمی ہے اسیکا نتیجہ ہے کہ طبیعیات جاننے والے
مجردات اور روحانیات کے منکر ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ اُن کا سلسلہ خدا تک
پہونچ جاتا ہے کیونکہ وہ اعلی المجردات ہے"۔

غرض اس عبارت کے نقل کرنے سے یہ ہی کہ مولانا شبلی مرحوم جس بحث و موضوع پر قلم اُٹھاتے تھے اُسکو مثل آشنائے فن کے ادا کر دیتے تھے، یہی ایک انشا پرداز کی نمایاں صفت ہے جو دیگر مصنفیں میں کم نظر آتی ہے،

(فلسفی)۔ ایک انشا پرداز کے لئے فلسفی ہونا بھی ضروری ہے، اس سے یہ مقصد نہیں ہے کہ اُسنے بحیثیت ایک فن کے اُس کا مطالعہ کیا ہو، کیونکہ اکثر ایسے فلسفہ داں گذرے ہیں جو انشا پرداز نہ تھے بلکہ مقصد اس سے یہ ہے کہ فطری طور پر اُس کا دماغ فلسفیانہ ہو تاکہ واقعات و مسائل کی بحث میں تحقیق و تنقید سے کام لے سکے، اگر ایک انشا پرداز کا فرض صرف اسقدر ہے کہ وہ کسی موضوع یا مبحث پر جسقدر معلومات مل سکے فراہم کرے تو ہر صاحب علم انشا پرداز ہونے کا دعوی کر سکتا ہے، لیکن ایک انشا پرداز کا رتبہ اس سے بہت اعلی وارفع ہے اس کا اصلی جوہر تحقیق و تنقید ہونا چاہیے، یعنی کسی مسئلہ یا مبحث پر قلم اُٹھاتے وقت یہ ذہن نشیں کر لینا چاہیے کہ اُس کو کیا لکھنا ہی اور کس ترتیب کے ساتھ لکھنا چاہیئے کون امر ضبط تحریر میں لانا ضروری ہے اور کونسا غیر ضروری، ان سب امور کا لحاظ اُسی شخص کو ہو سکتا ہے جو شخص فلسفی و حقیقت بیں ہو، وہ شخص جو فلسفی نہیں ہے وہ اُن امور کو مد نظر نہیں رکھ سکتا، تمثیلاً ہم مولانا محمد حسین آزاد کو لیتے ہیں موصوف کی آب حیات معرکۃ الآرا کتاب ہے، چونکہ مولانا آزاد فلسفی نہ تھے اسی وجہ سے آب حیات میں بہت نقائص نظر آتے ہیں، اول یہ کہ موصوف نے اردو شاعری کی صحیح معنوں میں تنقید نہیں کی، اُسکو شروع سے آخر تک مطالعہ کر جائیے لیکن اس کا اندازہ

بالکل نہیں ہوتا، کہ اردو کی ابتدا کیونکر ہوئی کیا کیا دور قائم ہوئے، عہد بہ عہد کیا کیا ترقیاں ہوئیں، ملک اور قوم کا شاعری پر کیا اثر پڑا اور شاعری کا ملک وقوم پر کیا اثر ہوا، درحقیقت مولانا آزاد کا آب حیات لکھتے وقت یہ فرض تھا کہ ان امور کو پیش نظر رکھتے، ورنہ شعرا کے حالات و قصے ہر شخص جسکو کچھ بھی استعداد ہو فراہم کرسکتا تھا، چونکہ مولانا آزاد فلسفی نہ تھے بدیں وجہ ان اہم و نازک مسائل کو پیش نظر نہ رکھ سکے،

برعکس اسکے شعر العجم کو ملاحظہ فرمائیے، تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ کسی دقیق النظر انشا پرداز کی سحر بیانی کا مرقع ہے، چنانچہ علامہ شبلی مرحوم نے شعر العجم تالیف فرماتے وقت ان تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے، فارسی شاعری کے ارتقائے تدریجی کا واضح طور پر تذکرہ کیا ہے، ہر دور کی شاعری پر مثلاً فلسفیانہ شاعری، صوفیانہ شاعری، عاشقانہ شاعری، اخلاقی شاعری و قصیدہ گوئی، ایران میں شاعری کیونکر پیدا ہوئی، شاعری کی تدریجی رفتار، نظام حکومت کا اثر شاعری پر کیا ہوا، غرض ہر بحث پر جیسی جامع و مانع تعریف قتل آشنائے فن کے کی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بلاغت و فصاحت و مضمون نگاری کا دریا لہریں مار رہا ہے، مولانا مرحوم نے شعر العجم حصہ پنجم صفحہ ۱۶۱ میں فلسفیانہ شاعری پر بحث کی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک فلسفی فلسفیانہ شاعری کا تذکرہ لکھ رہا ہے، پہلے فلسفہ کی تعریف کی ہے تاکہ معلوم ہو جاوے کہ فلسفہ کیا چیز ہے،

"کتب درسیات میں طبیعیات، عنصریات، فلکیات، الٰہیات ان سب کے مجموعہ کا نام فلسفہ ہے"

اسکی تعریف دوسری طرح یہ کی ہے کہ

"فلسفہ وہ علم ہے جسمیں موجودات کے متعلق وسیع ترین کلیات قائم کئے جاتے ہیں"

جس علم میں کسی مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے اُسکے عوارض انفرادی اور مختصات شخصی و نوعی تمام یا تقریباً تمام حذف کر دئے جائیں اور اس مسئلہ کی صرف کُلّی یا مجموعی حیثیت سے سروکار رکھا جائے، اُسی کا نام فلسفہ ہے"۔

صوفیانہ شاعری کی اس طرح بحث کی ہے کہ گویا ایک صوفی تذکرہ لکھ رہا ہے۔

"تصوف کے مقامات میں سے اکثر مقامات ایسے ہیں جن سے جذبات کو تعلق ہے مثلاً رضا، فنا، محویت وجدت، استغراق، اس لئے ان مقامات کے ادا کرنے میں خود بخود کلام میں زور، جذبہ اور اثر پیدا ہوتا ہے، اور یہی چیزیں شاعری کی روح ہیں، مثلاً رضا کے یہ معنی ہیں کہ جو کچھ عالم میں خیر و شر، نیک و بد، حسن و قبح، رنج و راحت ہے سب فاعل مطلق کے حکم سے ہے، اسلئے ہمکو چون و چرا کا حق اور گلہ و شکایت کا موقع نہیں خرابات مقام فنا کو کہتے ہیں، سالک عارف باخبر کو کہتے ہیں، تصوف میں انسان کو اشرف المخلوقات اور عالم اکبر مانا ہے، اسلئے صوفیانہ شاعری نے عزت نفس کا خیال پیدا کیا، تصوف نے بتایا کہ زمین و آسمان اور کون و مکان سب انسان کے لئے ہیں، ہم بادشاہ ازل کے نور کے سایہ ہیں، ہم آدم و حوا کے فرزند نہیں، تصوف نے بتایا کہ فرشتے اور افلاک انسان کا مرتبہ پہچاننے کے قابل نہیں، تصوف اصل میں زبان و قلم کی حدود سے باہر ہے وہ وجدان ذوق و مشاہدہ کا نام ہے جو بیان میں نہیں آسکتا، ایک تمثیلی حکایت لکھی ہے کہ کسی نے جگنو سے پوچھا کہ تم دن کو کیوں نہیں نکلتے، اُس نے کہا میں تو دن و رات ایک ہی جگہ رہتا ہوں، لیکن آفتاب کی روشنی کے ہوتے ہوئے میں لوگوں کو نظر نہیں آتا، یہی حال تمام عالم کا ہے کہ خدا کی ہستی کے مقابلہ میں اُن کا وجود اس حال کو نظر نہیں آتا، اس وحدت کو

وحدت شہود کہتے ہیں، اس وحدت کا خیال رفتہ رفتہ وجود کی حد تک
پہونچایا، حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اپنے مکتوبات میں ثابت کیا ہے کہ درحقیقت
خدا کے سوا کوئی اور چیز سرے سے موجود ہی نہیں یا یوں کہو جو کچھ موجود ہے
سب خدا ہی ہے"۔

ایک ایک لفظ پر غور فرمائیے، کس قدر ادیبانہ و صوفیانہ انداز میں ڈوبا ہوا ہے مولانا کا وصف امتیازی یہی ہے کہ کتاب کے صفحے کے صفحے مطالعہ کر جائیے لیکن، کہیں پر بھی کوئی رکیک و غیر فصیح لفظ یا مبتذل محاورہ نہ پائیے گا۔

وسعت معلومات:۔ ایک انشا پرداز کے لئے وسیع معلومات کا ہونا بھی ضروری ہے ترقیوں کی بوالعجبیاں، ایجادات کی بوقلمونی مرہون ہیں وسعت معلومات کی اور وسعت معلومات منت کش ہے مطالعہ کتب کی،

مشہور ضرب المثل ہے کہ شاعر پیدا ہوتے ہیں اور انشا پرداز بنائے جاتے ہیں، لیکن یہ صحیح نہیں، شاعر اور انشا پرداز دونوں پیدا ہوتے ہیں اور دونوں بنائے جاتے ہیں، ایک انشا پرداز کے لئے وسیع المطالعہ بھی ہونا ضروری ہے کیونکہ بغیر اس کے نظر میں وسعت نہیں پیدا ہو سکتی، اور نہ کسی مسئلہ یا مبحث پر جامع و مانع بحث کی جا سکتی ہے، ممکن ہے کہ ایک صاحب علم میں لطافت، رنگینی، ندرت، واجتہاد ہو لیکن جامعیت کی صفت حاصل نہیں ہو سکتی، بجز علامہ شبلی کے یہ صفت دوسرے مصنفین میں کم پائی جاتی ہے، وجہ اسکی یہ ہے کہ علامہ مرحوم ایک واقعہ یا مسئلہ کی تلاش میں کتابوں کے صفحے کے صفحے مطالعہ کر جاتے تھے، ہر واقعہ کو تحقیق و تدقیق کے ساتھ لکھنا اور اُس کا ثبوت بھی بہم پہونچانا مولانا ہی کا حصہ تھا، جب تک مرحوم ہر واقعہ کو تحقیق و تنقید کی کسوٹی پر خوب اچھی طرح پر کھ نہ لیتے، آگے بڑھنے کا نام نہ لیتے تھے۔

علامہ شبلی کا انداز تحریر اردو انشا پردازی کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے وہ یہ وصف ازل سے لیکر آئے تھے، موصوف میں یہ خاص خصوصیت تھی کہ ہمیشہ اس امر کا لحاظ رکھتے تھے کہ مخاطب کون ہے، کس حیثیت کا ہے، کس موقع پر کس قسم کی عبارت لکھنا چاہیئے، اسی کے موافق وہ الفاظ استعمال کرتے تھے، یہ صفت یعنی الفاظ کے انتخاب میں فرق مراتب کا لحاظ رکھنا بجز مولانا شبلی کے ڈاکٹر نذیر احمدؒ و مولانا حالیؔ وغیرہ میں بہت کم پائی جاتی ہے، اب راقم مضمون ہذا ان چاروں انشا پردازوں کے تصانیف کے چند اقتباسات ذیل میں درج کرتا ہے جن سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ انشا پردازی کا حقیقی معیار کیا ہے اور انشا پردازانہ حیثیت سے مولانا اپنے ہمعصروں میں کیا درجہ رکھتے ہیں۔

مولانا حالیؔ یادگار غالب صفحہ ۱۲ میں اپنے استاد مرزا اسد اللہ خاں غالب کی شان میں جن کے سامنے مولانا حالیؔ نے زانوئے ادب تہ کیا ہے فرماتے ہیں۔

"مرزا کے خاص خاص شاگرد اور دوست، جن سے نہایت بے تکلفی تھی، اکثر شام کو اُن کے پاس جاکر بیٹھتے تھے اور مرزا سرور کے عالم میں اُس وقت بہت پُرلطف باتیں کیا کرتے تھے ایک روز میر مہدی مجروح بیٹھے تھے اور مرزا پلنگ پر پڑے ہوئے کراہ رہے تھے، میر مہدی پاؤں دابنے گئے مرزا نے کہا بھئی تو سید زادہ ہے مجھے کیوں گنہگار کرتا ہے، انھوں نے نہ مانا اور کہا آپ کو ایسا ہی خیال ہے تو پیر دابنے کی اُجرت دید یجئے گا، مرزا نے کہا، ہاں اس کا مضائقہ نہیں جب وہ پیر داب چکے، انھوں نے اُجرت طلب کی، مرزا نے کہا بھیا کیسی اُجرت؟ تم نے میرے پاؤں دابے میں نے تمھارے پیسے دابے حساب برابر ہوا"۔

پلنگ پر پڑے ہوئے یہ بہت عامیانہ لفظ ہے جو اپنے سے کمتر درجہ کے

شخص کے لئے استعمال ہوتا ہے، اس موقع پر پلنگ پر بیٹھے ہوئے زیادہ موزوں تھا،

حیات انیس میں مولانا کا تبصرہ جو مرثیہ پر موصوف نے دیا ہے شائع ہوا ہے،
ملاحظہ ہو حیات انیس صفحہ، "ہم زندون کی تعریف کو قصیدہ بولتے ہیں اور مُردوں کی
تعریف کو مرثیہ، عرب کی قدیم شاعری میں قصائد اور مرثیے ایسے سچے اور صحیح حالات
و واقعات پر مشتمل ہوتے تھے کہ اُن سے متوفی کی مختصر لائف استنباط ہو سکتی تھی،
لہذا متاخرین کو اسکے سوا کچھ چارہ نہ تھا کہ مرثیہ میں کچھ جدّت پیدا کریں اور
اور اُس کے مضامین میں کچھ اضافہ کیا جائے، ترقی براہ راست مرثیہ کی ترقی
نہ تھی بلکہ اردو شاعری میں ایک قسم کا ایجاد تھا، کہ حسن نظم کی بنیاد محض بین
اور مرثیت پر ہونی چاہیئے تھی، اسمیں بین اور مرثیت کے علاوہ مدح اور قدح
فخر و مباہات رزم و بزم بھی نہایت شد و مد کے ساتھ شامل ہوگئی جس نے
اُردو شاعری میں بہت وسعت پیدا کردی، پہلے جہانتک ہمکو معلوم ہے
میر ضمیر نے ایسے مرثیے لکھے ہیں گویا وہی اس طرز کے موجد ہیں مگر میر انیس نے
نے کہ باوجود خداداد مناسبت کے چار پشت سے شاعری اور مرثیہ گوئی اُن کے
خاندان میں چلی آتی تھی میر اردو زبان کے الک تھے اور لکھنؤ بنا ہوا تھا اس طرز کو معراج کمال تک پہنچا دیا"

"زندوں کی تعریف کو قصیدہ بولتے ہیں" یہ محاورہ نہ اہل لکھنؤ کا ہے
نہ اہل دہلی کا بجائے قصیدہ بولنے کے اگر مولانا حالی اس جگہ قصیدہ کہتے ہیں
تحریر فرماتے تو موزوں ہوتا، علامہ شبلی نعمانی حیات انیس میں اسطرح مرثیہ پر تبصرہ
فرماتے ہیں ملاحظہ ہو صفحہ ۵۰ ۔

"عرب میں سب سے پہلے شاعری کی ابتدا مرثیے سے ہوئی اس کے بعد
شاعری اصلی حالت سے نکلکر کسب معاش کا ذریعہ بنی تو مرثیہ خود بخود
زوال پذیر ہوگیا کیونکہ قصائد کی طرح اُس سے کچھ صلہ نہیں ملسکتا تھا،

اسی زمانہ میں کربلا کا واقعہ پیش آگیا اُسوقت میں اگر عرب کے اصلی جذبات موجود ہوتے تو اس زور کے مرثیے لکھے جاتے کہ تمام دنیا میں آگ لگ جاتی، مگر زمانہ نے بنو اُمیہ اور بنی العباس کی سلطنت میں اس رنگ کو اُبھرنے نہ دیا، سب سے پہلے جس شخص نے مرثیہ کو موجودہ طرز کا خلعت پہنایا وہ میر ضمیر مرزا دبیر کے اُستاد ہیں، اس سے پہلے مرثیے سوز کے لہجے میں پڑھے جاتے تھے اب تحت اللفظ کا بھی رواج ہوا، غالباً پہلا شخص جسنے ممبر پر بیٹھکر تحت اللفظ پڑھا وہ میر ضمیر تھے، نئی تشبیہیں نئے استعارے پسندیدہ مبالغے واقعہ نگاری مناظر قدرت کی تصویر وغیرہ تمام محاسن کلام میر ضمیر کے یہاں پائے جاتے ہیں، مگر اُن کے ہاں ان کا رنگ ہلکا سا تھا، میر انیس اور مرزا دبیر نے اسکو زیادہ شوخ کردیا۔"

علامہ شبلی کا انداز تحریر اردو انشا پردازی کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے، وہ ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ کس موقع پر کس قسم کی عبارت لکھنی چاہیئے، اس کا اندازہ مندرجہ ذیل مثالوں سے ہو سکتا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمدؒ اپنی کتاب اجتہاد صفحہ ۱۴ میں حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کا تذکرہ ان الفاظ میں فرماتے ہیں،

"خدا کا کرنا پیغمبر صاحب کو عین وقت پر معلوم ہوگیا، اندھیرے میں چپکے سے سٹک گئے" "چپکے سے سٹک گئے،" یہ عامیانہ درکیک الفاظ ایک معمولی شخص کے متعلق بھی کسی انشا پرداز کو استعمال نہ کرنا چاہئیں، چہ جائیکہ ایک پیغمبر کی شان میں؛ راقم مضمون کا قلم اس عبارت کو لکھتے ہوئے کانپا جاتا ہے۔

ایک دوسری جگہ اپنی کتاب اجتہاد میں شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد تحریر فرماتے ہیں ملاحظہ ہو اجتہاد صفحہ ۸۳ -

"آخر دعوتِ اسلام کے چودھویں برس پیغمبر صاحب کو جان لیکر مدینہ بھاگ جانا پڑا"

"مدینہ بھاگ جانا پڑا وہ بھی جان لیکر" یہ الفاظ کوئی صحیح المذاق انشاپرداز کبھی ایک پیغمبر کی شان میں استعمال نہیں کرسکتا، حیرت اور سخت حیرت ہے، اب اسکے مقابلہ میں راقم مضمون ہذا علامہ شبلی نعمانی کی عبارت نقل کرتا ہے کہ وہ اس واقعہ کو کس طرح لکھتے ہیں، ملاحظہ ہو سیرۃ نبوی جلد اول صفحہ ۱۹۸

"کفار نے جب آپ کے گھر کا محاصرہ کیا، اور رات زیادہ گذر گئی تو قدرت نے ان کو بے خبر کردیا، آنحضرت اُن کو سوتا چھوڑکر باہر آئے، کعبہ کو دیکھا اور فرمایا "مکہ! تو مجھکو تمام دنیا سے زیادہ عزیز ہے، لیکن تیرے فرزند مجھکو رہنے نہیں دیتے"۔

"قدرت نے اُن کو بے خبر کردیا" اس فقرے کی بلاغت کو ملاحظہ فرمائے، کفار کا بے خبر ہو جانا محض اتفاقی امر نہ تھا، بلکہ یہ تائیدِ غیبی تھی، لیکن ڈپٹی نذیر احمد کی عبارت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ نعوذ باللہ آنحضرت نے ہجرت صرف بزدلی کی وجہ سے کی تھی،

بیعت رضوان کا واقعہ ڈپٹی نذیر احمد اپنی معرکۃ الآرا تصنیف الحقوق والفرائض حصہ دوم صفحہ ۹ میں اس طرح تحریر فرماتے ہیں"

"یہ صلح پیغمبر صاحب نے دب کر کی اور مسلمانوں کی بڑی دل شکنی ہوئی، اس وقت بعض مسلمانوں کو یہ خیال ہوا، کہ پیغمبر صاحب نے یہ کیسا خواب دیکھا تھا، اور بعض منافقین یہ شبہہ کرتے تھے کہ اگر خدا اسلام کا حامی ہوتا تو یوں دب کر صلح نہ کیجاتی، اور کچھ لوگ شروع ہی سے پیچھے رہگئے تھے اُن کو یقین تھا کہ اہل مکہ ان مسلمانوں کو گھسنے نہیں دینگے تو

اور ایسا ہی ہوا، فکر ہر کس بقدر ہمت اوست، حدیبیہ کی صلح بظاہر دبکر ہوئی تھی۔ مگر حقیقت میں اسمیں مسلمانوں کی بڑی جیت تھی، کہ ابتدائی حالت میں آئے دن کی لڑائی اُن کو پنپنے نہیں دیتی تھی، مسلمانوں کو مُہلت آئی اور مکہ پر چڑھ دوڑے، خدا کا کرنا کہ مکہ بے لڑائی فتح ہوا، حدیبیہ سے لوٹے تو پیغمبر صاحب سیدھے خیبر پر جا چڑھے، اور اُسکو فتح کیا اور وہاں مسلمانوں کو بہت سا مال غنیمت بھی ہاتھ لگا، اس صلح حدیبیہ کے چند واقعات قابل تذکرہ ہیں، ایک بیعت رضوان کے نام سے مشہور ہے جبمیں حضرت عثمانؓ بپیام صلح لیکر اہل مکہ کے پاس گئے تھے اُن کے آنے میں ہوئی دیر، یہاں یہ مشہور ہو گیا کہ حضرت عثمانؓ کو اہل مکہ نے مار ڈالا، تو اب چار و ناچار لڑائی ٹھہری، اس پر پیغمبر صاحب نے مسلمانوں سے لڑنے مرنے کی بیعت لی، جو بیعت رضواں کے نام سے مشہور ہے اور وہ ایک کیکر کے درخت کے تلے ہوئی تھی، ایک آیت نازل ہوئی تو کفار نے طعن کیا کہ مسلمانوں کا خدا بھی کیسا خدا ہے، اونچی دوکان پھیکا پکوان، خدائی دعویٰ اور مکھی جیسی حقیر اور قابل نفرت چیز کا نام، ہمکو تو مکھی کا نام لیتے ہوئے بھی گھن آتی ہے، کمشنر سے اونچے درجے کے حکام کی خط و کتابت اُن کے علو مرتبہ کے لحاظ سے اُن کا سکرتری اپنے نام سے کرتا ہے، جسکو عوام جو انگریزی نہیں جانتے سکتر کہتے ہیں، سکتر بھی اپنے افسر کے ہاتھ تلے کا سررشتہ دار ہے گو وہ اپنے نام سے خط و کتابت کرے، مگر حقیقت میں وہ خط و کتابت اُس کے افسر کی ہے، جس کا وہ سکتر ہے۔

دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں، ملاحظہ ہو الحقوق و الفرائض حصہ دوم صفحہ ۱۷۔

یہودیوں کی عادت بہت کٹھ حجتی کرنے کی تھی، چنانچہ ذبح گاؤ میں معلوم ہو چکا اللہ تعالےٰ نے مسلمانوں کو اس طرح کی کرید سے منع فرما دیا ہے اور آیات کی منسوخی کے بارہ میں اسکی وجہ تلاش کرنی یہ بھی ایک قسم کی کرید ہے"!

بیعت رضواں کے متعلق علامہ شبلی نعمانی اس طرح تحریر فرماتے ہیں ملاحظہ سیرۃ نبوی حصہ اول صفحہ ۳۲۲،

"بیعت رضوان۔ بالآخر آپ نے گفتگوئے صلح کے لئے حضرت عمرؓ کو انتخاب کیا، لیکن انھوں نے معذرت کی کہ قریش میرے سخت دشمن ہیں اور مکہ میں میرے قبیلہ کا ایک شخص بھی نہیں کہ مجھکو بچا سکے، آپ نے حضرت عثمانؓ کو بھیجا، وہ اپنے ایک عزیز ابان بن سعید کی حمایت میں مکہ گئے، اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا پیغام سنایا، قریش نے اُن کو نظر بند کر دیا لیکن عام طور پر یہ خبر مشہور ہو گئی کہ وہ قتل کر ڈالے گئے، یہ خبر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو پہونچی تو آپ نے فرمایا کہ عثمانؓ کے خون کا قصاص لینا فرض ہے، یہ کہکر آپ نے ایک ببول کے درخت کے نیچے بیٹھکر صحابہ سے جاں نثاری کی بیعت لی، تمام صحابہ نے جن میں زن و مرد دونوں شامل تھے، ولولہ انگیز جوش کے ساتھ دست مبارک پر جاں نثاری کا عہد کیا، یہ تاریخ اسلام کا ایک مہتم بالشان واقعہ ہے، اس بیعت کا نام بیعت رضوان ہے، سورہ فتح میں اسی واقعہ کا ذکر ہے اُس کا ترجمہ یہ ہے۔

"خدا مسلمانوں سے راضی تھا جبکہ وہ تیرے ہاتھ پر درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے، سو خدا نے جان لیا جو کچھ ان لوگوں کے دلوں میں تھا، تو خدا نے اُن پر تسلی نازل کی اور عاجلانہ فتح دی"

ڈپٹی نذیر احمدؒ سورۂ فتح کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں ۔

"جب مسلمان ایک (کیکر) درخت کے تلے تمھارے ہاتھ پر (لڑنے مرنے) کی بیعت کر رہے تھے، خدا مسلمانوں سے خوش ہوا اور اُس نے اُن کی دلی عقیدت مندی کو جان لیا اور اُن کو اطمینان قلب عطا کیا، اور بدلے میں اُن کو سر دست خیبر کی فتح دی"۔

ہجرت حبش کا تذکرہ ڈپٹی نذیر احمدؒ ان الفاظ میں فرماتے ہیں، ملاحظہ ہو اجتہاد صفحہ ۲۹ ۔

"پیغمبر صاحب نے اپنی خاندانی وجاہت کے بھروسہ پر جہاں تک ہو سکا ان نومسلموں کی حمایت کی، لیکن نری وجاہت ایسے لوگوں کی عام شورش کے مقابلہ میں کیا کام آئے، جو ہر وقت مار کٹائی اور بے حرمتی پر تلے رہتے تھے، آخر پیغمبر صاحب نے ان نومسلموں کے تحفظ کے لئے ان کو نجاشی بادشاہ حبشہ کے یہاں چلتا کیا"۔

"مار کٹائی" "چلتا کیا" "بے حرمتی" کیا یہ الفاظ ایک پیغمبر کی شان میں کوئی صحیح المذاق انشا پرداز استعمال کر سکتا ہے؟ غور فرمائیے کسقدر یہ الفاظ عامیانہ ہیں۔

علامہ شبلی نعمانی اسی واقعہ کو اس طرح تحریر فرماتے ہیں، ملاحظہ ہو سیرۃ نبوی جلد اوّل صفحہ ۱۷۱ ۔

"قریش کے ظلم و تعدی کا بادل جب پیہم برس کر نہ کھلا، تو رحمت عالم نے جان نثاران اسلام کو ہدایت کی کہ حبش کو ہجرت کر جائیں"۔

ڈاکٹر نذیر احمدؒ اپنی کتاب اجتہاد میں قریش کے برتاؤ کو جو انھوں نے حضور سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیا اس طرح بیان فرماتے ہیں:

ملاحظہ ہو صفحہ ۳۹ ۔

"وہ گرم مزاج لوگ بتوں کی تحقیر اور اپنے بزرگوں کی تحسین کی تاب نہ لا کر بھڑوں کی طرح چھتوں سے باہر نکل پڑے، اور پیغمبر صاحب کے ساتھ گستاخی اور بے ادبی اور دشنام دہی اور موقع پاکر زدوکوب کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا"

ایک دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں۔ ملاحظہ ہو اجتہاد صفحہ ۸۳ ۔

"اب تم ان حالات حقہ صحیحہ کو حاضر فی الذہن رکھکر ٹھنڈے دل سے انصاف سے تجویز کرو کہ پیغمبر صاحب جھوٹا دعویٰ رسالت کر کے کس مفاد کی توقع کر سکتے تھے، اسی دعویٰ نے تو ان کی یہ گت بنوائی تھی، کہ

جھڑکی تو دونوں سے مساوات ہو گئی — گالی کبھو نہ دی تھی سو اب بات ہو گئی
باقی ہی مار کہانی تو سن لوگے ایک دن — اسکی گلی میں اپنی یہ اوقات ہو گئی

اسی دعوے نے ان کو شہر بدر کرایا"

ملاحظہ کیجئے یہ بازاری و متبذل اشعار ایک پیغمبر کی شان میں استعمال کئے گئے ہیں اب علامہ شبلی نعمانی اسی واقعہ کو کس طرح بیان فرماتے ہیں، ملاحظہ ہو سیرۃ نبوی جلد اوّل صفحہ ۳۰۸

"خطبہ کے بعد آپ نے مجمع کی طرف دیکھا تو جباران قریش سامنے تھے ان میں وہ حوصلہ مند بھی تھے جو اسلام کے مٹانے میں سب کے پیشرو تھے، وہ بھی تھے جن کی زبانیں رسول اللہ پر گالیوں کے بادل برسایا کرتی تھیں، وہ بھی تھے جن کی تیغ و سنان نے پیکر قدسی کے ساتھ گستاخیاں کیں تھیں وہ بھی تھے جنھوں نے آنحضرت صلعم کے راستہ میں کانٹے بچھائے تھے، وہ بھی تھے جو وعظ کے وقت آنحضرت کی ایڑیوں کو لہولہان کر دیا کرتے تھے، وہ

بھی تھے جن کی تشنہ لبی خون نبوت کے سوا کسی چیز سے بجھ نہیں سکتی تھی ،
وہ بھی تھے جن کے حملوں کا سیلاب مدینہ کی دیواروں سے آکر ٹکراتا تھا، وہ بھی
تھے جو مسلمانوں کو جلتی ہوئی ریگ پر لٹا کر ان کے سینوں پر آتشیں مہریں
لگا یا کرتے تھے"۔

یہی مختصر اور بلیغ فقرے درحقیقت انشا پردازی کی جان ہیں،
مولانا محمد حسین آزاد رنگینی کے بادشاہ ہیں، لیکن رنگینی کے ساتھ ساتھ
لطافت اور شکوہ کا لحاظ رکھنا صرف علامہ شبلی کا کام ہے اسکا اندازہ آپ کو ان
دونوں مصنفین کی عبارتوں سے ہوجائیگا جو کہ حسب ذیل ہیں :۔
شمس العلماء محمد حسین آزاد نے آب حیات میں اپنے استاد محمد ابراہیم ذوق
کی تعریف میں رنگینی اور فصاحت کا دریا بہادیا ہے، ملاحظہ ہو آب حیات
صفحہ ۴۰۵۔

"جب وہ صاحب کمال عالم ارواح سے کشور اجسام کی طرف چلا تو فصاحت
کے فرشتوں نے باغ سخن کے پھولوں کا تاج سجایا۔ جن کی خوشبو شہرت
عام بنکر جہاں میں پھیلی، اور رنگ نے بقائے دوام سے آنکھوں کو طراوت
بخشی، وہ تاج سر پر رکھا گیا، تو آب حیات اُس پر شبنم ہوکر برسا، کہ
شادابی کو کملاہٹ کا اثر نہ پہونچے، ملک الشعرائی کا سکہ اُس کے نام سے
موزوں ہوا، اور اُس کے طغرائے شاہی میں یہ نقش ہوا کہ اس پر نظم اردو
کا خاتمہ کیا گیا، چنانچہ اب ہرگز امید نہیں کہ ایسا قادر الکلام پھر
ہندوستان میں پیدا ہو، سبب اسکا یہ ہے کہ جس باغ کا بلبل تھا وہ باغ
برباد ہوگیا، نہ ہمصفیر رہے نہ ہمداستاں رہے، نہ اُس بولی کے سمجھنے والے رہے
جو خراب آباد اس زبان کے لئے ٹکسال تھا، وہاں بھانت بھانت کا جانور

بولتا ہے "شہر چھاؤنی سے بدتر ہوگیا، اُمرا کے گھرانے تباہ ہوگئے، اگر انکے وارث علم و کمال کے ساتھ روٹی سے محروم ہوکر حواس کھو بیٹھے وہ جادو کار طبیعتیں کہاں سے آئیں جو بات بات میں دلپسند انداز اور عمدہ تراشیں نکالتی تھیں، آج جن لوگوں کو زمانہ کی فارغ البالی نے اس قسم کے ایجاد واختراع کی فرصتیں دی ہیں وہ اور اصل کی شاخیں ہیں، انھوں نے اور پانی سے نشو و نما پائی ہے، وہ اور ہی ہواؤں میں اُڑ رہی ہیں، پھر اُس زبان کی ترقی کا کیا بھروسہ کیا مبارک زمانہ ہوگا، جبکہ شیخ مرحوم اور میرے والد مغفور ہم عمر ہوں گے تحصیل علمی اُن کی عمروں کی طرح حالت طفولیت میں ہوگی، صرف و نحو کی کتابیں ہاتھوں میں ہوں گی اور ایک اُستاد کے دامن شفقت میں تعلیم پاتے ہوں گے، ان لوگوں کی ہر ایک بات استقلال کی بنیاد پر قائم ہوتی تھی، وہ رابطہ اُن کا عمروں کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا، اور اخیر وقت تک ایسا نبھ گیا، کہ قرابت سے بھی زیادہ تھا، ان کے تحریر حالات میں بعض باتوں کے لکھنے کو لوگ فضول سمجھینگے، مگر کیا کروں جی یہی چاہتا ہے کہ کوئی حرف اس گراں بہا داستان کا نہ چھوڑوں، یہ شاید اس سبب سے ہو کہ اپنے پیارے اور پیار کرنیوالے بزرگ کی ہر بات پیاری ہوتی ہے، لیکن نہیں اس شعر کے پتلے کا ایک رونگٹا بھی بیکار نہ تھا، ایک صنعت کاری کی کل میں کون سے پرزے کو کہہ سکتے ہیں کہ نکال ڈالو یہ کام کا نہیں اور کونسی حرکت اس کی ہے جس سے کچھ حکمت انگیز فائدہ نہیں پہونچتا ہے، اسی واسطے میں لکھونگا، اور سب کچھ لکھونگا جو بات اُن کے سلسلہ حالات میں مسلسل ہو سکے گی، ایک حرف نہ چھوڑونگا۔"

مولانا محمد حسین آزاد اپنی سب سے بہترین تصنیف دربار اکبری میں،
جلال الدین اکبر شہنشاہ ہندوستان کی پیدائش کا حال ان الفاظ میں بیان کرتے
ہیں، ملاحظہ ہو۔ دربار اکبری صفحہ ۱

امیر تیمور نے ہندوستان کو زور شمشیر سے فتح کیا، مگر وہ ایک بادل آیا تھا
کہ گرجا برسا اور دیکھتے دیکھتے کھل گیا، بابر اُسکا پوتا چوتھی پشت میں
ہوتا تھا، سوا سو برس کے بعد آیا، اُس نے سلطنت کی داغ بیل ڈالی
تھی کہ اُسی رستے ملک عدم کو روانہ ہوا، ہمایوں اُس کے بیٹے نے
قصر سلطنت کی بنیاد کھودی، اور کچھ اینٹیں بھی رکھیں، مگر شیر شاہ کے
اقبال نے اُسے دم نہ لینے دیا، اخیر عمر میں اُسکی طرف پھر ہوائے اقبال کا
جھوکا آیا تو عمر نے وفا نہ کی، یہانتک کہ ۹۶۳ھ میں یہ با اقبال بیٹا جانشین ہوا،
تیرہ برس کے لڑکے کی کیا بساط، مگر خدا کی قدرت دیکھو اُسنے سلطنت کی
عمارت کو انتہائے بلندی تک پہونچایا، اور بنیاد کو ایسا استوار کیا کہ
پشتوں تک جنبش نہ ہوئی، وہ لکھنا پڑھنا نہ جانتا تھا، پھر بھی اپنے
نیک نامی کے کُتابے کو ایسے قلم سے لکھ گیا ہے کہ دن رات کی آمدورفت
اور فلک کی گردشیں اُنھیں گھس گھس کر مٹاتی ہیں مگر وہ جتنا گھستے ہیں
اُتنا ہی چمکتے آتے ہیں، اگر جانشیں بھی اسی رستے پر چلتے تو ہندوستان کے
رنگا رنگ فرقوں کو دریائے محبت پر ایک گھاٹ پانی پلا دیتے، بلکہ وہی
آئین ملک ملک کے لئے آئینہ ہوتے، اس کے حالات بلکہ بات بات کے
نکتے اوّل سے آخر تک دیکھنے کے قابل ہیں۔

جن دنوں ہمایوں شیر شاہ کے ہاتھ سے پریشان حال تھا، ایک دن
ماں نے اُس کی ضیافت کی، وہاں ایک نوجوان لڑکی نظر آئی، اور دیکھتے ہی

اُسکے حسن وجمال کا عاشق شیدا ہو گیا، دریافت کیا تو لوگوں نے عرض کیا کہ حمیدہ بانو بیگم اس کا نام ہے، ایک سید بزرگوار شیخ ژندہ پیل احمد جام کی اولاد میں ہیں، اور آپ کے بھائی مرزا ہندال کے اُستاد ہیں، یہ اُنکے خاندان کی بیٹی ہے، ہمایوں نے چاہا کہ اُسے عقد میں لائے، ہندال نے کہا، مناسب نہیں، ایسا نہ ہو کہ میرے اُستاد کو ناگوار ہو، ہمایوں کا دل ایسا نہ آیا تھا کہ کسی کے سمجھائے سمجھ جاتا، آخر محل میں داخل کر لیا"۔

متذکرہ بالا عبارت مولانا محمد حسین آزاد کی انشا پردازی کا اعلیٰ نمونہ ہے لیکن اسکو علامہ شبلی نعمانی کے "ظہور قدسی" سے کیا نسبت ملاحظہ ہو سیرۃ نبوی حصہ اول صفحہ ۱۲۱ "ظہور قدسی"

"چمنستان دہر میں بارہا روح پرور بہاریں آچکی ہیں۔ چرخ نادرہ کار نے کبھی کبھی بزم عالم اس سروسامان سے سجائی ہے کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئی ہیں لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جسکے انتظار میں پیر کہن سال دہر نے کروڑوں برس صرف کر دئے، سیارگان فلک اسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ تھے، چرخ کہن مدت ہائے دراز سے اسی صبح جاں نواز کے لیئے لیل ونہار کی کروٹیں بدل رہا تھا کارکنان قضا وقدر کی بزم آرائیاں، عناصر کی جدت طرازیاں، ماہ وخورشید کی فروغ انگیزیاں، ابر وباد کی تردستیاں، عالم قدس کے انفاس پاک توحید ابراہیم، جمال یوسف، معجزہ طرازی موسیٰ، جان نوازی مسیح، سب اسی لئے تھے کہ یہ متاع ہائے گراں ارز، شہنشاہ کونین کے دربار میں کام آئیں گے، آج کی صبح وہی صبح جان نواز، وہی ساعت ہمایوں، وہی دور فرخ فال ہے، ارباب سیر اپنے محدود پیرایہ بیان میں لکھتے ہیں کہ آج کی رات ایوان کسریٰ کے

۱۴ کنگرے گر گئے، آتش کدۂ فارس بجھ گیا، دریائے ساوہ خشک ہو گیا،
لیکن سچ یہ ہے کہ ایوان کسریٰ نہیں بلکہ شانِ عجم، شوکت روم، اوج چین
کے قصر ہائے فلک بوس گر پڑے، آتش فارس نہیں بلکہ جحیم شر، آتش کدۂ کفر،
آذرکدۂ گمراہی سرد ہو کر رہ گئے، صنم خانوں میں خاک اڑنے لگی، بتکدے خاک
میں مل گئے، شیرازۂ مجوسیت بکھر گیا، نصرانیت کے اوراق خزاں
دیدہ ایک ایک کرکے جھڑ گئے، توحید کا غلغلہ اٹھا، چمنستان سعادت میں
بہار آ گئی، آفتاب ہدایت کی شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں، اخلاق انسانی کا
آئینہ پرتو قدس سے چمک اٹھا"

سرنامہ سیرۃ نبوی جلد اول میں یہ الفاظ علامہ شبلی نے تحریر فرمائے ہیں۔
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نگینہ پر شیشے جڑے ہیں،
"ایک گدائے بے نوا شہنشاہ کونین کے دربار میں، اخلاص و عقیدت کی
نذر لیکر آیا ہے، زچشم آستین بردار و گوہر را تماشا کن"۔

علامہ شبلی نعمانی کی تحریر میں ایک بڑا کمال یہ ہے کہ جس موقع پر جو الفاظ
خاص موزوں ہو سکتے ہیں وہی الفاظ استعمال کرتے ہیں، آقا و خادم،
چھوٹے اور بڑے کے مختصات ادب کے لئے جو الفاظ مناسب ہیں وہی صرف کرتے
ہیں، مولانا موصوف ثقیل لفظوں کو بالکل ناپسند کرتے ہیں اور اُن کو کیسا ہی
مضمون ہاتھ لگے لیکن جبتک وہ فصیح لفظوں کو ڈھونڈھ نہیں لیتے اُس مضمون کی
طرف متوجہ نہیں ہوتے، مولانا شبلی کا طرز تحریر بلاغت کی جان، سلاست کی
روح اور فصاحت کی کان ہے، مولانا موصوف فصیح لفظوں کو اس خوبی سے
ترتیب دیتے ہیں جیسے جڑنے والا نگینوں کو نہایت صحیح مناسبت کے ساتھ
کھیوروں میں بٹھاتا ہے، مولانا کے تسلسل بیان میں وہ خوبی ہے کہ کہیں سے

کوئی کڑی علحدہ ہی نہیں ہوتی، اور ایک کڑی دوسری کڑی سے اس خوبصورتی کے ساتھ ملی ہوئی ہے جو پہچانی نہیں جاتی، جیسے مرصع زیورات میں اعلیٰ کاریگر کا لگایا ہوا ٹانکا جو بالکل وصول ہوجاتا ہے اور دو حصوں کو وصل کر دیتا ہے،

مولانا حالی کا طرز تحریر سادہ اور صاف ہے لیکن عام طور پر خشک اور کمزور، ملاحظہ ہو حیات سعدی صفحہ ۱۔

"اُسکا نام شرف الدین اور مصلح لقب ہے، اور سعدی تخلص ہے، سر گور اوسلی نے اُسکی ولادت ۵۸۹ھ ہجری مطابق ۱۱۹۳ء میں لکھی ہے، مگر وہ سال مذکور سے بہت برسوں پہلے اتابک مظفر الدین تکلہ بن زنگی کے عہد حکومت میں پیدا ہوا ہے، شیخ کی ولادت کے کئی برس بعد اتابک سعد زنگی اپنے بھائی تکلہ بن زنگی کی جگہ تخت شیراز پر متمکن ہوا تھا، چونکہ شیخ نے سعد زنگی کے عہد میں شعر کہنا شروع کیا تھا اور نیز شیخ کا باپ عبد اللہ شیرازی سعد کے ہاں کسی خدمت پر مامور تھا، اس لئے اُس نے اپنا تخلص سعدی قرار دیا، شیخ کا باپ جیسا کہ اُسکے کلام سے معلوم ہوتا ہے ایک باخدا اور متورع آدمی تھا، شیخ کے بچپن کا حال اس سے زیادہ معلوم نہیں، کہ نماز روزہ کے مسائل اُس کو بہت تھوڑی عمر میں یاد کرائے گئے تھے، اور بچپن ہی میں اُسکو عبادت، شب بیداری اور تلاوت قرآن مجید کا کمال شوق تھا"

علامہ شبلی اپنی کتاب شعر العجم حصہ دوم صفحہ ۲۲ میں شیخ سعدی کے حالات اس طرح بیان فرماتے ہیں، مولانا موصوف خشک تاریخ کو مضمون کی چاشنی میں ہمارے دسترخوان پر پیش کرتے ہیں۔

"مصلح الدین لقب اور سعدی تخلص تھا، اُن کے والد اتابک سعد بن زنگی

بادشاہ شیراز کے ملازم تھے اس تعلق سے شیخ نے سعدی تخلص اختیار کیا، سال ولادت معلوم نہیں، وفات کی نسبت سب متفق ہیں کہ ۶۹۱ھ میں ہوئی، عمر کی مدت تذکروں میں ۱۰۲ برس لکھی ہے لیکن اس حساب سے سال ولادت ۵۸۹ھ ہوگا، شیخ نے تصریح کی ہے کہ وہ ابوالفرح ابن جوزی کے شاگرد ہیں اور غالباً یہ وہ زمانہ ہوگا جب شیخ بغداد میں تحصیل علم کے لئے آئے ہیں، سلطان محمود ۵۸۹ھ میں مرا ہے اس لئے اس زمانہ میں ان کی عمر ۱۰ برس کی ہوگی لیکن واقعات اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کی شاعری اور کمالات نے کم از کم ۳۰، ۴۰ برس کی عمر میں شہرت پائی ہے،

اُن کے باپ ان کی تربیت اسطرح کرتے تھے جس طرح ایک عارف سالک مُرید کو تزکیۂ نفس کی منزلیں طے کراتا ہے، وہ بات بات پر اُن کو ٹوکتے تھے اور اُن کی غلطیوں پر تنبیہ کرتے تھے، اُن کے اثر سے شیخ کو بچپن ہی میں زہد و عبادت کا چسکا پڑ گیا تھا،

غور فرمائیے ایک ایک لفظ کسقدر ادیبانہ انداز میں ڈوبا ہوا ہے، مولانا شبلی نے باوجود تاریخی مضمون ہونے کے ایسی خوبی سے اُس کو ادا کیا ہے کہ عبارت بھی فصیح اور دلچسپ ہے، اور تاریخی اصلیت بدستور اپنی اصلی صورت پر موجود ہے،

علامہ شبلی نعمانی جب کبھی رنگیں عبارت لکھتے ہیں کیونکہ مولانا عموماً سادہ لکھا کرتے ہیں تو مولانا آزاد باوجود اپنی قادر الکلامی کے اس حد تک نہیں پہونچ سکتے، ملاحظہ ہو شعر العجم حصہ چہارم صفحہ ۲۱۵،

"ایران ایک قدرتی چمن زار ہے، ملک پھولوں سے بھرا پڑا ہے، قدم قدم پر آب رواں، سبزہ زار، اور آبشاریں ہیں، بہار آگیں اور تمام سرزمین تختۂ

زمردیں ننگی، بادِ سحر کے جھونکے، خوشبوؤں کی لپٹ، سبزہ کی لہک، بلبلوں کی چہک، طاؤس کی جھنکار، آبشاروں کا شور، وہ سماں ہے، جو ایران کے سوا اور کہیں نظر نہیں آسکتا" ملاحظہ ہو شعر العجم حصہ چہارم صفحہ ۲۳۔

"بلبل نے اسی عالم میں اس سے زمزمہ سنجی کی تعلیم پائی ہے، پروانے اس کے ساتھ کے کھیلے ہوئے ہیں، شمع سے رات رات بھر وہ سوزِ دل کہتا رہا ہے، نسیم سحری کو اکثر اس نے قاصد بنا کر محبوب کے یہاں بھیجا ہے بارہا اس نے غنچہ کی عین اسوقت پردہ دری کی جب وہ معشوق کا تبسم چرا رہا تھا"

حضور سرورِ کائنات کی جامعیت کبریٰ کی تصویر ان لفظوں میں کھینچتے ہیں، ملاحظہ کیجئے سیرۃ نبوی جلد اوّل صفحہ ۲۔

"لیکن اسوقت تک دنیا کی جسقدر تاریخ معلوم ہے اسنے اس قسم کے نفوس قدسیہ جو پیش کئے ہیں وہ فضائل اخلاق کی کسی خاص صنف کے نمونے تھے، مثلاً جناب مسیح علیہ الصلوۃ والسلام کے مکتب درس میں صرف حلم و تحمل، صلح و عفو، قناعت و تواضع کی تعلیم ہوتی تھی، حکومت و فرمانروائی کے لئے جو فضائل اخلاق درکار ہیں، مسیحی تعلیم کی بیاض میں ان سطروں کی جگہ سادی ہے، حضرت موسیٰ اور نوح علیہما السلام کے اوراق تعلیم میں عفو عام کے صفحے خالی ہیں، اس بنا پر ہر قدم پر نئے نئے رہنما کی ضرورت پیش آئی، اور اس لئے عام انسانی تکمیل کے لئے زمانہ ہمیشہ ایسے جامع کامل کا محتاج رہا، جو صاحب شمشیر و نگیں بھی ہو گوشہ نشین بھی، بادشاہ کشور کشا بھی ہو، اور گدا بھی، فرمانروائے جہاں بھی ہو اور سبحہ گرداں بھی، . . . .

مفلس قانع بھی ہو اور دریا دل بھی، یہ برزخ کامل، یہ ہستی جامع، یہ صحیفہ یزدانی عالم کون کی آخری معراج ہے"

غور فرمائیے کس قدر بلیغ اور پُر شکوہ الفاظ ہیں، یہ ایک ایسے اعلیٰ انشا پرداز کی عبارت ہے جس کے دماغ کو بلند نظری و عالی خیالی نے آسمان تک پہونچا دیا ہے،

حضرت عمرؓ کی جامعیت کو ان الفاظ میں تحریر فرماتے ہیں، ملاحظہ ہو الفاروق حصہ دوم صفحہ ۲۴۴۔

"اب حضرت عمرؓ کے حالات اور ان کی مختلف حیثیتوں پر نظر ڈالو، صاف نظر آئے گا کہ وہ سکندر بھی تھے اور ارسطو بھی، ابراہیم ادہمؒ بھی تھے اور امام ابو حنیفہؒ بھی، مسیحؑ بھی تھے اور سلیمانؑ بھی، نوشیرواں بھی تھے اور تیمور بھی"۔

ان دونوں عبارتوں میں علامہ شبلی نے پیغمبر اور خلیفہ کے مراتب کا لحاظ رکھا ہے، اسی وجہ سے ایک خاص فرق نظر آتا ہے، پیغمبر کی شان میں جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں وہ نسبتاً زیادہ پرشکوہ اور شاندار ہیں، ان مراتب کا لحاظ رکھنا صرف علامہ شبلی ہی کا کام ہے، یہ لحاظ مولانا آزاد، مولانا حالی و ڈاکٹر نذیر احمدؒ کو نہیں ہو سکتا،

ان مثالوں سے آپ کو کامل طور پر اندازہ ہو گیا ہو گا کہ علامہ شبلی نعمانی اپنے معاصرین کے مقابلہ میں کیا درجہ رکھتے ہیں، مولانا موصوف کا طرز تحریر اردو انشا پردازی کا اعلیٰ نمونہ ہے جسکی پیروی ہر انشا پرداز کے لئے ضروری ہے،

اب ہم ڈاکٹر سر سید احمدؒ خاں مرحوم کی رائے عالی جو انھوں نے

مولانا شبلی کی کتاب "المامون" پر ظاہر فرمائی ہے نقل کرتا ہوں کیونکہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی رائے سے بھی میرے دعویٰ کی تائید ہوتی ہے، اسکے بعد کسی ثبوت کی ضرورت نہیں رہتی، ملاحظہ ہو "المامون" حصہ اوّل صفحہ۲۔

"اس کے حاشیوں پر جسقدر کتابوں کے حوالے ہیں ان کو دیکھ کر اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس کتاب کے لکھنے میں کسقدر جانکاہی ہوئی ہوگی اور مصنف کو کتنے ہزار ورق تاریخوں کے اُلٹنے پڑے ہوں گے، اور اسی کے ساتھ جب یہ خیال کیا جاوے کہ مصنف نے ان جزئیات کو ایسی کتابوں سے تلاش کیا ہے، جنکی نسبت خیال بھی نہ ہوتا تھا کہ انہیں مامون کے حالات ہوں گے تو اس محنت کی وقعت دقدر اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے، یہ کتاب اردو زبان میں لکھی گئی ہے، اور ایسی صاف و شستہ اور برجستہ عبارت ہے کہ دِلّی والوں کو بھی اسپر رشک آتا ہوگا، اردو زبان نے بہت کچھ ترقی کی ہے مگر اس بات کا بہت کم لحاظ رکھا گیا ہے کہ ہر فن کے لئے زبان کا طرز بیاں جداگانہ ہے"

ڈاکٹر سر سید احمد خاں مرحوم جو خود بہت بڑے اردو کے انشا پرداز تھے، فرماتے ہیں کہ "دِلّی والوں کو بھی اسپر رشک آتا ہوگا" غور فرمائیے اس سے بڑھکر ہمارے لئے اور کیا سند ہو سکتی ہے،

اب دوسرا سوال غور طلب یہ ہے کہ سب سے زیادہ اردو کی خدمت کس نے انجام دی راقم مضمون ہذا اسمیں بھی علامہ شبلی نعمانی کا اسم گرامی پیش کرتا ہے، کیونکہ مولانا کی ذات ادب اردو کے لئے ہمیشہ مایۂ ناز رہیگی، اُنکی متعدد تصنیفات نے آسمان علم پر ان کو آفتاب بناکر چمکایا ہے،

علامہ مرحوم نے تاریخ نگاری کی بنیاد ایسے زمانہ میں ڈالی جبکہ فن

تاریخ کا شوق ہمارے دلوں سے محو ہوچکا تھا، اردو زبان تاریخی کتابوں سے بالکل تہی مایہ تھی، اور ملک کا مذاق نہایت پستی کی حالت میں تھا، ایسے وقت میں علامہ موصوف کے قلم نے اس فن کے احیاء میں وہ قابل عزت خدمت کی ہے، جسکو زمانہ ابدالآباد تک فراموش نہ کر سکے گا تاریخ میں اُنکی وسعت معلومات کا اندازہ علامہ مرحوم کی مختلف الموضوع تصنیفات سے لگایا جا سکتا ہے، فارسی نظم کی تاریخ کی کم مایگی دیکھکر مولانا نے شعر العجم تصنیف کی، اس موضوع پر اردو زبان میں کوئی کتاب اس سے پیشتر کسی نے نہیں لکھی، ملک نے بھی علامہ مرحوم کی تصنیفات کی قدر خوب دل کھولکر کی۔

یہ بات ادب اردو کی دنیا میں ضرب المثل ہے کہ اردو زبان بوجہ اپنی کم عمری کے تہی مایہ ہے اور وہ ابھی ایک کامل الفن زبان کہلائے جانے کی مستحق نہیں ہے، یعنی ہنوز اُسمیں اسقدر سرمایہ جمع نہیں ہوا کہ اُس سے وہ ایک مستقل زبان بن سکے اسی بنا پر ارباب فکر عرصہ دراز سے اس امر کی کوشش میں مصروف رہے ہیں کہ اس اپنی اردو زبان میں کثرت سے تصنیفات و تراجم کئے جائیں، غیر زبانوں سے مواد و خیالات اردو زبان میں منتقل کیے جائیں اس فرض اہم کو سوائے مولانا شبلی کے کسی دوسرے مصنف یعنی مولانا آزاد و مولانا حالی و ڈاکٹر نذیر احمد نے اُنسے زیادہ انجام نہیں دیا اور لارڈ مکالے کے اس قول کو رد کر دیا وہ کہا کرتے تھے کہ وہ انکی دیسی زبان میں سوائے دودھ کے سمندروں اور ہیرے کے پہاڑوں وغیرہ کے اور کوئی تذکرہ کرنیکی صلاحیت نہیں، وہ جب اپنے اُردو کے کتب خانوں میں پہونچتے ہیں تو نظیر اردو کے ذخیرہ میں بجز دیوان سودا اور ہیرا من طوطے کے قصے کے کچھ نہیں ملتا افسوس! اگر دور حاضرہ میں لارڈ مکالے ہوتے تو کبھی یہ نہ کہتے کیونکہ علامہ شبلی نے اردو زبان کو متعدد کتابیں خصوصًا تاریخی تصنیف فرما کر

مالا مال کر دیا ہے، اگر مولانا مرحوم کی تصنیفات اُردو ذخیرہ میں سے علیحدہ کر لی جائیں
تو ہمارا اردو کا ذخیرہ بہت خالی ہو جائے اور اُسکی کوئی وقعت نہ رہے، اسکا اعتراف
ہر شخص کو غالبًا کرنا پڑیگا کہ مولانا محمد حسین آزاد نے اردو زبان کی تقدیر کھولی،
انھوں نے تمام مغلق اور مقفیٰ عبارتوں کو یک قلم برطرف کر دیا، شاہراہ قدیم سے
ہٹا کر اردو شاعری کے لیئے ایک نئی راہ نکالی، مرحوم نے مولانا حالیؔ کو نیچرل
شاعری کی طرف توجہ دلائی، چنانچہ اس کے ثبوت کے لیئے نظمیں، شب قدر،
صبح امید، حب وطن، برکھا رت پیش کیجاتی ہیں،

مولانا آزاد کی نثر میں دو قسم کی کتابیں ہیں اول وہ جو انھوں نے پنجاب کے
سر رشتہ تعلیم کے واسطے لکھیں۔

جن میں اردو کا قاعدہ، پہلی، دوسری، تیسری، چوتھی کتابیں
وقصص ہند وغیرہ ہیں، دوسری وہ کتابیں جو انھوں نے خود اپنے
شوق سے لکھیں جن میں آب حیات، دربار اکبری ونیرنگ خیال بہت مشہور
ہیں، آزاد مرحوم کی دربار اکبری بہترین کتاب اُردو تاریخ میں خیال
کی جاتی ہے لیکن فلسفہ تاریخی کے نکتہ شناس جانتے ہیں کہ اس کو تاریخی
حیثیت سے کیا وقعت حاصل ہے؟ مولانا آزاد کی چند کتابیں اردو میں ہیں
وہ بھی سب تاریخی ہیں، نیرنگ خیال میں مولانا آزاد نے خیالی طوطا و مینا
اڑا کر ناظرین کو خوش کر دیا ہے " صنف لطیف " کے لئے سوائے دو نصیحت کا
کرن پھول " کے کوئی دلچسپی او کام کی کتاب نہیں، برخلاف اس کے علامہ شبلی
کی مختلف الموضوع تصنیفات سے زن و مرد مساوی فائدہ اٹھا سکتے ہیں،
مولانا مرحوم نے شعر العجم و سیرۃ نبوی تصنیف فرماکر جو زبان اردو پر احسان کیا ہے
وہ کبھی فراموش نہیں ہو سکتا۔

ڈاکٹر نذیر احمدؒ نے اردو کو دہلی کے گھرانے اور محل سرائے سے نکال کر شاہراہ عام پر بٹھا دیا، مگر ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے مولانا نذیر احمدؒ نے ترجمہ قرآن شریف میں ایسی ہی رواجی اور خانگی اُردو کو ٹھونس دیا ہے اور قرآن عظیم کی اعلیٰ متانت کا خیال نہیں رکھا، ان کا ترجمہ قرآن شریف ناپسندیدہ اور قابل تنسیخ ہے، مولانا نذیر احمدؒ کی تمام تصنیفات دینیات پر مبنی ہیں، اس سے ہر ملت و مذہب کا شخص مستفیض نہیں ہو سکتا، زیادہ تر کتابیں "جنس لطیف" کی دلچسپی کے لئے لکھی ہیں، مثلاً ایامی، محصنات، بنات النعش، مراۃ العروس وغیرہ جسمیں ایک ہندوستانی گھرانے کی معاشرت کے ساتھ اخلاقی تعلیم کا بیان ہے،

مولانا نذیر احمدؒ کی اردو ایک زمانہ شناس بڑی بی بی معلوم ہوتی ہے،

مولانا الطاف حسین حالی کی تصانیف میں یادگار غالب، حیات سعدی اور حیات جاوید مشہور کتابیں ہیں اور اردو نثر کے ذخیرہ میں صرف یہ تصانیف یادگار ہیں، مولانا ایک ناصح مشفق شاعر تھے، زبان اُردو پر اُن کا یہ احسان ہمیشہ رہیگا کہ مرحوم نے جسقدر نئے خیالات نظم کئے ہیں کسی دوسرے شخص نے نظم نہیں کئے، اسکا ثبوت مسدس حالی ہے، یہ اردو زبان میں بہت قابل قدر کتاب ہے، اسمیں مولانا نے مسلمانوں کے عروج و زوال کی جو تصویر دکھائی ہے اُس سے زیادہ موثر کوئی چیز نہیں ہو سکتی، سر سید مرحوم نے اس مسدس کو قوم کے سامنے پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ "خدا جب مجھ سے پوچھیگا کہ کیا لایا ہے تو اس مسدس کو پیش کردوں گا" اور ہمیں امید ہے کہ مسدس اُن کی اور مولانا دونوں کی نجات کے لئے کافی ہوگا۔ لیکن مگر بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو مولانا شبلی سے زیادہ کسی نے آجتک اُردو کی خدمت

نہیں کی، مولانا مرحوم کی تصانیف میں سیرۃ نبوی والفاروق اور شعر العجم وغیرہ ایسی کتابیں ہیں جو سوائے اردو کے کسی زبان میں نہیں، آنحضرت کی سوانح عمریاں متعدد زبانوں میں لکھی گئیں لیکن ایسی جامع و مانع و مستند آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری مولانا مرحوم کی سیرۃ نبوی سے بیشتر کسی نے نہیں لکھی، اسمیں خاص بات یہ لحاظ کے قابل ہے کہ جو اعتراض کسی معترض کے دلمیں پیدا ہوتا ہے اُسکا کافی جواب آگے مطالعہ کرنے سے ملجاتا ہے،

مہاتما گاندھی نے بھی یروڈا جیل میں اس کا مطالعہ کیا ہے اور جو اثر مہاتما موصوف پر سیرۃ نبوی مطالعہ کرکے ہوا اُس کا اظہار انگریزی اخبار "کامریڈ" مورخہ ۱۳ اکتوبر ۱۹۲۴ء میں کیا ہے، مولانا شبلی کی تصانیف سے ہر ملت و مذہب کے لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں، موصوف کی تصنیفات نثر میں بہت کثرت سے کتابیں یادگار ہیں، الفاروق، المامون، سیرۃ نبوی، شعر العجم، رسائل شبلی خاص کر قابل تذکرہ ہیں اُردو نظم میں مثنوی صبح امید، نالہ، شبلی اور بوئے گل یادگار ہیں، مولانا شبلی معدودے چند مصنفوں میں ہیں جنہوں نے کریٹی سیزم تنقید کے اصلی مفہوم کو سمجھا ہے، اور کوشش کی ہے کہ تنقید کا حق اُردو زبان میں بھی ادا کیا جائے۔

غرض علامہ شبلی نعمانی کی ذات اردو زبان کے لئے نہایت قابل قدر تھی، مرحوم نے اس راستہ کو اتنا سہل گزار بنا دیا ہے کہ اُس کے پیرؤوں کو چلنے میں بہت سہولت ہوگئی ہے اور مختلف الموضوع کتابیں تصنیف فرماکر اردو زبان کو مالا مال کر دیا ہے،

راقم مضمون ہذا اپنے دعویٰ کے ثبوت میں مسٹر براؤن آف کیمبرج کی

وہ تحریر پیش کرتا ہے جو موصوف نے شعر العجم مطالعہ کرنے کے بعد ڈیلی نیوز "مسلم پبلسٹ" میں شائع کرائی تھی، کون کہہ سکتا تھا؟ کہ ۱۹۱۹ء میں دفعۃً علامہ شبلی کا وجود یورپ میں نمودار ہوگا اور پروفیسر براؤن آف کیمبرج سے جو آجکل مستشرقین یورپ میں ایک زبردست شخصیت رکھتے ہیں اور جن کو مشرقی لٹریچر سے خاص دلچسپی ہے خراج تحسین وصول کرے گا، پروفیسر موصوف نے شعر العجم کی عبارتیں بطور استناد تاریخ ادبیات ایران میں نقل کی ہیں، الغرض یہ بات اردو زبان کے لئے نہایت باعث فخر ہے کہ دوسری زبان اس سے سند لے، کیا اب بھی کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ علامہ شبلی سے زیادہ کسی دوسرے مصنف نے اردو زبان کو ترقی دی؟ موصوف نے جب تصنیف و تالیف کے میدان میں قدم رکھا اُس وقت سے لیکر اس جہان فانی کو خیرباد کرتے وقت تک مصروف رفتار رہے، جس کا ثبوت علامہ موصوف کی اس رباعی سے ملتا ہے،

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیم آستان غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرۃ پیغمبر خاتم
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

راقم مضمون محمد عبد اللطیف صدیقی طالب العلم ایف۔ اے کلاس
محلہ دوگا نواں، لکھنؤ۔

تصانیف مولانا شبلی مرحوم

سیرۃ النبی صلعم - جلد اوّل حصہ اوّل (مجلد) قیمت باختلاف کاغذ وجلد - ﷲ و صہ
〃 حصہ دوم 〃 〃 〃 〃 ﷲ و ﷲ
جلد دوم 〃 〃 〃 ﷲ و ﷲ

الفاروق - خلیفہ دوم سیدنا حضرت عمر فاروق کے سوانح زندگی اور آپ کا طرز حکومت صہ و عہ

سیرۃ النعمان - امام ابوحنیفہؒ کی سوانحعمری اور انکے اجتہادات ومسائل عہ و عہ

الغزالی - امام غزالی کی سوانح عمری اور اُن کا فلسفہ عہ و عہ

سوانح مولانا روم - مولانا جلال الدین رومی کی سوانحعمری، مثنوی اور دیگر تصانیف پر تقریظ عہ

المامون - خلیفہ مامون الرشید عباسی کے عہد سلطنت کے حالات عہ

رسائل شبلی - مولانا شبلی کے مختلف علمی مضامین کا مجموعہ عہ

مقالات شبلی 〃 〃 〃 〃 عہ و عہ

مضامین عالمگیر - شہنشاہ اورنگ زیب پر اعتراضات اور اُنکے جوابات عہ و عہ و عہ

علم الکلام - مسلمانوں کے علم کلام کی تاریخ - اسکی عہد بعہد کی ترقیاں اور علمائے متکلمین کے نظریات عہ و عہ

الکلام - جدید علم کلام، عقلی دلائل سے مذہب کا اثبات، اور ملاحدہ ومنکرین کا رد عہ و عہ

شعر العجم - (حصہ اوّل) شاعری کی حقیقت، فارسی شاعری کا آغاز اور قدما کا دور صہ و عہ
〃 (حصہ دوم) شعرائے متوسطین کا دور عہ و عہ
〃 (حصہ سوم) شعرائے متاخرین کا دور عہ و عہ
〃 (حصہ چہارم) فارسی شاعری پر ریویو صہ و عہ
〃 (حصہ پنجم) فلسفیانہ، صوفیانہ، اور اخلاقی شاعری پر تبصرہ عہ و عہ

سفرنامہ روم ومصر وشام - تینوں ملکوں کی معاشرت وتمدن کا بہترین مرقع - عہ

موازنہ انیس ودبیر - ایک ہی فن کے دو معاصر اُستادوں کے کلام پر تبصرہ جو ادبی تنقید کا بہترین نمونہ ہے قیمت صہ

آغاز اسلام - (ابتدائے عہد کی اسلامی تاریخ جو فارسی مین لکھی گئی تھی اُسکا ترجمہ) قیمت ۸ر

مجموعہ کلام شبلی (اردو) عہ مثنوی صبح اُمید (اردو) ۴ر کلیات شبلی (فارسی) عہ

متفرق مضامین - اسلامی حکومت ۲ر اسلامی مدارس ۴ر زیب النسا اور جہانگیر ۲ر کتبخانۂ اسکندریہ ۶ر

ملنے کا پتہ - الناظر بکسینجنسی - لکھنؤ

مرزا رجب علی بیگ سرور مرحوم
- فسانۂ عجائب عہ
- انشائے سرور ۶ر

امیر مینائی مرحوم
- امیر اللغات نامکمل عہ
- صنم خانۂ عشق عا
- ...و الغیب ہم
- ...خاتم النبیین ۸ر
- ...ئے سخن عہ
- مکاتیب امیر مینائی ہا

جلال مرحوم
- سرمایۂ زبان اردو ہا
- ...ہائے دلکش عہ
- ...نگارین عہ
- رسالہ تذکیر و تانیث ۸ر
- مادۂ تاریخ ۸ر
- ...المنتخب ۴۰ر

مرزا محمد عباس ہوش مرحوم
- افسانۂ نادر جہان ہر
- پیاری سہیلی ۱۲ر
- ...سحر ۸ر
- ...یمران ۱۲ر

منشی فضل حسین ثابت
- حیات دبیر للعہ
- ...حسین سے

پنڈت رتن ناتھ سرشار
- فسانۂ آزاد ۴ جلد ...
- سیر کہسار ہے
- خدائی فوجدار عہ
- جام سرشار عا
- الف لیلی کمل ...
- کامنی عہ
- بچھڑی دلہن ۶ر

منشی سجاد حسین مرحوم
- احمق الذین ۸ر
- حاجی بغلول ۸ر
- پیاری دنیا ۸ر
- کایا پلٹ ۸ر
- میٹھی چھری ۶ر
- طرحدار لونڈی عہ
- طلسمی فانوس ۱۲

منشی جوالا پرشاد برق
- مرزا لعی ۱۲ر
- مار آستین ۱۲ر
- بنگالی دلہن ۱۲ر
- معشوقۂ فرنگ ۱۲ر
- پرتاب ۸ر
- روہنی ۱۲ر

پریم چند
- پریم بتیسی ہے
- بازار حسن عہ

مولینا عبد الحلیم شرر
- جنید بغدادی عہ
- خواجہ معین الدین چشتی ۶ر
- تذکرۂ مشاہیر عالم ہا
- مخدرات عا
- قیس و لبنیٰ عہ
- مقدس نازنین ہر
- ایام عرب ۶ر
- فتح اندلس
- ماہ ملک
- حسن کا ڈاکو ۸ر
- دربار حرام پور ۸ر
- الفانسو ۸ر
- مفتوح فاتح ۸ر
- فلپانا ۶ر
- زوال بغداد عہ
- لعبت چین
- نیکی کا پھل
- جویائے حق
- بابک خرمی ۱۲ر
- طاہرہ ۱۲ر
- شوقین ملکہ ۱۲ر
- یوسف و نجمہ ۱۲ر
- گزشتہ لکھنؤ ۱۲ر
- شاعرانہ و عاشقانہ مضامین ۱۰ر
- آغاز و ختم سال ہہ
- سیر رجال ہے
- تاریخی و جغرافی مضامین ہے
- مینا بازار

حکیم محمد علی خان مرحوم
- رام پیاری کامل صہ
- عبرت کامل ہے
- حسن سرور کامل للعہ
- اختر حسینہ عا
- دیول دیوی ہر
- جعفر و عباسہ ۱۲ر

شوق قدوائی مرحوم
- ترانۂ شوق عا
- قاسم و زہرہ عہ
- نیرنگ جمال ۱۰ر
- گنجینہ ۱۲ر
- سیکفرن اور لوسی ۲ر

خواجہ عبد الرؤف عشرت
- زبان دانی ۶ر
- اصلاح زبان اردو ۶ر
- قواعد میر ۶ر
- اصول اردو ۶ر
- جان اردو ۶ر
- شاعری کی پہلی کتاب
- " دوسری کتاب
- " تیسری کتاب
- لغات اردو ہے

منشی محمد احسن وحشی
- محبوس گذشت عہ
- جام زہر

مولینا حکیم عبد الحی مرحوم
- یاد ایام ہہ
- تذکرۂ گل رعنا عہ

حکیم احمد حسین الہ آبادی
- تاریخ ابن خلدون جلد اول عا
- " " دوم عا
- " " سوم عا
- " " چہارم ہا
- " " پنجم ہے
- " " ششم ہا
- " " ہفتم ہے
- " " ہشتم ہے
- " " نہم ہا
- " " دہم ہا
- " " یازدہم ہا
- سلطان صلاح الدین عہ
- نور الدین محمود عہ

مولوی محمد حلیم انصاری
- الاسلام و النصرانیہ ۱۲ر
- فتح اندلس عا
- ابو مسلم خراسانی ہا
- تاریخ عرب صہ

مولوی حبیب الرحمن خان شروانی
- سیرۃ الصدیق ہر
- علمائے سلف ہم
- تذکرۃ الشعراء میر حسن

حافظ اسلم جیراجپوری
- سیرۃ الرسول ہر
- خلافت راشدہ عا
- خلافت بنو امیہ عا
- خلافت بنو عباس عا
- عباسیۂ بغداد
- علوم عرب ہر

قاضی محمد سلیمان منصورپوری
- رحمۃ للعالمین ہے
- سفرنامۂ حجاز عا

مولوی خلیل الرحمن
- اخبار الاندلس جلد ...
- تاریخ مولدین عا
- مختصر تاریخ اسلامی ہا
- عذرا ہر

مولوی محمد انشاء اللہ
- سیرۃ الرسول ہر
- تاریخ آل عثمان للعہ
- حالات عراق عرب و عمان عا
- حالات قسطنطنیہ عہ
- تاریخ مراکش و سفر الاقصی عا

منشی سعید احمد مارہروی
- آثار اکبری سے
- حیات خسرو عہ
- امرائے ہنود ہم

...نامہ۔ مہاتما بدھ کی مختصر سوانح عمری اور ان کی مذہبی تعلیم نہایت دلکش انداز میں لکھی گئی ہے۔ قیمت صرف .. ۴ر

مولوی عزیز مرزا مرحوم

خیالات عزیز عا ر

دکرم اردی عہ ر

خواجہ عباد اللہ اختر

صدیق اکبر عہ ر

حضرت زید ۶ ر

مشاہیر اسلام عہ ر

بغداد عا ر

دمشق سے ر

دیوان حافظ مع شرح عہ

مفتی انوار الحق ایم اے

تاریخ ابوالبشر عہ ر

تذکرۃ الحبیب عہ ر

حقایق اسلام عا ر

میر ولی اللہ بی اے

بندگی عا ر

کاس الکرام سے ر

لسان الغیب جلد اول ہے ر

" دوم عا ر

" سوم بہ ر

" چہارم بہ ر

سید حسن مسعود بی اے

نصاب اردو عہ ر

جاپان کا تعلیمی نظم سے ر

انتخاب زرین بہ ر

مولانا حسرت موہانی

شرح دیوان غالب عہ ر

کمل دیوان حسرت ۱۲ ر

سید سجاد حیدر بی اے

خیالستان عہ ر

ثالث بالخیر ۸ ر

زہرا ۱۲ ر

جلال الدین خوارزم شاہ ۱۲ ر

مسٹر ظفر عمر بی اے

جوردن کا کلب ۹ ر

نیلی چھتری عہ ر

بہرام کی گرفتاری عہ ر

مستقبل اسلام ۵ ر

پروفیسر فیروز الدین مراد

تحفہ سائنس سے ر

بادل کے بچے عہ ر

خونابہ عشق عہ ر

حکیم احمد شجاع بی اے

باپ کا گناہ عا ر

حسن کی قیمت ۶ ر

منشی عبد المجید سالک بی اے

راہ و رسم منزلہا ۸ ر

چمپا و دیگر افسانے عہ ر

چترا (ٹیگور) ۱۲ ر

منشی احمد علی بی اے

تاریخ تمدن ہے ر

شباب لکھنؤ عہ ر

مولوی عبد الماجد بی اے

فلسفہ جذبات بہ ر

مکالمات برکلے عہ ر

پیام امن عہ ر

تصوف اسلام عہ ر

فلسفیانہ مضامین عہ ر

زود پشیمان ۸ ر

منشی محمد لطیف بی اے

اکبر عہ ر

اورنگ زیب عہ ر

رنجیت سنگھ عہ ر

لارڈ کلایو عہ ر

پروفیسر نور الٰہی ایم اے

معالج الدین ۱۲ ر

تذکرۃ المصطفےٰ عہ ر

صحف سماوی سے ر

شمع سخن ۱۰ ر

پروفیسر الیاس برنی ایم اے

جذبات فطرت چار حصے للعہ ر

معارف ملت " للعہ ر

مناظر قدرت " للعہ ر

علم المعیشت صہ ر

مولوی سید سلیمان ندوی

ارض القرآن للعہ ر

سیرۃ عایشہ رضہ ہے ر

حیات امام مالک عہ ر

خلافت عثمانیہ اور اسلام عہ ر

خلافت اور ہندستان ۶ ر

مولوی عبد السلام ندوی

اسوہ صحابہ ۲ جلد سے ر

سیرۃ عمر بن عبد العزیز عہ ر

انقلاب الامم عا ر

تاریخ الحرمین الشریفین عا ر

نقرائے اسلام عہ ر

فطرت نسوانی عہ ر

شعر الہند ۲ جلد ہے ر

مولوی عبد الباری ندوی

مبادی علم انسانی عہ ر

برکلے کا فلسفہ عہ ر

مولوی سعید انصاری

سیر الصحابہ جلد اول صہ ر

سیر الانصار ۲ جلد سے ر

سیر الصحابیات عہ ر

مولوی عبد الرزاق ندوی

اسوہ حسنہ عا ر

کتاب الوسیلہ عا ر

ترکی اور یورپ ۶ ر

خواجہ حسن نظامی

قرآن آسان قاعدہ عہ ر

میلاد نامہ عہ ر

محرم نامہ عہ ر

فاطمی دعوت اسلام ہے ر

ذکر غوث پاک ۱۲ ر

کرشن جیون عہ ر

شامی جہاد عہ ر

سیپارۂ دل عا ر

کم تو موت عہ ر

چٹکیاں اور گدگدیاں ۱۲ ر

اتالیق خطوط نویسی عہ ر

روزنامچہ عا ر

بیوی کی تعلیم عہ ر

بیوی کی تربیت عہ ر

اولاد کی شادی عہ ر

جگ بیتی کہانیاں ۱۰ ر

آپ بیتی عہ ر

بچوں کی کہانیاں ۱۲ ر

سیر دہلی ۱۲ ر

سفرنامہ ممالک اسلامیہ عا ر

غدر دہلی کے افسانے عہ ر

یزید نامہ عہ ر

طمانچہ بر رخسار یزید عہ ر

اردو دعائیں ۸ ر

تسکین احساس ۸ ر

روزنامچہ ہند ۱۲ ر

اسلام کا انجام ۶ ر

تسخیر مہر و قہر ۱۰ ر

مولوی عبد الرشید الخیری

الزہرا ۱۲ ر

صبح زندگی عہ ر

شام زندگی عہ ر

شب زندگی ۶ ر

نوحہ زندگی ۱۲ ر

در شہوار ۱۰ ر

منازل السائرہ عا ر

سراب مغرب ۸ ر

بنت الوقت ۸ ر

قطرات اشک عہ ر

جوہر قدامت عہ ر

عروس کربلا عہ ر

یاسمین شام عہ ر

تیغ کمال عہ ر

ماہ عجم عہ ر

محبوبہ خداوند عہ ر

مودودہ ۸ ر

نیاز فتح پوری

گہتان جلی عا ر

گہوارہ تمدن عا ر

نگارستان عا ر

صحابیات عا ر

تاریخ الدولتین عہ ر

یاس عظیم آبادی

چراغ سخن عہ ر

نشتر یاس ۸ ر

تاریخ اندلس یعنی موحدون کے استقلال مسلمانوں کی شجاعت اور انگریزوں کی حکمت کا آئینہ از خانی خان قیمت ۱۲ ر

ہو المستعان

رجسٹرڈ نمبر اے ۴۷۸

الناظر

ایڈیٹر ـــــ ظفر الملک ـــــ علوی

الناظر پریس لکھنؤ میں باہتمام اسحاق علی علوی چھپا

قیمت سالانہ للعہ ر

قیمت فی پرچہ ۸ر

محصول معاف
۵عہ کی روانگی پر آدھا
اور
۱۰عہ کی روانگی پر پورا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اُردو کی بہترین کتابیں

ہدیۂ لیجیے
۵عہ کی روانگی پر الناظر ایک سال
اور
تمام کی روانگی پر ۱۰عہ کی کتابیں

مرزا غالب مرحوم
- اُردوئے معلی عہ
- عود ہندی ۸ر و عہ
- دیوان غالب ۸ے
- کل دیوان غالب صہ

سرسید مرحوم
- خطبات احمدیہ سے
- کمل مجموعہ لکچر للعہ
- اسباب بغاوت ہند ۸ر
- سیرت فریدیہ ۱۰ر
- خطوط سرسید ۶ر

نواب محسن الملک مرحوم
- مضامین تہذیب الاخلاق للعہ
- کمل مجموعہ لکچر
- تقلید و عمل بالحدیث ۱۲ر
- کتاب المحبت و الشوق ۱۲ر
- مکاتیب عہ
- مسلمانوں کی تہذیب ۶ر

خلیفہ محمد حسین مرحوم
- اعجاز التنزیل للعہ
- سفرنامہ برنیر ۲ جلد للعہ

مولانا آزاد مرحوم
- آب حیات سے
- دربار اکبری صہ
- سخندان فارس سے
- نگارستان فارس سے
- نیرنگ خیال عہ
- سیر ایران عہ
- ڈرامہ اکبر عہ
- مجموعہ مکتوبات آزاد عہ
- مجموعہ نظم آزاد ۸ر
- نصیحت کا کرنپھول ۸ر
- جانورستان ۱۰ر
- بیاض آزاد عہ
- تذکرۂ علماء ۵ر
- لغت آزاد عہ
- دیوان ذوق مرتبہ آزاد ۶ر

پروفیسر شہباز مرحوم
- زندگانی بے نظیر عہ
- خیالات شہباز عہ

مولوی سید ممتاز علی
- تذکرۃ الانبیا عہ
- شیخ حسن ۱۲ر

مولانا نذیر احمد مرحوم
- حمائل شریف ترجمہ صہ
- الحقوق و الفرائض سے
- بنات النعش ۹ر
- مراۃ العروس ۱۰ر
- توبۃ النصوح ۱۲ر
- موعظۂ حسنہ عہ
- رویائے صادقہ عہ
- ایامٰی عہ
- فسانۂ مبتلا عہ
- ابن الوقت عہ
- مصائب غدر ۱۲ر
- مجموعہ نظم بے نظیر عہ
- کمل مجموعہ لکچر ۲ جلد صہ
- منتخب الحکایات ۶ر
- چند پند ۶ر
- مبادی الحکمۃ عہ

مولانا شرر مرحوم
- حیات انیس ۶ر
- ایشیائی شاعری عہ
- نورجہان بیگم ۸ر
- ٹیپو سلطان صہ
- حیدر علی سلطان صہ

مولانا حالی مرحوم
- یادگار غالب سے
- حیات سعدی عہ
- مقدمہ شعر و شاعری عہ
- حیات جاوید للعہ
- دیوان حالی عہ
- مسدس حالی عہ و ۸ر
- مجموعہ نظم حالی عہ
- بیوہ کی مناجات ۲ر
- شکوۂ ہند ۲ر

مولوی بشیر الدین احمد
- واقعات دار الحکومت دہلی ۵عہ
- تاریخ بیجاپور ۵عہ
- حرز طفلان عہ
- نشاط عمر عہ
- عصائے پیری عہ
- لخت جگر ے
- حسن معاشرت عہ
- اصلاح معیشت عہ
- اقبال و لہن عہ
- شمع ہدایت ۱۲ر
- انشائے بشیر ۱۲ر
- دیوان بشیر عہ

مولانا شبلی مرحوم
- سیرۃ النبی جلد اول مجلد عہ
- جلد دوم مجلد عہ
- سوم ۵عہ مجلد عہ
- الفاروق صہ و ۶ر
- سیرۃ النعمان عہ
- الغزالی عہ
- المامون عہ
- سوانح مولانا روم ۶ر
- سفرنامہ مصر و روم و شام ۶ر
- علم الکلام
- الکلام
- رسائل شبلی عہ
- مقالات شبلی عہ
- شعر العجم جلد اول سے
- 〃 〃 دوم عہ
- 〃 〃 سوم عہ
- 〃 〃 چہارم ے
- 〃 〃 پنجم ۶ر
- موازنۂ انیس و دبیر ے
- مضامین عالمگیر ۸ر
- آغاز اسلام ۸ر
- مجموعہ کلام شبلی اردو ۱۰ر
- کلیات شبلی فارسی ۶ر

مولانا ذکاء اللہ مرحوم
- تاریخ ہندوستان ۱۰ جلد
- تاریخ عہد سلطنت انگلشیہ
- کرزن نامہ ۶ر
- آئین قیصری
- صحیفۂ فطرت
- تعلیم الانتظام عہ
- محاربات عظیم ۸ر
- جغرافیہ ریاضیہ ۱۲ر
- جغرافیہ طبعی ۹ر
- اہل عرب کا جبر و مقابلہ ۶ر
- رسالہ علم تناسب ۶ر
- معاون الحساب ۱۲ر
- مساحت ماڈہنٹر ۱۲ر

سید محمود مرحوم
- کتاب الطلاق ۶ر
- کتاب الشفعہ ے
- شرح قانون شہادت مع التحریر ے

مولوی رشید احمد
- المدنیۃ و الاسلام
- تحریر المراۃ

فہرست مضامین بابت اگست سنہ ۱۹۲۶ء

نمبر ۲ — جلد ۳۳

نظرے خوش گذرے

۳۱ - جولائی گذر گئی، اور کہیں سے کوئی مضمون اُس انعامی مقابلہ کے متعلق وصول نہ ہوا جسکا اعلان جنوری کے الناظر میں کیا گیا تھا - باوجودیکہ ہم نے ہر طبقے کے اہل قلم حضرات کو مطلع کرنے کے لیے اکثر روزانہ اور ہفتہ وار اخباروں اور دیگر رسالہ جات کے ذریعہ بھی اس اعلان کو مشتہر کر دیا تھا - اس بے التفاتی کا ایک سبب تو یہ ہو سکتا ہے کہ جو انعام تجویز کیا گیا تھا وہ لوگوں کی نگاہوں میں بہت ناکافی تھا، اور دوسرا سبب شاید یہ بھی ہو کہ لوگوں کو مولانا شرر مرحوم کی تمام تصانیف فراہم کرکے اُنکے مطالعہ کا موقع نہ مل سکا - اسباب خواہ کچھ بھی ہوں، لیکن ہمیں افسوس ہے کہ بہی خواہان اُردو نے مولانا شرر کے متعلق اپنا فرض ادا کرنے میں بہت کوتاہی کی - اور اگرچہ ہمیں یقین ہے کہ آج نہیں تو دس بیس برس بعد لوگوں کو اس قسم کی تنقید و تبصرہ کی ضرورت محسوس ہوگی - لیکن

بعد از سرِ من کُن فیکوں شد شدہ باشد

دو سال کے قریب ہوے جب الناظر میں اس مضمون پر انعامی مقابلہ کا اعلان کیا گیا تھا کہ

"نذیر احمد - حکیم محمد علی خاں - سرشار - شرر - اور مرزا رسوا کے افسانوں کا مقابلہ کرکے بتائیے کہ ان میں بہترین ناول نویس کون ہے اور آپ اُن کے کس ناول کو سب سے زیادہ پسند کرتے ہیں"

اور اگرچہ اُسوقت بھی ہمیں مایوسی ہی ہوئی کہ ملک بھر میں ایک صاحب بھی اس عنوان پر قلم اٹھانے پر آمادہ نہ ہوے، مگر خدا کا شکر ہے کہ عثمانیہ یونیورسٹی کے ایک گریجویٹ مولوی عبد القادر سروری نے دنیاے افسانہ کے نام سے حال ہی میں ایک کتاب شایع کی ہے جو فسانہ نویسی کے متعلق اُردو میں پہلی کتاب ہے - اور جس میں انھوں نے اِن مشاہیر فسانہ نویسوں پر بھی اختصار کے ساتھ تبصرہ کیا ہے - عثمانیہ یونیورسٹی کے تعلیم یافتگاں میں ایسے خوش سلیقہ اور ادب دوست اصحاب کا پیدا ہونا یقیناً ہندوستان کی سب سے پہلی ملکی زبان کی یونیورسٹی کے لیے فال نیک ہے اور یقین ہے کہ ملکی زبان کے ذریعہ اعلیٰ تعلیم دینے کا تجربہ پوری طرح کامیاب ثابت ہوگا - انشاءاللہ دنیاے افسانہ سے ہم آیندہ ناظرین کو زیادہ وضاحت کے ساتھ روشناس کر سکیں گے -

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۲ جلد ۲۳ — اگست ۱۹۲۷ء

فیضی اور اُسکی مثنوی

"الحق مثنوی ایست کہ دریں سہ صد سال مثل آں بعد از امیر خسرو شاید در ہند کسے دیگر نگفتہ باشد" یہ وہ الفاظ ہیں جو فیضی کی عشقیہ مثنوی (نل دمن) کے حق میں اُس کے سخت ترین مخالف مگر حق پسند نقاد البدایونی کے قلم سے نکلے ہیں۔ گستاخی نہ ہو تو میں اس میں اس قدر اور اضافہ کروں گا کہ البدایونی کے اس ریمارک پر تین سو برس سے زیادہ گذر جانے کے باوجود بھی گذشتہ چھ صدیوں میں کسی سے نل دمن کا جواب نہ ہو سکا۔

ان سطور میں یہ دکھانے کی کوشش کی جائے گی کہ یہ رائے کس حد تک صداقت پر مبنی ہے اور فیضی کے آرٹ کی وہ کون سی خصوصیات تھیں جنھوں نے ہندوستان اور ایران سے یکساں خراج تحسین وصول کیا۔ مگر اس امر پر بحث کرنے سے پیشتر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصر طور پر فارسی میں مثنوی کی ابتدا اور اسکی ترقیات کے دور پر چند مباحث بطور مقدمہ عرض کر دیے جائیں تاکہ اس امر کا اندازہ ہو سکے کہ فیضی کی مثنوی کا فارسی ادبیات میں کیا درجہ ہے۔

عا اس مضمون میں جن کتابوں سے خاص طور پر استفادہ کیا گیا ہے حسب ذیل ہیں۔ (تاریخ) اکبر نامہ۔ منتخب التواریخ۔ طبقات اکبری۔ (تذکرہ و تنقید) آئین اکبری۔ منتخب حصہ سوم۔ شعر العجم۔ ہفت آسمان۔ مقدمۂ شعر و شاعری حالی۔ مقدمۂ مجنوں لیلیٰ خسرو از مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی۔ دربار اکبری۔ (مثنویات) نل دمن۔ مرکز ادوار۔ لیلےٰ مجنوں نظامی۔ مجنوں لیلیٰ خسرو۔ لیلیٰ مجنوں جامی وغیرہ۔

مثنوی کی اصل

مثنوی کی اصل اہل ادب میں مختلف فیہ ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ اس کا ماخذ رجز ہے جو عربی شاعری کی قدیم ترین صنف ہے۔ مگر چونکہ عربی کے ادب میں برخلاف فارسی کے کوئی مستقل مثنوی نہیں ملتی، یہ نظریہ غلط معلوم ہوتا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ مثنوی کی ابتدا کا سہرا فارسی کے سر ہے۔ ذیل میں ہم ایک جدول دیتے ہیں جس سے ظاہر ہوگا کہ مشہور اصناف شعر کا ماخذ کیا تھا۔ اور انکو کس زبان میں کس نام سے پکارتے ہیں :-

صنف شعر	اصل	عربی نام	فارسی نام
رجز	عرب	رجز	-
مرثیہ	"	مرثیہ	مرثیہ
قصیدہ	"	قصیدہ	قصیدہ
غزل	فارس	نسیب (تشبیب)	غزل
مثنوی	"	مزدوجہ	مثنوی
رباعی	"	دوبیتی (رباعی)	ترانہ (رباعی)

فارسی زبان میں رودکی سے، جسکو آدم الشعرا کہا جاتا ہے پیشتر بھی اکثر شعر کہنے والے ہوئے ہیں اور انکے بعض اشعار بھی تاریخ نے ہم تک پہونچائے ہیں۔ بلکہ قیاس چاہتا ہے کہ ایران جیسے خطہ میں جو قدیم تمدن اور قدرتی لطافت کا مرکز رہا ہے فتوحات اسلام سے پہلے بھی نظم ونثر کا معتدبہ ذخیرہ ہوگا۔ بہرحال تاریخی شہادت کے نہ موجود ہونے کی صورت میں ہم یہ قرار دینے پر مجبور ہیں کہ شاعری کی باقاعدہ ترقی کا زمانہ سامانیوں سے آغاز ہوتا ہے جن کے دربار کا شاعر رودکی تھا۔ عام شاعری کے علاوہ مثنوی کی ابتدا بھی رودکی سے ماننی پڑیگی جسکی مثنوی کے چند شعر اسوقت تک محفوظ ہیں۔ نمونہ کے طور پر ملاحظہ ہوں

گفت با خرگوش خانہ خان من ‏ ‏ خیز و خاشاک از و بیروں فگن
شو بداں کنج اندر و خفتہ بجوے ‏ ‏ زیر او سنجے بہت بیروں شو بدوے
چونکہ مالیدہ بدو گستاخ شد ‏ ‏ کار مالیدہ بدو درواخ شد
آفریدہ مرداں مر رنج را ‏ ‏ پیشہ کردہ رنج جان آنچ را

ان اشعار کو پڑھ کر جو قدیم زبان میں ہیں بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس عہد تک مثنوی نے بلکہ شاعری نے کوئی خاص ترقی نہیں کی تھی۔ سیدھے سادے خیالات سادہ زبان میں ادا کرنے

جاتے تھے۔ رودکی کے بعد دقیقی کا شاہنامہ اور اسدی کا گرشاسپ نامہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہاں تک کہ وہ دور آتا ہے کہ فردوسی شاہنامہ کی تکمیل کر کے اپنے زورِ نظم سے ملکِ سخن کو تسخیر کرتا ہے۔ یہی وہ مثنوی ہے جسکو ابن اثیر قرآنِ عجم کہتا ہے۔ یہی وہ نظم ہے جسکو مستشرقین یورپ دنیا کے ادبیاتِ عالیہ میں شمار کرتے ہیں۔ فردوسی کے بعد مثنوی گویوں کے زمرے میں حکیم سنائی کی شہرت محتاجِ بیان نہیں جن کی کتاب حدیقہ عطار اور مولانا روم کے لیے شمعِ راہ ثابت ہوئی۔ ما از پے سنائی و عطار آمدیم (مولوی)

ان کے بعد مولانا نظامی گنجوی کا زمانہ آتا ہے جن کی پنج گنج (خمسۂ نظامی) کا آوازہ شش جہت عالم میں پھیلا ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شاہنامۂ فردوسی کا اگر جواب ہو سکتا ہے تو سکندر نامۂ نظامی ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ شاہنامہ نقشِ اول ہے اور سکندر نامہ نقشِ ثانی۔ نظامی کے بعد اکثر اساتذۂ فن نے رزمیہ شاہنامے لکھے مگر شعرا کا زورِ قلم اور مسلمانوں کا جوشِ قومی اسقدر افسردہ ہو چکا تھا کہ بقول علامہ شبلی اُن مثنویوں کے دو شعر بھی بر زبان نہ رہے۔ نظامی کی عشقیہ مثنویوں کی بھی اکثر شعرا نے تقلید کی اور بعض کامیاب بھی ہوئے۔ جن کا ذکر آگے آئے گا۔ غرض یہ امر مسلم ہے کہ نظامی کے بعد جو مثنوی نویس ہوئے سب نے نظامی ہی کے نمونے کو سامنے رکھ کر طبع آزمائی کی

نظامی کے معاصروں میں بھی چند با کمال مثنوی نویس گذرے ہیں جن میں خاقانی، ظہیر، عطار کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

عطار کے بعد مولانا روم نے مثنوی میں وہ کمال دکھایا کہ آج تک صرف ایشیا بلکہ یورپ تک اسکی صدائے بازگشت سے گونج رہا ہے۔ اسی کی تعریف میں بعض معتقدین نے یہاں تک کہا کہ ہست قرآں در زبانِ پہلوی۔

ذیل کی ترتیب سے مثنوی نویسوں کے دور اور مثنوی کے ارتقا کی کیفیت واضح ہو گی۔

(۱) رودکی (مثنوی کلیلہ دمنہ) ابوشکور۔ دقیقی (شاہنامہ) عنصری۔ اسدی (گرشاسپ نامہ) (۲) فردوسی (شاہنامہ) (۳) ناصر خسرو (روشنائی نامہ) فخرالدین اسعد گرگانی (ویس ورامین) حکیم قطران (قوس نامہ) مسعود سعد سلمان (۴) حکیم سنائی (حدیقہ الحقیقہ) عمعق بخاری

ما۔ مستشرقین نے ایران کے تمام لٹریچر میں چار کتابوں کو (classic works series) میں شمار کیا ہے۔ مثنوی شاہنامہ فردوسی، مثنوی مولوی رومی، دیوان حافظ، اور گلستان سعدی۔

(یوسف زلیخا) نظامی عروضی سمرقندی (ویس ورامین) فصیحی جرجانی (وامق وعذرا) (۵) نظامی گنجوی (پنج گنج) - رشیدی سمرقندی - خاقانی - ظہیر - ازرقی - عطار - (۶) مولانائے روم (مثنوی مولوی) (۷) مقلدین نظامی گنجوی

مولانا نظامی کے بارے میں اوپر عرض کیا گیا ہے کہ انکے بعد کے تقریباً تمام مثنوی نویسوں نے اُنھیں کے قائم کردہ اصول کو اپنا دستورالعمل بنایا اور اُنھیں کی تقلید کو اپنے لیے سرمایۂ افتخار جانا - بیشمار شعرانے نظامی کے تتبع میں خمسے لکھے اور داد کمال دی - ان میں سب سے زیادہ نامور اور کامیاب خسرو - خواجوی کرمانی - جامی اور فیضی گذرے ہیں - آج کا موضوع بحث یہ ہے کہ فیضی کی مثنوی کا آرٹ کیا ہے اور وہ کس حد تک نظامی کا صحیح جانشین کہا جا سکتا ہے - مگر پہلی بات جو غور طلب ہے وہ یہ ہے کہ خود نظامی نے مثنوی کو کیا ترقی دی اور انکی بابت اساطین فن کی کیا رائے ہے - نظامی کے معاصرین اور متاخرین اس امر پر متفق ہیں کہ نظامی ملک نظم کے فرماں روا اور خصوصاً مثنوی کے بادشاہ ہیں - خسرو جیسے استاد کو اعتراف ہے کہ

نظامی کآب حیواں ریخت در حرف — ہمہ عمرش دراں سرمایہ شد صرف
چناں در خمسہ داد اندیشہ را داد — کہ با پنج شد اوش بست بنیاد
نظامی خود سخن ناگفتہ نگذاشت — ز خوبی گوہرے ناسفتہ نگذاشت

صاحب سلم السموات لکھتے ہیں

نظامی کہ اُستادِ این فن ویست — درین بزمگہ شمع روغن ویست
ز ویرانۂ گنجہ شد گنج سنج — رسانید گنج سخن را بہ پنج

فیضی ایک قصیدہ میں مولانا نظامی کی اُستادی کا اس طرح معترف ہے

ز سحر کاری گنجو رگنجہ تیز مپرس — کہ داشت کلکش بر گنج غیب قہرمانی
بنظم او برسد نظم غیر اگر برسد — تخیل متنبی بہ نقش قسم آنی

تمام نقادان فن کا فیصلہ ہے کہ قصیدہ میں خاقانی (جدت) و انوری (سلاست) - غزل میں سعدی مثنوی میں فردوسی (رزمیہ) و نظامی (عشقیہ) - قطعہ میں ابن یمین اور رباعی میں عمر خیام ائمہ سخن ہوئے ہیں - اس میں کوئی شک نہیں کہ مثنوی نویس شعرانے ہمیشہ نظامی کا تتبع کیا ہے نہ کہ فردوسی کا - اور یہ بھی امر مسلم ہے کہ مولانا نظامی کی عشقیہ مثنویاں فارسی ادب کے شاہکار

تصانیف شمار کی جاتی ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ غزنویہ کے دور کی جنگجویانہ روح قوم میں ایک حد تک مضمحل ہو چکی تھی اور ملک کی قدرتی لطافت حُسن و عشق کے ولولوں کو اُبھارنے میں مدد دے رہی تھی۔ ان حالات میں مولانائے گنجوی کی معنی آفرین اور نکتہ رس طبیعت نے سونے پر سہاگہ کا کام دیا۔ انھوں نے مثنوی کا قالب مکمل کیا اور اُس میں تعریفِ سخن۔ سبب تالیف۔ نصائح۔ ساقی نامہ کے مضامین ایجاد کیے۔ جب سے مثنوی میں یہ لوازم قرار پائے۔ حمد۔ مناجات۔ نعت۔ ذکرِ معراج۔ منقبت۔ مدح۔ تعریفِ سخن و سخنوراں۔ سبب تالیف۔ نصائح۔ تمہید کلام۔ ساقی نامہ۔ آغازِ داستان۔ خاتمہ۔ انھوں نے مثنویوں میں مباحثِ حکمیہ کا اضافہ کیا اور آیندہ کے لیے فلسفیانہ مضامین کی بنیاد ڈالی۔ اُنھوں نے پانچ مختلف بحروں میں مثنویاں لکھیں اور مخزن اسرار اور ہفت پیکر کی بحروں کو مثنوی میں داخل کیا۔ (دیکھو شبلی) ان سب باتوں کے ساتھ اُنکی نازک خیالی اور مضمون آفرینی نے تشبیہ اور استعارہ کے زور سے شعر کو سحر کے درجہ پر پہونچا دیا۔ جسکی بدولت اُنکا کلام تازگی و شگفتگی میں اسوقت تک ضرب المثل ہے۔ کہن گشتی و ہمچناں تازۂ۔

مثنوی کا بہترین اصناف شعر ہونا

حقیقت یہ ہے کہ مثنوی سے بہتر اور مفید تر کوئی صنفِ سخن نہیں۔ سب سے بڑی بات جو مثنوی میں ہے وہ یہ کہ اس میں ردیف کا ہونا ضروری نہیں۔ برخلاف غزل کے جو ردیف کے بغیر نہایت خشک اور بے مزہ معلوم ہوتی ہے۔ قدما کی غزلوں کو پڑھو۔ عموماً ردیف سے معرا اور موسیقیت سے خالی پاؤگے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو فارسی غزل ایک نہایت مشکل اور پُر از تکلف چیز ہے جن زبانوں میں بلینک ورس کا رواج ہے اُن کا تو ذکر نہیں۔ ہمارے اہل ادب اُس کو نثر (مرجز) سے زیادہ درجہ نہیں دیں گے۔ غضب تو یہ ہے کہ قافیہ پر بھی قناعت نہیں بلکہ ردیف کی قید بڑھا کر خیال کو محدود اور دائرۂ سخن کو تنگ کر دیتے ہیں۔ بہر حال مثنوی میں یہ قید چنداں لازم نہیں۔ قاسم کاہی رسالہ قافیہ میں لکھتا ہے کہ در غزل ردیف زیب است و در مثنوی عکس آں۔ بعد لطف یہ کہ مثنوی کے ہر شعر میں قافیہ بدلتا رہتا ہے۔ یہ کتنی بڑی سہولت ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مثنوی میں تعداد اشعار محدود نہیں۔ رباعی کے دو شعر دیکھو اور اُس میں ایک مکمل تخیل ادا کرنے کی مشکلات پر غور کرو۔ غزل کے اشعار بھی عموماً سترہ یا اکیس سے زیادہ نہیں ہوتے۔ قصیدہ میں البتہ اساتذہ نے دو دو سو بلکہ کبھی اس سے زیادہ بھی شعر

کیے ہیں۔ مگر پھر بھی ایک حد ہے۔ اسکے برخلاف مثنوی میں اشعار کی کوئی تعداد معین نہیں۔ شعرانے پچاس پچاس اور ساٹھ ساٹھ ہزار مسلسل اشعار کی مثنویاں لکھی ہیں اور زور سخن دکھایا ہے شاہنامہ اور مثنوی مولوی وغیرہ ہمارے دعوے کے شاہد ہیں۔

اس کے علاوہ مضامین مثنوی میں تنوع کی اس قدر گنجایش ہے کہ اور اصناف شعر میں نہیں اُس میں غزل یا قصیدہ کی طرح تغزل یا مدح کی پابندی ضرور نہیں پایا۔ رزم و بزم اخلاق و موعظت۔ تصوف و فلسفہ غرض ہر موضوع کے لیے خواہ اُس میں علحدہ علحدہ مستقل بالذات تخیلات ادا کیے گئے ہوں یا ایک مربوط و مسلسل مضمون ہو اسکا میدان اپنے اندر کافی وسعت رکھتا ہے۔ مثنوی ایک طرف رزم و تاریخ و افسانہ پر حاوی ہونے کے لحاظ سے محاکات کے اور دوسری طرف فلسفہ و تصوف کی حامل ہونے کے اعتبار سے تخیل کے مختلف عناصر پر محتوی ہے۔ اسی جامعیت کا نتیجہ ہے کہ تاریخ و افسانہ و اخلاق کے بڑے سے بڑے دفتر صرف مثنوی ہی کی بدولت شعر کے جامہ سے مزین ہو سکے۔ ذیل میں ہم مثنوی کے مختلف اقسام اور انکی مثالیں دیں گے جن سے اُسکے تنوع کا اندازہ ہوگا۔ مثنوی کی تقسیم دو طریقہ سے ہوسکتی ہے۔ باعتبار معنی و بہ لحاظ صورت۔ پہلے طریقہ کی بابت یہ امر پیش نظر رکھنا چاہیے کہ کوئی جامع و مانع تقسیم تو نہیں کی جا سکتی البتہ موجودہ مثنویاں حسب ذیل عنوانوں کے تحت میں رکھی جا سکتی ہیں:

(۱) رزمیہ مثلاً شاہنامہ۔ سکندرنامہ۔ گشتاسپ نامہ۔ (۲) تاریخی۔ مثلاً اکبرنامہ فیضی۔ تاج الفتوح خسرو (۳) افسانہ۔ جیسے کلیلہ دمنہ رودکی۔ ہفت پیکر نظامی۔ ہشت بہشت خسرو (۴) عشقیہ مثلاً لیلیٰ مجنون یوسف زلیخا۔ شیرین خسرو۔ نل دمن (۵) اخلاقی۔ مثلاً مخزن اسرار تحفۃ الاحرار۔ مرکز ادوار مطلع انوار۔ مجمع الابکار۔ روضۃ الانوار۔ مشہد الانوار۔ منبع انہار۔ دیدۂ بیدار۔ بوستان۔ (۶) فلسفیانہ۔ جیسے روشنائی نامہ (۷) صوفیانہ۔ جیسے حدیقۂ سنائی۔ منطق الطیر۔ مثنوی مولوی معنوی۔ جام جم۔ گلشن راز۔

صورت کے لحاظ سے مثنوی سات بحروں میں منقسم ہو سکتی ہے۔ جو حسب ذیل ہیں۔

(۱) بحر متقارب مثمن مقصور (یا محذوف) جیسے کنوں رزم سہراب و رستم شنو ٭ دگرہا شنیدستی این ہم شنو۔ (شاہنامہ فردوسی)

(۲) بحر ہزج مسدس مقصور۔ مثلاً الٰہی غنچۂ امید بکشاے ٭ گلے از روضۂ جاوید بنماے (یوسف زلیخا ۔ جامی)

(۳) بحر ہزج مسدس اخرب مقبوض محذوف۔ جیسے اے نام تو بہترین سرآغاز۔ بے نامِ تو نامہ کے کنم باز (لیلیٰ مجنوں نظامی)

(۴) بحر رمل مسدس محذوف۔ جیسے بشنو از نے چوں حکایت میکند۔ وز جدائیہا شکایت میکند (مثنوی مولوی معنوی)

(۵) بحر رمل مسدس مخبون محذوف۔ مثلاً تا بجائے کہ حد پارسیاں۔ اندریں عہد دون گشت عیان۔ (نہ سپہر خسرو)

(۶) بحر سریع مسدس مطوی مکسوف۔ جیسے پیر زنے را ستمے در گرفت۔ دست زد و دامنِ سنجر گرفت (مخزن اسرار نظامی)

(۷) بحر خفیف مسدس ابتر۔ مثلاً ہر کسے کردہ ایں موافقت را۔ چہ شناسد قتیل و واقف را (باد مخالف غالب)

بعض متاخرین نے ایک بحر کا مثنوی میں اور اضافہ کیا ہے۔ بحر متقارب مثمن ثلم جیسے روزے بسوے دشت یمن شد۔ دشت از جمالش رشکِ چمن شد (لا اعلم) مثنوی کی اس ہمہ گیری اور وسعت کو دیکھتے ہوے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ یہ تمام اصناف شاعری میں مفید ترین ہے اور اسی کی بدولت مستقل اور طویل نظم فارسی میں مل سکتی ہے۔

عمدہ مثنوی کی شرائط مثنوی کی دو بڑی قسموں محاکاتیہ Narrative اور تخئیلیہ Reflective میں رزمیہ۔ تاریخی۔ افسانہ۔ اور عشقیہ قسم اول میں، اور اخلاقی۔ فلسفیانہ۔ صوفیانہ دوم میں داخل ہیں۔ چونکہ اس مقالہ کا موضوع قسم اول (خصوصاً عشقیہ) ہے اور عشقیہ مثنوی بداہتہً قصہ یا story کی حد میں آتی ہے اس لیے اسکے واسطے وہی لوازم ہونے چاہییں جو ایک قصہ کے لیے درکار ہیں۔

یہ لوازم یا شرائط حسب ذیل ہیں۔ الف۔ واقعات کی ترتیب اس موزونیت اور خوش اسلوبی کے ساتھ ہو کہ تسلسل اور ربط میں فرق نہ آنے پائے۔ جو امور کہ نمایاں کرنے کے قابل ہوں انکو نمایاں کر کے پیش کیا جائے۔ جو نکات کہ اشارۃً یا کنایۃً بیان کرنے ہوں وہ اس لطافت ادا کیے جائیں کہ باوجود کنایۃ ذہن اس کی طرف منتقل ہو جائے۔ کیونکہ الکنایۃ ابلغ من الصراحۃ (دیکھو شعر العجم)۔ اسی کے ساتھ یہ نکتہ بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ تخئیل و محاکات کا مصرف صحیح نظر انداز نہ ہو۔ تخئیل کی جگہ محاکات یا محاکات کے موقع پر تخئیل کا استعمال یا

دونوں میں سے ایک کا ترک کر دینا شاعر کے ناقص ہونے کی دلیل ہے۔

ایک خاص بات جو پلاٹ کے تیار کرنے میں مدنظر ہونی چاہیے وہ جذبات کی ترجمانی ہے مگر افسوس ہے کہ ہمارے اساتذہ نے اس خاص امر پر زیادہ توجہ سے کام نہیں لیا۔ وہ جذبات کی ترجمانی کرتے بھی ہیں تو اس طریقہ سے کہ بجائے ہیرو کی شخصیت قائم رکھنے کے اپنی شخصیت نمایاں کر دیتے ہیں اور اُس کے مُنہ سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں یا اس طرح کہ تمام قصہ فرضی اور غیر فطری معلوم ہونے لگتا ہے۔ قصہ نفس الامر میں واقعی ہو یا غیر واقعی، غیر فطری اور خلافِ مقتضائے حال نہ ہونا چاہیے۔ اسکے لیے ضرورت ہے کہ شاعر یا نثار مشاہدۂ فطرت اور مطالعہ جذباتِ انسانی کا خوگر رہا ہو۔

اس کا آرٹ یہ ہے کہ بے جان پُتلوں میں یوں جان ڈال دے کہ چشم نظارہ کو چلتے پھرتے نظر آئیں اور قصہ پر واقعہ کا دھوکا ہونے لگے۔ نہ صرف یہ بلکہ قارئیں کو اشخاص متعلق سے ہمدردی پیدا ہو جائے۔ مگر شرط یہ ہے کہ اخلاقی عنصر معدوم نہ ہو جائے اور جذبات کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ ضمنی طور پر اخلاق کا پہلو بھی پیش نظر رہے۔ ضمنی کی قید اس لیے مناسب معلوم ہوتی ہے کہ اگر بالکل اُڑا دی جائے گی تو اُس ادبی تصنیف اور جعفر زٹلی کے کارنامہ میں کوئی مابہ الامتیاز نہ رہے گا اور اگر اخلاق کا عنصر زیادہ نمایاں رہا تو وہ کتاب اخلاق ناصری یا جلالی بنجائے گی۔

(ب) کیرکٹر۔ ہر قصہ میں کچھ کیرکٹر (اشخاص) ہوتے ہیں جن کی سیرت کی صحیح ترجمانی پر ادیب کے کمال کا دار و مدار ہوتا ہے۔ خصوصًا قصہ کے ہیرو (فرد مخصوص) تمام قصہ کی جان ہوتا ہے اور اسی کی شخصیت تمام واقعاتِ داستان کی محور ہوتی ہے۔

کیرکٹر دکھانے کے لیے جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ضرورت ہے کہ ادیب کتاب فطرت کا مطالعہ کرنے والا ہو اور جو تصویر کھینچے وہ اس قدر اصلی، فطری اور صحیح ہو گویا اب بولنا چاہتی ہے۔

سیرت نگاری کا فن فارسی اور اُردو میں اسوقت تک بہت ناقص ہے۔ جو تصاویر ہمارے مثنوی نویس شعرا نے کھینچی ہیں وہ چند پُتلے ہیں جو اپنے تخیل کے زور سے اُنھوں نے بنا کر کھڑے کر دیے ہیں مگر جان دیکھو تو نام کو نہیں۔ مضمون کی طوالت اور وقت کی قلت کے سبب مجبور ہوں ورنہ ایسی بہت سی مثالیں جنسے کتابیں بھری پڑی ہیں قارئیں کرام کی خدمت میں پیش کیجا سکتی تھیں۔

غرضکہ سیرت نگاری میں اگر عمق اور ژرف بینی نہیں تو ادبی اور معنوی حیثیت سے اسکو کوئی درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ اسی سلسلہ میں اگر یہ عرض کر دیا جائے تو بیجا نہ ہو گا کہ سیرت نگاری میں جو نقائص عام طور

پر پائے جاتے ہیں وہ یا تو ادیب کی سطحی نظر کا قصور ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ فطرت و جذباتِ انسانی کے اعمال تک پہونچنے سے عاجز رہتا ہے یا کیرکٹر میں عدم اتحاد کا ہونا جسکی وجہ سے وہ ایک ہی شخص سے متضاد امور کے صدور کو ممکن ٹھہراتا ہے ۔ مثلاً ایک عالی حوصلہ شخص جس نے حق و صداقت کے لیے بڑی سے بڑی قربانیاں کر دکھائی ہوں ایک موقع پر معمولی دباؤ یا لالچ سے متاثر ہو جائے ۔ یا کیرکٹر کا احول سے مطابق نہ ہونا ۔ یعنی ایسے جذبات کا اظہار جو کسی مخصوص کیرکٹر کی حیثیت یا زمان و مکان سے قطعاً بیگانہ ہوں ۔ مثلاً ایک پست فطرت غلام کا بادشاہ سے حریفانہ برتاؤ کرنا ۔ یا اب سے صدیوں پہلے عرب میں کسی شادی کا فوٹو کھینچنا اور اُس میں ہندوستانیوں بلکہ ہندوؤں کی رسمیں دکھانا ۔ غرضکہ یہ اور اسی قسم کے امور ہیں جن کا خیال رکھنا ایک افسانہ نویس کو لازم ہے ۔

(ج) **محاکات** ۔ ایک افسانہ نویس کے لیے ضروری ہے کہ محاکات پر پوری قدرت رکھتا ہو ۔ اور کسی منظر یا واقعہ کے بیان کرنے میں ماہر ہو جس سے سننے یا پڑھنے والوں کی نگاہوں میں اُس کی تصویر کھنچ جائے ۔ علامہ شبلی مرحوم نے بہت خوب لکھا ہے ۔ ایک ماہر EXPERT. اور غیر ماہر LAYMAN. کے بیان یا محاکات میں ہمیشہ یہ فرق ہوگا کہ اول الذکر جس شے کی تعریف مقصود ہے اُس کے فنی محاسن یا نقائص ظاہر کرے گا ۔ واقعۂ زیر بحث کی نسبت تمام ضروری اور کافی تفصیلات پیش کریگا اور متناقض یا خلاف قیاس باتوں سے احتراز کرے گا ۔ اسکے برخلاف آخر الذکر عام اور مبہم یا سطحی و متناقض بیان سے کام لیگا ۔ محاکات کے بارے میں یہ نکتہ یاد رکھنا چاہیے کہ ایک ادیب انداز بیان میں ہمیشہ اختصار اور زور ملحوظ رکھے گا ۔ اور خلافِ تہذیب امور کے ذکر سے حتی الامکان مجتنب رہیگا ۔

قصہ مختصر یہ چند لوازمات ہیں جو ایک محاکاتیہ مثنوی یا افسانہ کے لیے ضروری ہیں ۔ رزمیہ مثنوی میں چند اور خصوصیات کا ہونا بھی لازم ہے جنکی تفصیل ہم کسی دوسرے موقع کیلیے موقوف رکھتے ہیں ۔

عشقیہ مثنوی کے خصائص | اب صرف یہ دیکھنا رہا کہ عشقیہ مثنوی کیلیے اور کیا اضافی خصوصیات ہیں جو اسکو عام افسانوں سے ممتاز کرتی ہیں اسکے لیے مناسب ہوگا کہ ہم اول چند اقتباسات پیش کریں اور پھر اُنسے نتیجہ اخذ کریں ۔ مثنوی اور خصوصاً عشقیہ مثنوی کے بادشاہ مولانا نظامی لیلی مجنوں میں فرماتے ہیں :۔

آمد بدیار یار پویاں لبیک زناں و بیت گویاں
چوں کار دلش ز دست بگذشت بر خرگہ یار رخت بگذشت

بر رسم عرب نشستہ آں ماہ / بر پشتہ زدہ شکنج خرگاہ

لیلیٰ چو فلک بپردہ داری / مجنوں چو ستارہ در عماری

لیلیٰ گلہا دراز کردہ / مجنوں گلہ نیز باز کردہ

لیلیٰ چو رباب دست بر سر / مجنوں ز خروش چنگ در بر

لیلیٰ نہ کہ صبح گیتی افروز / مجنوں نہ کہ شمع خویشتن سوز

لیلیٰ چمن خزاں ندیدہ / مجنوں چمن خزاں رسیدہ

لیلیٰ مے مشکبوے در دست / مجنوں نہ زمے نہ بوے مے مست

قانع شدہ ایں ازاں ببوئے / واں راضی ازاں بجست وجوے

شیریں خسرو میں لکھتے ہیں اور کیا خوب لکھتے ہیں:-

بگفت این و چو سرو از جاے برخاست / جبیں را گرو کرد و فرق را راست

بآں آئیں کہ خوباں را بود دست / زنخداں می کشاد و زلف می بست

جمال خویش را در خز و خارا / بپوشیدن ہمی کرد آشکارا

گہے بر فرق تند آشفتہ می بود / گرہ می بست و بر مہ مشک می سوز

بزیور راست کردن دیر می شد / کہ پالش بر سر شمشیر می شد

بچشمے ناز بے اندازہ می کرد / بدیگر چشم عذرے تازہ می کرد

ایک موقع پر شیریں خسرو سے یوں مخاطب ہے:-

ہنوزت در سر از شاہی غرور است / دریغا کیں غرور از عشق دور است

ہنوزم ہندواں آتش پرستند / ہنوزم دیدہا ترکان مستند

ہنوزم لب پر آب زندگانی ست / ہنوزم آب در جوے جوانیست

برہ تا بر تو نازشایم بخوں دست / کہ در گردن چنیں خونم بسے ہست

ان اشعار سے اشعار ذیل کا مقابلہ کرو تو معلوم ہوگا کہ عشقیہ شاعری کی زبان ہی مختلف ہے۔

ہزاہز در آمد بدو شست نبرد / رہ اژدر در آمد بمردان مرد

طرائفے کہ از مطرقہ خاستہ / رواں رفت زیں طاق آراستہ

ازاں تیغ برکشتہ جائے نبود / کہ در غار او اژدہائے نبود

کنند اژدہاے مسلسل شکنج / دہن باز کردہ بتاراج گنج

عشقیہ مضامین میں علاوہ لطافت مضامین کے زبان کا لوچ اور شیرینی اس قدر بدیہی امور ہیں جنکا انکار نہیں ہو سکتا - برخلاف اسکے رزمیہ شاعری میں زبان کا زور اور الفاظ کی شان و شکوہ اگر مفقود ہوں تو وہ رزم نہیں بزم ہو جاتی ہے - ہزاہز - طراق - طرقہ - اژدہا وغیرہ کا زور اس امر کا شاہد ہے کہ مولانا اس نکتہ سے واقف تھے کہ موضوع بدلنے سے تصنیف کا انداز بدل جاتا ہے - خود سکندر نامہ میں رزم اور بزم کی زبان مختلف ہے - نوشابہ کا دربار یا کنیزک چینی کی داستان ہمارے دعوے کی دلیل ہیں -

زبان کی لطافت کے علاوہ غالباً بحروں کے انتخاب کو بھی اس میں کافی دخل ہے - میرا خیال ہے کہ اگر شیرین خسرو یا لیلیٰ مجنوں سکندر نامہ کی بحر میں لکھی جاتیں تو وہ تاثیر پیدا نہ ہوتی - دوسری بات جو عشقیہ مضامین میں جان ڈالتی ہے اور طبیعتوں پر کیف پیدا کرتی ہے تشبیہ اور استعارہ کی نزاکت اور رنگینی ہے - جیسا کہ اوپر کے اشعار سے اندازہ ہوا ہوگا - رزمیہ اور عشقیہ تصانیف میں اسی فرق مراتب کے ترک کر دینے کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہمارے ہاں پرانے جو اکبرنامہ، تیمورنامہ، سلیمان نامہ، آئینہ سکندری خسرو، سکندرنامہ جامی میں رزم کے بدلے بزم کا سماں نظر آتا ہے اور اسی لیے ان میں سے کسی کو شاہنامہ یا سکندرنامہ کے عشر عشیر بھی درجہ نہ ملا - تمدن نے زبان اور خیالات کو اس قدر شیریں اور لطیف بنا دیا تھا کہ رزمیہ مضامین میں بھی بزم کے تلازمے باندھنے لگے - پھر اثر ہوتا تو کیونکر - غرضکہ اس میں کوئی شک نہیں کہ عشقیہ مثنوی میں زبان کا شیریں اور رنگین ہونا طرز بیان کا دلکش اور بدیع ہونا اور تشابیہ و استعارات کا لطیف اور نازک ہونا ایسا ہی ضروری ہے جیسا کہ غزل میں - اور اگر یہ نکتہ نظر انداز کر دیا جائے تو شاعر کا آرٹ ناقص اور نامکمل رہتا ہے -

قصہ نل دمن کی اصلیت

آمدم برسر مطلب - اس تمہید کے بعد جس کی بابت ہم قارئین کرام سے معذرت خواہ ہیں اصل مطلب شروع ہوتا ہے - یعنی فیضی ان شرائط پر کس قدر پورا اترا - اور کس اعتبار سے ایک کامیاب مثنوی نویس کہلایا - مگر اس سے پیشتر قصہ نل دمن کی اصلیت عرض کر دی جائے تو بیجا نہ ہوگا - اکبر کی خواہش تھی کہ خمسہ نظامی کا جواب لکھا جائے - یہ خدمت ملک الشعرا فیضی کو سپرد کی گئی - تجویز یہ تھی کہ مخزن اسرار کے جواب میں مرکز ادوار - خسرو شیریں کے جواب میں سلیمان بلقیس - لیلیٰ مجنوں کے جواب میں نل دمن - ہفت پیکر کے جواب میں ہفت کشور اور سکندرنامہ کے جواب میں اکبرنامہ تیار ہوں - مگر

زمانہ نے فرصت نہ دی اور صرف مرکز ادوار اور نل دمن تکمیل کو پہونچیں - نل دمن کا سنہ تصنیف سنہ ۱۰۰۳ھ ہے - جیسا کہ فیضی خود لکھتا ہے

سی و نهم از جلوس شاهی — تاریخ مجدد الٰهی
چوں سال عرب شمار کردم — الف و سه الف نگار کردم

اسوقت فیضی کی عمر اُنچاس برس کی تھی

اکنوں که چل و نهم درین دیر — هفتاد و دو شعبه کرده ام سیر

اس مثنوی میں چار ہزار سے کچھ زائد اشعار ہیں اور چار ماہ میں ختم ہوئی - بادشاہ کی طبیعت کا رجحان جیسا کچھ ہندو مذہب کی طرف تھا ظاہر ہے - اسی کا نتیجہ تھا کہ اسکی نگاہ انتخاب سب سے پہلے ایک ہندو قصہ پر پڑی اور فیضی نے بھی اپنے آقا کے حکم کی تعمیل - میں پہلے اسی کو تکمیل تک پہونچایا

گفت اے چمنت ز شبنم ما — جادوگر آتشیں دم ما
از دل شررے بدم درافگن — آتش بہ نے قلم درافگن
در ہند ز عشق سرگذشتے است — جاں را بنداش بازگشتے است
نو ساز فسانۂ کہن را — عشق نل و خوبیِ دمن را

نل دمن سنسکرت کی مشہور رزمیہ کتاب مہابھارت مصنفۂ بیاس سے ماخوذ ہے جس میں نسوانی وفاداری دکھائی گئی ہے - اس تصنیف کی تاریخ مسیح علیہ السلام سے تقریباً چار سو سال قبل ہے - قصہ کا خلاصہ یہ ہے کہ راجہ نل فرماں روائے اُجین نا معلوم طور پر اپنے دل میں خار محبت کی خلش محسوس کرتا ہے - آخر ایک مصاحب دمن (دختر راجہ بیدر) کے زاہد فریب جمال کا ذکر کرتا ہے اور نل عاشق ہو جاتا ہے - اُدھر دمن کے قلب میں بھی عشق کی لگن پیدا ہوتی ہے - باہم عاشقانہ خط و کتابت کا آغاز ہوتا ہے - آخر سوئمبر کی رسم قرار پاتی ہے اور دونوں کی شادی ہو جاتی ہے - اور یہ خوش نصیب عاشق و معشوق بخیر و خوبی اجین کو واپس آتے ہیں - مگر افسانہ یہیں پر ختم نہیں ہوتا - بلکہ یہاں سے دور آزمایش شروع ہوتا ہے - نل کے دل و دماغ پر ایک روح مسلط ہو جاتی ہے جو قدرت کی طرف سے امتحان وفا کے لیے معین ہوئی ہے - جس کے اثر سے وہ اپنے بھائی کے ساتھ شطرنج کھیلتا ہے اور بالآخر حکومت ہار جاتا ہے - اور جلا وطنی پر مجبور ہوتا ہے - دمن باوجود ممانعت مصیبت میں اپنے شوہر کا ساتھ دیتی ہے - نل ایک موقع پر اپنی نازک اندام بیوی کو جنگل میں سوتا چھوڑ کر چل دیتا ہے - دمن بیدار ہو کر لق و دق صحرا میں اپنے آپ کو بے یار و مددگار

پاتی ہے - اچانک ایک اژدہا اُس پر حملہ کرتا ہے مگر ایک شکاری کی مدد سے اُسکی جان بچتی ہے شکاری موقع پاکر دمن کو اپنے دامِ تزویر میں پھانسنا چاہتا ہے مگر وہ وفا شعار اپنے شوہر کے سوا دوسرے شخص کی صورت تک دیکھنا نہیں چاہتی اور بہزار مشکل وہاں سے گرتی پڑتی اپنے باپ کے قلمرو میں پہونچتی ہے - ادھر نل کو سانپ ڈستا ہے جسکی تاثیر سے اُسکا رنگ سیاہ پڑ جاتا ہے - سانپ ایک مُہرہ اُسکو دیتا ہے اور راجہ رت برن والیِ اجودھیا کے پاس جانے کی ہدایت کرتا ہے - نل تعمیل کرتا ہے اور اجودھیا پہونچ کر راجہ مذکور کی سلک ملازمت میں منسلک ہوتا ہے - دمن دُور دُور اُس کی تلاش میں آدمی روانہ کرتی ہے - بالآخر نل کا سراغ لگا لیتی ہے - ایک فرضی سوئمبر کے انعقاد کا اعلان کیا جاتا ہے - راجہ رت برن بھی شریک ہوتا ہے اور اُس کے معیت میں نل بھی پہونچتا ہے - مُہرہ کی مدد سے نل اپنی اصلی حالت پر آجاتا ہے دونوں عاشق و معشوق ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں - اور صدمہ ہجر مسرتِ وصال سے بدل جاتا ہے - نل دمن کو لیکر اُجین واپس آتا ہے اور رت برن سے قمار سیکھ کر اپنے بھائی کو ہراتا اور دوبارہ حکومت حاصل کرتا ہے - آخر ایک عرصے تک حکومت کرنے کے بعد نل کی شمع حیات بجھ جاتی ہے اور صداقت شعار دمن پروانہ وار اُس پر ستی ہو جاتی ہے -

مثنوی نل دمن کے محاسن

ہمیں نہایت سچائی کے ساتھ اعتراف کرنا چاہیے کہ افسانہ کے لیے جو شرائط جدید طریقۂ تنقید نے قرار دی ہیں اُن میں سے بعض فیضی کی مثنوی میں مفقود یا غیر نمایاں ہیں - اسکا سبب یہ ہے کہ تنقید کا موجودہ معیار اُس وقت تک قائم نہیں ہوا تھا - اُس زمانہ تک ایک افسانہ نگار (ناظم ہو یا نثار) کے لیے یہ کافی تھا کہ کسی واقعہ کو نازک خیالی اور بدیع الاسلوبی کے ساتھ تحریر کردے اور سامعین یا قارئین پر غم یا مسرت کی کیفیات طاری کردے - افسانہ نویسی اور سیرت نگاری کے موجودہ اصول ہمارے ایشیائی ادب میں بالکل حال کی پیدا وار ہیں -

اس کے علاوہ فیضی بحکم الماموُر معذور مجبور تھا کہ سنسکرت کے افسانہ کو حتی الامکان بعینہٖ فارسی میں منتقل کردے - اور تمام دور دراز کار روایات کو بلا تصرف جوں کا توں بیان کردے - معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں اُسکو اس خدمت کے سرانجام دینے میں کچھ تامل ہوا جیسا کہ اسکے اشعار سے مترشح ہوتا ہے -

از خواندنِ این فسانۂ راز	کش خواند برین فسانہ پرداز

مو بر تنِ من زبیم برخاست | دودے ز دلِ دو نیم برخاست
کیں زور نہ کار بازو یم بود | ویں سنگ نہ ہم ترازویم بود
رفت از کفم اختیار بیرون | کز حوصلہ بود کار بیرون
لیکن چکنم نداشت از بیم | بیچارہ دلم بغیر تسلیم
آں کو برضائے او قضا رفت | باید رہش از سر رضا رفت

مگر یہ خیال کرکے حیرت ہوتی ہے کہ ان مشکلات کے باوجود فیضی ایسی مثنوی لکھنے میں جسکو ادبیات فارسیہ کی اختراع فائق کہنا بیجا نہ ہوگا کیونکر کامیاب ہوگیا۔ شمس العلما آزاد دہلوی اس کا سبب یہ قرار دیتے ہیں کہ وہ سنسکرت اور فارسی میں معنی آفرینی کے جو انداز تھے دونوں سے واقف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں زبانوں کے نازک اسالیب کو باہم امتزاج دے کر اُس نے ایک ایسا نمونۂ شعر پیش کیا جو سحر کی حد تک پہونچا ہوا ہے۔

بہر حال ذیل میں ہم مثنوی مذکور کے محاسن چند خصوصیات کے تحت میں دکھانے کی کوشش کریں گے اور فیضی کے کمال سخن پر حتی المقدور روشنی ڈالیں گے۔

پہلی خصوصیت۔ موضوع کی ترتیب اور کیرکٹر کی ترجمانی۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا افسانہ نگاری کا موجودہ معیار اُس زمانہ میں قائم نہیں ہوا تھا۔ علاوہ بریں مترجم کو اپنی طرف سے رد و بدل کا اور تصرف کا اختیار بھی نہ تھا اس لیے موضوع کی ترتیب اور کیرکٹر کے معاملہ میں فیضی بالکل مجبور تھا۔ اگرچہ مثنوی نلدمن لفظ بلفظ ترجمہ نہیں ہے اور نہ ہو سکتی تھی۔ تاہم واقعات کو بعینہٖ نقل کر دینا فیضی کا فرض تھا۔ اُس نے دکھایا ہے کہ نل غیر معمولی طور پر اپنے دل میں عشق کی خلش محسوس کرتا ہے۔

ناگہ گلِ بخت نارس افتاد | در دیدۂ خواب او خس افتاد
گردش زدہِ ملال برخاست | در خانۂ دل خیال برخاست
در یافت بچشم خود غبارے | در سینہ نہفت تا رخارے
آگہ نہ کہ گرد دامن کیست | ویں غنچہ زخار گلشن کیست
در جیب گلش کہ ایں خساک ریخت | در زخم دلش کہ ایں نمک ریخت
آتش کہ بسقف خانہ در زد | ویں فتنہ ز دامنِ کہ سر زد

یا اُس نے لکھا ہے کہ سانپ نل کو کاٹتا ہے اور بعد کو ایک مہرہ دیتا ہے جسکی مدد سے

وہ آخر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوتا ہے۔ یہ اور اسی قسم کے بہت سے امور ہیں جنکو فیضی بحیثیت ایک مترجم کے نظر انداز کرنے کا مجاز نہ تھا۔

اسی طرح کیرکٹر یا سیرت کے بیان کرنے میں بعض خامیاں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً ایک موقع پر نل جو دمن کے نام پر جان دیتا تھا اُسکو تن تنہا لق و دق بیابان میں چھوڑ کر نکل جاتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اسکا الزام اصل مصنف پر ہے نہ کہ فیضی پر۔ ممکن ہے کہ اسکے باوجود یہ سطور بالا بجائے محاسن کے فیضی کے معائب میں شمار کی جائیں۔ مگر نہیں۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ ان پابندیوں کے ہوتے ہوئے بھی فیضی ایک ادیب کے فرائض سے کس خوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہو سکا ہے۔ مثلاً۔ ہندوستان کی شاعری میں عورت عاشق ہوتی ہے اور مرد معشوق۔ اور عورت ہی کی طرف سے اظہار عشق ہوتا ہے۔ ایک طرف تو یہ رسم و رواج کی آزادی ہے۔ دوسری طرف نسوانی حیا کی پابندی ہے جو سوز عشق کے باوجود اظہار سے مانع ہے۔ ان متضاد کیفیات کو ملحوظ رکھو اور پھر دمن کے خط کو پڑھو جو نل کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ اول چند اشعار نل کے نامۂ شوق کے سن لو۔ (یہ واضح رہے کہ پیام معاشقہ کی ابتدا مرد کی طرف سے کی ہے)

ای از بت چین ثبات بردہ　　　صد نقب بہ سومنات بردہ
جشنیست بہ روزگار حسنت　　　دیوانہ ام از بہار حسنت
روی تو چمن بہ کار بردہ　　　رنگ از رخ نوبہار بردہ
انداختہ ساقیم بہ محفل　　　در دارو بیہشی ہلاہل
بی وصل تو زندگانیم چیست　　　صد خندۂ مرگ بر چنین زیست
دریاب کہ من ز دست رفتم　　　در پای امید پست رفتم

نل کے جواب میں دمن لکھتی ہے۔ ایک ایک لفظ غور کرنے کے قابل ہے

از من بشنو کہ در چہ کارم　　　با درد و غمت چہ کار دارم
دل خفتہ بجون و دیدہ بیدار　　　من خانہ نشین و دل بہ بازار
زنار بہ بر ز بتان عصرم　　　دریاب کہ بے درست قصرم
برمن ز جہان خروش برخاست　　　خلقے ہزار جوش برخاست
عشقت و جہان جہان ملامت　　　دیگر چہ من و کجا سلامت
از نالۂ عاشقانۂ من　　　حسرت کدہ ایست خانۂ من

من پردہ نشین و غم نشیمن　　زندانِ بلاست خانۂ من
شاہی و دولت این و آن بند　　بر تخت حدیث عشق تا چند
تو بادہ بنوش آشکارا　　خوں نابہ بیا شتاں گوارا

من پردہ نشیں الخ کو پڑھیے اور دیکھیے کہ یہ طرزِ دلنشیں نسوانی فطرت کا کس قدر سچا آئینہ ہے! سیرت (کیرکٹر) کے سلسلہ میں ایک خاص امر اور قابلِ گذارش ہے۔ وہ یہ کہ قصہ کا موضوع اور ماحصل عورت کی وفاداری دکھانا ہے اسی لیے فیضی نے ہر ہر قدم پر کیرکٹر کے اعتبار سے دمن (دمنیت) کا تفوق نل پر ثابت کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ دونوں دوسے محبت میں صادق ہیں اور دونوں اپنی قربانیوں سے اپنی صداقت کا ثبوت دے چکے ہیں۔ مگر یہ ماننا پڑے گا کہ دمن کی محبت کا پایہ بلند تر ہے۔ اسکی مشکلات اور مصائب پر غور کرو۔ وہ عورت ذات ہے۔ سوزِ عشق دل میں رکھتی ہے مگر پاس ضبط مانع اظہار ہے۔ وہ مصیبت میں اپنے شوہر کی رفاقت سے منہ نہیں موڑتی اور سخت سے سخت مشکل میں اُس کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ تنہائی میں بھی نل کی یاد اُسکی مونس ہے۔ طرح طرح کی ترغیبات اُس کے راستہ میں حائل ہوتی ہیں مگر وہ ہر ایک کو سراپا ے استحقار سے ٹھکرا دیتی ہے۔ نل کی تلاش اور خیال اُس کی روح کی غذا اور اُسکے قلب کی تسکین ہے۔ بالآخر وہ اپنے گوہر مقصود کو پالیتی ہے اور دونوں طالب ومطلوب ایک دوسرے کے وصال سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ آخر کچھ عرصہ بعد نل جہانِ فانی کو خیرباد کہتا ہے اور دمن بکمال اخلاص اُسکی لاش پر ستی ہو جاتی ہے۔

ان تمام واقعات میں اول سے آخر تک صاف نظر آرہا ہے کہ شاعر نے کس قدر کامیابی کے ساتھ دمن کے کیرکٹر کا تفوق پیش نظر رکھا ہے۔

(۲) محاکات وادائے جذبات۔ فیضی کی قوتِ محاکات کا یہ عالم ہے کہ گویا دریا اُمڈا چلا آرہا ہے۔ روانی، صفائی اور زور میں اُس کا اندازِ بیان بے نظیر ہے۔ مگر عام ایرانی لٹریچر کی طرح (برخلاف ہندی کے) اُسکے محاکات تخئیل سے لبریز، تصنع سے مملو، اور بیشتر مبہم ہوتی ہیں۔ ایک نقاد کا تلخ فرض ہے کہ شاعر کی ہر خصوصیت کی خوبیاں دکھانے کے ساتھ اُسکی خامیاں بھی واضح کردے۔ لہذا ہمیں صاف کہنا چاہیے کہ اُسکی محاکات میں جزئی اور تفصیلی نقش ونگار کی تلاش بے سود ہے۔ اور یہ ایسا عیب ہے کہ اس میں فیضی ہی منفرد نہیں بلکہ ایران کے اکثر اساتذہ اُسکے شریکِ غالب ہیں۔

محاکات کی تمثیل میں نل دمن کے ذیل کے اشعار جن میں عشق کی حقیقت بیان کی گئی ہے پڑھنے کے قابل ہیں

حرفِ شبِ عاشقاں درازست — افسانۂ عشق جانگدازست
حسن آمد و بر جہاں صلا زد — عشق آمد و صد درِ بلا زد
عشق است سرِ سبو کشادہ — معشوق پیالۂ حسن بادہ
این شعلہ بلند گرم خیزاست — زنجاست کہ آفتاب تیزاست

مثنوی مذکور میں کئی جگہ عشق کی حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور داد نازکخیالی دی گئی ہے مگر حق یہ ہے کہ اسکو محاکات کے بجائے تخئیل کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ ایک موقع پر نل سے ایک مصاحب حُسن دمن کی غائبانہ تعریف بیان کرتا ہے جو کسی قدر زیادہ صاف اور نیچرل ہے۔

رنگیں چمنے ست روزگارت — گلہاست شگفتہ در بہارت
در خاکِ دکن کہ فتنہ خیزاست — امروز دکانِ فتنہ تیزاست
جادو صنمے صنم فریبے — نگذاشتہ در جہاں شکیبے
تنہا نہ ہند چشم مستش — ہندی صنماں صنم پرستش
صد برہمنش بجوں نشستہ — در بتکدہ بت بہت شکستہ
آتش زن سومنات قصرش — زنار گسل بتان عصرش
صد شعبدہ جلوہ ریزِ راہش — صد زلزلہ گرد جلوہ گاہش
شمشیر گرِ نگاہ خونی — سوہان زن آتش درونی
بر خندہ نمک براءت کردہ — از سحر نمک نبات کردہ
محبوبۂ ملکِ ناشکیباں — اعجوبہ شہر دلفریباں
صد صندل تر بجوئ تازہ — مالیدہ چو گل بجائے غازہ
شاہنشہِ غمزہ فوج در فوج — طوفان و کرشمہ موج در موج

دمن کے زاہد فریب حُسن کا موازنہ نل کے مردانہ حُسن سے کیجیے تو نہایت پُر لطف فرق نظر آئیگا۔

حُسنے و بہار دلفریبے — عشقے و جہان ناشکیبے
سیمیں بت و بت پرست ماہے — صد بتکدہ زیر ہر نگاہے
بالا چو سنانِ آب دادہ — ابرو چو کمند تاب دادہ

هم خیل سپاه بیکرانش   هم لشکر دل جهان جهانش

نل جسوقت سوئمبر کی شرکت کے لیے روانہ ہوا ہے اُس کے موکب اجلال کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے

از خط اُجین تا به بیدر   انباشته شد به زر و گوهر
دریا دریا ز عنبر تر   صحرا صحرا بمشک اذفر
گلبوے عبیر پرنیان سنج   پر ورده سبد هزار نارنج
آں دشت که صد چمن رواں داشت   خرمن خرمن ز زعفران داشت
از صندل و عود بسته بسته   وز لنبد و لعل دسته دسته
اکسون و پرند رنگ در رنگ   سنجاب و سمور تنگ در تنگ
ناهید تنان به پرده داری   بنشسته به هودج عماری
از خیمه چمن چمن دران دشت   کاندیشه در او رود به گلگشت

اوپر کے اشعار سے اندازہ ہوا ہوگا کہ فیضی جب تخیل اور آورد سے علحدہ ہوکر محاکات کا قصد کرتا ہے تو موقع کی تصویر کھینچ کر رکھ دیتا ہے - اور یہی بیان کی خوبی اور محاکات کا آرٹ ہے

جذبات کے بارے میں ہم بے تامل دعویٰ کر سکتے ہیں کہ اس میدان میں بھی وہ ایران کے کسی اُستاد سے پیچھے نہیں ہے - ملاحظہ کیجیے ۔ نل سب سے پہلے ایک ندیم سے دمن کے عالم سوز حسن کا ذکر سنتا ہے تو اُس پر کیا قیامت گذرتی ہے

اے همنفس این چه داستان بود   دیں گرد که ام آستان بود
گر یک گره مرا کشودی   چندین گره دگر فزودی
بر درد غم دل بلا کش من   آتش چه زدی بر آتش من
یاقوت ز دیده ام فشاندی   الماس به سینه ام نشاندی
بر دیده در بلا کشادی   بر فتنه صلاے عام دادی

دمن کی ماں اپنی پیاری بیٹی کو سمجھاتی ہے اور اسکی آشفتگی کا سبب پوچھتی ہے

آن مادر مهربان که دانی   برخواند فسون مهربانی
کاے تازه نهال نوبهاری   در سر ز تو چیست بیقراری
دیدی به رهے اگر پری را   در کار کنم فسونگری را

کہیں کہیں تصنع سے بھی کام لیا ہے۔ مثلاً ماں کا بیٹی سے کہنا

آشفتہ چنیں چراست خویت آشفتگی ایں نہ بس بویت
چوں غنچہ مپیچ خویشتن را تنگی بگذار پیرہن را

اس کے برخلاف باپ کا بیٹی کی محبت کے باوجود پاس ناموس سے برہم ہونا مردکی فطرت کی کتنی صحیح تصویر ہے۔

کے داشتم ایں گماں کہ درگشت از بام فلک بیفتدم طشت
اکنوں کہ فتاد شیشہ از طاق زد طبل ملامت من آفاق
ہیہات زہے محال کامی دیگر من و نام نیکنامی

علامہ شبلی کا خیال ہے کہ خواجہ حافظ کی طرح فیضی کا کلام بھی سوزوگداز کے جذبات سے یکسر خالی ہے۔ جو آخر الذکر کی علمی سرگرمی کا نتیجہ ہے۔ یہ خیال بہت زیادہ حد تک درست ہے۔ اگرچہ فیضی نے کہیں کہیں یاس و غم اور ناپائداری عالم کے مضامین خوب باندھے ہیں مگر جو چیز اُس کے کلام میں زیادہ نمایاں ہے وہ درد و غم نہیں بلکہ ولولہ اور رجائیت ہے۔ جسکو ہم آگے چل کر عرض کریں گے۔

(۳) تخئیل کی رفعت اور تشبیہ و استعارہ کی لطافت۔ یہ منجملہ اُن خصائص کے ہے جن میں فیضی نے ہند و عجم میں نام پایا اور کوس دارائی بجایا ہے۔ نہ صرف معاصرین بلکہ قدما میں کم ایسے باکمال نکلیں گے جو تخئیل کی فراوانی اور تشبیہ و استعارہ کی رنگینی میں اُسکے ساتھ میل سکے ہوں۔ حقیقت میں اگر اُسکی مثنوی میں اس کے سوا اور محاسن نہ ہوتے تو بھی صرف یہی خصوصیت اُسکے کلام کا کمال دکھانے اور اُس کے شعر کو سحر حلال قرار دینے کو کافی تھی۔ ذیل کی مثالیں ملاحظہ ہوں

حمد میں انسان کی عاجزی اور معرفت الہی سے اُسکی کوتاہی پرانے خیالات ہیں، مگر فیضی کس خوبی سے بیان کرتا ہے

توحید تو ہر کہ راند بر قیل بر مورچہ زد عماری پیل
پروانہ خس و ہوا شرربار پرواز چہ گل کند دریں کار
ہیہات مگو نہ سرکشد کس رہ بردم تیغ و پاے از خس
ہم پاشنہ ریش و ہم کف آماس چوں پاے نہم بدشت الماس

بعض ملکوں میں دستور تھا کہ مسافر یا مجرم سرکاری کارندوں سے بچنے کے لیے اپنے گھوڑوں کے نعل اُلٹے لگاتے تھے تاکہ سراغ لگانے والے دھوکے میں پڑ جائیں۔ فیضی نے یہ خیال ظاہر کرنے کے لیے کہ کنہ الٰہی نے اپنے اسرار مخفی رکھنے کے غرض سے انسان کو دھوکے میں مبتلا کر رکھا ہے "نعل واژگونہ" کی تمثیل استعمال کی ہے۔ یقیناً یہ نادر تشبیہ اس کی قوتِ متخیلہ کا کمال پرداز ہے اور اس کی نظیر فارسی یا عربی شاعری میں عاجز کی نظر سے نہیں گذری

آں نقش کہ دانیش نمونہ کنہش زدہ نعل واژگونہ

اسکے حقائق پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ہم نے باری تعالیٰ کی ذات و صفات کی نسبت جو تخیلات باندھ رکھے ہیں وہ اصلاً کیا ہیں؟ کیا اُسکی صحیح حقیقت پر اُن سے روشنی پڑتی ہے۔ حاشا۔ بلکہ وہ ہمارے ذہن کے اختراعات ہیں۔ سبحانہٗ عما یصفون۔ ہم خدا کے عدل۔ رحم۔ علم۔ قدرت پر اعتماد رکھتے ہیں مگر اُس لامتناہی ذات کے لامتناہی صفات کا قیاس کرنے کے لیے مخلوق کی تناہی صفات سے مدد لیتے ہیں جن کا ہم کو تجربہ ہے۔ لیکن کیا اسکو صفات باری کا صحیح ادراک کہہ سکتے ہیں؟

ایک موقع پر علم ظاہر کے بیہودہ ہونے کی جو تمثیلیں اُس نے پیش کی ہیں ملاحظہ ہوں:۔

آنکس کہ بجست از کتابش پیچیدہ ورق ورق حجابش
تو بردہ بخط گمان نفعے واں خود ہمہ عقربست وافعے
اے سادہ زخط مباش غافل کیں مورچہ خورد جوہر دل
آئینہ ز نقش سادہ باید کاں سادہ عذار رو نماید

تشبیہات و استعارات کی رنگینی اور نزاکت کا اندازہ کرنے کے لیے وہ اشعار کرر پڑھو جو چمن کے حسن کی تعریف میں اوپر گذرے۔ چند اشعار جن میں خاک ہند کی عشق خیزی بیان کی ہے سننے کے قابل ہیں

ایں شعلہ چراغ ہر خسے نیست ایں رشتہ بدست ہر کسے نیست
ایں بادہ مجو ز بزم ہر کس کیں نشہ بہند باشد و بس
ہند ست و ہزار عالم عشق ہند ست و جہاں جہاں غم عشق
خاکش ہمہ ذرہ ذرہ مہر ست ہر ذرہ چراغ نہ سپہر ست
ہندی عنمانِ آتشیں خوے آتش نگناں بہر بن موے

زاں غمزہ کہ در خرام کردہ　　صد زلزلۂ فتنہ وام کردہ

(۴) جوشِ بیاں اور رجائیت[۱] - یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہ ہوگا کہ جوشِ بیان اور سرمستیِ ادا میں فیضی کی نل دمن کا درجہ اس قدر بلند ہے کہ امیر خسرو اور مولانا نظامی بھی برابری نہیں کر سکتے - اِن دونوں بزرگوں کے کمالِ فن کا جو منکر ہو وہ شاعری کے مذہب کی رو سے کافر - مگر بہ قولِ شخصے انصاف شیوہ ایست کہ بالاے طاعت است - لیلیٰ مجنوں نظامی اور مجنوں لیلیٰ خسرو کو پڑھیے اور فیصلہ کیجیے کہ یہ جوشِ بیان اُنکے یہاں ہے یا نہیں - علامہ شبلی مرحوم نے سچ کہا ہے کہ فیضی کا جوشِ بیان حافظ و عرفی سے برتر ہے - یہ واقعہ ہے کہ اسکے کلام میں سرمستی اور جوشِ بیان کا وہ زور ہے گویا دریا کا سیلاب اُمڈا چلا آرہا ہے - زیادہ تفصیل کے بجاے ہم تمثیل پر اکتفا کریں گے - جس موقع پر شاہی نقیب اس کی طلبی کے لیے آتا ہے اُس کے فخر و مسرت کی حد نہیں رہتی - جب اُسکو معلوم ہوتا ہے کہ سلطانی نوازشیں اُس کے حال پر مبذول ہیں وہ اپنا کلاہ گوشۂ افتخار کج کرتا ہے اور خوشی سے جامہ میں نہیں سماتا - کون سلطان - جو اُسکا مربی، محسن اور منعم ہی نہیں بلکہ اُسکی جان، مال، عزت ہر چیز کی حفاظت کا کفیل ہے - اُس کا مرجع امید اور مرکزِ تمنا ہے - ظاہر ہے کہ اس حالت میں وہ کیا کچھ جوش اور فخر کے جذبات سے بیکیف نہ ہوگا - ملاحظہ ہو -

یعنی کہ نقیبِ بارگاہی　　آورد نویدِ پادشاہی
برخیز کہ یاد کرد بختت　　شہ خواند بہ پایگاہِ تختت
برخاستم از زمیں فلک تاز　　برخاستہ مو بمو بہ پرواز
پا از مژہ چوں برہ کشادم　　بر ہر مژہ منتے نہادم
چشمے کہ برہ گذار کردم　　چشم دگرش نثار کردم

. . . .

زیں در بگذشتہ پیش رفتم　　وانجا نفسے ز خویش رفتم
بگذشتم ازیں دراِ ادب نیز　　کونین گذاشتہ بہ دہلیز
دیدم دو جہاں بیک جہاں در　　صد عمر ابد بیک زباں در
چوں ذرہ ز مینیاں گسستم　　نزدیک بہ آسماں نشستم
دل بود و جریدہ بارگی بود　　ہر مو بہ تنم نظارگی بود

[۱] رجائیت —— optimism

گفت اے ہمت ز شبنم ما / جادو گر آتشیں دم ما
از دل شررے بدم درافگن / آتش بہ نے قلم درافگن
نو ساز فسانۂ کہن را / عشق نل و خوبی دمن را

دربار میں حاضر ہونے کے جو کیفیت بیان کی ہے (زیں در گذشتہ الخ) اُسکا جوش محتاج تعریف نہیں انکے بعد کچھ فخریہ اشعار لکھے ہیں جنکی بلند آہنگی ایک ایک قدم پر آسمان سے باتیں کر رہی ہے:-

امروز نہ شاعرم حکیم / دانندۂ حادث و قدیم
کلکم بہ نقاط جزو و کل بیں / یک نخل بعد ہزار گل بیں
سوگند بمنظر الٰہی / یعنی بجمال پادشاہی
کیں شیشہ نہادہ ام براں طاق / کانجا نرسید دست عشاق
گفتم سخنے دریں سخن نیست / کانجا کہ منم مقام من نیست
دریاب کہ از فلک رہا چند / بگذشتہ ام ستارۂ چند

دوسرے موقع پر یہی لے اور زیادہ اونچی ہو جاتی ہے۔ سننے کے قابل ہے

شاہنشاہا خسرو پژوہا / دریا گہرا فلک شکوہا
بزمیست جہاں بعیش پیوست / دور تو شراب و آسماں مست
من مطرب ساز پردہ خونی / کلکم بہ نوائے ارغنونی
زیں بزم کہ عشرتِ تو ساقیست / گر من بروم ترانہ باقیست
امروز بایں نوائے چوں شہد / من باربدم تو خسروِ عہد
ترکیب طلسم تو انیم بیں / وال خدمت جاودانیم بیں
زیں پردہ کہ نسج آسماں بافت / بخت تو طرازِ جاوداں یافت
پیراستہ ام معانیِ بکر / در گنجۂ طبع و دہلی فکر
ایں کار نہ صنعت و کار ہر کس نیست / اندازۂ اختیار کس نیست
بگداختہ ام دل و زباں را / کیں نقش نمودہ ام جہاں را
ہم با امرا نظیر گشتم / ہم با شعرا امیر گشتم
فخر الحکما خط جبینم / ختم الشعرا گل نگینم
طرز دگراں وداع کردم / طرز دگر اختراع کردم

اس کے فخریہ کے جواب میں مثنوی نشانی (مولانا احمد علی شہرت دہلوی) کے چند فخریہ اشعار بھی پڑھیے اور انصاف کیجیے کجا فیضی کجا نشانی۔ مولانا کا زورِ قلم یقیناً مسلم، مگر وہ جوش اور روانی کہاں؟

چند زنی لاف کہ در ساحری ساحریم ساحریم ساحری
خسرو ملکِ ہمہ دانی منم حاکم اقلیم معانی منم
جوہری سلک سخن دانیم صیرفی نقد سخن رانیم
دعوی اعجاز معانی مکن شمع مدہ چرب زبانی مکن
خانہ کہ از نظم بیاراستی آب و گلش از دگراں خواستی
گر خضری آبِ حیاتِ تو کو ور شکری شاخِ نباتِ تو کو
ساحریم من کہ بزور فسوں لعبتے از سحر بر آرم بروں
غلغلہ در زہرہ و ماہ افگنم نسخۂ ہاروت بہ چاہ افگنم
ساحراں در گروِ موے من بابلیاں در چہ جادوے من

فخریہ میں سرمستی اور رجائیت اور عشقیہ میں رنگینی اور لطافت لازمی ہیں اور ظاہر ہے کہ فیضی اس تفاوت کے نکتہ کو ہمیشہ ملحوظ رکھتا تھا۔

(۵) جدت اسلوب اور قدرت زباں۔ زورِ بیان اور روانی کلام کے علاوہ جن کی چند مثالیں اوپر گذریں۔ اُس کا پایہ جدت ادا اور حُسنِ ترکیب وغیرہ کے اعتبار سے بھی اہل زباں سے کم نہیں۔ ایک بات کو متعدد، متنوع اور دلکش پیرایوں میں ادا کرنا اُس کے کلام کا مایۂ ناز وصف ہے۔ یہ بیان کرنا ہے کہ راجہ کے دل میں عشق کی خلش پیدا ہوتی ہے، مگر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس کا باعث کیا ہے۔ اسکو اس طریقہ سے لکھتا ہے

آگہ نہ کہ گردِ دامن کیست وین غنچہ زخارِ گلشن کیست
در جیبِ گلش کہ ایں خسک ریخت در زخمِ دلش کہ ایں نمک ریخت
آتش کہ بہ سقفِ خانہ در زد وین فتنہ ز دامنِ کہ سر زد
ایں صبر و شکیب خستۂ کیست وین شیشہ برہ شکستۂ کیست
ایں فتنہ بجونِ من کہ سر داد ایں دارو بیہشی کہ در داد
ایں شعلہ ز آب و شنۂ کیست ایں دیدۂ خشک تشنۂ کیست

دامن کا تابان عصر میں متاثر ہونا کس ندرت کے ساتھ ادا کیا ہے

آتش زن سومنات قصرش زنارگسل بتانِ عصرش
معبد بہ ہمنش بجوں نشستہ در بتکدہ بت بہ بت شکستہ

"عشق اول دردلِ معشوق پیدا می شود" کو کس کس طریقہ سے بیان کرتا ہے - ملاحظہ ہو

عاشق جرسے کہ بر فغان بست معشوق ہمان جرس بجان رفت
عاشق قدحے کہ در جگر زد معشوق ہمان قدح بسر زد

یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ بادشاہ کے قرب میں پہونچکر فخر و خوشی سے اپنے آپنے میں نہ رہا - اسکا اسلوب ادا کس قدر نادر اور پُر زور ہے

پیوند ز مینیاں گسستم نزدیک بہ آسماں نشستم

علاوہ بریں اُس نے بعض تراکیب جو اُس کی مخصوص تراکیب ہیں اس خوبی سے صرف کی ہیں جس سے اُس کی اُستادی اور قادرالکلامی کی بین شہادت ملتی ہے - مثلاً

بمورچہ عماری فیل زدن - کوس برلب ودال زدن - فرگان گسل - نظر گداز - اندیشہ زدائے پیش بنیاں - ذرہ گل خیز - قطرہ لب ریز - شاہد اقدسی عمامہ - آداب پسیں - موج اول - بیجاب تو ہم بساط افلاک - مشعل نہ پیشگاہ اقرار - آتش زنِ دہ دامان انکار - مطلع اول سباعی - مصرع آخر باقی - شمشیر گر نگاہ خونی - سوہان زن آتش درونی - آئینہ بست خود پرستی - وغیرہ وغیرہ

(٦) فلسفہ و اخلاق - یہ امر حیرت انگیز ہے کہ باوجود ایک متبحر فلسفی ہونے کے اُس نے مثنوی میں فلسفہ و اخلاق کا عنصر کم رکھا ہے - اس سے یہ مراد نہیں کہ اُس کی مثنوی میں بداخلاقی کے مضامین ہیں (بلکہ سوائے ایک آدھ موقع کے نل دمن کا پیرایہ نہایت شایستہ اور مہذب ہے) مراد یہ ہے کہ اُس نے شاید عشقیہ مثنوی کو فلسفیانہ بحث کے لیے عمداً موزوں خیال نہیں کیا - پھر بھی جو کچھ لکھا ہے بہت غنیمت ہے - ایک درویش (سادھو) اس طرح راجہ نل کو نصیحت کرتا ہے

ملک تو عجب کشیدہ خوانیست بر خوانِ تو خانِ میہما نیست
از دادۂ ایزدی بروں دہ او داد فزوں تو ہم فزوں دہ
چوں کوس زنی ببام درگاہ یاد آر ز نالۂ سحرگاہ
با غیر کن آں ترانہ سنجی کز غیر چو بشنوی نہ رنجی

غور کرو "کز غیر چو بشنوی نہ رنجی" علم اخلاق کا کس قدر زریں اصول ہے - اور جیسا پیشتر صحیح تھا اب بھی صحیح ہے - فیضی ایک موقع پر عشق کی ماہیت اور فلسفہ بیان کرتے ہوئے تصوف کی سرحد

تک پہونچ گیا ہے

این عشق مگو که در رگ و پوست　　　راهیست نهفته تا در دوست

بی بانگ و صداست این چغانه　　　عشق ست که می زند ترانه

عشقے بپذیر جاودانی　　　کو ماند اگر تو خود نمانی

دوسرے موقع پر یہی رنگ ذرا زیادہ گہرا ہوگیا ہے

دریاب که عشق ترک هستی ست　　　نے شیوۂ کام بد پرستی ست

چوں دیدہ ز صورتت ببستم　　　وقتے ست کہ معنیت پرستم

مضمون زیادہ طویل ہوجائے گا اگر نل دمن کے تمام محاسن کی تفصیل اور دوسرے اساتذہ کی عشقیہ مثنویوں سے اس کا موازنہ کیا جائے۔ صرف چند سطور لکھنے کے بعد ہم مضمون کو ختم کرتے اور اپنی لغزشوں اور نقائص کی طوالت کے لیے حضرات قارئین سے معذرت خواہ ہوتے ہیں۔

نل دمن کے متعلق آخری فیصلہ

فارسی ادب میں مثنوی مذکور کا جو درجہ ہے اُس کا اب ہم آسانی سے اندازہ کرسکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ اسکے متعلق البدایونی کا مندرجۂ عنوان ریمارک بالکل واقعیت پر مبنی ہے۔ البدایونی نے پوری جرأت سے کام لیکر فیضی کی سیرت اور اس کے عقائد اور عام کلام کی نسبت نہایت معاندانہ رائے ظاہر کی ہے مگر مثنوی کی بابت کمال صداقت سے مُلّا کو اعتراف کرنا پڑا ہے کہ امیر خسرو کے بعد اس کا نظیر نہ ہوسکا۔ الفضل ما شہدت بہ الاعداءُ۔ مولانا شبلی نعمانی ہندوستان میں فارسی شاعری کے صرف دو رُکن قرار دیتے ہیں خسرو اور فیضی۔ اور فیضی کو مثنوی کا استاد قرار دیتے ہیں۔ آزاد دہلوی کا فیصلہ آپ پڑھ چکے کہ وہ نل دمن کو فیضی کی شاہکار تصنیف قرار دیتے ہیں۔
اہل عجم کی ناتواں بینی مشہور ہے۔ وہ ارض ہند کی بدولت خاک سے اکسیر بن جاتے ہیں مگر نہایت دیدہ دلیری اور محسن کُشی کے ساتھ اہل ہند ہی کو گالیاں سناتے ہیں۔ ہندوستان کے باکمالوں کے کمال کا اقرار کرنا انکی توہین ہے۔ حد ہوگئی کہ خسرو جیسا خسرو ملک سخن بھی اُنکے حملوں سے محفوظ نہ رہ سکا۔ ایک کہتا ہے "خسروست وہیں دوازدہ بیت"۔ دوسرا کہتا ہے "خانۂ شعر نظامی تاراج کردۂ خسروست"۔ تیسرے فرماتے ہیں

"کفش بود زاں گونہ گوہر تہی　　　زرش ساخت لیکن زر دہ دہی"

جب یہ حال ہو تو فیضی کیسے بچ سکتا تھا۔ وانہٗ دغستانی فیضی کے کمال سے تو انکار نہ کرسکا مگر اسد رے تعصب، اُسکو اہل ایمان ہی کا فیض یافتہ قرار دیا۔ لکھتا ہے کہ چاشنی و عذوبتے کہ در کلام شیخ فیضی یافتہ می شود از فیض اثر صحبت خواجہ حسین ثنائی ست"۔ واضح رہے کہ یہ خواجہ حسین ثنائی وہی بزرگ ہیں جن کی بابت البدایونی کا قول ہے" عامی بے مادہ بود۔ عبارات و قافیہ قصیدہائے لبہ او نمی کند۔ ہماں مثل است کہ

فانوشاں لبند و ہمت پست ‎ ‎ ‎ یارب ایں ہردو را برابر کن"

ظاہر ہے کہ اسکو پڑھنے کے بعد وآلہ کے ریمارک کی کیا وقعت رہ جاتی ہے۔ لیکن باغ میں جہاں خار ہیں وہاں گل بھی ہیں۔ بعض منصف مزاج ناقدانِ عجم فیضی کے علوِ کمال اور قدرت کلام کے نہایت بلند آہنگی کے ساتھ مقر ہیں۔ امین احمد رازی صاحب ہفت اقلیم لکھتے ہیں "فیضی عربیت و حکمت را بیشتر تتبع کردہ و در انشا و انبساط طبع و مکارم اخلاق بے ہمتا ست"۔ علی نقی کا قطعہ ماخذ ہو جسکا ایک شعر یہ ہے

کیم یا او رسد در شاعری دعوائے ہم چشمی ‎ ‎ ‎ کہ در ایں خانقاہم من مرید اوست پیر من

صائب ایک غزل میں اس کی تقلید کرتا ہے اور آخر میں لکھتا ہے

ایں آں غزل کہ فیضی شیریں کلام گفت ‎ ‎ ‎ در دیدہ دام تعلیدہ و در دل نشستہ

ان شہادتوں کے بعد فیضی اور اسکے کلام کی نسبت زیادہ کہنے کی گنجایش باقی نہیں رہتی۔

فبای حدیث بعدہ یومنون

ضیاء احمد البدایونی (ایم اے)

بہت بے اختیار اس بلِ ناشاد کا دل ہے ‎ ‎ ‎ ہم آنکھوں میں ہے انکا، حسرت دیدار قاتل ہے
فغانِ اہلِ زنداں کو اگر تاثیر حاصل ہے ‎ ‎ ‎ تو اک دن دیکھنا یہ سر ہے اور شمشیر قاتل ہے
فراقِ یار میں ملتی ہے لذت وصل جاناں کی ‎ ‎ ‎ خیالِ دوست سے خلوت میں بھی آباد محفل ہے
قفس کو پھونکدے جس روز چاہے اپنے نالہ میں ‎ ‎ ‎ دلِ سوزاں کو اے صیاد یہ قدرت بھی حاصل ہے
اُٹھیں گے داغِ حسرت لیکے ہم گلزار ہستی سے ‎ ‎ ‎ یہی اک پھول اس گلشن سے لیجانے کے قابل ہے

توقع رحم کی بیجا ہے اے سید کہ مقتل میں
نگاہِ حسرت آگیں بھی ستم افزائے قاتل ہے
سید حسین بی اے (علیگ)

"میں اور میرا ایک رفیق کُتا"

(ترجمہ از ترجینو)

ایک روز جبکہ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی باہر ہوا کے تند و تیز جھونکوں، بجلی کی چمک اور بادل کی کڑک نے ایک عجیب وحشت ناک منظر پیدا کر رکھا تھا۔ میں تنہا کمرے میں بیٹھا ہوا ہوں اور میرے قریب میرا رفیق کُتا ہے۔

یہ بالکل میرے مقابل بیٹھا ہوا ٹکٹکی باندھے مجھے بغور دیکھ رہا ہے۔ میں خود بھی اسے گہری نظروں سے دیکھ رہا ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ مجھ سے بولنے ہی چاہتا ہے۔ مگر آہ وہ بے زبان ہے۔ اظہار مطلب کے لیے اُسکے پاس الفاظ کا ذخیرہ نہیں، وہ نافہم ہے مگر مجھے اُس کے احساسات کا کافی اندازہ ہے۔

میں محسوس کر رہا ہوں کہ اس وقت میرے اور اُس کے دل میں ایک ہی قسم کے خیالات موجزن ہیں کہ "ہم دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ ہم دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ اور ہم میں سے ہر ایک میں وہی ایک بھڑکتا ہوا شعلہ روشن ہے۔

"موت اپنے وسیع بازو کی ایک ذرا سی جنبش سے ہمارا وجود درہم و برہم کر دیتی ہے بس یہی ہمارا اختتام ہے"........

اس کے بعد پھر بھلا کون تمیز کر سکتا ہے کہ ہمارے قلب کس نور سے منور تھے اور اسکے یہاں کون سا نور ضو فشاں تھا۔

نہیں! نہیں ہم ایک دوسرے کو بحیثیت ایک انسان اور حیوانِ مطلق کے نہیں دیکھ رہے ہیں......... بلکہ یہ آنکھیں دو ہم رتبہ اور مساوی لوگوں کی آنکھیں ہیں۔ یہی وہ آنکھیں ہیں جنھوں نے ایک دوسرے کو آپس میں بالکل ملا دیا ہے۔ اور ہر دو حیوان مطلق اور انسان کی زندگی حالتِ خوف میں ایک دوسرے سے بالکل مخلوط ہو جاتی ہے"......

حکیم الدین علوی

قدیم اُردو شاعری کے لطائف

قدیم شاعری میں بہتیرے ایسے محاورات دیکھنے میں آتے ہیں جو آجکل صفحۂ ہستی سے بالکل معدوم ہیں۔ اُس زمانہ کی شاعری میں ہندی کے الفاظ اور محاورات بہت مروج تھے آج کل وہ کان کو ابکھے معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے ایک لغت میں بہتیرے ایسے محاورات دیکھے۔ یہ لغت اُردو سے انگریزی کا ہے ۱۸۱۵ء کا مطبوعہ ہے اور شکسپیر کا مرتبہ ہے۔ اس میں صرف اُردو کے تقریباً ۸۰۰۰۰ الفاظ ہیں۔ اور جابجا اشعار بھی مندرج ہیں۔ زیادہ تر میر تقی کے اشعار نقل ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اُس زمانہ میں میر سے لوگوں کو کتنی عقیدت تھی۔ مندرجۂ ذیل اشعار قابل تذکرہ ہیں :-

(۱) لفظ سانگ کا استعمال

بن جو کچھ بن سکے جوانی میں — رات تھوڑی ہے اور بہت ہے سانگ (میرؔ)

(۲) شاخسانے

شاخسانے ہزار نکلیں گے — جو گیا اُسکی زلف کا یکتار (")

(۳) شاخِ زعفران

تازہ چمن وہی ہے بلبل سے گو خزاں ہے — ٹہنی جو زرد بھی ہے سو شاخِ زعفران ہے (")

(۴) عقل کو عشق ہونا :-

عشق اُنکی عقل کو ہے جو ماسوا ہمارے — ناچیز جانتے ہیں نابود جانتے ہیں (")

(۵) گھر ہونا :-

دُنیا کی نہ کر تو خواستگاری — اس سے کبھی بہرہ ور نہ ہوگا
آ، خانہ خرابی اپنی مت کر — قحبہ ہے یہ اس سے گھر نہ ہوگا (")

(۶) لالے پڑنا :-

اس اسیری کے نہ کوئی اے صبا پالے پڑے — اک نظر گل دیکھنے کے بھی ہمیں لالے پڑے (")

(۷) لفظ "لپکا" کا استعمال :-

اپنی تو جہاں آنکھ لڑی پھر وہیں دیکھو — آئینہ کو لپکا ہے پریشان نظری کا (")

(۸) مُنہ دکھانا :-

وصل میں رنگ اُڑ گیا میرا کیا جدائی کو منہ دکھاؤں گا (میر)

(۹) منہ سے پھول جھڑنا :

گالیاں دے کے اب بگڑتے ہیں واہ کیا منہ سے پھول جھڑتے ہیں (〃)

(۱۰) ہوتا رہے گا :-

تو یوں گالیاں غیر کو شوق سے دے ہمیں کچھ کہے گا تو ہوتا رہے گا (〃)

(۱۱) تجنیس خطی :-

یہ نہ ہو دریا کہ جس سے گذریے پُل باندھکر موجِ چشمِ عاشقاں دے توڑ پل میں پل کے پُل (سودا)

(۱۲) سہرنا :-

گیا جو پوس پہونچیا ماگھو سہر یہ لگے جاڑا بدن اوے سہر کر (نامعلوم)

(۱۳) طوطی سے ہونٹھ مل ڈالنا :-

بولا نکر لے یار تو ہر اک سے بگڑ کر مل ڈالے گا طوطی سے کوئی ہونٹھ پکڑ کر (نامعلوم)

(۱۴) طوفان ہونا :

اشک گلگوں جیب دداماں پہ مرے غلطاں ہیں
اس زمانے کے تو لڑکے بھی کوئی طوفاں ہیں (ہدایت)

(۱۵) تجھ رُو :

تجھ رُو میں لطف ہے سو ماہ کو خبر نہیں خورشید کیا ہے اسکی نالک کو خبر نہیں (افضل جھنجھانوی)

(۱۶) کڑاہاں میں غلیلا لگانا :

بیٹھے اگر خوشی سے آ کر چمن میں بلبل کڑاہاں میں غلیلا ایسا لگے کہ اُڑ جائے (سجاد)

(۱۷) گھر بیٹھنا :-

جس سمت کو تو نے آنکھ اُٹھا کر دیکھا مانندِ حباب گھر کے گھر بیٹھ گئے (میر درد)

(۱۸) پائیں بہنی پاتوں :-

نہ تو یو جھیں لال جھجکر اور نہ یو بجھے کو سئے
پائیں چلی باندھ کر مت ہرنا کو دا ہوئے (نامعلوم)

(۱۹) دانت نکالنا :- (مستزاد)

نین سوز عبث دیکھ کے حیران ہوگا خوباں کا جمال
دل زلف میں اُلجھے گا پریشاں ہوگا مت لے یہ وبال
یہ چال بُری ہے تجھ سے نبھنے کی نہیں آ مان کہا
کیا ہنستا ہے تو بہت پشیماں ہوگا مت دانت نکال

(۲۰) موج مارنا :-

سیلِ سرشک اپنا جب سرا موج مارے طوفانِ نوح بیٹھا گوشہ میں موج مارے (محمد بقا)

(۲۱) میں خوش مرا خدا خوش :-

گر ناخوشی سے میرے ہوتا ہے جی ترا خوش
جس میں تری خوشی ہو میں خوش مرا خدا خوش (نامعلوم)

(۲۲) نام دھرنا اور "ناشاعر" :-

کبھی بولیں عقیق اور گہ نگینِ لعل ٹھہراویں یہ ناشاعر ترے ہونٹوں کو کیا کیا نام دھرتے ہیں (نامعلوم)

(۲۳) ہاتھ اُٹھا :-

ہاتھ اُٹھا ظلم اور جفا سے تو یہی گویا سلام ہے تیرا (یکرنگ)

(۲۴) دل پر ہاتھ کا دھرا رہنا اور "سو" کا استعمال :-

چاہو جو چھینو دست حنا بستہ سے یہ دل ایسا سو دل کسی کا دھرا ہاتھ پر نہیں (تپش)

(۲۵) منہ لے کے رہ جانا :-

دیکھا جو اُسکے چشم و دہن کو تو شرم سے منہ لیکے اپنا پستہ و بادام رہ گئے (نامعلوم)

(۲۶) لفظ ہار بمعنی والا

بہار آئی، نہ دیکھن ہار آیا انار آیا، نہ چاکھن ہار آیا (")

قاضی محمد فرید

صاحب مضمون نے انتخاب میں کافی احتیاط ملحوظ نہیں رکھی اور اُن الفاظ، ترکیبوں اور محاوروں کی مثالیں بھی لکھدیں جو اَب بھی رائج ہیں اور صحیح مانے جاتے ہیں۔ کہیں کہیں نقل بھی مطابق اصل نہیں معلوم ہوتی ہے ممکن ہے کہ خود شاعر سے سہو ہوا ہو یا شیکپیر صاحب کو صحیح فقرہ نہ ملا ہو۔ ایڈیٹر

سر سید احمد خاں مرحوم

(سید سجاد حیدر یلدرم بی اے علیگ)

(۱)

دور دل سے اب خیالِ زحمت و آلام کر   کوثر و تسنیم سے شیریں دہن و کام کر
واسطہ اللہ کا اس وقت اتنا کام کر   جانشینوں کو ذرا تفہیم کر افہام کر
خوب محنت کر چکا آرام کر آرام کر

(۲)

مشکلوں کا ہم پہ گر باراں ہے تو تجھکو کیا   قالبِ قومی اگر بے جان ہے تو تجھکو کیا
ایک عالم ششدر و حیران ہے تو تجھکو کیا   خانہ جنگی کا اگر سامان ہے تو تجھکو کیا
گر قیامت ہو یہاں برپا تو تجھکو کیا خبر

(۳)

اب مسلمانوں میں ایسا درد والا کون ہے   ملتِ اسلام کا شیدا و والا کون ہے
بہتری کا جس نے ایسا ڈھنگ ڈالا کون ہے   اپنے سر پر بار کا یوں لینے والا کون ہے
کون ہے جو دے دعا و شام دیں اُسکو اگر

(۴)

رحمتیں تجھ پر کہ تو اب کام اپنا کر چکا   کام اپنا کر چکا اور نام اپنا کر چکا
اپنے ہمعصروں سے اونچا بام اپنا کر چکا   کلفتیں بھی سب سہیں آرام اپنا کر چکا
تیری روحِ پاک پر ہو حق کی رحمت کا گذر

مشیر احمد علوی (مرسلہ)
بی اے (علیگ)

۲۸ مارچ سنہ ۲۹ء

---

* یہ نظم سرسید کی برسی کے موقع پر علیگڈھ میں پڑھی گئی تھی۔ ایڈیٹر

مسلم یونیورسٹی کی حالتِ زار

(سلسلۂ ماہِ گذشتہ)

صاحبزادہ صاحب نے یونیورسٹی کی جن بدنظمیوں پر توجہ دلائی ہے اُن میں اساتذہ کی کونسلوں میں شرکت کا معاملہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ الناظر بابت فروری و مارچ کے صفحات ۷۷ لغایت ۸۰ میں صاحبزادہ صاحب کے طولانی بیان کا خلاصہ درج کیا جاچکا ہے۔ جس سے حسبِ ذیل امور منکشف ہوتے ہیں

(۱) ۲۳ء کے انتخابات میں ڈاکٹر ضیاء الدین و ڈاکٹر کریم حیدر لودی علی الترتیب صوبہ کی کونسل اور اسمبلی کے رُکن منتخب ہوے۔ تین سال میں اُنکی غیرحاضری سے یونیورسٹی کے کام میں ہرج واقع ہوا۔ حتیٰ کہ شعبۂ اقتصادیات جس کے ڈاکٹر حیدر معلم اعلیٰ تھے، اُس کے نتائج خراب رہے اور بیرونی ممتحنین نے شکایت کی

(۲) ۲۶ء کے انتخاب میں شرکت کے لیے جب ڈاکٹر حیدر اور مسٹر حبیب نے اجازت طلب کی تو صاحبزادہ صاحب نے ہرجِ کار ہی کی بنیاد پر اختلاف کیا، مگر ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب کی مخالفت اور اساتذہ کی کثرتِ رائے سے ان اصحاب کو اجازت دے دی گئی۔

(۳) مسٹر حبیب اپنے انتخاب کی جد و جہد کے لیے اکتوبر اور نومبر کے دو مہینوں میں برابر اپنے کام سے غیرحاضر رہے۔

(۴) اس دو ماہ کے عرصہ میں مسٹر حبیب نے اتفاقی اور رعایتی رخصتیں بھی حاصل کیں جن کے وہ ازروے قواعد مستحق ہو سکتے تھے، اور کچھ زمانہ ایسی غیرحاضری میں بھی بسر کیا جو بالکل خلافِ قاعدہ تھی۔

(۵) رخصت حاصل کرنے اور بے رخصت غیرحاضر رہنے کے سلسلہ میں جو بیقاعدگیاں مسٹر حبیب نے کیں انپر اگزیکیٹو کونسل نے قواعد کے بموجب کارروائی نہیں کی۔

نوٹ۔ ایگزیکیٹو کونسل کے ضوابط کا باب نہم فقرہ ۱۳ (فروری و مارچ کے الناظر میں صفحہ سطر ۲ پر ۱۳ کے بجاے ۳۸ غلط چھپا ہے) جسکا حوالہ صاحبزادہ صاحب نے دیا ہے حسبِ ذیل ہے

"اگر یونیورسٹی کا کوئی افسر یا ملازم دانستہ اپنے کام سے غیر حاضر ہو اور وقت معینہ پر اپنے فرائض کو حاضر ہوکر انجام نہ دے تو متصور ہو گا کہ اُس نے بغیر اطلاع دیے اپنی جگہ سے استعفا دیدیا۔"

اور باب یازدہم کے فقرہ جات ۳۰ - ۴۲ (جنکا حوالہ صاحبزادہ صاحب نے دیا ہے) میں سے فقرہ ۴۲ حسب ذیل ہے:-

"اگر کوئی افسر یا ملازم اپنی رخصت کے ختم ہو جانے کے بعد ایک ہفتہ کے اندر اپنے کام پر نہ لوٹے تو یہ تصور کیا جائے گا کہ اس نے اپنی جگہ خالی کردی۔ اور یونیورسٹی کی ملازمت سے علٰحدہ ہو جائے گا بشرطیکہ اپنی غیر حاضری کے مناسب وجوہ بیان کر کے ایگزیکیٹو کونسل کا اطمینان نہ کردے۔"

صاحبزادہ صاحب نے جو کچھ اس سلسلہ میں بیان فرمایا ہے اُن میں دو باتیں اور اضافہ کی جا سکتی ہیں:-

(۱) ڈاکٹر کریم حیدر لودی، اسمبلی کے رکن منتخب ہونے کے بعد ایک سرکاری کمیشن کے رکن منتخب ہوگئے ہیں جسکی وجہ سے یونیورسٹی سے ایک مدت تک غیر حاضر رہیں گے۔

(۲) یونیورسٹی کے اساتذہ جب کسی انتخاب میں شریک ہوتے ہیں تو اپنی انتخابی جد و جہد کو کامیاب بنانے کے لیے یونیورسٹی کے طلبہ کو اضلاع میں کام کرنے کے لیے لے جاتے ہیں - جس کے باعث اُنکی تعلیم میں ہرج واقع ہوتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی جوابی رپورٹ میں ڈاکٹر لودی یا مسٹر حبیب کے بارے میں ایک حرف نہیں لکھا۔ جس کے صاف معنے یہ نکلتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کے پاس صاحبزادہ صاحب کے اعتراضات کا کوئی جواب نہیں ہے - اور ظاہر ہے کہ واقعات کا بطلان وہ کیسے کر سکتے تھے - بر اینہم یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اس بحث پر بالکل خامہ فرسائی نہ فرماتے - چنانچہ اُنھوں نے اس فصیح و بلیغ جملہ سے اپنا جواب شروع فرمایا ہے کہ

"بدقسمتی سے صاحبزادہ صاحب اس امر کو پسند نہیں کرتے کہ عملۂ تعلیمی کا کوئی رکنِ قوم، ملک یا حکومت کی خدمت انجام دیکر اپنا رتبہ بڑھائے یا امتیاز حاصل کرے" انتہٰی

اس کے بعد اساتذہ کا یہ مطمح نظر ظاہر کیا ہے کہ

"بے شبہہ وہ اپنے تئیں اس درسگاہ کو کامیابی سے چلانے کا ذمہ وار جانتے ہیں

مگر ساتھ ہی وہ محسوس کرتے ہیں کہ اُن کا ایک فرض یہ بھی ہے کہ وہ تمام حصص ملک کے مسلمانوں کے تعلیمی و دیگر امور میں عملی حصہ لیں" (ایضاً)

پھر کورٹ کی دسمبر ۲۳ء کی اس تجویز کو درج کرکے جسکی رو سے یونیورسٹی کا کوئی ملازم ایگزیکیٹو کونسل کی اجازت کے بغیر کونسل یا اسمبلی وغیرہ کے انتخاب میں شرکت نہیں کرسکتا، ایگزیکیٹو کونسل منعقدۂ ۵۔جولائی ۲۶ء کی ایک تجویز نقل فرمائی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ جن افسروں کو انتخابات میں شریک ہونے کی اجازت دی جائے اُنھیں عام رخصتوں کے علاوہ ۵ یوم کی رخصت خاص بغیر تنخواہ کے پانے کا حق ہوگا اور اگر وہ پانچ یوم سے زیادہ رخصت چاہیں تو ۳۵ یوم تک کا اضافہ منظور کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ وہ اپنا قائمقام دیں جسکا تقرر اُنھیں کے صرف سے ۲۵۰ ماہوار پر کیا جائے گا اور اُس صورت میں یہ ۳۵ یوم کی رخصت با تنخواہ ملے گی۔

اور آخر میں ۲۴۔دسمبر ۲۶ء کے کورٹ کے جلسہ کی یہ کارروائی بیان فرمائی ہے کہ جب منشی سید نثار حسین کی تحریک اور مولوی حبیب اللہ خاں کی تائید سے یہ مسئلہ پیش ہوا کہ آیندہ سے کسی معلم کو انتخابات میں حصہ لینے کی اجازت نہ دی جائے۔ تو ۴۰ میں سے صرف ۳ اصحاب نے اس تجویز کی موافقت کی۔ جس سے ڈاکٹر صاحب اس نتیجہ کی طرف رہنمائی کرنا چاہتے ہیں کہ کورٹ کی اکثریت اُنکی ہمنوا اور صاحبزادہ صاحب کی رائے کی مخالف ہے۔

عزیب صاحبزادہ صاحب نے کب یہ دعویٰ کیا تھا کہ کورٹ یا کونسل کی اکثریت اُنکی ہمنوا ہے۔ وہ تو خود اسی کے شاکی ہیں کہ قوم کے نمایندوں یعنی کورٹ کے اراکین نے جس شخص کو وائس چانسلر مقرر کیا، جس کا درجہ یونیورسٹی کے قانون کے بموجب چانسلر اور پرو چانسلر کے بعد رکھا گیا ہے اور جسے بجا طور پر یونیورسٹی کے نظم و نسق کا سب سے زیادہ ذمہ دار سمجھا جاتا ہے وہ یونیورسٹی کے ایک تنخواہ پانے والے افسر کے مقابلہ میں، محض اس سبب سے کہ کورٹ اور کونسل کے اندر اسکو اکثریت حاصل رہتی ہے، عضو معطل بنا ہوا ہے۔ ممکن ہے کہ خود صاحبزادہ صاحب کے اندر ایسے عیوب موجود ہوں جنکے باعث وہ یونیورسٹی کے ارباب کار کا استحاد (؟) حاصل کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو گئے ہوں لیکن جو حالات ابتک سامنے آئے ہیں اُن سے تو اس کی تصدیق نہیں ہوتی بلکہ صاف

نمایاں ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو جو اقتدار حاصل ہو گیا ہے اُس کی وجہ سے قطعًا ناممکن تھا کہ صاحبزادہ صاحب اپنے فرائض کو دیانت و ایمانداری کے ساتھ انجام دے سکتے۔

واقعات پکار پکار کر کہہ رہے ہیں، کہ اگر حالات میں مناسب تبدیلی نہ ہوئی تو آیندہ صرف وہی اصحاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو سکیں گے جو ڈاکٹر صاحب کی رضا جوئی کو، یونیورسٹی کے قانون اور طلباء کے مفادِ تعلیمی پر مقدم سمجھیں - اور غالبًا اس ضرورت کو ایسے ہی بزرگ زیادہ خوبی کے ساتھ پورا کر سکیں گے جو اس عہدہ کے لیے باعثِ عزت نہوں بلکہ جن کے لیے یہ عہدہ موجبِ عزت افزائی ہو جائے - کونسل میں اساتذہ کی شرکت سے یا اُنکے مرتبہ وعزت میں خواہ کتنا ہی اضافہ ہو لیکن اس میں کچھ شبہہ نہیں کہ انتخابات کے زمانہ میں جو شدید انہماک ہوتا ہے اُس سے اور اُسکے بعد مسلسل کونسل کے جلسوں میں شرکت کرنے کی غرض سے جس قدر توجہ اور وقت صرف کرنا پڑتا ہے اُس سے یونیورسٹی کے تعلیمی کام کو ضرور نقصان پہونچتا ہے -

لیکن اگر بفرضِ محال ڈاکٹر صاحب ہی کی رائے صائب مان لی جائے کہ کونسلوں میں مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ کی شرکت مفید اور ضروری ہے، تب بھی یہ بات تو بہر حال کسی طرح پسندیدہ نہیں ہو سکتی کہ اساتذہ بالکل مطلق العنان چھوڑ دیے جائیں، جب چاہیں کام کریں اور جب چاہیں گھر بیٹھ رہیں - مسٹر حبیب، یونیورسٹی میں جیسا اچھا کام کر رہے تھے، اگر ڈاکٹر صاحب کی رائے میں کونسل کے اندر رہ کر وہ اس سے بھی زیادہ یونیورسٹی کے لیے مفید ہو سکتے تھے تو اُنکو چاہیے تھا کہ شروع ہی سے اُنکو دو ماہ یا زائد کی رخصت مع تنخواہ کے دلا دیتے بلکہ انتخابات کے مصارف کے لیے کچھ رقم بطور انعام یا امداد کے بھی منظور کرا دیتے - لیکن یہ تو صریح ہٹ دھرمی اور ناانصافی ہے کہ مسٹر حبیب یونیورسٹی کے قانون اور عام ضابطہ اخلاق کو پامال کریں اور یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر جنھیں ڈسپلن اور ضابطہ کا مجسمہ ہونا چاہیے، یہی نہیں کہ چُپ چاپ بیٹھے رہیں بلکہ جب وائس چانسلر کی تحریک پر معاملہ کونسل کے سامنے پیش ہو تو خود ہی اُنکی پردہ پوشی کرنا چاہیں -

جس درسگاہ کا سب سے اعلیٰ تعلیمی افسر قانون اور ضابطے سے اس قدر بے پروا ہو، وہاں کسی دوسرے افسر یا طالبِ علم سے ضابطہ و قانون کی پابندی کی توقع ہی فضول ہے - اور یہی صاحبزادہ صاحب کی اصلی شکایت ہے -

مسٹر حبیب کے معاملہ سے بھی زیادہ سنگین مولوی مقتدیٰ خاں شروانی منیجر مسلم یونیورسٹی پریس کا واقعہ ہے۔ اور اگرچہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے جواب میں اس کا قطعاً کوئی ذکر نہیں کیا ہے مگر یہ بات یقیناً مسلم یونیورسٹی کی اکزیکیٹو کونسل یا پرو وائس چانسلر کے لیے لائق ستائش نہیں کہی جا سکتی کہ یونیورسٹی کا ایک ملازم اُس کے سب سے بڑے عہدہ دار کے خلاف علانیہ بغاوت کرے اور یونیورسٹی کی با اختیار جماعت اُسے سزا دیئے بغیر چھوڑ دے۔

اور خواہ عالیجناب نواب سر مزمل اللہ خاں صاحب اور جناب ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب اسے تسلیم نہ کریں لیکن عام طور پر یہی نتیجہ نکالا جائے گا کہ مولوی مقتدیٰ خاں شروانی کو ہرگز صاحبزادہ صاحب کے خلاف پروپاگنڈا کرنے کی جرأت نہ ہوتی اگر یونیورسٹی کے ایسے بڑے بڑے اور ذمہ دار اصحاب اُن کی پشت پناہی کے لیے موجود نہ ہوتے۔

دسمبر ۲۶ء میں اکزیکیٹو کونسل نے قرار دیا تھا کہ

"چونکہ اس معاملہ میں چند ایسی باتیں ہیں جن کی توضیح کی ضرورت ہے اس لیے یہ معاملہ کونسل کے آیندہ اجلاس تک بغرض مزید تجویز ملتوی کیا جاتا ہے"۔

۲۷ء کے اندر غالباً اسوقت تک متعدد جلسے اکزیکیٹو کونسل کے ہو چکے ہیں کیا ڈاکٹر صاحب یا عالیجناب وائس چانسلر صاحب حال از راہ کرم مطلع فرمائیں گے کہ اسوقت تک اس بارے میں کیا کارروائی ہوئی؟ جہاں تک دریافت سے ہمیں معلوم ہوا ہے کوئی کارروائی نہیں کیگئی۔ اور اس سے صاف ظاہر ہے کہ گذشتہ دسمبر میں جو کچھ قرار دیا گیا تھا اُس کی غایت محض دفع الوقتی تھی، تاکہ صاحبزادہ صاحب کے میدان سے ہٹ جانے کے بعد یہ معاملہ قطعاً نظر انداز کر دیا جائے۔

یونیورسٹی کی تعلیمی حالت کی ابتری اور عام طور پر قوانین کی پابندی نہ کرنے کی جو شکایات صاحبزادہ صاحب نے کی ہیں اُن پر تبصرہ کرنے کے لیے یونیورسٹی کے اندرونی حالات سے زیادہ گہری واقفیت کی ضرورت ہے۔ نیز یہ امر بھی لازمی ہے کہ یونیورسٹی کے ہر قسم کے کاغذات پر پورا دسترس حاصل ہو اور اس امر کا اعتراف کر لینے کے بعد کہ ہمیں اس قسم کے موقع حاصل نہیں، ہم اس ضروری حصہ پر تبصرہ کرنے کی جسارت نہ کریں گے۔ اور اب تو یہ خبر اخبارات میں شایع ہو چکی ہے کہ علیا حضرت بیگم صاحبہ بھوپال نے بحیثیت مسلم یونیورسٹی کی

چانسلر ہونے کے ایک تحقیقاتی کمیشن کا تقرر کیا ہے جو بمبئی کے مشہور رہنما سر ابراہیم رحمت اللہ کی صدارت میں امید ہے کہ اپنے فرائض بخوبی انجام دے گا - اس لیے فی الاصل کسی تبصرہ کی حاجت بھی باقی نہیں رہی -

بایں ہمہ یہ عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح ان تمام امور میں جن کا ذکر اب تک کیا گیا صاحبزادہ صاحب کے بیانات صحیح ماننے کے قابل اور ڈاکٹر صاحب کے جوابات سراسر ابلہ فریبیوں سے لبریز ہیں، اسی طرح یہ توقع بیجا نہ ہوگی کہ یونیورسٹی کے تعلیمی نظم ونسق سے متعلق جو کچھ صاحبزادہ صاحب نے تحریر فرمایا ہے وہ بھی صداقت سے خالی نہ ہوگا -

ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب بے شبہ ہماری قوم میں بحیثیت ایک ماہر تعلیم ہونے کے ایک خاص امتیازی حالت رکھتے ہیں لیکن علی گڈھ کالج کے ایک سابق طالب علم کے بقول جو اب ایک سرکاری محکمہ کے ممتاز عہدہ دار ہیں، حالات ایسے نازک اور پیچیدہ ہو گئے ہیں کہ قوم کو ڈاکٹر صاحب اور مسلم یونیورسٹی کے درمیان ایک فیصلہ کن انتخاب کرنا ہوگا - مسلم یونیورسٹی کو اگر ایسی حالت پر لانا ہے کہ وہ اس معیار کے مطابق مسلمانوں کی تعلیمی خدمت انجام دے جو گذشتہ پچاس سال سے برابر مسلمانوں کے پیش نظر رہا ہے اور جسے سر سید احمد خاں سے لیکر آج تک تمام مسلمان قومی رہنما اپنی تقریروں اور تحریروں میں بار بار مسلمانوں کے روبرو پیش کرتے رہے ہیں تو یونیورسٹی کو ڈاکٹر صاحب کے پنجۂ اقتدار سے نکال کر ایسے ہاتھوں میں دینا پڑے گا جو اس نصب العین کے مطابق کام کر سکتے ہوں، اور اگر یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد کی رائے میں ڈاکٹر صاحب کا وجود یونیورسٹی کے لیے ہر نہج میں ناگذیر ہے تو بس انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھ کر مسلم یونیورسٹی کی فاتحہ خوانی کر دینا چاہیے۔

آخر میں ہم کو یہ بھی عرض کر دینا ہے کہ صاحبزادہ صاحب نے بھی قوم کے ساتھ حد درجہ بے اعتنائی برتی - ان کا فرض تھا کہ اپنی سہ سالہ میعاد خدمت کے خاتمہ پر نہیں بلکہ اس سے بہت پہلے یونیورسٹی کے تمام حالات سے نہ صرف کورٹ کے اراکین کو بلکہ ساری قوم کو مطلع کرتے تاکہ اب سے بہت پہلے یونیورسٹی کی ابتر وزبوں حالت پر توجہ کی جاتی اور یونیورسٹی کے قانون میں جس تبدیلی کی حاجت وہ محسوس فرماتے تھے اس میں ترمیم کرانے کے لیے بھی باقاعدہ جد وجہد عمل میں آتی -

ظفر الملک

پچھلے مہینے کے رسالے

معارف

غالباً ناظرین کو یاد ہوگا کہ مرہٹی انسائکلوپیڈیا میں حضور سرورِ کائنات صلعم کی ذاتِ اقدس پر بے بنیاد اعتراضات کیے گئے تھے، جس پر مسلم پریس نے بہت کافی لے دے کی تھی، اور بالآخر اڈیٹر انسائکلوپیڈیا کو معافی مانگنا پڑی تھی۔ انھیں اعتراضات کے جواب میں پروفیسر نواب علی صاحب ایم اے نے "سیرۃ رسول اللہ" کے نام سے ایک مکمل کتاب لکھنا شروع کی ہے۔ مقامِ شکر ہے کہ اس کتاب کے تقریباً ۱۲ جزو لکھے جا چکے ہیں۔ ابھی تک "غزوۂ بنو نضیر" تک کتاب لکھی گئی ہے۔ غزوات نبوی اور فلسفۂ جنگ کے عنوان سے اس کا ایک ٹکڑا جولائی کے معارف میں شایع ہوا ہے۔ انشاء اللہ کتاب دورِ حاضرہ کی مغربی و مشرقی جملہ معلومات سے مکمل ہوگی۔ ہم بھی مدیر معارف کے ہم نوا ہو کر یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ "اردو" سے زیادہ ضرورت اس کتاب کی انگریزی میں ہے۔ اور چونکہ پروفیسر صاحب اسکے اہل ہیں، اس لیے اگر یہ امید کی جائے کہ وہ اس ضرورت کو پورا کریں گے تو کچھ بیجا نہ ہوگا۔ امید ہے کہ پروفیسر صاحب قوم کی ان توقعات کو ضرور پورا کریں گے۔ صاحب موصوف نے اپنے مضمون میں جنگ کے فلسفہ پر بہت لطیف بحث کی ہے۔ اسی سلسلہ میں گذشتہ انبیاء اور ملل کی جنگوں کا حوالہ بھی دیا ہے۔ قبل اس کے کہ غزوات پر بحث کی جائے مسئلۂ جنگ کو جس حیثیت سے وہ مختلف اقوام و مذاہب میں سمجھا جاتا ہے مجملاً بیان کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:—

.... حکماے یوناں نے مسئلۂ جنگ کو علم النفس کی روشنی میں دکھایا، انسان میں جبلّی قوتِ غضبی جب حدِ اعتدال کو پہونچے تب فضیلت شجاعت حاصل ہوتی ہے ورنہ حدِ افراط یعنی تہور اور حدِ تفریط یعنی جبن دونوں مذموم ہیں۔ یہی حال تمام صفاتِ حسنہ کا ہے، اس لیے عدالت جامع فضائل ہے۔ اور یہی معیار ہے۔ افلاطون اپنی کتاب قوانین میں کہتا ہے کہ حاکم عادل کا فرض اولیں یہ ہے کہ ملک و ملت کو صلح آشتی سے آباد کرے اور صرف ضرورت کے وقت جنگ میں مشغول ہو۔ لیکن جب معاملہ وحشی اقوام سے پڑے تو عدل کے قوانین پر عمل دشوار ہو جاتا ہے۔ ارسطو اپنی کتاب سیاستِ مدن میں کہتا ہے کہ منافات ملت بدیہی فرض ہے افزائش ملت جنگ

کے ذریعہ سے روا ہے۔ بشرطیکہ جائز طریقہ سے ہو۔ ایسی اقوام جن کی طینت میں محکومی ہے ان پر استیلا روا ہے تاکہ امن و امان قائم رہے۔ ارسطو کا یہ آخر الذکر قول جو اسکندر کی حرص فتوحات کے لیے ایک دستاویز تھا، دولت روما اور بعد کو اُسکے جانشینوں یعنی موجودہ یورپین سلطنتوں کی ہوس ملک گیری اور اقوام عالم کو اپنا محکوم بنانے کے لیے ایک بہانہ ہوگیا ہے جسکے نتائج نہایت خوفناک ہیں"

ہمایوں | ہمایوں کے جولائی نمبر میں منشی محمد حامد خاں دہلوی نے ایک دلچسپ مضمون بدویت و حضریت، کے عنوان سے سپرد قلم کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ انسان کسی پیشہ کا ہو دونوں حالتوں میں سے ایک نہ ایک حالت وہ ضرور اختیار کرے گا۔ لیکن فی زمانا عجیب دلچسپی ہے کہ ہم نے دونوں حالتیں اختیار کرلی ہیں۔ اسی سلسلہ میں ایک جگہ فرماتے ہیں

"...... عہد عتیق میں دور حاضرہ کے خلاف حضریت شاذ و نادر اور بدویت عام تھی شاید اس وجہ سے کہ انسان میں اوراک پیدا ہوتے ہی دیگر ضروریات کے احساس کے علاوہ عمدہ اور خوشگوار مقامات کی تلاش بھی لابد ہوتی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو بنی آدم کی زندگی کے چار مدارج ہیں۔ صیادی۔ راعیت۔ زراعت اور حکومت۔ صیادی۔ جب بنی آدم کا مسکن غار اور گذر چوپایوں کے شکار پر تھی جن کے گوشت سے شکم پروری اور چرم سے تن پوشی ہوتی تھی اُسوقت بھی انکو اکثر جگہوں یا خانہ بدوشی کی صورت میں بدویت اختیار کرنی پڑتی ہوگی...... راعیت۔ یہ کوئی نہیں بتا سکتا کہ سب سے پہلے کس نے گھوڑے کو زیر اور جانوروں کو رام کیا۔ بلا شبہ حضرت انسان اس اپنے ارادہ میں خوب کامیاب ہوے۔ صحرائی اور خونخوار زندگی سے گزر کر شائستہ پیشہ ایا نیت اختیار کرنا واقعی انسان کے طرز معاشرت اور خیالات میں انقلاب عظیم کا ثبوت ہے۔ اس تغیر کے ساتھ ہی قبضۂ ملک کے احساس نے بھی نشو و ترقی شروع کی ہوگی...... زراعت کاشتکاری کے بغیر حضریت حاصل نہیں ہوتی...... کاشتکاری سے تمدن، حکومت اور تہذیب کا آغاز ہوتا ہے۔ غور کیا جائے تو کاشتکار کی جھوپڑی ہی سے ریاست کی ابتدا ہے... قانون قدرت کا تقاضہ ہے کہ جب انسان اس درجہ پر پہونچتا ہے تو اپنے ہمسایوں کے ساتھ جو اسی طرح آباد ہوگئے تھے بحالت مخالفت جنگ سے پیش آتا ہے۔ ورنہ بصورت اتحاد باہمی تجارت کو فروغ دیتا ہے۔ یہی آغاز سلطنت کا ہے جو ملکی تدابیر و مصالح خارجہ کا سرچشمہ ہوتی ہے۔ حکومت یا شاہی...... اعلیٰ ترین درجہ شہروں کا بنانا اور شہروں میں آباد ہونا ہے۔ جب کثیر التعداد اور تمام قوم بنی آدم ایک مخصوص مقام پر مکانات تعمیر کرکے آباد ہو جاتے ہیں تو وہ مقام شہر یا قصبہ کہلاتا ہے۔ محافظت کی غرض سے

(نوٹ) اس اقتباس میں جگہ جگہ عبارات حذف کردی گئی ہیں گر نقل میں علامت حذف ہوگئی۔ ایڈیٹر

اسکے گرداگرد مستحکم دیوار تعمیر کرتے ہیں۔ جو شہر پناہ یا فصیل کے نام سے منسوب ہوتی ہے ...... اگر غور کیا جائے تو ہر قوم کی ابتدا اور اسکے تمدن کا آغاز مندرجۂ بالا صورتوں کے سوا اور کسی صورت سے نہیں ہوا......"

نیرنگ خیال کا جولائی نمبر "تحفۂ تیاتر" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ پروفیسر مولانا محمد علم الدین صاحب سالک بی اے نے اس میں فارسی ڈراما پر ایک بے مثل مضمون لکھا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ فارسی ڈراما کب شروع ہوا؟ اسکا سنگ بنیاد کیونکر رکھا گیا؟ اس کے متعلق ادبائے اروپا نے مجمل خیالات کا اظہار کیا ہے۔ سر مالکم نے اس ڈراما کے متعلق ایران کی تاریخ میں نہایت حیرت و استعجاب سے اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔ ایک جگہ پروفیسر علم الدین تحریر فرماتے ہیں کہ

"...... ایسے قصے اور "مقامات" ایرانی ڈرامہ کی ابتدائی داغ بیل ہیں اور انھیں پر موجودہ ڈراما نگاری کی نقش آرائیاں ہو رہی ہیں۔ ایران میں آجکل بھی دو قسم کے ڈرامے کھیلے جاتے ہیں۔ ایک وہ ڈرامے جن کا تعلق مذہبی وارفتگی اور جوش سے ہے، دوسرے وہ ڈرامے جو تفنن طبع کے لیے کھیلے جاتے ہیں۔ پہلی قسم کے ڈراموں کو "تعزیہ" اور دوسری کو "تماشہ" کہتے ہیں۔ "تماشہ" کے ممثل عام طور پر بازاری لوگ رند، اوباش اور دنیا بھر کے بفکرے ہوتے ہیں۔ ایرانی ان کو لوطی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ انھیں اپنے فن میں اس قدر مہارت حاصل ہوتی ہے کہ جس وقت وہ اسٹیج پر آکر اپنا پارٹ ادا کرتے ہیں تو حاضرین مارے ہنسی کے لوٹن کبوتر بن جاتے ہیں۔ "تماشا" کی زبان ادبی نقطۂ نظر سے بالکل عامیانہ ہوتی ہے۔ اس میں بازاریت اور ابتذال کا عنصر بہت غالب ہوتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا دور از انصاف نہ ہوگا کہ ایرانی "تماشا" کامڈی (تمثیل بہجت) کی ادنیٰ ترین مثال ہے۔ "تعزیہ" مذہبی جوش اور ولولہ کا نتیجہ ہے۔ اس میں اصلیت و واقعیت کا عنصر زیادہ ہوتا ہے۔ وہ دلوں کو ہلا دیتا ہے، جذبات میں ہیجان پیدا کر دیتا ہے اور روحوں کو ا‌ٹھاتا (؟) ہے چونکہ ایرانیوں کے قومی ہیرو (بطل)، ابن الشہیدین ہیں اس لیے جو اُنس و محبت اور عقیدت اہلبیت سے ہے وہ کسی اور شے سے نہیں .... وہ واقعات کربلا کو ڈراما کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ "ممثلین تعزیہ" خاص الخاص افراد ہوتے ہیں۔ طبقۂ اعلیٰ کے افراد اور اُن کے بچے مذہبی جوش اور عقیدت کی بنا پر اس ڈراما میں شامل ہوتے ہیں ..... تمثیل تعزیہ یوماً فیوماً ایران میں ترقی کر رہی ہے اسکی اہمیت دن بدن بڑھ رہی ہے۔ اکثر تمثیلوں کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں ہو رہا ہے ..... مشہور و معروف فلسفی اور مستشرق

> ارنسٹ رینن "تعزیہ" پر بحث کرتا ہوا ایک جگہ لکھتا ہے کہ اگر شیکسپیر ان ڈراموں کو پڑھ لیتا تو وہ بھی مسحور ہو جاتا ..... وہ چیزیں جو انکے (ایرانیوں کے) خیال میں خامیوں سے پُر اور لغزشوں سے لبریز ہیں ہمارے لیے اہل مغرب کی تصنع آفرینیوں اور فنی قیود سے پابند ادبی کارناموں سے ہزار درجہ بہتر ہیں"

مخزن مخزن کے جولائی نمبر میں ڈاکٹر سٹاڈر کا طبی مضمون ہے جس میں انھوں نے بیخوابی اور اسکے سات اسباب لکھے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ شب کو بیخوابی کی وجہ سے جو تکان محسوس ہوتا ہے اُسکی وجہ یہ نہیں ہے کہ بیخوابی ہوتی ہے بلکہ وہ پریشانی کی وجہ سے ہوتی ہے کیونکہ بے خوابی کی وجہ سے پریشانی ہوتی ہے اور اُسی پریشانی کے باعث تکان محسوس ہوتا ہے۔ اُنھوں نے حسب ذیل (۷) اسباب عام بے خوابی کے لکھے ہیں (۱) خون کا دباؤ (ضعیف آدمیوں کے جگر سے بہت زور سے خون نکلتا ہے اور رگوں میں گرتا ہے جیسے بلندی سے پتھر یعنی ضعیفوں کے خون کا دباؤ زیادہ ہوتا ہے) (۲) تشکیل امراض مثلاً دمہ، سر پہ رسولی نکلنا (۳) وہ حالتیں جن میں کسی زہر نے جسمانی نظام پہ اثر کیا ہو گھیگا وغیرہ (۴) پُرخوری یا بے وقت کا کھانا (۵) دماغ کا تکان (۶) اعصاب کی کمزوری (۷) پریشان رہنا ڈر خوف وغیرہ۔ آخر میں فاضل ڈاکٹر نے اسکا علاج بھی لکھا ہے کہ

> "نیند جسم کے ستانے کا دوسرا نام ہے۔ جسم کو اُسوقت تک آرام نہیں پہونچ سکتا جب تک دماغ کو آرام نہ میسّر ہو۔ سوچنا بند کر دو تو سو جاؤگے۔ لہذا بیخوابی کے تین علاج یہ ہو سکتے ہیں (۱) دماغی آرام (۲) جسمانی آرام (۳) اکتا دینے والی آوازیں .... دماغ کو الجھنوں سے پاک کرو۔ دماغ کی "پاکیزگی" جسم کو مدد دیتی ہے اور تم سو جاتے ہو"

القاسم القاسم ایک ماہوار علمی و دینی رسالہ ہے جو مرکز العلوم الاسلامیہ جامعہ قاسمیہ دارالعلوم دیوبند کا نقیب ہے اسکے محرم نمبر میں مولانا حسین احمد صاحب معلم حدیث کا ایک مضمون "معراج و سائنس" ہے جو مسلسل شایع ہوتا رہے گا۔ مضمون بہت عمدہ ہے۔ ایک جگہ پہ فاضل مضمون نگار تحریر فرماتے ہیں کہ

> "عرب کے باشندے کہانت کو تسلیم کرتے تھے جن کا حصول جنات سے ہوتا تھا۔ جنات کی تیزی اور تند حرکت کے ماننے میں ان کو پس و پیش بھی نہ ہوتا تھا۔ اسی طرح ملائکہ اور فرشتوں کی تیزی اور قوتِ حرکت کا ان کو اقرار تھا اور یہی وجہ تھی کہ باوجود نبی کریم صلعم کی ہر قسم کی مخالفت اور تکذیب کے اُنھوں نے کبھی اس مقدمہ سے

انکار نہ کیا کہ بہت شاید بارگاہ خداوندی سے فرشتہ وحی لے آتا ہے۔ یہ کبھی نہیں کہا گیا کہ فرشتہ میں یہ قوت نہیں کہ چشم زدن میں آسمانوں کے اوپر سے کوئی چیز لا سکے۔ اور نہ فرشتوں کے وجود کا انکو انکار تھا۔ اس سے انکو سوچنا چاہیے تھا کہ جبکہ جنات و فرشتوں وغیرہ میں اس قدر قوت ہے کہ آناً فاناً میں کہیں سے کہیں پہونچ جاتے ہیں تو اگر روحِ نبوی میں اس قدر قوت تھی جو کہ آناً فاناً میں اس جسم کو لیکر آسمانوں اور ان کے اوپر تک پہونچ جائے یا جسم نبوی نے روح و جسم کی مجاورت کی وجہ سے روحانی خفت ایسی پیدا کرلی ہو کہ آناً فاناً میں روح کے ساتھ اڑتی چلی جائے یا کسی قوی فرشتہ نے آنحضرت صلعم کی روحانی اور جسمانی برداشت کی اور آپ کو اپنی قوت سے ایک منٹ میں کہیں سے کہیں اٹھا کر پہونچا دیا تو کیا استبعاد ہے اور کون سا امر محال شمار کیا جاتا ہے؟

تنظیم ڈاکٹر کچلو کے مخلص رفیق جناب قریشی نے ہفتہ وار اخبار تنظیم کے ساتھ چند ماہ سے اسی نام کا ایک ماہوار رسالہ جاری کیا ہے جسکے جولائی نمبر میں مولانا داؤد صاحب غزنوی مدیر "توحید" نے "اسلام اور سرمایہ داری" پر ایک دلچسپ مضمون تحریر کیا ہے۔ ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ

"سرمایہ داری کا یہ دیو بڑی بڑی حکومتوں ہی کی شکل میں نظر نہیں آتا بلکہ غلام قوموں میں بھی بڑی سرمایہ دار قوم چھوٹی سرمایہ دار قوم کو اپنا غلام بنانا چاہتی ہے اور چھوٹی سرمایہ دار قوم اپنے غریبوں کو ذلت و نامرادی کے گڑھے میں پھینکنا چاہتی ہے۔ اور یہی وہ مفاسد ہیں جن کے باعث اسلام نے سرمایہ داری کے خلاف جہاد کیا ہے۔ اسکو بدترین معصیت ٹھہرایا ہے۔ اور اسکی کثرت و عمومیت کو وجہ فساد ٹھہرایا ہے ...... اسلام دنیا کے لیے ایک پیغام امن اور مکمل نظام عمل ہے۔ اسلام کا مقصد دنیا میں خدائی حکومت کا قائم کرنا اور اس کی ماتحتی میں ایک ایسی انسانی برادری کی تشکیل ہے جسکی زندگی کا مقصد مخلوق خدا کی بے غرضانہ خدمت، قربانی، ایثار، اخوت اور عام مکارم اخلاق کی تکمیل ہے۔ بس ہر وہ چیز جس میں خود غرضی، بے رحمی، سنگدلانہ بے اعتنائی ہوگی، جس میں انسانی اخوت کے بجائے تعبد اور غلامی کو دخل ہوگا اسلام کے نزدیک اس قابل ہے کہ وہ مٹا دی جائے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ دنیا کا امن و راحت دن بہ دن مفقود ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اور انسانی دماغ رات دن ایسے آلات کی تیاری میں مصروف ہیں جن سے انسانوں کو قتل کرنے اور دوسری اقوام کو غلامی کے دائرہ میں لانے میں زیادہ سے زیادہ آسانی ہو، اور انسانی اخوت کے بجائے تعبد اور غلامی کا راستہ

صاف ہو لیکن آپ جانتے ہیں ان تمام برائیوں کا سرچشمہ کیا ہے؟ سرمایہ داری (کیپٹل ازم) - پس اسلام نے "دولت" اور "سرمایہ داری" سے پیدا ہونے والے مفاسد کے انسداد کے لیے زکوٰۃ فرض کردی، تاکہ ایک طرف مال کی محبت اور بخل و امساک امرا کے اخلاق کو مغلوب نہ کرسکے - اور دوسری طرف غربا کی جماعت کو ایسے دولتمند اور سرمایہ داروں سے اُنس و محبت ہو..... اسلام نے "سود" کو اسی لیے حرام کیا ہے"

زمانہ | ہز ایکسلنسی سر ولیم شکا میرس کے - سی - ایس - آئی گورنر صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ نے ہندوستانی اکاڈمی کے افتتاح کے موقع پر ۱۹ - مارچ ۱۹۲۷ء کو قیصر باغ لکھنؤ میں جو پُر مغز تقریر کی تھی اُس کا ترجمہ زمانہ جون نمبر میں شایع کیا گیا ہے - یوں تو ساری تقریر کارآمد اور مفید مشوروں سے لبریز ہے لیکن چند مقامات خاص طور پر اس قابل ہیں کہ بہی خواہان اردو اُن پر غور فرمائیں، اس لیے یہاں منتخب کیے جاتے ہیں

(۱) ..... سخت محنت اور کوشش سے زبان کے قواعد منضبط کیے جائیں زبان سے بھرتی کے الفاظ دُور کیے جائیں اور زبان کو بیرونی اثرات سے محفوظ رکھ کر اس قابل بنایا جائے کہ علوم و فنون کی تالیف اور انکے ترجموں میں کوئی دقت نہ پیش آئے۔

(۲) ..... میں جانتا ہوں کہ اگر کتاب زیادہ تعداد میں فروخت کرنا منظور ہے تو اسکی قیمت کم رکھنا ہوگی - لیکن کفایت کا لحاظ رکھتے ہوے جہاں تک ممکن ہو عمدہ کاغذ اور عمدہ طباعت کا انتظام بھی ضروری ہے اور اگر تصاویر کی ضرورت ہو تو عمدہ تصویریں بھی ہونا چاہییں -

(۳) سب سے بہتر ناول وہ ہوتے ہیں جو "معمولی" انسان کے متعلق ہوتے ہیں

(۴) ابھی تک کسی نے ہندوستانی مذاق کے موافق ناول نہیں لکھے -

(۵) ..... کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ اصلی اور سیدھے سادے افسانے نہ لکھے جائیں۔ اور انھیں لوگ نہ پڑھیں - لیکن ان افسانوں میں جو واقعات لکھے جائیں وہ ایسے ہوں جنکا تعلق ملکی معاشرت سے ہو - یہ میدان فسانہ نگاری کے لیے بہت وسیع ہے - فطرت سے جنگ کرنا اس ملک میں اتنا ہی ضروری ہے جتنا امریکہ کے مغربی اضلاع میں تھا علوم کے حاصل کرنے اور روزی کمانے میں یہاں اتنی ہی جد و جہد کرنا پڑتی ہے جتنی اسکاٹ لینڈ کے طالبعلموں کو عرصہ تک کرنا پڑی تھی - ہندوستانی ادب میں اتنی گنجایش ہے کہ وہ مذہبی افسانے پیش کرسکے - پیدایش، حیات، ممات، شادی و غمی کے

ایسے واقعات ہیں جو کسی ملک اور کسی وقت کے لیے مخصوص نہیں کیے جا سکتے ان کے افراد تلاش کرنے میں دقت نہ ہوگی بلکہ ان میں زمیندار، کاشتکار، وکلاء، سوداگر، پنشن یافتہ، سپاہی، اخبار نویس، طلباء، صوفی اور رند سب کام دے سکتے ہیں اور ہندوستانی افسانہ کی دنیا میں وہ ایسے ہی بھلے معلوم ہوں گے جیسے اسکاٹ اور بالزاک کے صفحات میں یہ صرف ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک سمجھدار مصنف غور سے نظر کرے اور ہمدردی سے ان کی تصاویر کھینچے۔ اگر اسکے الفاظ میں تصاویر کی سی دلکشی ہوگی تو اس کی کتابیں لوگ دل سے پسند کریں گے، اُنکو خریدیں گے اور پڑھیں گے۔ تاکہ ان سے انکی ضرورتیں پوری ہوں۔

(۶) .... اگر ہندوستانی شاعری کا مستقبل شاندار بنانا ضروری ہے تو اس بات کی سخت کوشش ہونا چاہیے کہ زبان محدود محاوروں اور روزمرہ کے اندر محدود نہ رہ جائے۔ یہ شاعری درباری رسوم اور شاہی لوازمات کی بنا پر رسمی سی ہوگئی ہے۔ اسکے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ عام نظموں کی زبان کو صاف کیا جائے۔ میری اس رائے کو قطعی اور یقینی نہ سمجھ لینا چاہیے۔ کیونکہ اُن لوگوں کو اس میں ترمیم کا پورا حق ہے جو مجھ سے بہتر رائے دے سکتے ہیں۔ لیکن جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں دیہات کے گیتوں اور راگوں میں بہت سے ایسے موجود ہیں جن کی زبان عمدہ ہے اور جو دل پر بہ نسبت بعض مسلّم اُستادوں کے کلام کے زیادہ اثر کرتے ہیں۔

(۷) ..... اگر کسی سے ترجمہ کرایا جائے تو پہلے یہ معلوم کر لینا چاہیے کہ وہ ہندی یا اُردو زبان سے واقف ہے اور جس مضمون کا ترجمہ کر رہا ہے اُسکو بھی پوری طور پر سمجھتا ہے اور تب اُسکے ترجمہ پر اُن لوگوں کو رائے دینا چاہیے جو خود بھی واقف ہوں۔

(۸) .... اُردو لکھنے والے عربی کے جملے استعمال کریں جیسا کہ پولیس کے روزنامچہ لکھنے والے کچھ دن پہلے کیا کرتے تھے یا ہندو مصنفین سنسکرت کے الفاظ خواہ مخواہ اپنی عبارت میں بھریں تو یہ لوگ دوہری مصیبت لا رہے ہیں۔ پہلا جُرم انکا یہ ہے کہ وہ خود بھی دوسرے فرق سے دور ہوتے جاتے ہیں اور اپنے ناظرین کو بھی اُنسے دُور کرتے ہیں۔ اس طرح یہ ادبی جرم سے زیادہ معاشرتی جرم ہے۔ اس کے علاوہ اس طریقہ سے وہ اپنی کتابوں کو ناقابلِ فہم بناتے ہیں جنکو عام آدمی نہیں سمجھ سکتے۔ یہ ایک ایسا گناہ ہے جو وہ اکاڈمی کے مقاصد کے خلاف کرتے ہیں۔ ......

جامعہ

جولائی کے پرچہ میں ڈاکٹر احمد محی الدین کی کتاب "ترکیۂ جدید میں تمدنی تحریک" کے دیباچہ کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف ایک ترک نژاد

ادب میں اور المانیہ کی تاسیس لایزک میں ترکی ادب و زبان کے اُستاد ہیں۔ یہ کتاب جہاں تک اس مضمون سے تعلق ہے سنجیدہ دلچسپ ہے۔ جامعہ میں آیندہ بھی اس کتاب کا ترجمہ بالاقساط شایع ہوگا اور اگر کارپردازانِ جامعہ کو موقع ملا تو علحدہ ایک کتابی صورت میں بھی یہ اوراق شایع ہوں گے۔

ڈاکٹر صاحب ایک جگہ پر تحریر فرماتے ہیں کہ

"..... میں پھر ایک مرتبہ ترکوں پر مغربی تمدن کے اثر کا ذکر کرنا چاہتا ہوں یہ تاریخ تمدن کا ایک ایسا پیچیدہ مسئلہ ہے جو چند جملوں میں حل نہیں کیا جا سکتا۔ لوگ اس اثر کے اندازہ میں مبالغہ سے کام لیتے ہیں۔ مغربی خیالات کا اثر ایک طرف تو تعلیم اور حرکت پیدا کرنے کا باعث ہوا لیکن دوسری طرف تباہ کن اور مضر۔ اور یہ مسلم ہے کہ ترکوں میں آج جو ذہنی بےچینی عام ہے وہ بڑی حد تک اسی کا نتیجہ ہے۔ لیکن تحریک تمدن میں ترک بس اس حد تک آگے بڑھے ہیں جہاں تک اُنھوں نے خود تخلیقی کام کیا ہے۔ جن بڑے آدمیوں نے اس تحریک میں کچھ کیا ہے وہ یا تو مغرب سے بالکل متاثر نہیں ہوے ہیں یا پھر اُنھوں نے جلدی اپنے کو مغربی اثر سے آزاد کر لیا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ مغرب پسندی ختم ہو چکی ہے۔ جذبۂ قومیت اور اصلاح اسی کا ردعمل ہیں۔ ابتک جو خیالات اور افادہ گاہیں یورپ سے مستعار لی گئی ہیں انھیں آخری چیز نہیں سمجھنا چاہیے۔ اسکی حیثیت بس عارضی اور اکثر ناکام کوششوں کی سی ہے۔ اب تک ہر چیز غیر متعین ہے ......"

"مشیر قادری"

رسید کتب

۱۔	حکایات و احتساسات۔	از سید سجاد حیدر بی اے (علیگ) علیگڈھ	۱۲؍
۲۔	نئے گوشے	مولوی سید مظفرالدین ندوی ایم اے حیدرآباد دکن	۸؍
۳۔	دنیاے افسانہ	مولوی عبدالقادر سروری بی اے (عثمانی) حیدرآباد دکن	۱۲؍
۴۔	بیداری ہند	لالہ مقصدی لعل ہندی میرٹھ	۶؍
۵۔	دیوان نوشاد	راجہ محمد اعجاز رسول خاں تعلقدار جہانگیر آباد	
۶۔	رنگ زمانہ (مجموعۂ نظم)	منشی برج بھوکن لال محب دریابادی	۱؍
۷۔	سیر گل	مسٹر جلیل احمد جلیل قدوائی بی اے (علیگ)	۱۲؍
۸۔	انیس حرفی قاعدہ	منشی مقصود حسن جھانسی	۳؍

اردو رسائل کے خاص مضامین

(جولائی سنہ ۱۹۲۷ء)

زمانہ - کانپور

۱- ہندوستانی اکاڈمی کے مقاصد
۲- بھاشا کے نورتن

معارف - اعظم گڈھ

۱- غزوات نبوی اور فلسفۂ جنگ
۲- ہندوستان کی معاشی حالت پر کمپنی کا اثر
۳- ابن رشد کی تصنیفات

جامعہ - دہلی

۱- آسمانی بجلی
۲- ترکی میں جدید تمدنی تحریک

القاسم - دیوبند

۱- تعلیمات اسلام
۲- معراج اور سائنس

مرقع - لکھنؤ

۱- زبان اردو میں مختصر قصص و افسانے
۲- اقبال کی اردو

مخزن - لاہور

۱- بیخوابی اور اس کے اسباب
۲- زندگی کا سانس (افسانہ)

ہمایوں - لاہور

۱- بدویت و حضریت
۲- خونناب مسرت
۳- انجام عیش

نیرنگ خیال - لاہور

۱- رتناولی (ڈراما)
۲- لیلائے وطن (ڈراما)
۳- فارسی ڈراما۔

تنظیم - امرتسر

۱- اسلام و سرمایہ داری

کیف - اجمیر

۱ ہمایوں کی ناکامی کے اسباب
۲- بدگمانی (افسانہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آزاد، حالی، شبلی اور نذیر احمد میں اردو کا سب سے بڑا انشا پرداز کون ہے؟

ہمارے اُردو لٹریچر کے اربعہ عناصر یعنی شبلی، حالی، نذیر احمد اور مولانا آزاد کا نام نامی آسمان شہرت پر آفتاب بنکر چمکا ہے، جنکے خامۂ جادو نگار کی دایہ نے دربار شاہجہانی کی اس ننھی سی چھوکری کو مدتوں کی جانفشانیوں کے بعد پال پال کر اس لائق کر دیا ہے کہ وہ اپنی ہمسایہ بہنوں کے پاس جہاں کبھی نہیں بیٹھ سکتی تھی، اب چار چار آنکھیں ملانے لگی ہے، ورنہ ایک وقت تھا کہ اردو کا دائرہ اسقدر تنگ اور غیر وسیع تھا کہ بیچاری گمنامی کے ظلمات میں جا پڑی تھی، علوم و فنون کا اس کے یہاں بہت کم وجود تھا، ادبی تاریخی اور فلسفیانہ حیثیت سے بالکل کوری تھی، البتہ اس کے مرتبوں کے دفتر میں شعراء کا نام تھا جو اسے عالم خیال کی سیر کراتے مگر واقعات کے میدان سے دور ہی دور لئے پھرتے تھے، مگر فللہ الحمد کہ ایک مدت کے بعد ان بزرگوں (شبلی حالی نذیر احمد اور آزاد) کے سہارے پر گمنامی کے عالمگیر تاریکی سے اس نے جو سر نکالا تو آفتاب شہرت کی شعاعیں اس پر عکس فگن تھیں، اس سماں کو دیکھکر اپنی اس عالم بیکسی پر انکی ذرہ نوازیوں کو یاد کر کے بزبان حال وہ بول اٹھی:

شاہان چہ عجب گر بنوازند گدا را"۔

لیکن اتفاق سے اندنوں بعض علمی حلقوں میں یہ سوال گشت لگا رہا ہے

ہے کہ اردو کا سب سے بڑا انشا پرداز ان چاروں بزرگوں میں سے کون ہے، سو خاکسار کا اس باب میں نتیجہ فکر یہ ہے کہ اردو کا سب سے بڑا انشا پرداز محمد حسین آزاد ہے اردوئے معلی کا ہیرو ہے آگے چلکر ہم اس کو بخوبی ثابت کریں گے، مگر اول اول ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ انشا پردازی کا اطلاق کن کن اشیا پر ہوتا ہے، انشا پردازی اعلےٰ درجہ کی تحریری قابلیت کا نام ہے جسکو فصاحت اور بلاغت کے بےمثل پیرایہ میں اس طرح ادا کیا جائے کہ اگر کسی واقعہ یا تخیل کی تصویر کھینچنی منظور ہو تو اس کی زندہ تصویر کا سماں آنکھوں کے روبرو پھر جائے، فصاحت سے یہ مطلب ہے کہ الفاظ ثقیل بھدے اور غیر مانوس نہوں اور قواعد صرفی کے رو سے صحیح ہوں، اور روزمرہ اور محاورہ اگرچہ ایک جداگانہ وصف سمجھا جاتا ہے، لیکن درحقیقت وہ فصاحت ہی کا ایک فرد خاص ہے[۱]، بلاغت اسے کہتے ہیں کہ کلام فصیح مقتضائے حال کے مناسب ہو، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اگر خوشی اور فرحت کا موقع ہو تو سرور و انبساط کی روح پھونکی جائے، اگر غم و الم کی داستان بیان کرنی ہو تو رنج و مصیبت کی تصویر کھینچی جائے، مگر اکثر مواقع ایسے آپڑتے ہیں کہ جہاں کلام کا نشتر دلپر اسی وقت کھٹکتا ہے جبکہ اسکو گوناگوں طریقہ سے تشبیہ، استعارے اور ضرب الامثال کے قالب میں ڈھال دیا جائے، کیونکہ یہ چیزیں حسن کلام کا زیور ہیں بلکہ سچ یہ ہے کہ نظم نثر تصویر اور تحریر میں جو کچھ جادوگری ہے، بہت کچھ انہی کی بدولت ہے[۲] بشرطیکہ اسمیں اعتدال ہو ورنہ اصل مضمون خاک میں ملجائیگا اور فسانہ عجائب اور منبجر قعہ کے مضامین کی طرح مقصود مبالغہ کے کانٹوں میں الجھکر رہجائیگا، اسکی مثال یوں سمجھنی چاہیے کہ مثلاً کوئی اپنے بیٹے کے مرجانے پر بجائے یہ کہنے کے کہ "میرا عزیز بیٹا مر گیا" یوں کہے کہ "میری آنکھ پھوٹ گئی" یا "میرا گل مرجھا کر

[۱] دیکھو موازنہ انیس دبیر صفحہ ۲۶، تعریف فصاحت [۲] موازنہ انیس دبیر صفحہ ۵۰،

خاک پر گر گیا" تو مضموں کہاں سے کہاں تک بلند ہو جاتا ہے،

اسی طرح ضرب الامثال اور تشبیہات بھی لٹریچر کی روح خیال کیجاتی ہیں جیسے "دلی دور است، ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، چھوٹا منہ بڑی بات" وہ جملے ہیں جن سے بڑے سے بڑے مضمون کو باتوں باتوں میں ادا کر سکتے ہیں، کبھی معشوق کیلئے "گل، زلف کے لیے بنفشہ، آنکھ کے لیے نرگس، قاصد کے لیے باد سحر، لاکر کلام کو بہت بلیغ بنادیتے ہیں، اسی طرح کلیجہ پر سانپ لوٹنا، ہوا سے باتیں کرنا، آسمان سے زمیں پنوانا، وہ جملے ہیں جو کلام کے لطف کو دوبالا کر دیتے ہیں، غرضیکہ یہ وہ چیزیں ہیں جن کے بغیر بعض اوقات انشاپردازی کا جمال قائم نہیں رہ سکتا، خلاصہ یہ کہ انشاپردازی کے لیے حسب ذیل چیزیں ازبس لازمی ہیں"

(۱) کلام کا فصیح ہونا، یعنی عیوب ثلاثہ سے پاک صاف ہونا، اگر اس کے ساتھ ساتھ روزمرہ اور محاورات بھی ہوں تو کلام کی فصاحت اور بڑھ جائیگی، کیونکہ یہ چیزیں اسکا ایک فرد خاص ہیں،۔

(۲) کلام کا بلیغ ہونا، اور اس کے لئے مناسب موقع پر تشبیہ استعارہ اور ضرب الامثال سے کام لینا جو لٹریچر کی جاں ہیں اور حسن کلام کا زیور،

(۳) معانی کا بلیغ ہونا، کیونکہ اعلےٰ درجہ کی بلاغت معانی کی بلاغت ہے، الفاظ سے اسکا چنداں تعلق نہیں، محض مضامیں کو بلیغ یا غیر بلیغ کہہ سکتے ہیں، بلاغت الفاظ درحقیقت بلاغت کا ابتدائی درجہ ہے[1]۔

غرضیکہ انشاپردازی کے شرائط یہ ہیں، جنکا ایک ادیب یا انشاپرداز میں پایا جانا لازمی ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ انشاپردازی کی یہ تعریف کس کے کلام پر بدرجۂ اتم صادق آتی ہے، تاکہ اس کو سب پر فوقیت دیجائے، مگر اسکے معلوم کرنے کا

[1] موازنہ انیس و دبیر صفحہ ۳۲،

ایک اور بھی ذریعہ ہے وہ یہ کہ اگر ان بزرگوں میں سے کوئی صاحب کسی خاص فن کے دائرہ میں مقید نہ ہونگے بلکہ اس سے نکلکر ہر قسم کے تخیلات پر بھی بہ نسبت دوسروں کے نہایت کامیابی کے ساتھ بہت کچھ لکھ سکتے ہیں تو ان کو اس حیثیت سے دوسروں پر ترجیح ہوگی، لیکن مشکل یہ ہے کہ ان بزرگوں نے ایک ہی مسئلہ پر بہت کم قلم آزمائی کی ہو، البتہ کہیں کہیں بعض بعض مقامات متحد المعنا میں نظر آ گئے ہیں جن کو ہم موازنہ کے طور پر پیش کرنا چاہتے ہیں،

علامہ شبلی شیراز کی مشہور سیرگاہ چشمۂ رکنا باد کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں،

"رکنا باد جو ایک چشمہ ہے شیراز کی مشہور سیرگاہ ہے، اب تو محض ذرا سی نہر رہگئی ہے، خواجہ صاحب کے زمانہ میں وسیع چشمہ ہوگا، اس کے کنارے بیٹھ کر لطف اٹھاتے ہیں، دوست احباب جمع ہوتے ہیں، ہر قسم کی صحبتیں رہتیں، اکثر اشعار میں مزے لے لے کر اسکا ذکر کرتے ہیں،

بدہ ساقی مے باقی کہ در جنت نخواہی یافت — کنار آب رکنا باد وگلگشت مصلیٰ را [۱]

آزاد اسکو یوں فرماتے ہیں"

"زمین مذکور سبزہ و گل کا وطن ہے، خصوصاً فصل بہار میں کہ جب سبزہ فرش خاک پر زمرد سجاتا ہے، پھول سبزہ کے سر پر تاج رکھتا ہے، در و دیوار سے بہار برستی ہے، شادابی ہوا میں موجیں مارتی ہے، شیراز کے گلزار، خاک مصلےٰ، چشمہ رکنا باد، اصفہان کے مرغزار، کوہ الوند کی چوٹیاں اور دامن پھولوں سے بھرے، ان کے آثار چڑھاؤ پر پانی کی چادریں گرتی ہیں، اور گھاٹیوں میں گرجتے بادلوں کی طرح گرداگرد اتی چلی جاتی ہیں، انہیں میں سے لہراتی لہریں نکلتی ہیں۔ لہکتی مہکتی ہوا میں کبھی ابر کبھی بادلوں کی بہار کبھی منہ کا پھوار،

[۱] شعر العجم جلد دوم صفحہ ۲۲۱۔

بدہ ساقی مے باقی کہ در جنت نخواہی یافت کنار آب رکنا باد و گلگشت مصلیٰ را [1]

اب غور سے دونوں بزرگوں کی عبارت کو دیکھو، کسقدر فرق نظر آتا ہے ' دکھانا تو یہ ہے کہ خواجہ صاحب کے سامان تفریح چشمہ رکنا باد کے کنارے کس قسم کے تھے، مگر آزاد نے اس کے لئے ایک خاص طرز بیان ایجاد کیا ہے جو علامہ کے یہاں بہت پھیکا ہے، خصوصاً خط کشیدہ جملے بہت پر شکوہ اور فصیح ہیں جنھیں محاورہ کے طور پر اکثر بولا کرتا ہیں"

گلستان سعدیؒ کی عالمگیر شہرت اور اسکی عام مقبولیت پر مولانا حالی لکھتے ہیں اگرچہ اس کے ساتھ بوستان کا بھی ذکر ہے۔

"ان دونوں کتابوں کو شیخ کے کلام کا لب لباب کہنا چاہئے، ظاہرا فارسی زبان میں کوئی کتاب اس سے زیادہ مقبول خاص و عام نہوئی۔ . . . . بچپن میں اسکی تعلیم شروع ہوتی ہے' اور بڑھاپے تک مطالعہ کا شوق رہتا ہے' لاکھوں استادوں نے انہیں پڑھایا، اور کروڑوں شاگردوں نے انہیں پڑھا' اس کے بشمار نسخے خوشنویسوں کے قلم سے لکھے گئے' اور بے انتہا اڈیشن لوہے اور پتھر پر چھاپے گئے' مشرق اور مغرب کی اکثر زبانوں میں ان کے ترجمے ہوئے' مشائخ اور علما نے اسکی قدر کی [2]"

آزاد اسپر فرماتے ہیں'

"عجائب اتفاق سے ہے کہ اس عہدی کے ۶۵۶ھ میں شیخ سعدی کی زبان پر جوش طبیعت نے ایک چشمہ کھولدیا، اس میں فصاحت نے شربت اور سلاست نے دودھ بہایا، اور گلستان ایک ایسی کتاب سرسبز ہوئی جسکا آجتک جواب نہیں ' ادنےٰ سے اعلےٰ تک کوئی پڑھا لکھا نہوگا جس نے اس سے سبق نہ پڑھے ہوں' مگر

[1] سخندان پارس صفحہ ۲۱۲

اس عالم میں پڑھا ہے کہ گویا نہیں پڑھا' .... عجب تر یہ کہ عالم
عارف اور پارسا سے رند بے حیا تک سب پڑھتے ہیں اور اپنے اپنے مزے لیتے ہیں'
پھر کیسی طبیعت اور کیسا مزاج لیکر آیا تھا کہ شاہانہ، فقیرانہ، واعظانہ، نصیحت بزرگانہ
جس مضمون کی حکایت کو چاہو پڑھ لو، اسکی شوخی اپنے انداز سے کبھی بھی نہیں چوکتی'
یہ بھی قدرتی اتفاق ہے کہ حسن قبول نے اُسے محبت کے ہاتھوں پر لیا[1]

آزاد اور حالی کی اس عبارت میں بہت فرق ہے، حالی کی عبارت بالکل سادہ ہے، لیکن آزاد نے کچھ اس ڈھنگ سے لکھا ہے کہ فصاحت کا دریا بہا دیا، اور اسپر خط کشیدہ جملے خاص لطف دیتے ہیں، نذیر احمد کا کوئی مشترک مضمون نہیں ملتا مگر کم سے کم بطور امتحان کے ہم انکی ایک عبارت نقل کئے دیتے ہیں، جسکو انھوں نے لکھکر ایک خاص موقع پر پڑھا تھا، فرماتے ہیں۔

جن دنوں قرآن نازل ہوا ہے، وہ ایک وقت تھا کہ عربی لٹریچر کے جوبن پر بہار آرہی تھی، لوگوں میں یہ مادہ ایسا برسر ترقی تھا کہ کوئی متنفس مذاق شعری سے خالی نہ تھا' یہ تو عربی زبان کے عروج کا زمانہ تھا، یوں بھی عرب کو اپنی بولی پر بلا کا ناز تھا، انھوں نے اپنے سوا دوسروں کا نام رکھا تھا "عجم" یعنی گونگے کہ جن کو بات کرنے کا سلیقہ نہیں، ایسے لوگوں سے کیسی ہی اچھی بات کہی جاتی، وہ ہوتی حلیہ فصاحت سے عاری تو اس کے کان پر جوں بھی نہ چلتی، پس ضرور تھا کہ کسی داؤں سے پچھاڑا جائے، اجاڑ جوان کو خوب رواں تھا، یعنی فصاحت" قرآن نازل ہوا تو جو اپنے اپنے وقت کے سرسید، محسن الملک، سید محمود اور حالی شبلی تھے سب کے چھکے چھوٹ گئے[2]

ڈپٹی صاحب کی یہ عبارت جسقدر شوخ اور ظریفانہ انداز میں نظر آتی ہے اگرچہ ایک سلیم الطبع انسان کو ناگوار خاطر معلوم ہوگی لیکن انصاف سے دیکھو

[1] سخندان پارس صفحہ ۲۳، [2] لکچرز آف ڈپٹی نذیر احمد،

توانشا پردازی کا اعلےٰ نمونہ ہے مگر تاہم آزاد کے جدتِ اختراع کو نہیں پہنچ سکتی، جو آگے چلکر مجموعی حیثیت سے معلوم ہوگا، موازنہ کی یہ چند صورتیں گزر گئیں سب میں آزاد ہی کو مجموعی لحاظ سے ترجیح رہی، اور چونکہ اب اس کی کوئی صورت نظر نہیں آتی اسلئے ہم ہر شخص کے خصوصیات انشا یعنی کلام کی فصاحت بلاغت اور ان کے دائرۂ سخن کے حدود کی تعیین کے متعلق فرداً فرداً مفصل گفتگو کرینگے، جس سے یہ اندازہ لگانا بالکل آسان ہوگا کہ مجموعی حیثیت سے کس کو ترجیح ہے، چنانچہ پہلے ہم علامہ شبلی کے خصوصیات کلام کو دکھلاتے ہیں، علامہ فرماتے ہیں،

سب سے اخیر کوکبۂ نبوی نمایاں ہوا، جس کے پرتو سے سطح خاک پر نور کا فرش بچھا جاتا تھا، حضرت زبیر بن العوام علم بردار تھے، ابوسفیان کی نظر جمال مبارک پر پڑی تو پکار اٹھے کہ حضور نے سنا؟ عبادہ کیا کہتے ہوے گئے، ارشاد ہوا کہ عبادہ نے غلط کہا، آج کعبہ کی عظمت کا دن ہے یہ کہکر حکم دیا کہ فوج کا علم عبادہ سے لیکر ان کے بیٹے کو دیدیا جائے[۱]،

پھر ایک جگہ فرماتے ہیں،

"جو لوگ اختیار کے قائل ہیں انکا منتہای استدلال یہ ہے کہ انسان کو خدا نے یہ اختیار دیا ہے کہ وہ دو متناقض کاموں میں سے جس کام کو چاہے اختیار کرلے، اسلئے انسان کو ارادہ اور اختیار حاصل ہے اور اسلئے وہ مجبور نہیں کہا جا سکتا، لیکن اسکی تہ میں بھی غلطی ہے، بے شبہ خدا نے انسان کو ارادہ اور قدرت عطا کی ہے، لیکن اس ارادہ پر بھی وہ مجبور ہے، یعنی جب وہ کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو ایسے اسباب جمع ہوتے ہیں کہ وہ اس کام کے ارادہ پر مجبور رہتا ہے، لوگوں نے یہ سمجھکر کہ ہمارا نفس بد ہمکو برے کام کا حکم دیتا ہے، نفس بد کا نام

[۱] سیرت النبی صفحہ ۲۷۰،

نفس امارہ رکھا ہے، لیکن خود یہ نفس امارہ کسکا مامور ہے[1]

ان اقتباسات سے پتہ چلتا ہے، کہ علامہ کی عبارت کسقدر صاف شفاف اور سلیس ہوتی ہے، اور مشکل واطناب طلب مضموں کو وہ کس خوبی سے چند جملوں میں ادا کر دیتے تھے، اسکی بہتیری مثالیں ہم انکے کلام سے پیش کرتے ہیں مگر چونکہ وہ بہت طول طویل ہیں جو کسی طرح یہاں لکھی نہیں جا سکتیں، اسلئے ہم محض چند حوالے پر اکتفا کریں گے،

(۱) غزوۂ بدر ایک مختلف فیہ تاریخی واقعہ ہے، اسمیں مسلمانوں کے پیش قدمی کے علل اور اسباب کا دریافت کرنا کہ آیا انکا مقصد اس سے مشرکین کے حملوں کا دفاع تہا، یا کارواں قریش کو لوٹنا، ایک معرکۃ الآرا مبحث ہے، اور ضرورت تہی کہ اسکے لیئے سیکڑوں صفحے کم سے کم وقف کر دیے جائیں، مگر علامہ نے کس خوبی سے قرآں وغیرہ کے چند اصول قائم کرکے محض آٹھ صفحوں پر "غزوۂ بدر پر دوبارہ نظر" کے عنواں سے لکھدیا ہے،

(۲) ذبیح کون ہے؟ اس طویل البحث مضموں کو فقط دو ورق میں باوجود پیچیدہ ہونے کے طے کر دیا،

(۳) کہ معظمہ کی تعیین کے اختلاف کو تین صفحوں میں ادا کیا"

ان سب باتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مولانا تاریخ کے مشکل سے مشکل مسائل کو کس آسانی کے ساتھ بات بات میں حل کر دیتے، اور عبارت نہایت سلیس اور رواں ہوتی، اور یہی انکا اصلی کمال ہے، تمام سیرت نبوی، شعر العجم اور اں کی تمام سوانحات کو اٹھا کر دیکھو، سب کو اسی رنگ میں رنگی ہوئی پاؤگے یعنی عبارت سادہ سلیس صاف شفاف اور رواں ہوگی، البتہ سیرت نبوی میں

[1] شعر العجم جلد پنجم صفحہ ۲۱۶،

میں جسکو مولانا نے نہایت جوش اور خروش کے ساتھ لکھی ہے، کہیں کہیں واقعات کے ضمن میں اپنی بہترین انشا پردازی کا جوہر بھی دکھلایا ہے، اگران مقامات کو اگر یکجا جمع کر دیا جاے تو زیادہ سے زیادہ اس کے لئے چار ورق درکار ہوں گے، اس جگہ ہم انکی چند بہترین عبارت کو نقل کرتے ہیں، مولانا فرماتے ہیں،

"چمنستان دہر میں بارہا روح پرور بہاریں آچکی ہیں، چرخ نادرہ کار نے کبھی کبھی بزم عالم کو اس سروسامان سے سجائی ہیں، کہ نگاہیں خیرہ ہوکر رہگئیں ہیں، لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کے انتظار میں پیر کہن سال دہر نے کروڑوں برس صرف کر دے ہیں، سیارگان فلک اسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ تھے، چرخ کہن مدتہاے دراز سے اسی صبح جانفواز کے لیے لیل ونہار کی کروٹیں بدل رہا تھا، کارکنان قضا وقدر کی بزم آرائیاں، عناصر کی جدت طرازیاں، ماہ وخورشید کی فروغ انگیزیاں، ابر وباد کی تیز دستیاں، عالم قدس کے انفاس پاک، توحید ابراہیم، جمال یوسف، معجز طرازی موسیٰ، جاں نوازی مسیح، سب اسی لئے تھے کہ یہ متاع ہاے گراں ارز شاہنشاہ کونین کے دربار میں کام آئیں گے، آج کی صبح وہی صبح جانواز وہی ساعت ہمایوں، وہی دور فرخ فال ہے، ارباب سیر اپنے محدود پیرایہ بیاں میں لکھتے ہیں "کہ "آج کی رات ایوان کسریٰ کے چودہ کنگرے گرگئے، آتشکدہ فارس بجھ گیا، دریاے ساوہ خشک ہوگیا، لیکن سچ ہے کہ ایوان کسریٰ نہیں، بلکہ شان عجم، شوکت روم، اوج چین کے قصرہاے فلک بوس گر پڑے، آتش فارس نہیں بلکہ جحیم شر، آتشکدہ کفر آذرکدہ گمرہی سرد ہوکر رہگئے، صنمخانوں میں خاک اڑنے لگی، بت کدے خاک میں ملگئے، شیرازۂ مجوسیت بکھر گیا، نصرانیت کے اوراق خزاں دیدہ ایک ایک

کر کے جھڑ گئے، توحید کا غلغلہ اٹھا، چمنستان سعادت میں بہار آگئی آفتاب ہدایت کی شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں، اخلاق انسانی کا آئینہ پر تو قدس سے چمک اٹھا[1] اس سے کبھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مولانا نے ولادت نبوی اور اس کے ضمن میں دیگر تاریخی واقعات کو جس گوناگوں انداز میں دکھلایا ہے اس سے اُن کی تاریخی واقعات کو نہایت عمدگی سے قلمبند کرنے کی شہادت ملتی ہے، لیکن خط کشیدہ جملے تبلاتے ہیں کہ عبارت کی ساری شان فارسی الفاظ کی خوشگوار آمیزش نے رکھ لی ہے، اگرچہ فی نفسہ ہم اسے برا نہیں کہتے کیونکہ اردو زبان فارسی کی ہمیشہ سے خوشہ چیں رہی ہے لیکن کسی استاد کے اس مقولہ کو کہتے ہیں اسے زبان اردو" جیسیں نہو رنگ فارسی کا،

پر نظر پڑتی ہے تو کہنا پڑتا ہے کہ اردو کی یہ شان نہونی چاہیئے، تم خود دیکھو، پیر کہن سال دہر، متاع ہائے گراں ارز، معجز طرازی موسیٰ، آذر کدہ گبر ہی، اوج جبیں کے قصرہائے فلک بوس، کیا یہ جملے اردو جیسی شیریں اور سلیس زبان کے لیے کس طرح زیبا ہیں،

پھر ایک جگہ فرماتے ہیں،

"اب ایک طرف نود سالہ پیر ضعیف ہے جسکو دعاہائے سحر کے بعد خانداں نبوت کا چشم و چراغ عطا ہوا تھا، جسکو وہ تمام دنیا سے زیادہ محبوب رکھتا تھا، اب اسی محبوب کے قتل کے لیے اسکی آستینیں چڑھ چکی ہیں، اور ہات میں چھری ہے، دوسری طرف نوجوان بیٹا ہے جس نے بچپن سے باپ کی محبت آمیز نگاہوں کی گود میں پرورش پائی ہے" اب باپ ہی کا مہر پرور ہات اسکا قاتل نظر آتا ہے، ملائکہ قدسی فضائے آسمانی سے عالم کائنات کا یہ حیرت انگیز تماشا دیکھ رہے ہیں،

[1] سیرت نبوی جلد اول صفحہ

اور انگشت بہ دنداں ہیں کہ دفعتہً عالم قدس سے یہ آواز آتی ہے،

طفیاں ناز بیں کہ جگر گوشۂ خلیل — در زیر تیغ رفت و شہیدش نمی کنند

بیٹے نے جس استقلال، جس عزم اور جس حیرت خیز ایثار سے اپنے آپ کو قربانی کے لیے پیش کیا، اسکا صلہ یہی تھا کہ رسم (قربانی) قیامت تک دنیا میں اسکی یادگار رہجائے[1]،

بہرکیف اس ساری داستان سے معلوم ہوا کہ مولانا کی ادبی معرکہ آرائیوں کا جولانگاہ فقط تاریخ ہے جسپر انھوں نے فلسفہ کا رنگ چڑھایا ہے اور انکی عبارت نہایت صاف شفاف اور سلیس ہوتی ہے اسی کو انکا اصلی کمال سمجھنا چاہیے، ملک کا ایک مشہور انشا پرداز لکھتا ہے،

"جس طرح تاریخ میں فلسفہ کا رنگ سب سے پہلے شبلی نے چمکایا ہے اردو کو انشا پردازی کے درجہ پر جس نے پہونچایا وہ آزاد اور صرف آزاد ہیں[2]"

فصاحت وبلاغت کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ علامہ کی عبارت چونکہ حشو وزوائد سے پاک اور سلاست اور روانی کا بہترین نمونہ ہے اسلئے فصیح ہے، اور مشکل سے مشکل مسائل کو وہ چند لفظوں میں ذہن نشیں کرا دیتے ہیں اسلئے بلاغت کی جان ہے، لیکن ایک بات یہاں اور قابل ذکر ہے وہ یہ کہ روزمرہ اور محاورات وغیرہ کی ان کے یہاں بیحد کمی ہے، تاریخی واقعات وغیرہ سے ہٹکر مولانا نے بہت کم لکھا ہے، شعر العجم میں خیال تھا کہ دائرہ تحقیق سے ہٹکر عام تخیلات پر کچھ لکھیں گے مگر اسمیں بھی علامتر تحقیق ہی تحقیق ہے، البتہ ایک جگہ شاعری کی تعریف کرتے ہیں، چنانچہ لکھتے ہیں،

"کسی چیز کا بیان جب اس طرح کیا جائے کہ اس شے کی اصلی تصویر آنکھوں میں

[1] سیرت نبوی جلد اول صفحہ ۲۰۳، [2] افادات مہدی صفحہ ۲۱۰،

پھر جائے تو اس پر شعر کی تعریف صادق آئیگی، دریا کی روانی، جنگل کا سناٹا، باغ کی شادابی، سبزہ کی لہک، خوشبو کی لپٹ، نسیم کے جھونکے، دھوپ کی شدت، گرمی کی تپش، جاڑوں کی ٹھنڈ، صبح کی شگفتگی، شام کی دلآویزی یا رنج و غم، غیض و غضب جوش و محبت، افسوس و عبرت خوشی ان اشیاء کا اسطرح بیان کرنا کہ اس کی صورت آنکھوں میں پھر جائے، یا وہی اثر دلپر طاری ہو جائے، یہی شاعری ہے[۵۱]"

مگر اس قسم کی مثالیں آپ کو بہت کم ملیں گی، غرضیکہ ان کے خصوصیات کلام کی تلخیص حسب ذیل یوں کیجا سکتی ہے۔

(۱) ان کے ادبی فتوحات کا دائرہ محض فلسفہ تاریخ تک محدود ہے، جسکو انہوں نے سلیس صاف اور رواں عبارت میں لکھا ہے،

(۲) انکا کلام فصیح اور بلیغ ہے، البتہ روزمرہ اور محاورات اور امثال وغیرہ کی ان کے یہاں بہت قلت ہے،

(۳) وہ مضامین جو کسی واقعات یا خاص معلومات سے تعلق نہیں رکھتے اور سراسر تخیلات کے دفتر ہوا کرتے ہیں علامہ کے قلمرو سخن کے حدود سے باہر ہیں،

رہے حالی سوان کے ادبی کارناموں کو دیکھنے کے لئے ہم ان کی کتابوں کے چیدہ چیدہ اقتباسات ذیل میں درج کر دیتے ہیں، جن سے آسانی کے ساتھ ہم ان کے خصوصیات انشا معلوم کر سکتے ہیں، فرماتے ہیں:

مرزا کی نیت آموں سے کسی طرح سیر نہوتی تھی، اہل شہر تحفۃً بھیجتے تھے، خود بازار سے منگواتے تھے، باہر سے دور دور کا آم بطور سوغات کے آتا تھا،

۵۱ شعر العجم حصہ اول صفحہ ۱۲،

گر حضرت کا جی نہیں بھرتا تھا، نواب مصطفےٰ خاں مرحوم ناقل تھے کہ ایک صحبت میں مولانا فضل حق اور مرزا اور دیگر احباب جمع تھے، اور آم کی نسبت ہر شخص اپنی اپنی رائے بیان کر رہا تھا، کہ اسمیں کیا خوبیاں ہونی چاہییں، جب سب لوگ اپنی اپنی رائے کہہ چکے، تو مولانا فضل حق نے مرزا سے کہا کہ تم بھی اپنی رائے بیان کرو، مرزا نے کہا، بھئی، میرے نزدیک تو آم میں صرف دو باتیں ہونی چاہییں، میٹھا ہو اور بہت ہو سب حاضرین ہنس پڑے[1]

پھر ایک جگہ فرماتے ہیں،

"اگرچہ جس زمانہ میں کہ پہلی بار راقم کا دلّی جانا ہوا اس باغ میں بت جھڑ شروع ہو گئی تھی، کچھ لوگ دلّی سے باہر چلے گئے تھے اور کچھ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے، مگر جو باقی تھے اور جن کے دیکھنے کا مجھکو ہمیشہ فخر رہیگا، وہ بھی ایسے تھے کہ نہ صرف دلی سے بلکہ ہندوستان کی خاک سے پھر کوئی ویسا اٹھتا نظر نہیں آتا، کیونکہ جس سانچے میں وہ ڈھلے تھے وہ سانچہ بدل گیا اور جس ہوا میں انھوں نے نشوونما پائی تھی وہ ہوا پلٹ گئی[2]

ان اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے کہ حالی میں ایجاز بیانی کسقدر تھی، وہی مضمون جو دوسروں کے یہاں کئی صفحوں پر نہیں آسکتا ان کے یہاں اس کے لئے فقط چند سطریں کافی ہیں، پھر اسپر عبارت کا سلجھاؤ اور اسکا حشو و زوائد سے پاک صاف ہونا عجیب لطف دیتا ہے، حیات جاوید میں ایک جگہ لکھتے ہیں،

آئین اکبری اول تو زبان اور طرز بیان کے لحاظ سے ایک نئی طرح کی کتاب تھی، دوسرے جس قسم کے مضامین اسمیں بیان کئے گئے ہیں ... فارسی لٹریچر میں کبھی اس قسم کے مضامین بیان نہیں ہوئے تھے، اسلئے اس کے

[1] یادگار غالب صفحہ ۶۳، ۶۴، [2] یادگار غالب صفحہ ۱۔

پڑھنے سے جی الجھتا تھا، پھر آئین اکبری کے نسخے کاتبوں کے مسہود خطاسے اکثر مسخ ہو گئے تھے، اسلئے اسکا صحیح کرنا بہت دشوار تھا، سرسید نے اول جہاں تک مل سکے اس کے متعدد نسخے بہم پہونچائے، اسمیں ایک ادھ نسخہ صحیح بھی مل گیا[1] انکی ان عبارتوں کو دیکھکر کہنا پڑتا ہے کہ فن سوانح نگاری میں وہ ایک کہنہ مشق استاد کی حیثیت رکھتے تھے، اور جیسا کہ لائف نگاری چاہتی ہے کہ جہانتک ہو اختصار کے ساتھ تمام واقعات زندگی قلمبند کر دے جائیں تاکہ پڑھتے وقت طبیعت میں الجھن نہ پیدا ہو، وہ حتی الامکان ایجاز سے کام لیتے اور حشو و زوائد کو ہاتھ نہ لگاتے تھے، عبارت میں ایک خاص سلجھاؤ تھا اور یہی انکا اصلی کمال ہے جس نے انکو ممتاز بنادیا، اس سے قطع نظر کرکے دیکھئے تو وہ اس سے ہٹکر انشا پردازی کے عام منظر پر بھی نکل آئے ہیں، شعر و شاعری کا مقدمہ اسکی بہترین نظیر ہے، مسدس حالی کے دیباچہ میں وہ فرماتے ہیں"

البتہ شاعری کی بدولت چندروز جھوٹا عاشق بننا پڑا، ایک خیالی معشوق کی چاہ میں برسوں دشت وجنوں کی خاک اڑائی کہ قیس و فرہاد کو گرد کر دیا، کبھی نالہ نیم شبی سے ربع مسکوں کو ہلا ڈالا، کبھی چشم دریا بار سے تمام عالم کو ڈبو دیا، آہ و فغاں کے شور سے کروبیوں کے کان بہرے ہو گئے، شکایتوں کی بوچھار سے زمانہ چیخ اٹھا، طعنوں کی بھرمار سے آسمان چھلنی ہوگیا، جب رشک کا تلاطم ہوا ساری خدائی کو رقیب سمجھا، یہانتک کہ آپ اپنے سے بدگماں ہوگئے، جب شوق کا دریا امڈا تو کشش دل سے جذب مقناطیسی اور قوت کہربائی کا کام لیا، بارہا تیغ ابرو سے شہید ہوئے.................. اور بارہا ایک ٹھوکر سے جی اٹھے، گویا زندگی ایک پیراہن تھا کہ جب چاہا اوتار ڈالا اور جب چاہا

[1] حیات جاوید،

بن لیا، میداں قیامت میں اکثر گذر ہوا، بہشت دوزخ کی بارہا سیر کی، بادہ نوشی پر آئے، تو خم کے خم لنڈھا دئے، اور پھر بھی سیر نہوے، کبھی خانہ خمار کی چوکھٹ پر جبہ سائی کی، کبھی مے فروش کے در پر گدائی کی، کفر سے مانوس رہے، ایماں سے بیزار رہے، پیر مغاں کے ہاتھ پر بیعت کی، برہمنوں کے چیلے بنے، بت پوجے، زنار باندھا، قشقہ لگایا، زاہدوں پر پھبتیاں کیں، واعظوں کا خاکہ اڑایا، دیرو بتخانہ کی تعظیم کی، کعبہ و مسجد کی توہین کی، خدا سے شوخیاں کیں، نبیوں سے گستاخیاں کیں، اعجاز مسیحی کو ایک کھیل جانا، حسن یوسفی کو ایک تماشا سمجھا، غزل کہی تو پاک شہدوں کی بولیاں بولیں، قصیدہ لکھا تو بھاٹ اور بادخوانون کے منہ پھیر دئیے[ا]،

اس عبارت کو دیکھکر کہنا پڑتا ہے کہ جسطرح وہ فن لالف نگاری کے استاد تھے وہ ایک کامل انشا پرداز بھی تھے، مقدمہ شعروشاعری کو انھوں نے اسی رنگ میں لکھا ہے مگر انکا بہترین کارنامہ سیرت نگاری ہے، ان کے خصوصیات انشا یہ ہیں،

(۱) سیرت نگاری، اس فن میں جتنی کتابیں انھوں نے لکھی ہے سبکی عبارت سلیس اور بالکل سادہ ہے،

(۲) لالف نگاری سے ہٹکر وہ عام تخیلات میں بھی اپنی انشا پردازی کا بہترین ثبوت دے سکتے ہیں، مقدمہ اسکی دلیل ہے، مگر یہ انکا اصلی کمال نہیں،

(۳) انکا کلام فصیح اور بلیغ ہے، فصیح یوں ہے کہ اں کے یہاں عیوب ثلاثہ سے عموماً الفاظ پاک ہوتے ہیں اگرچہ زیادہ تر سادہ ہی کیوں نہوں، بلیغ اس وجہ سے ہے کہ زیادہ تر اں کی تصانیف فن سیرت میں ہے، یہ فن ایجاز طلب ہے اور ایجاز

ا دیباچہ مسدس حالی صفحہ ۲،

سلجھاؤ اور حشو زوائد کا نہ ہونا اُن کے کلام کا جزو اعظم ہے، اور یہ حد درجہ کی بلاغت ہے کہ جو فن جیسا ہو اسکو اسی رنگ میں ادا کر دیا جائے،

آقائے اردو علامہ نذیر احمد کا اعلیٰ وصف دہلی کی ٹکسالی زبان کو معیار ترقی پر پہونچا دینا ہے، اُن کی بے مثل فصاحت اور اعلےٰ درجہ کی بلاغت لٹریچر کی جان ہیں جسکا اندازہ ان کے اقتباسات کلام سے ہوتا ہے،

فرماتے ہیں، -

"خداوند کریم کا شکر اپنی گویائی کی بساط بھر تو ادا ہو ہی نہیں سکتا اسکی بندہ نوازیاں اور ہزاروں لاکھوں نعمتوں کی مکافات کا حوصلہ، چھوٹا منھہ بڑی بات پیغمبر صاحب کی مدح، اپنی ارادت ناقص کی قدر تو بن ہی نہیں پڑتی ان کی شفقتوں اور دل سوزیوں کی تلافی کا دعوی، اتنی سی جان گز بھر کی زبان[1]"

ان جادو بھرے جملوں کو دیکھو، اور پھر اسپر ضرب الامثال کا اضافہ سونے پہ سہاگہ کا کام دیتا ہے، ایک جگہ فرماتے ہیں،

حسن آرا کے مزاج کی افتاد، ایسی بری پڑی تھی کہ اپنے ہی گھر میں سب سے بگاڑ تھا، نہ ماں کا ادب، نہ آپا کا لحاظ، نہ باپ کا ڈر، نہ بھائیوں سے ملاپ، نوکر ہیں کہ آپ نالاں ہیں، لونڈیاں ہیں کہ الگ پناہ مانگتی ہیں، غرض حسن آرا سارے گھر کو سر پر اٹھائے رہتی تھی، شاہ زمانی بیگم کے آنے سے چاہیئے کہ بڑی خالہ سمجھکر حسن آرا گھڑی دو گھڑی کو چپ ہو کر بیٹھ جاتی، کیا ذکر شاہ زمانی بیگم کو پالکی سے اترے دیر نہوئی تھی کہ لگاتار دو تین فریادیں آئیں، نرگس روتی ہوئی آئی کہ بیگم صاحب دیکھئے چھوٹی صاحبزادی نے

[1] دیباچہ مراۃ العروس صفحہ ۱،

اس زور سے تھپڑ مارا کہ میری آنکھیں پھوٹتے پھوٹتے بچ گئیں، سوسن نے آفریاد کی کہ بیگم صاحب چھوٹی صاحبزادی نے مجھ سے کہا کہ دیکھوں سوسن تیری زبان جوں ہی پنے دکھانے کو زبان نکالی نیچے سے تھوڑی میں ایسا مکا مارا کہ سارے دانت زبان میں بیٹھ گئے، گلاب بلبلا اٹھی کہ ہائے میرا کان خونا خون ہو گیا، دائی چلائی کہ دیکھئے مجھ کمبخت کے ایسے زور سے لکڑی ماری کہ بازو میں بدھی پڑ گئی، باورچی خانہ سے ماما نے دہائی دی کہ اچھے کوئی ان کو سمجھانا سالن کی پتیلیوں میں مٹھیاں بھر بھر کر راکھ جھونک رہی ہیں، شاہ زمانی بیگم نے آواز دی کہ حسنا یہاں آؤ، خالہ کی آواز پہچان بارے حسن آرا چلی تو آئی، نہ سلام نہ دعا، ہاتھوں میں راکھ پاؤں میں کیچڑ اسی حالت میں دوڑ خالہ سے لپٹ گئی، خالہ نے کہا حسنا تم بہت شوخی کرنے لگی، حسن آرا نے کہا اس سنبل چڑیل نے فریاد کی ہوگی، یہ کہکر خالہ کی گود سے نکل ایک کر بخطا ہقصور سنبل کا سر کھسوٹ لیا، ہتیرا خالہ ایں ایں کرتی رہیں ایک نہ سنی[1]،،

عبارت سے اعلیٰ درجہ کی انشا پردازی ٹپکتی ہے، طرز ادا بہت دلکش ہے اہل زبان کے روزمرہ کا چٹخارہ اگر دیکھنا مقصود ہو، تو اس عبارت کو پڑھو کہ کس خوبی سے مضمون کو ادا کیا ہے، محاورات کی بھی کثرت ہے۔

پھر ایک جگہ فرماتے ہیں،

"یوں دیکھنے اور کہنے کو تو حسن آرا اکیلی مکتب میں بیٹھی مگر کوئی درجن بھر لونڈیاں اسکے ساتھ تھیں اور کوئی کوڑی بھر سہیلیاں، لونڈیاں کا تو یہ قاعدہ تھا کہ بے ضرورت بھی ہردم اور ہر لحظہ چاروں طرف حسن آرا کو گھیرے رہتیں اور کچھ کام نہیں تو بات بات میں خوشامد بات بات پہ تعریف، ذرا ٹھکنی کہ سب کی سب

[1] بنات النعش صفحہ ۳۰۲،

بول انھیں بسم اللہ بسم اللہ، چھینک لی تو سب چلائیں شکر الحمد للہ، مانی جی ہیں کہ چپکے ہی چپکے قل ہو اللہ کی تسبیحاں پڑھ پڑھ کر پھونک رہی ہیں، انا ہیں کہ بار بار ان پیکا ذ دم کرتی جاتی ہیں، اور جو کہیں حسن آرا نے آنکھ اٹھا کر دیکھا تو کوئی جلدی جلدی پنکھا جھلنے لگی، کوئی چوری یا رومال ہلانے کھڑی ہو گئی، کوئی بولی واری جاؤں گلوری کھالو یا گوٹے ہی کے دو دانے ڈال لو، دیر ہوئی منہ بدمزہ ہو گیا ہوگا، کوئی کہنے لگی، صدقے گئی، ایک گھونٹ شربت ہی پی لو، نگوڑے ہونٹھ ہیں کہ سوکھے جاتے ہیں پپڑیاں بندھ گئی ہیں، بھاڑ میں جائے ایسا پڑھنا اور آگ لگے ایسے مکتب کو، لڑکی کا سونا تو دیکھو کیسا ذرا سا نکل آیا ہے یہ کہکر جلدی سے لپک کر چٹا چٹ بلائیں لے حسن آرا کو گلے سے لگا لیا، جس شخص پر حسن آرا کی طرح ایسے لونڈیوں کا غضب الٰہی اور ایسے نوکروں کی بلا مسلط ہو اسکے مزاج کا درست رہنا عجب کی بات ہے، فرشتہ بھی ہو تو ایسی صحبت میں تو بد ہوتا سے بدتر ہو جائے[۱]،

اس عبارت پر نگاہ ڈالو، اہل زبان کے روزمرہ کی بول چال اور اس پر اضافہ یہ کہ محاورات و امثال کی کثرت کو علامہ نذیر نے جس خوبی کے ساتھ اپنے کلام میں جگہ دی ہے، اس سے ان کی انشا پردازی کی غیر معمولی قابلیت کا پتہ چلتا ہے، حق تو یہ ہے کہ دہلی کی ٹکسالی زبان ان کے قلم کے نسا یہ میں پلکر بام ترقی کے انتہائی زینہ تک پہنچ گئی، اور ان کے قلم کے فیوض و برکات سے مالا مال ہو گئی رویائے صادقہ کی وہ عبارت جہاں انہوں نے دہلی کی سوسائیٹی کا نقشہ کھینچا ہے خصوصًا اس بلا کی ہے کہ اسکے متعلق ملک کے ایک مشہور انشا پرداز کو یہ کہنا پڑا کہ اس سے بڑھکر چند سطریں لکھنا کسی طرح امکان میں نہیں آسکتا، مجھے تعجب ہے

۱؎ بنات النعش صفحہ ۶، ۲؎ ایم مہدی۔

ان لوگوں پر جو بے سوچے سمجھے زباں سے کہہ گذرتے ہیں کہ علامہ نذیر احمد کا کلام بلیغ نہیں، اس کی حقیقت بھیڑوں کے غول سے زیادہ نہیں کہ جس راستہ پر ہولیا اندھے ہوکر اسی پر ہمیشہ ہمیشہ چلتے رہے، انکا منتہای استدلال یہ ہے کہ ان کے لکچر ز ٹو دی پوائنٹ نہیں ہوتے، بھلا ان سے کوئی پوچھے کہ جس شخص کے لکچروں کا کوئی مستقل عنوان نہیں ہوتا اُس کے ٹو دی پوائنٹ ہونے کے کیا معنی؟ ڈپٹی صاحب محض تفریحاً جلسہ میں کھڑے کئے جاتے اور جہانتک ان سے ہوسکتا اپنی جادو اثر تقریر اور اپنی بے مثل فصاحت کا جوہر دکھاتے، کسی خاص مسئلہ پر بولنے کے لیے وہ شاید ہی اسٹیج پر آئے ہوں، اگر بالفرض وہ آتے تو اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ وہ اپنی بےمثل قادر الکلامی اور اعلےٰ درجہ کی علمی قابلیت کے ہوتے ہوئے ناکام رہجاتے، کیا توبۃ النصوح یا دیگر کتابوں کے لکھنے میں وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہوئے، المحقوق والفرائض میں انھوں نے ایماں بالقدر کے دقیق مسئلہ کو جس خوبی سے ثابت کیا ہے اس سے اس کی بے مثل بلاغت کی داد دینی پڑتی ہے، البتہ اس جگہ ایک بات کھٹکتی ہے وہ یہ کہ اس کے لکچروں یا دیگر تصانیف میں انگریزی وغیرہ کے ثقیل اور غیر مانوس الفاظ اس طرح آگئے ہیں کہ اس کے کلام کے غیر فصیح ہونیکا دھوکہ ہوتا ہے اگر شرط انصاف یہ ہے کہ ان سبک نکتہ چینیوں سے انکا کلام بے نیاز رہیگا، چنانچہ اس کے متعلق امور ذیل کا لحاظ رکھنا کافی ہے،

(۱) ہر زباں کے فصحا کا قاعدہ ہے کہ وہ دوسری زباں کے بہت سے الفاظ اپنی زباں میں استعمال کرنے لگتے ہیں، مصر و شام میں یورپ کے عام زبانوں کے بہت سے الفاظ معرب ہوکر آگئے ہیں، حالانکہ انکی جگہ خود اس کی زبان میں الفاظ موجود ہوتے ہیں، جیسے پروانہ راہداری کو قدیم عربی میں تذکرہ مرور کہتے ہیں مگر مصریوں نے اس کے ہوتے ہوئے پاسپورٹ کا معرب بسابورط بنا لیا ہے،

(۲) ان کے یہاں ایسے الفاظ بہت کم آپ کو ملیں گے لہذا اس قلتِ عیوب کی کثرتِ محاسن کے مقابلہ میں کچھ وقعت نہیں، اور نہ اس سے ان کی فصاحت پر کچھ دھبہ آتا ہے مرزا غالب اردو کے مسلم الثبوت شاعر ہیں مگر نقادان سخن اکثر ان کے کلام پر سخت چوٹ کر بیٹھتے ہیں، لیکن کیا اس معمولی خامیوں سے ان کے اصلی کمال کو کوئی صدمہ پہونچتا ہے گلاب کا پھول دنیا کی بہترین نعمت ہے مگر اسکا حال یہ ہے کہ کانٹوں میں الجھا ہوا ہوتا ہے،

(۳) ہم نے مانا کہ ایسے الفاظ حلیہ فصاحت کے لیے زیبا نہیں، مگر انھوں نے اُنھیں کچھ اسطرح ادا کیا ہے کہ یہی الفاظ جو دوسروں کے یہاں بیگانہ ہیں، ان کے زور بیان میں آکر اس طرح جذب ہوگئے ہیں کہ اجنبیت کا ذرہ برابر احساس نہیں ہوتا اور نہ اس سے ان کے مخصوص طرز کو کچھ صدمہ پہونچتا ہے، یہ سارا قصور ان کے زور بیاں کا ہے،

(۴) اصول نمبر ۳ میں ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ اصلی بلاغت معنی کی بلاغت ہے، لہذا نذیر احمد کا کلام اگر بلیغ ہے تو پھر ان چند بے جوڑ اور غیر مانوس الفاظ کی سبک نکتہ چینیوں سے انکی بلاغت ہمیشہ بے نیاز رہیگی،

مگر ان کی ساری کتابوں کو پڑھکر ہر شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ مذہبی دائرہ سے ہٹنے کا نام نہیں لیتے، تاریخ کی طرف جسمیں تحقیق کے ساتھ ساتھ استخراج نتائج کی سخت ضرورت ہے وہ عموماً نہیں آتے، اور یہی انمیں ایک کمی ہے، ان کے خصوصیات انشا کی تلخیص یوں کی جاسکتی ہے،

(۱) وہ مذہبی دائرہ سخن میں رہکر فصاحت و بلاغت کا دریا بہا سکتے ہیں، مگر اس سے الگ ہوکر وہ دوسرے کوچہ میں قدم نہیں رکھتے، اور یہی ان میں ایک کمی ہے،

(۴) دہلی کی ٹکسالی زبان کو انھوں نے ترقی دی اور اسپر جا بجا محاورات اور ضرب الامثال کی کثرت لٹریچر کی روح ہے، کلام نہایت فصیح اور بلیغ ہے،

پروفیسر آزاد کے خصوصیات سخن کو ہم دو طرح سے بتلانا چاہتے ہیں، ایک تو وہ جسکا خاص کر تاریخی یا دیگر قسم کے واقعات سے تعلق ہے، دوسرے وہ جو محض تخیلات یا افسانہ کی حیثیت رکھتے ہیں، تاریخی واقعات،

آزاد فرماتے ہیں،

حضرت عشق نے شادی کی تھی، اور محبت کے قاضی نے نکاح پڑھایا تھا، ہمایوں کو دم بھر جدائی گوارا نہ تھی، دن ایسے نحوست کے تھے کہ ایک جگہ قرار نہ ملتا تھا، ابھی پنجاب میں ہے، ابھی سندھ میں ہے، ابھی بیکانیر اور جیسلمیر کے ریگستانوں میں سرگرداں چلا جاتا ہے، پانی ڈھونڈھتا ہے تو منزلوں تک میسر نہیں جودھپور کا رخ ہے، کہ ادھر سے امید کی آواز آئی ہے، قریب پہنچ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ امید نہ تھی دغا آواز بدل کر بولی تھی، وہاں تو موت منھ کھولے بیٹھی ہے، ناچار الٹے پاؤں پھرا آتا ہے، یہ سب مصیبتیں ہیں، مگر پیاری بی بی دم کے ساتھ ہے، کئی لڑائیوں کے مقاموں میں اس کے سبب سے خطرناک خرابیاں اٹھانی پڑیں، مگر اسے تعویذ کی طرح گلے لگائے پھرا، جب وہ جودھپور کے سفر میں تھا، تو اکبر ماں کے پیٹ میں باپ کے رنج و راحت کا شریک تھا، اس سفر سے پھرے اور سندھ کی طرف آئے، ایام ولادت بہت نزدیک تھے، اس لئے بیگم کو امرکوٹ میں چھوڑا اور آپ آگے پرانی لڑائی کو تازہ کیا، اس عالم میں ایک دن ملازم نے آکر خبر دی کہ مبارک، اقبال کا تارا طلوع ہوا، یہ تارا ایسے ادبار کے وقت جھلایا تھا کہ کسی کی آنکھ ادھر نہ اٹھی، مگر تقدیر ضرور کہتی ہوگی کہ دیکھنا وہ آفتاب ہوکر چمکیگا اور سارے ستارے اسکی روشنی میں دھندلے ہوکر نظروں سے غائب ہوجاینگے،

ہمایوں کے پاس جب سوار یہ خبر لایا تو اسکی حالت ایسی ہو رہی تھی کہ دائیں بائیں دیکھا کچھ نہ پایا، آخر یاد آیا کمر میں ایک مشک نافہ ہے، اسے نکال کر توڑا اور ذرا ذرا سا مشک سب کو دیدیا کہ شگون خالی نہ جائے، اللہ اللہ تقدیر نے کہا ہوگا کہ دل میلا نہ کیجیو، اس بچے کی شمیم اقبال مشک کی طرح تمام عالم میں پھیلیگی[لہ]"

اس واقعہ کو پڑھو، آزاد نے ہمایوں کی پریشانی، حمیدہ بیگم سے اس کی شادی اور اکبر کی ولادت کے واقعات کی تصویر کس بلیغ اور دلستان انداز میں کھینچی ہے کہ واقعہ کی زندہ تصویر آنکھوں میں پھر گئی، یہی وہ بلاغت ہے جسپر جسقدر ناز کیا جائے بجا ہے، ملا بدایونی نے ہر چند عہد اکبری کی تاریخ لکھی مگر آزاد کی دربار اکبری کے گرد کو نہیں پہنچ سکتی، بسبب اسکا یہ ہے کہ ملا نے فقط اہم واقعات کو یکجا جمع کر دیا ہے اور درباری امراء پر پھرے دے کیا ہے، مگر آزاد نے اس زمانہ کی زندہ تصویر اور اکبر کے کرایکٹر کا مکمل خاکہ کھینچا ہے کہ گویا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی دربار لگا ہے، اور یہ حددرجہ کی بلاغت ہے، اکبر کی سواری کی کیفیت وہ یوں بیان کرتے ہیں،

اب دولہا کے سامنے عروس دولت کی برات گذرتی ہے، نشان کا ہاتھی آگے، اس کے بعد اور ہاتھیوں کی قطار، پھر ماہی مراتب اور اور نشانوں کے ہاتھی، جنگلی ہاتھی پر فولادی پاکھر بن، پیشانیوں پر ڈھالیں، بعض کی مستکوں پر دیوزادی نقش و نگار، بعض کے چہروں پر گینڈوں، ارنے بھینسوں اور شیروں کی کھالیں کلوں سمیت چڑھی ہوئی ہیبت ناک بصورت، ڈراونی مورت، سونڈوں میں گرز، برچھیاں، تلواریں لے، سانڈنیوں کا سلسلہ جن کے سو سو کوس کے دم، گردن کھنچی، سینے تنے، جیسے لقا کبوتر، پھر گھوڑوں کی قطاریں، عربی ایرانی، ترکی ہندوستانی آراستہ پیراستہ ساز و یراق میں غرق، چالاکی میں برق اچھلتے مچلتے

لہ دربار اکبری صفحہ ۲،

کودتے شوخیاں کرتے چلے جاتے تھے، ببر شیر پلنگ، چیتے گینڈے، بہتیرے جنگل کے جانور سدھے سدھائے شائستہ چیتوں کے چھکڑوں پر نقش و نگار، گل گلزار آنکھوں پر زردوزی غلاف وہ اوراں کے جبل کشمیری شالیں، مخمل وزربفت کی جھولیں اوڑھے، بیلوں کے سروں پر کلغیاں اور تاج سینگ مصوّروں کی قلمکاری سے قلمدان کشمیر، پاؤں میں جھانجن، گلے میں گھنگرو چھم چھم کرتے چلے جاتے تھے، شکاری کتے کہ شیر سے منہ نہ پھرائیں، شکار کی بو پہ پتال سے پتا نکال لائیں[لہ]"

یہاں سواری کی کیفیت کس پرزور عبارت میں بیاں کی ہے، الفاظ کا زور شور خصوصًا کس غضب کا ہے کہ گویا کوئی تفنگ چلا رہا ہے کہ رکنے کا نام نہیں لیتا، ایک جگہ ذوق مرحوم کی خوش نصیبی کی داستاں لکھتے ہیں،

جب وہ صاحب کمال عالم ارواح سے کشور اجسام کی طرف چلا تو فصاحت کے فرشتوں نے باغ قدس کے پھولوں کا تاج سجایا، جس کی خوشبو شہرت عام بنکر جہاں میں پھیلی، اور رنگ نے بقائے دوام سے آنکھوں کو طراوت بخشی، وہ تاج سر پہ رکھا گیا تو آب حیات اس پر شبنم ہوکر برسا کہ شادابی کو کملاہٹ کا اثر نہ پہونچے، ملک الشعرائی کا سکہ اس کے نام سے موزوں ہوا اور اس کے طغرائے شاہی میں یہ نقش ہوا کہ اس پر نظم اردو کا خاتمہ کیا گیا، چنانچہ اب ہرگز امید نہیں کہ ایسا قادر الکلام پھر ہندوستان میں پیدا ہو، سبب اسکا یہ ہے کہ جس باغ کا وہ بلبل تھا وہ باغ برباد ہوگیا، نہ ہمصفیر رہے، نہ ہمداستاں رہے، نہ اس بولی کے سمجھنے والے رہے جو خراب آباد اس زباں کے لئے ٹکسال تھا، وہاں بھانت بھانت کا جانور بولتا ہے، شہر چھاؤنی سے بدتر ہوگیا، امرا کے گھرانے

لہ دربار اکبری صفحہ ۱۴۲، ۱۴۴،

تباہ ہوگئے" گھرانوں کے وارث علم وکمال کے ساتھ روٹی کپڑے سے محروم ہوکر حواس کھو بیٹھے، وہ جادو کار طبیعتیں کہاں سے آئیں جو بات بات میں دلپسند انداز اور عمدہ تراشیں نکالتی تھیں آج جن لوگوں کو زمانہ کی تاریخ البالی نے اس قسم کے ایجاد واختراع کی فرصت دی ہیں وہ اور اور کی شاخیں ہیں، انھوں نے اور پانی سے نشوونما پائی ہے وہ اور ہی ہواؤں میں اڑ رہے ہیں[لہ]"

تم نے ان اقتباسات کو دیکھا، آزاد نے ان واقعات میں کسطرح انشاپردازی کی روح پھونکی ہے، واقعات اپنی اپنی جگہ پر کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتے، کسی میں محض اتنا ہے کہ ہمایوں نے اپنی پریشانی کے زمانہ میں حمیدہ بیگم سے شادی کی اور اکبر کی ولادت ہوئی، ایک میں ہے کہ اکبر کی سواری کی کیا کیفیت تھی، دوسرے میں ہے کہ ذوق مرحوم کی خوش نصیبی کا کیا عالم تھا، مگر آزاد نے کس فصاحت اور بلاغت کے ساتھ اسکو ادا کیا، غرضیکہ ان اقتباسات کا تعلق واقعات سے تھا جسکے اندر رہکر انھوں نے اپنی انشاپردازی کا جوہر دکھلایا ہے،

(۲) عام تخیلات کی چند مثالیں،

برسات کا سماں دکھلاتے ہیں،

برسات کا سماں باندھتے ہیں تو کہتے ہیں، سامنے سے کالی گھٹا جھوم کر اٹھی، ابر ہواں دھار ہے، بجلی کوندتی چلی آتی ہے، پیاہی میں سارس اور بگلوں کی سفید سفید قطاریں بہاریں دکھا رہی ہیں، جب بادل گرجتا ہے اور بجلی چمکتی تو پرندے کبھی دبکسا کر ٹہنیوں میں چھپ جاتے ہیں، کبھی دیواروں سے لگ جاتے ہیں، مور جدا جھنکارتے ہیں، پپیہے الگ پکارتے ہیں، محبت کا متوالا چنبیلی کی جھرمٹ میں آتا ہے تو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا مہک... کر بوار بھی پڑنے لگی ہے، مست ہوکر وہیں

لہ آب حیات صفحہ ۳۴۴، ۳۴۳،

بیٹھ جاتا ہے اور شعر پڑھنے لگتا ہے[۱]"

پھر ایک جگہ فرماتے ہیں،

"جب صبح کا نور ظہور دیکھتا ہے، تو کہتا ہے دیگ مشرق سے دودھ ابلنے لگا، کبھی کہتا ہے دریاے سیاب موج مارنے لگا، کوئی مشرق سے کا نور آڑا تا چلا آتا ہے، صبح تباشیر بکھیرتی آتی ہے یا مثلاً سورج نکلا اور کرن ابھی اسمیں نہیں پیدا ہوئے وہ کہتا ہے سنہری گیند ہوا میں اچھالی ہے، صبح طلائی تھالی سر پہ دھرے آتی ہے کبھی مرغان سحر کا غل، اور عالم نور کا جلوہ، آفتاب کی چمک دمک اور شعاعوں کا خیال کر کے صبح کی دھوم دھام دکھلاتا ہے، تو کہتا ہے، بادشاہ مشرق سبز خنگ فلک پہ سوار، تاج مرصع سر پہ رکھے، کرن کا نیزہ لئے مشرق سے نمودار ہوا، شام کو شفق کی بہار دیکھتا ہے تو کہتا ہے مغرب کی چھپر کھٹ میں آفتاب نے آرام کیا اور شنگرفی چادر تان کر سو رہا، کبھی کہتا ہے جام فلک خون سے چھلک رہا ہے، نہیں مغرب کے ایوانوں میں آگ لگی ہے، تاروں بھری رات میں چاند کو دیکھتا ہے تو کہتا ہے لاجوردی چادر میں ستارے ٹنکے ہوے ہیں، دریاے نیل میں نور کا جہاز چلا جاتا ہے اور روپے کی مچھلیاں تیرتی پھرتی ہیں[۲]"

حق تو یہ ہے انسان عبارتوں پر جھومتا اور ناز کرتا ہے، کثرت تشبیہات نے کلام کو بالاتر بنا دیا ہے۔

آزاد فسانہ کے طور پر اپنے ایک خواب کو بیان کرتے ہیں،

یکایک آنکھ لگ گئی، دیکھتا ہوں ــــــ کہ میں ایک باغ نوبہار میں ہوں جسکی وسعت کی انتہا نہیں، امید کے پھیلاؤ کا کیا ٹھکانا ہے، آس پاس سے لیکر جہانتک نظر کام کرتی ہے تمام عالم رنگیں اور شاداب ہے، ہر چمن رنگ و روپ کی دھوپ سے

[۱] آب حیات صفحہ ۸۰، [۲] آب حیات صفحہ ۸۰،

چمکتا، خوشبو سے مہکتا، ہوا سے لہکتا نظر آتا ہے، زمین فصل بہار کی طرح گلہائے گوناگوں سے بوقلموں ہو رہی ہے، اور رنگا رنگ کے جانور درختوں پر چہچہے بھر رہے ہیں، یہ نظارہ دلکش و دلپذیر ایک عالم طاری ہوا کہ سرتاپا محو ہو گیا، جب ذرا ہوش آیا تو ان جنہائے دلکشا کو نظر غور سے دیکھا اور ایسا معلوم ہوا کہ اگر آگے چلوں تو شگفتگی اور تفریح کا لطف زیادہ ہو، پھر دیکھا کہ تھوڑی ہی دور آگے رنگیلے چمکیلے پھول کھلے ہوئے ہیں، آب زلال کے چشمے دھوپ کی چمک سے جھلمل جھلمل کر رہے ہیں، اونچے اونچے درخت جھنڈ کے جھنڈ چھائے ہوئے ہیں، جو جانور دھیمی دھیمی آواز سے بولتے سنائی دیتے تھے یہاں خوب زور شور سے چہکار رہے ہیں، چاروں طرف ہرے ہرے درخت لہلہاتے ہیں اور پھول اپنی خوشبو سے مہک پھیلاتے ہیں،[1]

ان چند اقتباسات سے ان کی ہر مضمون پر بے نظیر قادر الکلامی کا کافی ثبوت ملتا ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ الفاظ کی شیرینی اور ان کی موزونیت اس درجہ کی ہے کہ اپنا بیان کا خاتمہ کیا جائے، مضمون اسقدر دل میں گھر کر لیتا ہے اور بلاغت کی جان اسپر فدا ہے لیکن ان کے کلام میں ایسا بھی بعض جگہ انگریزی وغیرہ کے غیر مانوس الفاظ بھی آگئے ہیں جو ایک حد تک ثقیل معلوم ہوتے ہیں، مثلاً ٹمپریسٹی بل ڈاگ، گڈ صاحب، اگاڈزر وغیرہ وغیرہ، اگر غور سے دیکھو تو اسکا بھی یہی جواب ہے جو ہم علامہ سرور پر اعتراض کے متعلق دے چکے ہیں، ان کے خصوصیات انشا کا خلاصہ یوں ہوگا،

(۱) وہ تاریخی واقعات اور اس سے الگ ہو کر یعنی تمام تخیلات ہر دو اصناف پر کامل مہارت اور قدرت رکھتے ہیں، خلاصہ یہ کہ وہ کسی چیز یا سہارے کے محتاج نہیں، ہر مضمون پر یکساں قادر ہیں،

[1] نیرنگ خیال صفحہ ۲۵، ۲۶

(۲) انکا کلام نہایت فصیح اور بلیغ ہے، کلام میں کثرت محاورات تشبیہات، استعاروں کی دلفریبی شاعرانہ تخئیل، عبارت کی بیساختگی اور برجستگی لڑیچر کی جان ہیں،

آپ کے سامنے ہر شخص کے خصوصیات، کلام ان کے عیوب و نقائص ... نیز ملک کے ادبی معرکہ آرائیوں کی داستان پوری طرح سے بیان کردی گئی خود ہی فیصلہ کو قلم ہاتھ میں لیجئے اور انصاف سے دیکھیے کہ کس کو ترجیح دیجائے خاکسار کا فیصلہ تو یہ ہے کہ اردو کا سب سے بڑا انشا پرداز ان میں آزاد ہے اسکا سبب یہ ہے کہ مذکورہ بالا تقریر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ علامہ شبلی ہیں کہ ان کے سارے ادبی کارنامے محض تاریخی واقعات کے ساتھ ساتھ وابستہ ہیں، اس سے الگ ہو کر یعنی اگر تاریخ ان سے لے لیجئے تو وہ کچھ نہیں رہجاتے انکا کلام فصیح اور بلیغ ہے، البتہ محاورات روزمرہ تشبیہات اور استعارات وغیرہ کی جو حسن کلام کے زیور ہیں انکے یہاں بہت کمی ہے حالی ہو ہے کہ وہ محض سیرت نگاری کے استاذ ہیں، انکا کلام فصیح اور بلیغ ہے، اس سے الگ ہو کر وہ بہت کچھ لکھ سکتے ہیں مگر یہ انکا اصلی کمال نہیں، نذیر احمد کی ساری فصاحت و بلاغت مذہب کے میدان میں کام آسکتی ہے، مگر ان کے کلام میں سوقیت بھی بہت زیادہ ہے،

مگر آزاد، شبلی حالی اور نذیر احمد کی طرح کسی خاص فن کے دائرہ میں مقید نہیں وہ ہر مضمون پر نہایت کامیابی کے ساتھ لکھ سکتے ہیں، خواہ انکا تعلق واقعات سے ہو یا تخیلات سے، اور اعلےٰ درجہ کی انشا پردازی کا یہی کمال ہونا چاہیے، دوسری بات یہ ہے کہ اگرچہ ان تینوں بزرگوں کا کلام فصیح اور بلیغ ہے مگر آزاد کے کلام کو استعاروں کی دلفریبی شاعرانہ تخئیل اور تشبیہات و محاورات کی کثرت کی وجہ ان کے کلام پر فوقیت ہے، غرضیکہ مجموعی حیثیت سے آزاد کو اوروں پر ترجیح ہے،

ملک کا ایک انشا پرداز لکھتا ہے،

"سر سید سے معقولات الگ کر لیجئے تو کچھ نہیں رہتے، نذیر احمد بغیر مذہب کے لقمہ نہیں توڑ سکتے، شبلی سے تاریخ لے لیجئے تو قریب قریب کورے رہجائیں گے، حالی بھی جہاں تک نثر کا تعلق ہے سوانح نگاری کے ساتھ چل سکتے ہیں، لیکن آقائے اردو یعنی پروفیسر آزاد صرف انشا پرداز ہیں جنکو کسی سہارے کی ضرورت نہیں، اس لئے واقعات بھی انھوں نے جسقدر لکھے ہیں قصص (ٹیلز) کی حیثیت رکھتے ہیں جنھیں افسانۂ یاراں کہن سمجھئے"[1]

اب اردو کی خدمت کا سوال ہے کہ اسکی سب سے زیادہ ان بزرگوں میں سے کس نے خدمت انجام دی، چنانچہ ہم ہر شخص کے متعلق اس کے دائرہ سخن کے حدود کی تعین کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ کس نے کس فن میں کسقدر تصانیف چھوڑی ہیں، تاکہ آسانی کے ساتھ اس امر کا فیصلہ کیا جا سکے،

مولانا حالی کے کارنامے،

(۱) ادب میں مقدمہ شعروشاعری، دیوان حالی اردو مسدس حالی، بیوہ کی مناجات، چپ کی داد، وغیرہ،

(۲) فن سیرت میں حیات سعدی، حیات جاوید، یادگار غالب،

نذیر احمد کے کارنامے،

(۱) ادب میں مراۃ العروس، نبات النعش، توبۃ النصوح، رویائے صادقہ، الحقوق والفرائض، اجتہاد، مبادی الصرف۔

(۲) فن منطق میں مبادی الحکمۃ،

مولانا آزاد کے کارنامے،

[1] افادات مہدی، صفحہ ۱۰۲

(۱) ادب میں ۔ آب حیات، نیرنگ خیال، سخندان پارس، مجموعہ نظم اردو، نصیحت کے کرن پھول، دیباچہ دیوان ذوق، مکتوبات آزاد، سیر ایران، قند پارسی وغیرہ،

(۲) فن تاریخ میں ۔ دربار اکبری،

(۳) فن سیرت میں ۔ نگارستان فارس (شعرا فارسی کی مختصر سوانح)

علامہ شبلی کے کارنامے،

(۱) ادب میں ۔ شعر العجم ۵ جلدوں میں، مجموعہ کلام شبلی اردو، مثنوی صبح امید، مکاتیب شبلی دو حصہ میں،

(۲) فن سیرت میں سیرت نبوی دو جلدوں میں، سیرت النعمان، الفاروق، الغزالی، المامون، سوانح مولانا روم،

(۳) تاریخ میں ۔ مقالات شبلی، (تاریخی مضامین کا مجموعہ) عالمگیر پر ایک نظر، رسائل شبلی، وغیرہ

(۴) فلسفہ میں ۔ علم الکلام، الکلام،

(۵) مذہبیات میں ۔ ظل الغمام فی قرأۃ خلف الامام،

اسکے علاوہ علامہ حیدر آباد میں انجمن ترقی اردو کے سکریٹری رہ چکے ہیں، وہاں ان کے اہتمام میں السنہ یورپ کی بہتری کتابوں کا اردو میں ترجمہ ہوا، انمیں فلسفہ اجتماع، اور تاریخ تمدن، خاص طور پر قابل ذکر ہیں،

الندوہ کے سرپرست رہکر مدت تک انھوں نے اردو زبان کی خدمت کی اب ہر شخص کے علمی کارنامے آپ کے سامنے موجود ہیں، اور بجز علامہ شبلی کے کسی نے مذکورہ بالا فنوں میں کافی کتابیں نہیں لکھیں، نذیر احمد نے افسانے کے طور پر چند رسالے لکھدئے، تاریخ سیرت اور فلسفہ کی طرف انھوں نے آنکھ اٹھاکر نہ دیکھا

مولانا حالی نے فن سیرت اور کچھ ادب میں کتابیں لکھ کر اپنا کام ختم کر دیا، ہندا نذیر احمد اور حالی تو خدمت کے لحاظ سے علامہ شبلی کا مقابلہ نہیں کر سکتے، اب رہے آزاد تو انکی زیادہ کتابیں فن ادب ہی میں ہیں، فلسفہ یا فن سیرت میں انھوں نے کچھ نہ لکھا، البتہ نگارستان فارس فن سیرت میں ایک مختصر سا رسالہ ہے، مگر علامہ نے فن ادب کے علاوہ سیرت اور فلسفہ میں بھی متعدد کتابیں لکھیں، یہی وہ سبب ہے جس سے کہنا پڑتا ہے کہ اردو زباں کی سب سے زیادہ انجام دینیکا سہرہ علامہ شبلی کے سر ہے، دوسری حیثیت سے دیکھیں تو یہ حضرات مولانا کے پاسنگ کو بھی نہیں پہونچے، اسکی وجہ یہ ہے کہ اردو میں فن تاریخ اور سیرت وغیرہ کی بہتیری کتابیں پہلے ہی سے موجود تھیں، مولوی ذکاء اللہ نے دس ضخیم جلدوں میں ہندوستان کی اسلامی اور برٹش حکومت کی مفصل تاریخ لکھی، فسانہ عجائب ادب کی بہترین کتاب موجود تھی، مگر اسلام کے تاریخی واقعات کی سچی داستاں کسی کو معلوم نہ تھی،

علم کلام اور فلسفہ یونان کے متعلق زبان اردو میں کچھ ذخیرہ نہ تھا، لیکن علامہ شبلی نے اس خدمت کا بار گراں اپنے سر لیا اور مدتوں کی دماغ پاشی اور طرح طرح کی جانفشانیوں کے بعد اسلامی واقعات کی تحقیق کی (جو تھیں رسائل شبلی میں مل سکتے ہیں) اور علم الکلام اور الکلام لکھ کر اس کمی کو ایک حد تک پورا کیا، علامہ کی سب سے بڑی اردو زباں کی خدمت دار المصنفین کا قائم کرنا ہے جسکے اردو زباں کی خدمت کا سلسلہ ہمیشہ غیر فانی رہیگا، ملک کا ایک مشہور انشا پرداز لکھتا ہے،

"نذیر احمد اپنی لائق رنگ عربیت کے ساتھ کچھ یوں ہی سے رہے، یادش بخیر! حالی نے مسدس کے ساتھ مقدمہ شعر و شاعری اور حیات جاوید لکھکر اپنا ٹھکانا کر لیا، لیکن شبلی قطعاً غیر فانی ہیں، آج ہزاروں صفحے متعدد جلدوں میں ان کے قلم سے نکل چکے ہیں، اور جس موضوع پر

جو کچھ لکھا گیا ہے کسی زبان میں اس سے بہتر مجموعۂ خیال موجود نہیں[۵]،
اسلئے علامہ شبلی کی خدمات سب سے اعلیٰ اور ارفع ہیں۔

الراقم محمد یوسف متعلم مدرسۃ الاصلاح سرائمیر، ڈاکخانہ
سرائمیر، ضلع اعظم گڈھ،

[۵] افادات مہدی صفحہ ۱۰۰،

کتب مصنفہ شمس العلماء ڈاکٹر مولوی حافظ نذیر احمد مرحوم و مغفور

حمائل شریف مجلد۔ ترجمہ بین السطور مع فہرست مضامین و فرہنگ الفاظ اردو سفر و حضر میں ساتھ رکھنے کے قابل قیمت عہ

دہ سورہ فی احسن سورہ۔ مترجم بجسورہ کی جگہ۔ وظیفہ پڑھنے والوں کے لیے بہت ضروری ہے۔ قیمت ۱۰؍

ادعیۃ القرآن۔ قرآن شریف کی ساری دعائیں مع ترجمہ و خواص قیمت ۱۲؍

الحقوق والفرائض (۳ جلد) مذہب اسلام کے سارے مسائل کا مجموعہ۔ قرآن شریف کی آیات احادیث کے ساتھ ۷؍

اجتہاد۔ اسلام کی حقانیت کا دلائل و براہین قاطعہ سے اثبات۔ جو مسلمان اپنے عقیدے میں پکا ہونا چاہے وہ اس کتاب کو ضرور دیکھے عہ

نظم بے نظیر۔ مولانا مرحوم کی نظموں کا مجموعہ۔ بصراحت اس امر کے کہ کہاں اور کس موقع پر پڑھی گئی۔ قیمت عہ

مراۃ العروس۔ لڑکیوں کو امور خانہ داری اور سلیقہ سکھانے کی سب سے بہتر کتاب، اصغری اکبری کا قصہ قیمت ۱۲؍

بنات النعش۔ مراۃ العروس کا دوسرا حصہ قیمت ۹؍

توبۃ النصوح۔ عورتوں کو نیک کرداری اور مذہبی و اخلاقی تعلیم دینے کا بہترین طریقہ۔ قیمت ۱۰؍

محصنات۔ تعدد ازدواج کے روح فرسا نتائج۔ قیمت عہ

رویائے صادقہ۔ مختلف مذاہب کا مقابلہ اسلام سے۔ قیمت عہ

ایامیٰ۔ بیواؤں کے حالات کا دردناک فوٹو۔ قیمت عہ

ابن الوقت۔ انگریزی وضع کی کورانہ تقلید کے تباہ کن نتائج۔ قیمت عہ

موعظہ حسنہ۔ مولانا کے اصلی نصیحت آمیز خطوط فرزند کے نام عہ

منتخب الحکایات۔ بچوں کے لیے چھوٹی چھوٹی دلچسپ نتیجہ خیز کہانیاں۔ قیمت ۲؍

چند پند۔ مفید و نصیحت آمیز مختلف مضامین کا مجموعہ بچوں کے لیے۔ قیمت ۲؍

صرف صغیر۔ اردو زبان میں فارسی گرامر۔ قیمت ۲

نصاب خسرو۔ جدید طرز کی خالق باری۔ قیمت ۲؍

رسم الخط۔ املا نویسی کے قواعد لڑکوں کے لیے۔ قیمت ۲؍

مبادی الحکمۃ۔ سلیس اردو میں عربی منطق کے قواعد۔ قیمت ۸؍

ایغنک فی الصرف۔ صرف عربی کی بہترین گرامر اردو میں۔ قیمت ۱۲؍

لکچروں کا مجموعہ۔ دو جلدوں میں ۴۴ لکچر الگ الگ حصے فروخت ہوں گے۔ قیمت عہ

مطالب القرآن۔ قرآن شریف کی تفسیر کا پہلا حصہ جتنا لکھا جا چکا تھا چھاپ دیا گیا۔ قیمت عہ

ملنے کا پتہ:۔ الناظر بک ایجنسی۔ لکھنؤ

مرزا ہادی رسوا مرحوم
- فسانۂ ...
- ... سرود

امیر مینائی مرحوم
- امیر اللغات نا مکمل
- صنم خانۂ عشق
- مرآۃ الغیب
- محامد خاتم النبیین
- ... سخن
- مکاتیب امیر مینائی

جلال مرحوم
- سرمایۂ زبان اردو
- دستور الفصحاء دلکش
- علم نگارین
- رسالہ تذکیر و تانیث
- قاعدۂ تاریخ
- قواعد المنتخب

مرزا محمد عباس ... مرحوم
- شاہد ... جہاں
- ... لیلیٰ
- ...

...
- ...

پنڈت رتن ناتھ سرشار
- فسانۂ آزاد کامل جلد
- سیر کہسار
- خدائی فوجدار
- جام سرشار
- الف لیلیٰ کے طرز نا دل
- کامنی
- بچھڑی دلہن

منشی سجاد حسین مرحوم
- احمق الذین
- حاجی بغلول
- پیاری دنیا
- کایا پلٹ
- میٹھی چھری
- طرحدار لونڈی
- طلسمی فانوس

منشی جوالا پرشاد برق
- مرزا ... 12
- مار آستین 12
- بنگالی دلہن 12
- معشوقۂ فرنگ 12
- ... خواب
- ...

پریم چند
- پریم پچیسی
- ...

مولینا عبدالحلیم شرر
- جنید بغدادی
- خواجہ معین الدین چشتی
- تذکرۂ مشاہیر عالم
- مخدرات
- قیس و لبنیٰ
- مقدس نازنین
- ایام عرب
- فتح اندلس
- ماہ ملک
- حسن کا ڈاکو
- دربار حرام پور
- الفانسو
- مفتوح فاتح
- فلپانا
- زوال بغداد
- لعبت چین
- نیکی کا پھل
- جویائے حق
- بابک خرمی
- طاہرہ
- شوقین ملکہ
- یوسف و نجمہ
- گذشتہ لکھنؤ
- شاعرانہ و عاشقانہ مضامین
- آغاز و ختم سال
- سیر رجال
- تاریخی و جغرافی مضامین
- ...

حکیم محمد علی خان مرحوم
- رام پیاری کامل
- عبرت کامل
- حسن سرور کامل
- اختر حسینہ
- دیول دیوی
- جعفر و عباسہ

شوق قدوائی مرحوم
- ترانۂ شوق
- قاسم و زہرہ
- نیرنگ جمال
- گنجینہ
- سیکھنے اور لوی 2

خواجہ عبدالرؤف عشرت
- زبان دانی 6
- اصلاح زبان اردو 6
- قواعد میر 6
- اصول اردو 6
- جان اردو 6
- شاعری کی پہلی کتاب
- دوسری کتاب
- تیسری کتاب
- لغات اردو

منشی محمد احسن وحشی
- مجموعۂ ...
- جام ...

مولینا حکیم عبدالحی مرحوم
- یاد ایام
- تذکرۂ گل رعنا

حکیم احمد حسین الہ آبادی
- تاریخ ابن خلدون جلد اول
- ” ” دوم
- ” ” سوم
- ” ” چہارم
- ” ” پنجم
- ” ” ششم
- ” ” ہفتم
- ” ” ہشتم
- ” ” نہم
- ” ” دہم
- ” ” یازدہم
- سلطان صلاح الدین
- نور الدین محمود

مولوی محمد حلیم انصاری
- الاسلام والنصرانیہ 12
- فتح اندلس
- ابو مسلم خراسانی
- تاریخ عرب

مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی
- سیرۃ الصدیق
- علمائے سلف
- تذکرۃ الشعراء حسین ...

حافظ اسلم جیراجپوری
- سیرۃ الرسول
- خلافت راشدہ
- خلافت بنو امیہ
- خلافت بنو عباس
- عباسیۂ بغداد
- علوم عرب

قاضی محمد سلیمان منصورپوری
- رحمۃ للعالمین
- سفرنامۂ حجاز

مولوی خلیل الرحمن
- اخبار الاندلس جلد
- تاریخ مولدین
- مختصر تاریخ اسلامی
- عذرا

مولوی محمد انشاء اللہ
- سیرۃ الرسول
- تاریخ آل عثمان
- حالات ...
- حالات قسطنطنیہ
- تاریخ ...

منشی محمد عبد الحلیم ...
- آثار اکبری
- حیات خسرو
- امرائے ہنود

... سب ... کتابیں ... ملنے کا پتہ ... قیمت صرف ...

مولوی عزیز مرزا ایم اے
- خیالات عزیز
- ذکر مار فی

خواجہ عباد اللہ اختر
- صدیق اکبر
- حضرت زید ۶ر
- مشاہیر اسلام
- بغداد
- دمشق
- دیوان حافظ مع شرح

مفتی انوار الحق ایم اے
- تاریخ ابو البشر
- تذکرۃ الحبیب
- حقایق اسلام

میر ولی اللہ بی اے
- بندگی
- محسن الکرام
- لسان الغیب جلد اول
- دوم
- سوم
- چہارم

سید ... علی بی اے
- ... اندر
- ... کا تعلیمی نظام
- ... زرین

مولانا حسرت موہانی
- شرح دیوان غالب
- کلیات دیوان حسرت

سید سجاد حیدر بی اے
- خیالستان
- ثالث بالخیر ۸ر
- زہرا ۱۲ر
- جلال الدین خوارزم شاہ
- (shown above as: شاہ)

مسٹر ظفر عمر بی اے
- چوروں کا کلب ۹ر
- نیلی چھتری
- بہرام کی گرفتاری
- مستقبل اسلام

پروفیسر فیروز الدین مراد
- تحفہ سائنس
- بادل کے نیچے
- خونناب عشق

حکیم احمد شجاع بی اے
- باپ کا گناہ
- حسن کی قیمت

منشی عبد المجید سالک بی اے
- راہ و رسم منزلہا ۸ر
- چہار دیگر افسانے
- چترال ... ۱۲ر

منشی احمد علی بی اے
- تاریخ تمدن
- شباب لکھنؤ

مولوی عبد الماجد بی اے
- فلسفہ جذبات
- مکالمات برکلے
- پیام امن
- تصوف اسلام
- فلسفیانہ مضامین
- زود پشیمان ۸ر

منشی محمد لطیف بی اے
- اکبر
- اورنگ زیب
- رنجیت سنگھ
- لارڈ کلایو

پروفیسر نور الٰہی ایم اے
- مبادی علم انسانی
- برکلے کا فلسفہ

مولوی سعید انصاری
- معارج الدین
- تذکرۃ المصطفےٰ
- صحف سماوی
- شمع سخن ۱۰ر

پروفیسر الیاس برنی ایم اے
- جذبات فطرت جلد حصہ ...
- معارف ملت
- مناظر قدرت
- علم المعیشت

مولوی سید سلیمان ندوی
- ارض القرآن
- سیرۃ عائشہ رض
- حیات امام مالک
- خلافت عثمانیہ اور اسلام
- خلافت اور ہندوستان

مولوی عبد السلام ندوی
- اسوۂ صحابہ ۲ جلد
- سیرۃ عمر بن عبد العزیز
- انقلاب الامم
- تاریخ الحرمین الشریفین
- نقرائے اسلام
- فطرت نسوانی
- شعر الہند ۲ جلد

مولوی عبد الباری ندوی
- مبادی علم انسانی
- برکلے کا فلسفہ

مولوی عبد الرزاق ندوی
- سیر الصحابہ جلد اول
- سیر الانصار ۲ جلد
- سیر الصحابیات
- اسوۂ حسنہ
- کتاب الوسیلہ
- ترکی اور یورپ ۶ر

خواجہ حسن نظامی
- قرآن آسان قاعدہ
- میلاد نامہ
- محرم نامہ
- فاطمی دعوت اسلام
- ذکر غوث پاک ۱۲ر
- کرشن جیون
- شاہی جہاد
- سیپارۂ دل
- کرم توموت
- چٹکیاں اور گدگدیاں ۱۲ر
- اتالیق خطوط نویسی
- روزنامچہ
- بیوی کی تعلیم
- بیوی کی تربیت
- اولاد کی شادی
- جگ بیتی کہانیاں ۱۰ر
- آپ بیتی
- جوگی کی کہانیاں ۱۲ر
- سیر دہلی ۱۲ر
- سفرنامہ ممالک اسلامیہ
- غدر دہلی کے افسانے
- یزید نامہ
- طمانچہ بر رخسار یزید
- اردو دعائیں ۸ر
- تسکین احساس ۸ر
- روزنامچہ ہند ۱۲ر
- اسلام کا انجام ۶ر
- تسخیر مہر و قہر ۱۰ر

مولوی عبد الراشد الخیری
- الزہرا ۱۲ر
- صبح زندگی
- شام زندگی
- شب زندگی
- نوحہ زندگی ۱۲ر
- دُرِّ شہوار ۱۰ر
- منازل السائرہ
- سراب مغرب
- بنت الوقت ۸ر
- قطرات اشک
- جوہر قدامت
- عروس کربلا
- یاسمین شام
- تیغ کمال
- ماہ عجم
- محبوب خداوند
- سوودرہ ۸ر

نیاز فتح پوری
- گیتان جلی
- گہوارۂ تمدن
- نگارستان
- صحابیات
- تاریخ الدولتین

یاس عظیم آبادی
- چراغ سخن
- نشتر یاس

تحفۂ اردو ... مرحوموں کے استقلال، مسلمانوں کی شجاعت اور انگریزوں کی حکمت کا آئینہ از ... خانی خان ... قیمت

رجسٹرڈ نمبر ل ۸۷۴

ہوالمستعان

الناظر

ایڈیٹر — ظفرالملک علوی

الناظر پریس لکھنؤ میں باہتمام اسحاق علی علوی چھپا

قیمت سالانہ
لعہ/

قیمت فی پرچہ
۸/

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اردو کی بہترین کتابیں

محصول معاف
عـہ کی روانگی پر آدھا
اور
عـہ کی روانگی پر پورا

ہدیہ نیہ لیجیے
عـہ کی روانگی پر الناظر ایک۔
اور
تمام کی روانگی پر عـہ کی کتابیں

مرزا غالب مرحوم
- اردوئے معلی
- عود ہندی
- دیوان غالب
- اکمل دیوان غالب

سر سید مرحوم
- خطبات احمدیہ
- اکمل مجموعہ لکچر
- اسباب بغاوت ہند
- سیرت فریدیہ ۱۰
- خطوط سر سید

نواب محسن الملک مرحوم
- مضامین تہذیب الاخلاق
- اکمل مجموعہ لکچر
- تقلید و عمل بالحدیث ۱۲
- کتاب المحبت والشوق ۱۲
- مکاتیب
- مسلمانوں کی تہذیب ۶

خلیفہ محمد حسین مرحوم
- اعجاز التنزیل
- سفرنامہ برنیر ۲ جلد

مولانا آزاد مرحوم
- آب حیات
- دربار اکبری
- سخندان فارس
- نگارستان فارس
- نیرنگ خیال
- سیر ایران
- ڈرامہ اکبر
- مجموعہ مکتوبات آزاد
- مجموعہ نظم آزاد ۸
- نصیحت کا کرن پھول ۸
- جانورستان ۱۰
- بیاض آزاد
- تذکرۂ علماء ۵
- لغت آزاد
- دیوان ذوق مرتبہ آزاد

پروفیسر شہباز مرحوم
- زندگانی بے نظیر
- خیالات شہباز

مولوی سید ممتاز علی
- تذکرۃ الانبیا
- شیخ حسن ۱۲

مولانا نذیر احمد مرحوم
- حمائل شریف مترجمہ
- الحقوق والفرائض
- بنات النعش ۹
- مراۃ العروس ۱۰
- توبۃ النصوح ۱۲
- موعظۂ حسنہ
- رویائے صادقہ
- ایامیٰ
- فسانۂ مبتلا
- ابن الوقت
- مصائب غدر
- مجموعہ نظم بے نظیر
- اکمل مجموعہ لکچر ۲ جلد
- منتخب الحکایات ۶
- چند پند ۶
- مبادی الحکمۃ

مولانا اثہری مرحوم
- حیات انیس
- الشیائی شاعری
- نور جہاں بیگم
- ٹیپو سلطان
- حیدر علی سلطان

مولانا حالی مرحوم
- یادگار غالب
- حیات سعدی
- مقدمہ شعر و شاعری
- حیات جاوید
- دیوان حالی
- مسدس حالی
- مجموعہ نظم حالی
- بیوہ کی مناجات ۲
- شکوۂ ہند ۲

مولوی بشیر الدین احمد
- واقعات دار الحکومت دہلی
- تاریخ بیجاپور
- حرز طفلان
- نشاط عمر
- عصائے پیری
- لخت جگر
- حسن معاشرت
- اصلاح معیشت
- اقبال دلہن
- شمع ہدایت
- التماس بشیر
- دیوان بشیر

مولانا شبلی مرحوم
- سیرۃ النبی جلد اول
- سیرۃ النبی جلد دوم
- سیرۃ النبی جلد سوم
- الفاروق
- سیرۃ النعمان
- الغزالی
- المامون
- سوانح مولانا روم
- سفرنامہ مصر و روم و شام
- علم الکلام
- الکلام
- رسائل شبلی
- مقالات شبلی
- شعر العجم جلد اول
- شعر العجم جلد دوم
- شعر العجم جلد سوم
- شعر العجم جلد چہارم
- شعر العجم جلد پنجم
- موازنہ انیس و دبیر
- مضامین عالمگیر
- آغاز اسلام
- مجموعہ کلام شبلی اردو
- کلیات شبلی فارسی

مولانا ذکاء اللہ مرحوم
- تاریخ ہندوستان ۱۰ جلد
- تاریخ عہد سلطنت انگلشیہ
- کرزن نامہ
- آئین قیصری
- صحیفۂ فطرت
- تعلیم الانتظام
- محاربات عظیم
- جغرافیہ ریاضیہ ۱۲
- جغرافیہ طبعی
- اہل عرب کا جبر و مقابلہ
- رسالہ علم مناسبت
- معاون الحساب
- مساحت ماڈرن

سید محمود مرحوم
- کتاب الطلاق
- کتاب الشفعہ
- شرح قانون شہادت (لکچر)

مولوی رشید احمد انصاری
- المذہب والاسلام
- تحریر المراۃ

بسم اللہ

الناظر

فہرست مضامین ماہ ستمبر ۱۹۲۷ء

نمبر ۳ — جلد ۳۳

رعایت

نغمۂ حرم - جو بہترین میلاد شریف مانا جاتا ہے اور ہزاروں میں عام طور پر فروخت ہوتا ہے اُن اصحاب کو صرف محصولڈاک لیکر دیا جائیگا جو اخبار سچ کی خریداری منظور کریں - سچ کا سالانہ چندہ تے اور نغمۂ حرم کا محصول ہر حلبہ ہے یا چندہ منی آرڈر ارسال فرمائیے تو اخبار جاری کیا جائے اور نغمۂ حرم ارسال خدمت ہو - وی پی نہ طلب کیا جائے -

مہتمم اخبار سچ - لکھنؤ

نئی کتابیں

بیداری ہند - مہاتما گاندھی نے اپنے مشہور اخبار ینگ انڈیا میں جو مضامین تحریر کیے اُن کے ترجمہ کی یہ پہلی جلد ہے جس سے اردو خوان پبلک کو ہر مسئلہ کے متعلق مہاتما گاندھی کے خیالات سے براہ راست واقفیت ہوگی۔ کتاب کے شروع میں مہاتما جی کی شخصیت کے متعلق یورپ و امریکہ کے مشاہیر کی رائیں درج کردی گئی ہیں۔ نیز آپ کے سوانح اور کارنامے مختصراً بیان کیے گئے ہیں۔ حجم ۴۰۰ صفحے۔ قیمت عہ ر

مخزن ادب - جسکے نصف اول میں شیخ عبدالقادر صاحب ایڈیٹر رسالہ مخزن کی تحریریں ہیں اور نصف آخر میں مخزن کے دیگر ممتاز معاونین کی نظم و نثر کے انتخابات درج کیے گئے ہیں حجم ۶۵۶ صفحہ۔ کتاب مجلد ہے۔ قیمت سے ر

تاریخ راجگان ہند - مولوی نجم الغنی صاحب رامپوری کی اس بسیط تالیف میں جملہ ہندو اقوام و ملل خصوصاً قوم راجپوت اور اسکی شاخوں کا مفصل بیان ہے۔ جس کے مطالعہ سے بیک نظر معلوم ہو جاتا ہے کہ آج جو لوگ ہندو کہے جاتے ہیں، وہ اصل میں کون تھے اور کہاں سے آئے تھے - آخر میں مسلمانوں اور انگریزوں کے ہندوستان پر متصرف ہونے کے حالات درج کیے گئے ہیں اور ضمناً کرنل ٹاڈ و دیگر مورخین کی غلط بیانیوں کی تردید کی گئی ہے - حجم ۶۲۰ صفحے تقطیع کلاں قیمت صہ

مکتوبات اکبر - یعنی حضرت اکبر الہ آبادی کے خطوط مشہور اہل قلم خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب کے نام - قیمت ۱۲ر

سراغرسانوں کی عجیب و غریب داستانیں

مترجمہ منشی تیرتھ رام فیروزپوری

ڈاکٹر نکولا - مشہور فسانہ نویس گئی بوتھبی کے حیرت انگیز سراغرساں کے کارنامے - قیمت عہ ر

شاہی خزانہ - مارس لیبلانک نے نامی چور آرسین لوپن کے عجیب و غریب واقعات لکھے ہیں عہ ر

سراب زندگی - ولیم لکیو کا یہ افسانہ سراغرسانی کی داستانوں میں خاص شہرت رکھتا ہے عہ ر

سنہری بچھو - جاسوسوں کے حالات لکھنے میں سکیس رومہر کا خاص انداز قابل دید ہے - قیمت عہ ر

آتشی کتا - سر آرتھر کینن ڈائل کے مشہور سراغرساں لاک ہومز کے کارنامے - قیمت عہ

انصاف - سنسنی پیدا کر دینے والے واقعات کے بیان میں ایڈگر والیس بہت مشہور ہے عہ ر

مینیجر الناظر بک ایجنسی لکھنؤ سے طلب کیجیے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الناظر

نمبر ۳ جلد ۲۳ ماہ ستمبر سنہ ۱۹۲۶ء

مسلمان اور علوم ہند

حال ہی میں مسٹر کنہیا لال بی اے (آکسن) نائب صدر مجلس مقننہ صوبہ متحدہ نے ہندی مسلمانوں کے عہد حکومت کی علمی ترقیوں کے متعلق ایک پُر از معلومات و بے لوث مقالہ سپرد قلم کیا ہے۔ ابتداءً یہ مضمون ہندی جریدہ "سرسوتی" (الہ آباد) میں شایع ہوا تھا۔ اُسکے بعد مختلف اُردو مجلات و اخبارات میں اس کا ترجمہ ہوا۔ تنگ خیالی و عصبیت پرستی کے موجودہ دَور میں ایک ہندو اہل قلم کی زبان سے اس قسم کی تحریر کا نکلنا باعث صد تشکر و امتنان ہے۔ اور ہر حیثیت سے قابل مضمون نگار کی سعی جمیل مستحق داد ہے۔ گو مضمون مذکور مسلمانوں کی علمی جدوجہد کا ایک نہایت ہی غیر مکمل مرقع ہے۔ یہی خیال مضمون ہذا کی تحریر کا محرک ہوا ہے۔

سطور ذیل میں فرزندان اسلام کے اُن کارناموں کا ایک اجمالی خاکہ پیش کیا جاتا ہے جو شعبۂ علوم ہند سے متعلق اُنھوں نے عہد ماضی میں سرانجام دیے۔ اور متوقع ہوں گا کہ کوئی ایسے بزرگ جنھیں مجھ سے زیادہ فرصت اور علمی ساز و سامان میسر ہے اس بحث پر ایک جامع مضمون تحریر فرمانے کی زحمت گوارا فرمائیں گے۔

مسلمان اپنی تعلیمی جدوجہد کے زمانے میں تمام دنیا کے علمی خزائن اپنے تصرف میں

لے آئے تھے۔ یونان وروما، مصر وہند، بابل واسیریا کے پرانے تمدنوں کے رازہائے سربستہ انکے تفحص وتحقیق علمیہ کے روبرو پانی کی مثال تھے۔ ملتِ اسلامیہ کے علمی کارناموں کا عہدزریں عباسی عہدحکومت ہے۔ اس دور میں دوردور سے کتب علمیہ زرکثیر صرف کرکے منگائی جاتی تھیں اور اُنکے تراجم اور تلخیصات سے عربی زبان وعربی تمدن کو مالامال کیا جاتا تھا۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ ہندی ذخائرِ علمیہ کی جانب آستانۂ خلافت کی توجہ نہایت شد و مد سے مبذول ہوئی۔

اس بحث پر قلم اُٹھانے سے پہلے اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم مختصراً عربی ادبیات کے مختلف مدارجِ ارتقائیہ پر تبصرہ کریں۔ عربی ادب کا سنگِ بنیاد سنہ ۵۰۰ء و ۶۰۰ء کے مابین رکھا گیا تھا۔ ابتداءً عربوں نے سوائے مذہبیات کے دوسرے شعبوں کی طرف بہت کم توجہ کی. مگر بعد کو ان کی ہمہ گیر ذہنیت نے تمام اصنافِ علوم وفنون پر قبضہ کرلیا۔ انکی معلومات کے ماخذ حسب ذیل تھے:-

۱- یونانی ادبیات وعلوم

۲- فارسی علوم وفنون

۳ ہندی عناصر

یونانی علوم وفنون مختلف تراجم کے ذریعہ سے عربوں میں بہت زیادہ مروج ہوئے اُن کے فلسفہ، مابعدالطبیعات، نفسیات اورمنطق وغیرہ پر زیادہ تر یونانی رنگ غالب ہے۔ یونانی تخئیل نے عربی تخئیل پر کیا اثر ڈالا، اسکے لیے ایک جداگانہ مضمون کی ضرورت ہے۔ میں انشاءاللہ بشرطِ فرصت اس بحث پر بھی قلم اُٹھاؤں گا۔ اس موضوع پر سردست اتنا لکھنا کافی ہے کہ یونانی تمدن اور یونانی تخئیل نے عربی تمدن پر اتنا گہرا اثر ڈالا تھا کہ دونوں میں بمشکل تمیز ہوسکتی ہے۔

جب عربی فتوحات کا سیلاب کسریٰ (کیخسرو) کے ملک تک پہونچا اور اللہ والے صحرانشینوں نے درفش کاویانی کی عظمت کو پارہ پارہ کردیا تو مفتوحین نہ صرف سیاسی حیثیت سے مغلوب ہوئے بلکہ اُنھوں نے مذہبی، اخلاقی اورمعاشرتی حیثیت سے بھی فاتحین کا اتباع کیا۔ مفتوح اور فاتح ایک ہی رنگ میں رنگ گئے۔ عجمیوں نے اہلِ عرب کا مذہب قبول کیا اور عرب فاتحین مفتوح تمدن سے متاثر ہوئے بغیر نہ بچ سکے۔ ایرانی

ویستانی زبان ملک کے نظم ونسق کی زبان قرار پائی۔ افسانوں کی تعداد کثیر ایرانی ادب سے مستعار لی گئی۔ الف لیلہ۔ کلیلہ و دمنہ۔ شاہ نامہ اور دیگر فسانہ جات عشق و محبت کے پلاٹ ایرانی ادب سے ماخوذ ہیں۔ اخلاقی قصص اور بزرگ مہر و نوشیروان کے نقلوں کا ماخذ بھی یہی ایرانی ادب ہے۔ فن جنگ۔ علم بیطاری اور طب کی بعض کتابیں ایرانی سے ترجمہ کی گئیں۔ اہل ایران نے ریاضیات و ہیئت جیسے علوم میں بہت کم ترقی کی تھی مگر ان علوم کے متعلق بھی جو کتابیں ایرانی ادب میں موجود تھیں ان سے مسلمانوں نے استفادہ حاصل کیا علی ابن زیاد التیمی نے اپنی مشہور کتاب زیج الشہریار کو ایرانی زبان سے ترجمہ کیا۔ مشہور الخوارزمی نے برہما سدھانت کی تلخیص میں اس کتاب سے مدد لی ہے۔ ایرانی ادب سے مسلمانوں نے اکثر مصطلحات مستعار لی ہیں۔

ہندی عنصر دو مختلف ذرایع سے عربی ادب میں داخل ہوا:۔

۱۔ براہ راست سنسکرت اور پراکرت کے تراجم سے

۲۔ ایرانی تراجم سے یعنی ابتداءً سنسکرت اور پراکرت سے ایرانی میں ترجمہ ہوا بعدۂ ایرانی سے عربی لباس پہنایا گیا۔ مسلم فتوحاتِ ملکیہ نے بھی اس میں بہت زیادہ حصہ لیا۔

ملک ہند میں اسلام کا پرچم سب سے اول اموی عہد میں لہرایا اور عرب کا وہ منچلا نوجوان جو آج تاریخ میں محمد بن قاسم کے نام سے پکارا جاتا ہے، چھتیس کروڑ دیوتاؤں کے استھان میں آکر براجا۔ ہندو علوم وفنون سے مسلمانوں کی علم دوست طبیعت اس زمانہ میں بہت زیادہ روشناس ہوئی اور اسکی چاشنی ملک عرب کی علمی دنیا تک پہونچی۔ جب اموی نیرِ اقبال گہن میں آگیا اور عباسی مہر نیمروز نے اپنے تحیر خیز و نظارہ سوز انداز سے ایشیا کے ذرہ ذرہ کو جگمگانا شروع کیا تو ہندو اقوام اور ان کے علوم کا رسوخ بھی عربی قدردانوں میں یوماً فیوماً بڑھنے لگا۔ ہیئت و فلکیات۔ ہندسہ و ریاضیات کے مرقوم جواہر ریزے جدید آب و تاب سے عراقی بازاروں میں بکنے لگے۔

خلیفہ منصور (۷۵۳ - ۷۷۴) کے عہد حکومت میں سندھ کا ایک صوبہ تھا۔ اس صوبہ سے بغداد میں وفود آتے تھے اور بغدادی شائقین علم ہندوستانی علوم سے سیراب ہونے کے لیے مختلف قطاعِ ہند کے سفر کیا کرتے تھے۔ اسی زمانہ میں برہم سدھانتا مصنفۂ برہم گپت کا ترجمہ عربی میں ہوا۔ یہ کتاب علم ہئیت میں ہے اور سند ھند کے نام سے

مسلمانوں میں رواج پاگئی ہے۔ بطلیموسی اور فیثا غورثی کتب کی ترویج سے پہلے یہ سندہند مسلمانوں میں فلکیات اور ہیئت کا ذوق سلیم پیدا کر چکی تھی۔ اس کتاب کو محمد ابن ابراہیم الفزاری نے ہندو اصحاب علم کی مدد سے عربی کا جامہ پہنایا۔ اسکے علاوہ برہم گپت کی دوسری کتاب کرن کھنڈ کھانڈک کا بھی عربی میں ترجمہ ہوا اور اس کا نام الارکند مشہور ہوا۔ افسوس ہے کہ حوادث و مرور ایام نے ہمیں الفزاری کے علمی سرمایہ سے محروم کر دیا۔ اور اب صرف اس کا نام باقی ہے۔

یعقوب بن طارق نے دوسری صدی ہجری میں ہیئت و ریاضی۔ علم السنین اور جغرافیۂ ہنود کا درس دینا شروع کیا۔ محمد ابن موسیٰ الخوارزمی موجد جبر و مقابلہ و عربی عدد نے جو مسلمانوں میں مشہور ریاضی داں گذرا ہے سدھانت کی تلخیص کی اور بغدادی طالبعلموں کی زبان پر اسکو رائج کرادیا۔ الفزاری اور ابن طارق کا ہمعصر ایک دوسرا حکیم ابوالحسن اہوازی تھا جس نے سیاروں کی حرکات کی جدولیں چھٹی صدی عیسوی کے مشہور ریاضی داں اور ہیئت داں آریہ بھٹہ کی ہیئت کی کتابوں سے تیار کی تھیں۔ یہ کتاب سدھانت کے بعد عالم وجود میں آئی۔

علم ہیئت اور طب کے علاوہ ہندو حکماء کی بہت سی دیگر کتابیں بھی عربی میں ترجمہ کی گئیں۔ احکام نجوم۔ تعبیر رویاء۔ قیافہ شناسی۔ فلاحت اور موسیقی کی متعدد تصانیف عربی لباس سے ملبوس ہو کر شائقین علوم کے ہاتھوں میں پہونچیں۔

عہد ہارونی میں (۷۸۶ - ۸۰۸) برامکہ سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ اس خاندان نے ہند و علوم و فنون کے نشر و اشاعت میں نہایت فیاضی سے حصہ لیا۔ ہندو اصحاب علم کو بغداد بلا کر مناصب جلیلہ پر فائز کیا۔ طلبا ہندی علوم سے براہ راست واقفیت پیدا کرنے کے لیے ہندوستان بھیجے جاتے تھے۔ ہندو علماء کو کثیر مشاہرہ دے کر بغداد بلایا جاتا تھا۔ مشہور شفا خانے انکی نگرانی میں دیے جاتے تھے اور ان سے طب علم الادویہ علم السمم۔ فلسفہ۔ ہیئت اور دیگر علوم کی کتابوں کے ترجمہ میں مدد لی جاتی تھی۔ انھیں اغراض کے لیے مسلم سفیر برامکہ کی طرف سے ہندوستان کی سیاحت پر مامور کیے جاتے تھے۔ الموفق نے البیرونی سے پہلے ہندوستان کا سفر کیا۔ افسوس ہے کہ ہندی عربی تصنیفات کا زیادہ حصہ برباد ہو گیا۔ صرف اُنکے نام فہرستوں میں باقی ہیں۔

برامکہ کے زمانہ میں اسپتالوں کا مہتمم اعلیٰ ابن دہن تھا۔ یہ لفظ غالباً دھنیاں یا دھنین کا معرب ہے۔ اسی زمانہ کا دوسرا طبیب کنکا ہے اس کا اصلی نام کنکیانہ ہے۔ اسی نام کی ایک کتاب ہندی طب میں سند کا کام دیتی ہے۔ دوسرا طبیب واشہ ہے۔ یہ شخص مشروبات پر ایک کتاب کا مصنف ہے۔ اسی زمانے میں بیدبا یا یا بیدباہ کی ایک کتاب کا عربی ترجمہ ہوا ہے ہم اکثر اس نام کا ترجمہ بیدپاوے کے نام سے پاتے ہیں۔ یہ لفظ اصلاً ویداویاسا ہے۔ یہ فلسفہ ویدانت یا ہندی تصوف کا موجد خیال کیا جاتا ہے۔ اہل عرب نے سرپا ودیا (علم الحیات) وشا ودیا (علم السم) طلسم۔ طلبی ارواح۔ منطق۔ فلسفہ۔ اخلاقیات وسیاسیات وفن حرب کے متعلق بھی بہت سی کتابوں کے ترجمے کیے ہیں۔

جب سندھ عباسیوں کے ہاتھ سے نکل گیا سلسلہ تبادلۂ خیالات کا منقطع ہو گیا۔ ہندی علوم و فنون سے اہل عرب کو کافی شغف نہ رہا۔ اب عربی ادبیات کا رجحان دوسری طرف ہو گیا۔ اس زمانے میں مسلمان یونانی علوم و فنون سے خاص طور پر متاثر ہوئے۔ نسطوری اطبا و فلاسفہ حران نے افلاطونی ارسطاطالیسی اور جالینوسی نظریات کا درس دینا شروع کیا۔

خلافت میں ضعف پیدا ہونے کے بعد خاندان سامانیہ (۸۹۲ - ۹۹۹) نے ہندی علوم کے احیا کا دوبارہ بیڑا اٹھایا اس خاندان کے وزیر الجیہانی کو اس جانب خاص توجہ تھی۔ الپتگین و سبکتگین اسی خاندان کے آغوش تربیت کے پرورش یافتہ ہیں۔

خاندان سبکتگین کا مہر منیر سلطان محمود غزنوی ہے پانچویں صدی ہجری کے اوائل سے محمود کو مجبوراً ملاحدہ اور باطنیہ کے استیصال کے لیے ہندوستان آنا پڑا۔ محمود زبردست فاتح اور بعدیل جنرل ہونے کے علاوہ علم دوست اور فضل نواز بھی تھا۔ اسکے عہد میں غزنی علوم و فنون کا سرچشمہ اور فضلاء و اہل کمال کا ملجاء و ماوی تھا سلطانی عنایات و الطاف خسروانہ کے سحاب فیضان سے علم و فن کے سوکھے ہوئے جدولوں میں از سر نو آبیاری ہونے لگی۔ دور دور کے ارباب فضل و کمال شاہی کرم ہائے گوناگوں کے مقناطیسی اثر سے کھنچ کر اس عروس البلاد میں جمع ہوئے۔ عنصری۔ عسجدی۔ فرخی۔ انوری۔ فردوسی۔ البیرونی جیسے اساتذۂ علم و فن کا دربار میں مجمع تھا۔ ہند کے حکماء و فضلاء بھی اس ہمہ گیر کشش سے نہ بچ سکے۔ اس زمانہ میں غزنی دنیائے متمدن کا لندن تھا۔ علاوہ دیگر علوم کے سنسکرت

کے علمی ذخائر بھی قدر دانانِ فن کے سامنے پیش کیے جاتے تھے۔

عہدِ غزنوی کا ارسطاطالیس ثانی البیرونی ہے۔ البیرونی کو علومِ ہند سے خاص شغف تھا۔ اس نے ہندو علوم و فنون سے واقفیت تامہ حاصل کرنے کے لیے خود سنسکرت پڑھی تھی۔ اور مختلف حصص ہند کی سیاحت بھی کی تھی۔ بیرونی کی مشہور تصنیف "کتاب ابی ریحان محمد ابن احمد البیرونی فی تحقیق ما للہند" کتاب الہند کے نام سے مشہور ہے۔ البیرونی نے نہایت محنت و جانفشانی سے اہل ہند کے متعلق ہر قسم کی معلومات حاصل کیں اور انکو اس کتاب میں جمع کیا۔ کتاب الہند میں زیادہ تر ذاتی مشاہدات اور مطالعہ سے لی گئی ہے۔ البیرونی کو ۴۵ سال کی عمر میں یہ شوق پیدا ہوا اور اس نے ۱۵ سال تک ہندو علوم کی تحصیل و تلاش میں صرف کیے۔ البیرونی اہل ہند کے مذہبیات۔ فلسفہ۔ فلکیات اور ریاضیات کے متعلق نکات کو نہایت عمدگی سے سمجھتا تھا۔ اس میدان میں اسکی وسعت معلومات سے نہایت حیرت ہوتی ہے۔ البیرونی کی معرکۃ الآرا تصنیف ۱۰۔ ابواب پر مشتمل ہے۔ مضامین کی بوقلمونی۔ طرزِ بیان کی خوش اسلوبی اور مباحث کی جامعیت سے بے اختیار ہو کر کہنا پڑتا ہے کہ واقعی بیرونی نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ البیرونی نے اس کتاب میں ہر مسئلہ پر ایک بے لوث مورخ کے نقطۂ نظر سے تنقید کی ہے۔ اس کتاب سے علمی نشاۃ ثانیہ کا پتہ چلتا ہے۔

ملک ہند کی بدقسمتی سے ہندی خزائن علمیہ کے کلید بردار ایسے اصحاب تھے جو "ملکش" اقوام کے ناپاک قدموں سے اپنی پاک اور پوتر درسگاہوں کو گندہ نہ کرنا چاہتے تھے۔ زبان سنسکرت جو ہندی علوم و فنون کی زبان تھی چند برہمنوں کے حلقہ میں محدود تھی۔ غیر برہمن کی دسترس وہاں تک محال تھی۔ مگر امت محمدیہ کے تشنگان علم نے "الحکمۃ ضالۃ المومن" کو تلاش کرتے ہوئے ہزاروں میل کے سفر کرکے لاکھوں مصائب برداشت کرکے علم کے موتیوں کو سائنس کے گنجینوں کو ہر ممکن طریق پر فراہم کیا۔ سنسکرت کی صعب الحصول سرزمین بھی انکی تلاش کے دوررس اثرات سے نہ بچ سکی۔ اور انکی علم دوستی نے ہند کے پردہ نشین علوم و فنون سے دنیا کا تعارف کرا کے چھوڑا۔ البیرونی نے بھی زبان سنسکرت کی مشکل ترین صرف و نحو کی منزل ہفتخواں کو طے کرکے علمائے ہند کو رام کیا۔ اور ان سے علمی خزائن کی کنجیاں حاصل کیں۔ یہ تمام مراحل البیرونی کی متبحر طبیعت کے سامنے چنداں دشوار گزار

تھے ابتدائی مشکلات کے حل ہونے کے بعد البیرونی کی گیرائی نے ہر قسم کے علمی نکات کا احاطہ کر لیا اور کچھ عرصہ کے بعد وہ اپنے اساتذہ کی امداد سے بھی بے نیاز ہو گیا۔ البیرونی اس سلسلۂ تلمذ کے متعلق لکھتا ہے

> "ہندو ہیئت دانوں سے ابتداءً میرا تعلق شاگردانہ رہا۔ لیکن تھوڑے زمانہ میں جب کچھ واقفیت ہوگئی تو میری حیثیت استادی کی ہوگئی۔ مجھے ہیئت دانی میں مہارتِ تامہ حاصل تھی۔ اب میں انھیں خود درس دینے لگا۔ پنڈتوں کو میری معلومات سے بہت تعجب ہوتا تھا۔ وہ مجھ سے حیران ہو کر پوچھتے تھے کہ تم نے کس ہندو پنڈت سے یہ معلومات حاصل کی ہیں۔ انھیں کسی طرح یقین نہ آتا تھا کہ کوئی اجنبی انکے یہاں آکر ہمسری کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ وہ لوگ مجھے ساحر سمجھنے لگے تھے اور اکثر "ساگر" کے نام سے پکارتے تھے" (کتاب الہند باب اول)

البیرونی نے تحصیل علوم سنسکرت میں بہت سے پرانے تراجم سے بھی مدد لی تھی۔ یہ تمام تراجم اسکے کتبخانے میں موجود تھے۔ علی ابن زین کا **کراکا** کا ترجمہ اسکے یہاں تھا۔ **پنچا تنتر** کا ترجمہ اسکے پاس تھا۔ اس کے کتبخانے میں **کارن سار** مصنفۂ **وتی سوارا** کا بھی ترجمہ تھا۔ مترجم کا نام معلوم نہیں۔ البیرونی نے ہندو علوم کے سیکھنے میں الفزاری۔ ابن طارق۔ ابو الحسن اہوازی۔ الکندی۔ ابو معشر بلخی اور الجیہانی کی تصانیف سے بہت زیادہ مدد لی۔ اس نے پرانے تراجم کے اغلاط درست کیے۔ اکثر کتابوں کے عربی ترجمے کیے۔ **کپل کی سانکھ۔ پاتنجلی۔ پان سارے دھانت** مصنفۂ **برہم گپت** سدھانت یا سندہند کا ترجمۂ ثانی **یری ہم ہتیا** اور **لگھو جاتکم** مصنفہ **وراہمیر** کا نام البیرونی کی فہرست تراجم میں شامل ہے۔ امراض خبیثہ کے متعلق بھی ایک سنسکرتی تصنیف کا ترجمہ اس نے عربی میں کیا۔

البیرونی نے بعض عربی کتب کو بھی سنسکرت کا جامہ پہنایا۔ یہ ارادہ غالباً ہندو احباب کے اصرار پر کیا گیا ہوگا۔ کتاب الاقلیدس۔ کتاب المجسطی اور بعض اپنی تصانیف متعلق علم ہیئت کا ترجمہ اس نے سنسکرت میں کیا۔

اس کے علاوہ البیرونی نے بہت سی سنسکرت کتب کا مطالعہ کیا۔ **بھگوت گیتا** گوہر ادبیات سنسکرت البیرونی کو بہت زیادہ پسند تھی اس نے اس کا ترجمہ کیا ہے۔

دنیائے اسلام میں البیرونی ہی پہلا شخص ہے جس نے پرانوں کا بغور مطالعہ کیا اور غیر ہندو دنیا سے ان کا تعارف کرایا۔ پرانوں کے مطالعہ کے سلسلہ میں اسنے وشنو دھرم وشنو پران۔ وایا پران اور ادتیا پران کو بغور دیکھا۔ البیرونی نے مہابھارت راماین۔ منو مہاراج کا دھرم شاستر بھی پڑھا تھا۔ جگہ جگہ ان کتابوں کے اقتباسات اس کی تصانیف میں درج ہیں۔

البیرونی کی تصانیف اسکے پیشروؤں کے مقابلہ میں بہت زیادہ جامع مبسوط اور صحیح ہیں۔ البیرونی نے فلسفۂ ہنود کی شرح کا جواب طریق پر کی ہے۔ دینیات و فلسفہ کے مباحث کے سلسلہ میں البیرونی نے کپل کی سانکھ۔ پاتنجلی اور گیتا سے بہت زیادہ مدد لی ہے۔ ہیئت، نجوم، جغرافیہ اور دیگر مذاکرات کے دوران میں البیرونی نے کثیر التعداد ہندو تصانیف کا مطالعہ کیا تھا۔ غرض اس فرید روزگار و وحید عصر علامہ کے علمی تبحر اور وسعتِ معلومات پر عقل انسانی ششدر ہو جاتی ہے اور بے اختیار کہنا پڑتا ہے

بے دور باید کہ چرخ ظفر بیارد کسے چوں تو بار دگر

افغان و خلجی عہد حکومت میں مسلمانوں کی سلطنت ہندوستان میں دور دور تک پھیل گئی تھی۔ شاہانِ وقت و اعیانِ دولت نے علم و فن کی قدردانی میں خلفاء بغداد، ویالمہ و سلاجقہ کے نمونے پیش کیے۔ بادشاہانِ وقت و اہل دولت کی سرپرستیوں نے ہندوستان کو اہل کمال کا مستقر بنا دیا۔ مختلف شعبہ جات علمی کے ساتھ ساتھ علوم سنسکرت کو بھی حصہ ملا۔ بلبنی اور خلجی عہد میں ہندوستان کا شاعر بے بدل، باکمال ادیب، اقلیم سخن میں اپنی خسرویت کے کوکبہ کو بلند کرکے گورنظامی میں زلزلہ ڈال رہا تھا۔ آج ہندوستان کا بچہ بچہ حضرت امیر خسرو کے اسم گرامی سے واقف ہے۔ ترکی و فارسی امیر کی مادری زبان تھی۔ عربی ادب میں وہ ادباء عرب کے ہم پایہ تھے۔ سنسکرت میں بھی امیر کو مہارتِ تامہ حاصل تھی اُس وقت عربی اور ہندی تمدنوں کی آمیزش سے ایک نئی قوم بن رہی تھی جو آئندہ چل کر تاریخ ہند میں جدید باب کا اضافہ کرنے والی تھی۔ علوم، فنون، زبان و اخلاق میں حاکم و محکوم دونوں ایک دوسرے کا رنگ اختیار کرتے جاتے تھے۔ اہل ہند "الناس علیٰ دین ملوکہم" پر عمل پیرا ہو کر عربی و فارسی اساتذہ کے حضور زانوئے ادب تہ کر رہے تھے اور مسلمان اپنے ہمسایوں کے حالات اور علوم و فنون کے درخشاں کارناموں کو حاصل کرنے کے لیے بھاشا

اور سنسکرت سیکھتے تھے۔ امیر خسرو اس قِرانُ السعدین کے بہترین فرزند تھے۔ امیر نے موسیقی میں متعدد ایسی راگنیاں ایجاد کیں جو ہندی و عجمی راگوں کا مجموعہ تھیں۔ اس نے موسیقی میں انقلابِ عظیم پیدا کر دیا۔ علاوہ بریں شعر و سخن کے میدان میں امیر یکتائے زمانہ سخن ہیں۔ کوئی دوسرا ان کی گرد کو بھی نہیں پہونچتا۔ فارسی شاعری میں امیر کی نادرالکلامی نے شعرائے عجم سے خراجِ تحسین وصول کر کے چھوڑا۔ برج بھاکا میں بھی امیر اساتذۂ وقت کے ہم پلہ تھے۔ اوحدی نے تذکرۂ عرفات میں لکھا ہے کہ امیر کا جتنا کلام فارسی میں ہے اتنا ہی برج بھاکا میں ہے۔ افسوس ہے کہ زمانے کے بے رحم ہاتھوں نے امیر کے اس کلام کا مجموعہ ہم تک نہ پہونچنے دیا۔ امیر اپنی سنسکرت دانی کا تذکرہ "مثنوی نہ سپہر" میں ایک گونہ کسرِ نفسی کے ساتھ کرتے ہیں۔ ع

"من قدرے بہ سرایں کارشدم"

یہ شاعرانہ انکسار ہے ورنہ امیر کی وسعتِ معلومات اس زبان میں بھی کسی سے کم نہ تھی۔ امیر نے فارسی کے اشعار میں بھی بیشتر بھاشا کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ بالآخر اسی قسم کی فارسی و بھاشا کی ترکیبِ امتزاجی سے خانوادہ السنہ میں وہ دخترِ نیک اختر پیدا ہوئی جو آج اُردو کے نام سے پکاری جاتی ہے۔ امیر کے اس کلام کے چند نمونے ہم محقق ناظرینِ کرام کے تفننِ طبع کے لیے پیش کرتے ہیں

داریم آرزو کہ حکایت کنیم بات　　لالہ غلام روے تو صد برگ زیر پاے
ہر برہمن کہ دید رخِ خوبت اے صنم　　زنار را شکست دلکر زد برد ے لاے

رفتم تماشا کنار جوئے　　دیدم بہ لبِ آب زانِ ہندوئے
گفتم صنما بہاے موئیت چہ بود　　فریاد برآورد کہ دُر دُر موئے

شاہانِ ہند کے تغلقیہ سلسلے نے بھی ایسے ایسے قدردانِ علم و فن پیدا کیے ہیں کہ ان کا نام ہندوستان کی علمی تاریخ میں آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ اس سلسلہ کا گوہرِ درخشاں، انمول موتی فیروز شاہ تغلق ہے۔ آج ہندی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والا ہر فرد اس شاہِ ذیجاہ کے علمی و سیاسی کارناموں سے واقف ہے۔ برادرانِ وطن اپنے مسلمان محسنوں کی شان میں جتنا مشاتمہ چاہیں روا رکھیں اور ان کے متعلق جو چاہیں لکھیں، اور

سیاسی رنگ آمیزی کے خوگر مسیحی مورخین جو کچھ چاہیں تحریر کریں مگر منصف مزاج اور بالغ نظر اصحاب پر فرزندان اسلام کا عدل و انصاف پوشیدہ نہیں۔

عہد فیروزی میں اصحاب بست و کشاد میں سب سے زیادہ بلند مرتبہ دو ہندو وزراء کو حاصل تھا۔ ملک کا سیاہ و سپید اُن کے اختیار میں تھا۔ دربار شاہی سے بھی انکو "خانِ جہاں" کا خطاب تھا۔ سلطانی رواداری صرف مناصب تک محدود نہ تھی۔ دربارِ شاہی سے گراں قدر مصارف محکوم اقوام کے علوم و فنون کے حصول کے لیے بھی منظور کیے گئے تھے۔ جس وقت سلطانی عساکر ظفر موج کا داخلہ نگر کوٹ میں ہوا اور راجہ مخذول و مغلوب ہوکر دست بستہ حاضر دربار کیا گیا۔ فیاض سلطان نے دشمن کے قصور کو نہایت دریادلی سے معاف کر دیا اُسکی سلطنت اُسکو واپس دیدی۔ اس وقت عمائدین راج نے سلطان کو اطلاع دی کہ نگر کوٹ کے مندر میں جس شبیہ کی پرستش ہوتی ہے وہ نوشابہ زوجہ سکندر اعظم کی تصویر ہے۔ یہ تصویر یونانی فاتحوں نے اپنے مفتوحین کو نذر کی تھی اب اس شبیہ کی پرستش ہوتی ہے اُسکو "دیوی" کا مرتبہ حاصل ہے اور جوالا مکھی کے نام سے پکاری جاتی ہے۔ ہندوستان کی باطل پرستی قابلِ داد ہے۔ یہاں ہر صاحب عظمت کو بآسانی مرتبۂ الوہیت حاصل ہو جاتا ہے۔ اس مندر کے متعلق ہندو کتبِ علمیہ کا ایک کتبخانہ بھی تھا جس میں کم و بیش ۱۴۰۰ نادر نسخے تھے۔ فیروز نے صرف اس علمی سرمایہ کو اپنی فتح کا حاصل قرار دیا۔ بقیہ مال و منال سے عذر کیا۔ سلطانی حکم سے مختلف دیار و امصار سے ہندو اہل علم ان کتابوں کے ترجمے کے لیے جمع کیے گئے۔ مسلمان فضلا بھی اُنکے شریک کار رہے۔ اس زمانے میں مسلمانوں میں بھی سنسکرت دانوں کی کمی نہ تھی۔

اس سلسلہ میں خاص طور پر اس زمانے کے شہرۂ آفاق شاعر عزالدین خالد خانی کی خدمات حاصل کی گئیں۔ عزالدین علاوہ دیگر السنۂ شرقیہ کے زبان سنسکرت کا بھی فاضل تھا۔ عزالدین کو ایک کتاب کا ترجمہ سپرد کیا گیا جو بالآخر "دلائل فیروزشاہی" کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ کتاب فارسی نثر میں تھی۔ مسٹر ایلیٹ مولف تاریخ فیروزشاہی نے لکھنو کے ایک کتبخانے میں فارسی زبان میں علم ہیئت پر ایک کتاب دیکھی۔ اسکی اصل سنسکرت زبان میں تھی جس کا ترجمہ عہد فیروزشاہی میں ہوا تھا۔ اس عہد میں

علم بیطاری کی ایک کتاب سالی ہوتر کا ترجمہ فارسی میں ہوا اور اس کا نام "قرۃ الملک" رکھا گیا۔ غالباً سلوتر اور سلوتری اسی کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں۔ عہد شاہجہانی میں بھی اس کتاب کا دوبارہ ترجمہ ہوا۔ لودی عہد میں دیسی اور نو وارد اقوام میں میل جول اور اختلاط وارتباط بہت زیادہ ہو گیا۔ ہندو اصحاب نے فارسی ادب سے دلچسپی لینا شروع کر دی اور مسلمانوں کا رجحان سنسکرت کی طرف زیادہ ہوا۔ عہد سکندر لودی میں متعدد کتابوں کے ترجمے فارسی میں ہوئے۔ اس میں سب سے زیادہ مشہور ادگا مہا ویدک علم الادویۃ والمعالجہ کا ترجمہ ہے۔ اس تالیف جدید کا نام "طب سکندری" رکھا گیا۔ یہ کتاب اُس زمانے کے اطباء ہند کی سرمایۂ ناز تھی۔ بعد کو اس کتاب میں مزید ترمیمات ہوئیں۔ چنانچہ صاحب وقائعات مشتقی کا قول ہے کہ "یہ کتاب اُن مجموعہ کا نام ہے جسکو ویدک اطباء ہند اور خراسانی اطباء یونانی نے مدون کیا تھا"۔

تاریخی حیثیت سے ظلم ہوگا اگر ہم ہندوستانی مسلمانوں کے مساعیٔ علمیہ کے ساتھ ساتھ سلاطین بنگال کی ادبی و علمی دلچسپیوں کو نظر انداز کر دیں۔ فی زماننا السنۂ ہند میں بنگالی سب سے زیادہ جامعیت، علمیت اور کثرت ذخائر پر ناز کرتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بنگال نے ایسے ایسے باکمال اصحاب پیدا کیے کہ آج اُن میں سے اکثر اپنی عالمگیر شہرت و نیکنامی کے باعث چہار دانگ عالم میں مشہور ہیں۔ مشہور سائنس دان سر بوس اور شاعر بے بدل رابندر ناتھ ٹیگور کو کون نہیں جانتا۔ گیتان جلی آج بنگال کا سام وید ہے تمام اہل بنگال اپنی زبان پر بجا طور پر ناز کرتے ہیں، مگر کبھی کسی نے یہ معلوم کرنے کی بھی کوشش کی ہے کہ خود بنگالی زبان کا وجود کس کے فیضان کرم کا نتیجہ ہے؟ یہ مایۂ ناز زبان کس کے آغوش تربیت میں پلی، بڑھی اور جوان ہوئی؟ یہ زبان مسلم حکمرانان بنگال کی مرہون منت ہے۔ بنگالی ادب کا سنگ بنیاد مسلمانوں نے رکھا اور اُسکو مختلف تراجم و تصنیفات سے مالامال کیا۔ بنگال میں ایک عرصہ تک سنسکرت کا دور دورہ رہا ہے اور اہل علم و اہل مذہب کی زبان سنسکرت ہی تھی۔ بنگالی کو سنسکرت سے بہت زیادہ لگاؤ ہے۔ اس دختر ربیبہ کے نشو ونما اور نیز ہندی خزائن علمیہ پر قبضہ کرنے کے فطری میلان نے بنگال میں بھی حلقہ بگوشان اسلام کو سنسکرت کے دفائن اور کنوز مخفیہ کی طرف متوجہ کیا۔ یہی شوق تھا جو بالآخر بنگالی ادب کی ترقی کا باعث ہوا۔

ناصر شاہ سلطان بنگالہ ۱۲۸۲ء سے لیکر ۱۳۲۵ء تک سریر آرائے سلطنت رہا۔ ناصر شاہ صوبۂ بنگال کی دیسی زبان یعنی بنگالی کا بہت زبردست مربی و حامی گذرا ہے۔ سلطان کے عہد میں شاہی خزانۂ عامرہ کے مصارف سے **مہابھارت** کا ترجمہ سنسکرت سے بنگالی میں ہوا۔ مشہور شاعر **ودیاپتی** کو دربار سلطانی میں بہت بڑا رسوخ حاصل تھا اُس نے متعدد قصیدے سلطان کی مدح میں تصنیف کیے۔ **رامائن** کا بنگالی ترجمہ سلطان غیاث الدین کی یادگار ہے۔ ہمارے بھائیوں کی احسان شناسی قابل دید ہے کہ وہ اسکو راجہ کشنا نرائن کی جانب منسوب کرتے ہیں۔

سلطان حسین شاہ بھی بنگالی کا بہت بڑا محسن تھا۔ **مالادھر باسو** کو سلطان نے مامور کیا تھا کہ وہ **بھاگوت پُران** کو بنگالی لباس سے آراستہ کرے۔

سلطانی عہد کے والیوں اور صوبہ داروں نے بھی اس علمی دلچسپی میں بہت بڑا حصہ لیا اس زمانے میں چٹگانگ کی زمام حکومت ایک علم دوست والی "پراغل خاں" کے قبضہ میں تھی۔ اسکے بعد اسکا بیٹا چھٹے خاں نظامتِ چٹگانگ پر فائز ہوا۔ پراغل خاں کے اہتمام سے **مہابھارت** کا ایک اور ترجمہ بنگالی میں شروع ہوا۔ جسکا سلسلہ چھٹے خاں کے عہد تک جاری رہا۔ پراغل خاں کو بنگالی تراجم سے عشق تھا۔ وہ روزانہ **مہابھارت** کا ترجمہ سنا کرتا تھا۔ پراغل خاں کے زمانے میں "**استری پروا**" تک ترجمہ ہوا چھٹے خاں نے اس سلسلہ کو "**اشوامیدھ پروا**" تک پہونچا دیا۔ (ملاحظہ ہو تاریخ ادب بنگال مولفۂ **دنیش چندر سین** صفحہ ۱۲) اس زمانے میں سنسکرت داں صاحبان علم اور ہندو راجہ بنگالی سے متنفر تھے۔ اور اُسکو باقاعدہ ادبی زبان بنانے کے راستہ میں ان کا وجود سنگ راہ تھا۔ مگر مسلم حکمرانوں اور ناظموں کے علم دوست طبائع، روادارانہ خصائل اور غیر معمولی زرپاشی نے اس تنگ خیالی و کجروی کے ٹکڑے اُڑا دیے اور بنگالی کو اس راستے پر لگا دیا جس پر چل کر وہ متمدن السنہ کے مقابل لاف ہمسری مارنے لگی۔ خدا کی شان ہے کہ ہمارے دست حق پرست کے پروردہ اور ہمارے خوانِ کرم کے زلہ رُبا آج ہم پر پھبتیاں اُڑا رہے ہیں۔ سچ ہے

ہم نے جسکو آشنا لطفِ تکلم سے کیا   اُس حریفِ بدزباں کی گرم گفتاری بھی دیکھ

عہد شاہیہ کے مہتم بالشان سلسلہ کی دو اولین کڑیاں بابر و ہمایوں ہیں۔ انکا دور تغیر و

انقلاب کا دور ہے۔ حکومت کو ہنوز استقلال نصیب نہ ہوا تھا بلکہ ہمایوں تو
"اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے"
کا مصداق تھا، لیکن اکبری زمانہ علم و فن کی ترقی کا اعلیٰ عہد ہے۔ نیم جاہل بادشاہ کا دربار ہر مذہب و ملت کے باکمال اصحاب کا مرجع تھا "عبادت خانۂ اکبری" کی مجالس علمی مباحث کے لیے مخصوص تھیں۔ زردشتی واسرائیلی، مسیحی و ہنود، سُنّی و شیعہ، براہمنہ و جینی، بُدھ مت و دہریہ، غرض ہر مذہب و عقیدہ کے لوگ وہاں جمع تھے۔ پادری روڈلف بھی پرتگیزی مقبوضہ گوا سے اس علمی اکھاڑے میں زور آزمائی کے لیے حاضر ہوتا تھا۔ بادشاہی حکم سے بہت سی سنسکرت کی کتابوں کے ترجمے فارسی یا ہندی میں کیے گئے۔ ۱۵۸۲ء میں مہابھارت کے ترجمہ کا خاص اہتمام کیا گیا۔ بادشاہ کو اس سے گہری دلچسپی تھی۔ متعدد ہندو و پنڈت مختلف مقامات سے اس کار خاص کے لیے طلب کیے گئے۔ ملا عبدالقادر بدایونی، فیضی اور سلطان حاجی تھانیسری کی بھی امداد حاصل کی گئی۔ مکمل ہونے کے بعد اس ترجمہ کا نام "رزم نامہ" رکھا گیا اور اس کو جگہ جگہ مناسب تصاویر سے بھی مزین کیا گیا۔ ۱۵۸۹ء میں ملا عبدالقادر کے سپرد دوسری خدمت کی گئی۔ ملا سنسکرت میں بھی وحید عصر و یکتائے زمانہ تھا۔ ملا نے رامائن کا ترجمہ فارسی میں کیا۔ اسی زمانے میں اتھروید کا ترجمہ دوسرے عالم حاجی ابراہیم سرہندی کے سپرد کیا گیا۔ **لیلاوتی** کا ترجمہ فیضی کے حصہ میں آیا۔ فیضی بھی سنسکرت کا فاضل اور علامہ تھا۔ ہیئت کی ایک کتاب **تاجک** کا ترجمہ محمد خاں گجراتی کے سپرد کیا گیا۔ اکبری عہد میں کاشمیر کی سنسکرتی تاریخ کو فارسی کا جامہ پہنایا گیا۔ مولانا شاہ محمد شاہ آبادی اسکے مترجم ہیں۔ ترجمے کا نام بعد تکمیل "روضۂ طاہراں" رکھا گیا۔ **راج ترنگینی** کا ترجمہ مولانا عماد الدین کا مرہون منت ہے۔ سنسکرت کی مشہور کتاب "ہربنسا" کا ترجمہ بھی فارسی میں کیا گیا۔ سنسکرت کی دوسری شہرۂ آفاق تصنیف "**پنچا تنتر**" یا دانش طیور کے نام سے موسوم تھی۔ ملا نصر اللہ مستوفی نے نہایت محنت و جاں کاہی سے اسکو فارسی ملبوس سے مزین کیا اور اس کا نام کلیلہ و دمنہ رکھا۔ یہ ترجمہ مشکل تھا اسکو اور زیادہ سہل کیا گیا اور نئی تالیف کا نام عیار دانش ہوا۔ علامۂ عصر فیضی نے لیلیٰ و مجنوں کے طریق پر فارسی میں مثنوی لکھی۔ نل و دمینتی کے مشہور افسانۂ عشق و محبت کو سنسکرت سے لیکر نظم فارسی

جامہ پہنایا اور اُس کا نام نل دمن رکھا۔ اس مثنوی کا مشہور مطلع

اے در تگ و پوے تو ز آغاز عنقا سے نظر بلند پرواز

اسوقت تک زبان زدِ عوام ہے۔ سنسکرتی تراجم کو اور بھی زیادہ دلکش اور دلآویز بنانے کے لیے فن مصوری سے امداد لی جاتی تھی اور فن تصویر سازی و تحریر کے ہر جدید اسلوب سے انکو مرصع و مذہب کیا جاتا تھا۔ شاہنشاہی فرمان کے اتباع میں سنسکرت کے مشہور عالم تصنیف سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ ملا عبدالقادر بدایونی نے فارسی میں کیا۔ اس جدید تالیف کا نام خرد افزا نامہ رکھا گیا۔ علامہ ابو الفضل کے زیرنگرانی متعدد ہیئت کی کتابیں سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کی گئیں۔ ان کتابوں میں کشن جوشی۔ گنگا دھر اور مہیش مہانندا شامل ہیں۔ عہد شاہجہانی میں سنسکرت کی تعلیم و ترویج زیادہ تر شاہزادۂ دارا شکوہ کی مرہونِ منت ہے۔ دارا شکوہ خود سنسکرت کا فاضل تھا اور بآسانی سنسکرت کا ترجمہ فارسی میں اور فارسی کا ترجمہ سنسکرت میں کرسکتا تھا۔ اس شاہزادہ کو ہندو علوم و فنون سے غلو تھا۔ اسکے وقت کا زیادہ حصہ پنڈتوں، جوگیوں اور سنیاسیوں کی خدمت میں گذرتا تھا۔ دارا شکوہ کے کے پاس ایک انگوٹھی تھی جسکے نگ پر اس نے "پربھو" کندہ کرایا تھا۔ وید کے ترجمہ کے لیے اس نے جگہ جگہ سے ہندو علماء کو طلب کیا تھا۔ دارا شکوہ نے اپنیشد کا ترجمہ فارسی میں کیا اور اس کا نام سرّ الاسرار رکھا۔ بھاگوت گیتا کا ترجمہ بھی دارا شکوہ کے حُسنِ سعی کا نتیجہ ہے رامائن کا بھی نیا ترجمہ کیا گیا۔ دارا شکوہ پر ہندو فلسفہ، ویدانت اور صوفیاء کے مسئلۂ "ہمہ اوست" کا رنگ غالب تھا۔ ان دونوں مسائل کی تشریح کے لیے اُس نے ایک کتاب "مجمع البحرین" تصنیف کی۔ غرض سنسکرت کی تصانیف کے تراجم کا سلسلہ عہد محمد شاہ تک جاری رہا۔ محمد شاہ نے دہلی میں ایک زبردست رصدگاہ تعمیر کرائی اور اُسکا نام "جنتر منتر" رکھا۔ یہ رصدگاہ جاٹوں کی یورش میں تباہ ہوگئی۔ مرزا خیر اللہ، شیخ محمد اور جے سنگھ اس رصدگاہ کے روح رواں تھے۔ رصدگاہی مشاہدات کا نام "محمد شاہی نقشۂ ہیئت" رکھا گیا۔ زیچ محمد شاہی اسی رصدگاہ کی ممنونِ احسان ہے۔ دہلی کی رصدگاہ میں ایک زبردست دھوپ گھڑی تھی جو سمرت جنتر کے نام سے ملقب تھی۔

افسوس! اس وقت دنیاے اسلام پر علمی جمود کی کیفیت طاری ہے۔ علوم و فنون کے جدید شعبوں کی تحقیق و تدقیق تو در کنار ہم میں اتنی بھی صلاحیت باقی نہیں کہ ہم کم از کم

اپنے اسلاف کے علمی کارناموں کو اپنے ذہن ہی میں محفوظ رکھ سکیں
ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

محمد یحیی ایم اے بدایونی

غزل

جناب سید انور حسین صاحب آرزو لکھنوی جانشین حضرت جلال مرحوم

کیا ہنسیں بولیں کہیں درد محبت دل میں ہے
چھیڑنے کو یادِ خلوت ساتھ ہر محفل میں ہے

صفحۂ دردِ نہاں کی سطر ہے ایک اک شکن
ہاں مرے ماتھے پہ لکھا ہے جو میرے دل میں ہے

زندگی میں موت کا ڈر خوفِ پرسش بعدِ مرگ
اک نئی مشکل غرض درپیش ہر منزل میں ہے

دردِ الفت کے مزے لیتا ہوں کہہ سکتا نہیں
تا زباں کس طرح وہ آئے جو لذت دل میں ہے

آفتِ ہوش و خرد ہیں دھشر کی دلچسپیاں
جس سے شمعیں بجھ رہی ہیں وہ ہوا محفل میں ہے

جام کو چھلکا دیا شیشے میں کھاکر مے نے جوش
ٹپکی پڑتی ہے وہ آنکھوں سے جو حسرت دل میں ہے

بن گئی جوہر زبانوں کا مرے دل کی خلش
ذکر اب رازِ نہفتہ کا ہر اک محفل میں ہے

کچھ نہیں حاجت کماں کی گر نشانے میں ہو جذب
جو ترے ترکش میں تھا وہ تیر میرے دل میں ہے

ہیں سبق آموز عالم واقعاتِ زندگی
وہ چراغِ کشتہ ہوں جسکی ضیا محفل میں ہے

درد اک دیتا ہے لاتا ہے دو اک آرزو
دیکھو کس کس طرح کا اہر یکھوی محفل میں ہے

قصائد محشر پر تنقیدی نظر

جناب مرزا کاظم حسین صاحب محشر لکھنوی کا دیوانِ قصائد مسمّٰی بہ "شفیع محشر" کچھ مدت گذری شائع ہوا ہے۔ قصائد تمامتر اہلبیت اطہار اور ائمۂ کبار کی منقبت میں ہیں۔ دیوان کے آخری اوراق پر چند مشہور احباب کی تقریظیں شامل ہیں جن میں مصنف موصوف کے کلام پر کسی قدر وضاحت کے ساتھ تبصرہ کیا گیا ہے۔

یہ مسلّمہ امر ہے کہ اصنافِ شاعری میں مشکل ترین صنف قصیدہ ہے۔ چنانچہ غزل گوئی سے متجاوز ہو کر شاعر قصیدہ کے میدان میں قدم رکھتا ہے۔ اس طرح قصیدہ کا میدان غزل سے وسیع تر ہے اور اس میں شاعر کے سمندِ فکر کو زیادہ آزادی کے ساتھ جولانی کا موقع ملجاتا ہے۔ گذشتہ دَورِ شاعری میں قصیدہ محض سلاطین و اُمراء کی مدحت سرائی کے لیے وقف سمجھا جاتا تھا اور کسی دوسرے عالی تر مقصد میں اس کا استعمال شاذ و نادر ہی ہوتا تھا۔ گویا یہ شعرا کے لیے دنیاوی اعزاز و دولت حاصل کرنے کا آلہ رہ گیا تھا۔ موجودہ دَور میں شاعری کی بالعموم اور قصیدہ گوئی کی بالخصوص کساد بازاری کے اسباب مشرقی سلاطین کا انتزاعِ سلطنت نظامِ حکومت کا تغیر، اور اُمرا کے سلبِ اختیارات وغیرہ کہے جاسکتے ہیں لیکن فی الحقیقت اس کا سب سے بڑا راز عالمگیر شاعرانہ مذاق کی تبدیلی ہے۔ اب کسی شاعرانہ خوبی کا معیار شوکتِ الفاظ اور بعید از واقعہ حالات کی مبالغہ آمیز بندش نہیں، بلکہ حقیقی جذبات اور کارآمد خیالات کا اظہار ہے۔ اور یہی فی الواقع شاعری کا اچھا مصرف ہو سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ منقبت نگاری شاعری کا بالعموم اور قصیدہ گوئی کا خاص کر اعلیٰ ترین مقصد کہا جا سکتا ہے لیکن شاعری کی یہ صنف جس قدر اہم ہے اُسی قدر دشوار بھی۔ اسکے لیے ضروری ہے کہ شاعر کو اس باب میں فطرت کی طرف سے خاص طور پر مذاقِ سلیم اور جوہرِ استعداد مناسب ودیعت ہوا ہو۔ کیونکہ فطری استعداد کی عدم موجودگی میں شرفِ قبول حاصل ہونا نہ صرف مشکل بلکہ امرِ محال ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ شعرا کے حلقہ میں ہم کو ایسے شاعر جنھوں نے اس صنف میں معراجِ کمال حاصل کیا ہو صرف معدودے چند نظر آتے ہیں۔

جناب محشر کے کلام میں شاعرانہ محاسن کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ ہم ذیل میں

نمونے از خروارے پیش کرتے ہیں۔
رفعت تخیل میں بعض بعض جگہ تو جناب محشر کا پایہ کسی طرح قاآنی سے کم نہیں رہتا۔ ملاحظہ ہو

وہی میں ہوں کہ جوشِ نشہ میں میری نگاہوں نے لگائے بارہا نشتر رگِ ابرِ بہاراں پر
وہی مئے نوش ہوں جس وقت کھولا منہ صراحی کا اُڑا اس طرح جو ہر چھا گئی بدلی گلستاں پر

لطافت خیال کے باب میں انشانے بڑے بڑے جوہر دکھائے ہیں لیکن جناب محشر کا یہ شعر بھی لطافت کی جان ہے :-

زحمتِ تشریف سے چہرہ پہ سرخی آگئی کیا ہی رنگِ حسن میں ڈوبا ہوا پھولا گلاب

ذیل کے شعر میں بہار کے اعلان کا پیرایہ کس قدر لطیف اختیار کیا گیا ہے :-

دیتے ہیں غنچے چٹک کر نغمۂ بلبل کی داد کر رہے ہیں عاشق و معشوق اعلانِ بہار

رہوارِ تخیل کی میدانِ منقبت میں جولانی ملاحظہ ہو :-

جو اُدنیٰ شحنۂ عدلِ شہِ والا کا آیا ہو نہ لے مریخ پھر صبح ابد تک نامِ جلادی
یداللٰہی دکھائی آپ نے یوں جنگِ خیبر میں کہ توڑا کفر کے رشتے کی صورت بابِ فولادی

بہار کی ردیف میں بے شمار قصائد کہے گئے ہیں، لیکن جناب محشر کے قصیدہ نے منقبت کے پیرایہ میں اس ردیف کو چار چاند لگا دیئے ہیں :-

گلشنِ محبوب خالق کے گلِ شاداب ہیں جنکا اک کہنہ سراپردہ ہے دامانِ بہار
آپ کے گلزارِ معنی کی اگر پھیلے شمیم گھیر لے کون و مکاں کو دَورِ دورانِ بہار
طبعِ روشن سے جو دیں اُفتادہ طینت کو ضیا غازۂ روئے جناں ہو خاکِ میدانِ بہار
عدل انکا قلبِ دشمن میں جو نیکی ڈالدے تا قیامت ہو خزاں ہی سے نگہبانِ بہار
آتشِ قہر و غضب سے ہوں اگر پیدا شرر کاغذِ آتش زدہ بنجائے دامانِ بہار

مندرجۂ بالا محاسن کے ساتھ ساتھ جناب محشر کے کلام میں بعض ایسی فروگذاشتیں بھی نظر آئیں گی جنکے متعلق ماننا پڑیگا کہ وہ جناب محشر جیسے کہنہ مشق، ماہرفن اور پُرگو شاعر کے شایانِ شان نہیں ہوسکتیں۔ اس مختصر ریویو میں ہم اس فروگذاشت کے پہلو کو بھی جس کی موجودگی ہر مصنف کے کلام میں کم و بیش ہونا فطری امر ہے مختصراً پیش کریں گے۔ اس طرح تصویر کے اُس تاریک رخ پر کسی قدر روشنی پڑ جائے گی جسکی عدم موجودگی میں دائرۂ تنقید محدود و ناقص

ہو کر رہ جاتا ہے۔

اولاً ہمارا اشارہ صرف اُن اغلاط کی جانب ہے جو شاعرانہ نقطۂ نظر سے سرزد ہوئی ہیں۔ مذہبی تنگ نظری اور عقیدتمندانہ غلو کی بنا پر جو ہیں وہ اسکے علاوہ ہیں۔ باینہمہ جناب محشر کا کلام دیگر مختلف اعتبارات سے بلند پایہ اور فی الجملہ قابل ستایش ہے اور آپ موجودہ شعرا میں ایک ممتاز اور بلند درجہ پانے کے مستحق ہیں۔

ان اغلاط کی مثال میں ہم جناب محشر کے دیوان قصائد سے چند اشعار انتخاب کرکے پیش کرتے ہیں، ملاحظہ ہوں :۔

اگر محشر ہوں پی لوں گا وہیں الدن نیت بھر کے   قیامت کا بھروسہ ہے مجھے جذبات پنہاں پر

ظاہر ہے کہ "نبت" میں صحیح یائے مشدد ہے نہ کہ متحرک۔ یہ ایسی فروگذاشت ہے جو کسی طرح اجازات شعر کی حد میں نہیں آسکتی۔

نیز ملاحظہ ہو :۔

یہ دنیا درمیاں ہیں اک حد فاصل ہو گیا یعنی   جیوں گا تیرے احساں پہ مروں گا تیرے احساں پر

اس شعر میں حد کی دال بالتشدید ہونا چاہیے۔

اسی طرح اس شعر میں :۔

شگافِ خامہ جسکا حیدرِ صفدر کی نصرت میں   بنا ہے درمیاں میں حق و باطل کے حدِ فاصل

ذیل کے شعر میں "لے" کی 'ی' وزن سے گر جاتی ہے، جو اگرچہ اجازات کی حد میں آتا ہو لیکن شاعرانہ معائب میں ضرور داخل ہے :۔

وہ ساقی جسکا جام شربتِ دیدار پینے کو   لے آیا جذبۂ دل کھینچکر آدم کو جنت سے

مندرجۂ بالا شعر ہمارے سرسری انتخاب میں آگیا ہے، ورنہ اس نوع کے اغلاط جو اس سے زیادہ سنگین اور بدنما ہیں جناب محشر کے دیوان میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔

دوسری نوع کے تحت میں وہ اغلاط ہیں جو "غلوِ مذہبی" کی بدولت، جسے "فرطِ محبت" سے تعبیر کیا جاتا ہے پیدا ہوئی ہیں۔ اور ہماری نظر میں یہ اغلاط کی معیوب ترین قسم ہے۔ جناب محشر کا یہ قول کہ :۔

بجوشِ منقبت مدہوشیاں بھی عین ملت ہیں   نہیں پروا اگر محشر کو لہدے کوئی غالی ہے

خلاکا مدّا نکا ما دشمنِ آلِ محمدؐ ہے   زمانہ دیکھ ہی لے گا قیامت ہونیوالی ہے

برأت کی سند نہیں ہو سکتا۔ اگر غلو کے جذبہ نے فرقِ مراتب باقی نہ رکھا جسکی مثال نُصیری کا عقیدہ پیش کرتا ہے تو ایسا غلو مستحسن نہیں بلکہ خسرانِ عظیم کا باعث ہے۔ گر فرقِ مراتب نہ کُنی زندیقی۔ لیکن محشر صاحب بالخصوص اُس موقع کے لیے کیا کہیں گے جہاں اُنھوں نے اہلبیت کی منقبت کے غلو میں احترامِ شانِ رسالت کو نظر انداز کر دیا ہے۔ یہاں

با خدا دیوانہ باش و با محمدؐ ہوشیار

کا مفہوم پیش نظر رہنا چاہیے تھا۔

مثال کے طور پر ملاحظہ ہو :-

جہانِ فطرت میں اُس کا ہمسر خیالِ انساں کہاں سے لائے
کہ جسکو ذات و صفاتِ احمدؐ سے ادعا ہو برابری کا

خدائی صدقے ہے جولانگہِ حسنِ امامت پر — جہاں مُہرِ نبوت کو بھی شوقِ پائمالی ہے

اسی "جوشِ غلو" یا جذبِ محبت سے بے اختیار ہو کر جناب محشر دیگر انبیا علیہم السلام کی شان میں ایسے کلمات ادا کر گئے ہیں جن سے صاف طور پر تنقیص و اہانت کا پہلو نکلتا ہے۔ اس نوع کے اشعار انکے تقریباً ہر قصیدہ میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہم یہاں چند اشعار درج کرتے ہیں:

یدِ بیضا کلیم اللہ نے پایا انکے صدقہ میں — دمِ حسنِ عطا یہ قدرتِ روشن خیالی ہے

قصۂ یوسفؑ شنیدہ واقعہ یہ دیدہ ہے — جوشِ عشرت کا سبب اہلِ ولا سے پوچھیے

گویا قصۂ یوسف کی صداقت میں جو نصِ قرآنی سے ثابت ہے، شبہ کی گنجائش ہے۔ نعوذ باللہ من ذٰلک۔

ذیل کے اشعار سے انبیاے اولوالعزم کی شان میں استخفاف کا پہلو نکلتا ہے :-

زہرِ عیسیٰ کی ہیں گو چرخ کے تاک شہپر — فقر کی حالت میں فخرِ نفس حیدر دیکھ لو

چلے ہو طور پہ سننے کو موسیٰ یار کی باتیں — خدا ہی راس لائے حسرتِ دیدار کی باتیں

حشر کا روز آئے تو عہدِ خدا دکھائے تو — حب کی سند کہ انبیا آپ کو مقتدا کہیں

شرابِ حُبِ علی کا ہے میری بزم میں دور — حلال کہہ کے جسے انبیا ہوے عاقل

ترے کرم کو اگر دیکھیں نزعِ مومن میں — مسیح و خضر کو ہو جائے زندگی مشکل

رسولانِ سلف کو جب ہوا قربِ خدا حاصل — کہ دنیا کو گیا ملے آپ کی راہِ ہدایت سے

وہ در پردہ جمالِ مرتضیٰ کی ایک جھلکی تھی — گیا تھا طور پر جسنے کلیم اللہ کو غافل

جناں سے انبیا کی رُوحیں کیسی ہوئی آئیں　ہمارے ترک اولیٰ کی بھی حل ہو یا علی مشکل
کہاں ہیں حضرت یوسف نہ اب سامنے آئیں　جمالِ مرتضیٰ نے سارے دعوے کر دیے باطل
بے تکلف قبر میں پھر دیکھنا حُسنِ علی　جلوہ گاہ طور سے موسیٰ پھریں ناکامیاب
آئیں کلیم میرے ساتھ نورِ خدا نجف میں ہے　جذبۂ شوقِ لُوِ رنگ جا کے دکھا دیا تو کیا
نہ جانے موسیٰ پہ کیا بنی تھی کہ طور کی شکل پھر نہ دیکھی　بُرا نہ مانے کوئی تو کہدیں یہ شانِ شوق لقا نہیں ہے
جناب یوسف پہ چاک دامن ہنسا تو دل کو ہوئی مسرت　ارے زلیخا ذرا خبر لے یہ مقتضائے وفا نہیں ہے
وغیرہ ۔

اس نوع کے گستاخانہ تخیلات عاشقانہ شاعری میں نہ صرف جائز بلکہ بدقسمتی سے اُسکے طرۂ افتخار سمجھے جاتے ہیں لیکن منقبت کے باب میں یہ کہاں تک قابلِ قبول یا قابلِ درگزر ہو سکتے ہیں، اسکا فیصلہ ہم ناظرین کے ذوقِ سلیم پر چھوڑتے ہیں ۔

اس امر کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ جناب محشر مذہب امامیہ رکھتے ہیں ہم یہ عرض کریں گے کہ جناب محشر کے عقائد فی الحقیقت اُس متجاوز عن الحد اور محدود شیعی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں جس نے سب و شتم یا بدرجۂ اقل نوک جھونک کو اپنا شعار مذہبی سمجھ رکھا ہے ۔ اس دعوے کے ثبوت میں ہم جناب محشر کے چند اشعار پیش کرتے ہیں ملاحظہ ہوں :-

یہ صدائے بازگشت اب تک غدیرِ خم کی ہے　مصطفےٰ کا جز علی کوئی نہیں نائب مناب
وجہ نزولِ اِنّما خاص علی کی ذات ہے　فرطِ ہوس میں اوروں نے گھر بھی لُٹا دیا تو کیا
علی خلیفۂ برحق علی امین اللہ　علی وصیِّ بلا فصل و رہبرِ کامل

علاوہ ازیں بعض قصائد میں طوالت و اطناب حدِ اعتدال سے متجاوز ہو گیا ہے ۔ مثلاً قصیدہ زیرِ عنوان "مناظرۂ حقیقی" میں سوال و جواب کی ایک لڑی قائم کر کے ہر پہلے شعر کے مصرعۂ ثانی کو دوسرے شعر کے مصرعۂ اولیٰ سے مربوط کیا ہے ۔ لیکن اس سلسلہ کے درمیانی حلقوں میں اکثر مقامات پر ندرت و لطافت مفقود ہو گئی ہے اور بھرتی کے جملوں اور برائے بیت الفاظ کا داخلہ مذاقِ سلیم پر گراں گزرنے لگتا ہے ۔

محبوب علی صدیقی

ریسرچ اسکالر الٰہ آباد یونیورسٹی

ایک دلچسپ مکالمہ

(اردو شعر و شاعری پر)

گرمی کا موسم صبح کا وقت، دل میں آیا کہ آج سویرے چل کر دہلی سے جو چیزیں لانا ہیں اُنھیں خرید لاؤں۔ چاندنی چوک پہونچا تو معلوم ہوا کہ ابھی دُکانیں نہیں کھلیں۔ تقریباً آٹھ بجے ہوں گے۔ اب یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ دس بجے تک کا وقت کہاں اور کس طرح کاٹا جائے۔ فوراً خیال آیا کہ احمد مرزا سے عرصہ سے ملاقات نہیں ہوئی اور غالباً اُنکو شکایت بھی ہوگی کہ میں اکثر دہلی آتا جاتا ہوں اور اُن سے کئی مہینے سے نہیں ملا۔ چلو آج اُن سے ملیں اور بعد ازاں چاندنی چوک سے چیزیں خرید کر غازی آباد واپس ہو جائیں۔ جلد ہی جلدی قدم اُٹھا کر میں احمد مرزا کے عالیشان مکان پر پہونچا۔ حضرت ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے حقے کا شغل فرما رہے تھے اور دو چار اصحاب جو میرے بھی شناسا تھے اِدھر اُدھر کرسیوں پر تمکن تھے۔ مجھے دیکھتے ہی احمد مرزا نے کہا "آج کہاں بھول پڑے؟" اور دیگر حضرات نے کہا "بھئی خوب آئے، آپ سے تو عرصے سے ملاقات ہی نہیں ہوئی تھی" مزاج پرسی اور معمولی شکوہ و شکایت کے بعد سلسلۂ کلام یوں شروع ہوا جو غالباً پہلے سے جاری تھا:

احمد مرزا۔ "بھئی! مجھے تو جگر مرادآبادی، اصغر گونڈوی، اور فانی بدایونی کے کلام میں ایک ندرت معلوم ہوتی ہے اور ہماری شاعری جو ابتذال کی حد تک پہونچ گئی تھی اور نواب مرزا داغ مرحوم کے بعد ہر غزل گو نے جو اپنا شعار معاملہ بندی قرار دے لیا تھا اور غزل کو ہزل بنا دیا تھا اُس شاہراہ سے ہٹ کر چند شعراء نے نئی راہ نکالی جن میں سے یہ تینوں حضرات ضرور قابل الذکر ہیں۔ انھوں نے دنیا کو دکھلا دیا کہ اُردو شاعری محض زلف پیچاں اور کنگھی چوٹی تک محدود نہیں ہے۔ اس میں اعلیٰ خیالات بھی نظم ہو سکتے ہیں۔ اور غزل ہی وہ میدان ہے جس میں ہر قسم کے جذبات و احساسات نہایت عمدگی کے ساتھ مختصر طور پر ظاہر کیے جا سکتے ہیں۔"

راقم۔ "آہا! آج تو پروفیسر احمد مرزا صاحب اُردو شاعری پر لیکچر دے رہے ہیں! بھئی غور سے سنو۔"

احمد مرزا۔ (ذرا ہنس کر اور راقم سے مخاطب ہو کر) "خیر! لیکچر ویکچر تو نہیں! آپ کے آنے سے

پہلے کچھ اسی قسم کی باتیں آپس میں ہو رہی تھیں میں نے بھی اپنا خیال ظاہر کر دیا۔ اتفاق سے آپ بھی تشریف فرما ہیں۔ تبادلۂ خیالات نہایت عمدہ چیز ہے کچھ آپ بھی اس بارے فرمائیے۔"

راقم - (اظہار، عابد، محمود کی طرف دیکھ کر) "پہلے کچھ آپ حضرات ارشاد فرمائیں تو مجھے اصل بحث کا پتہ چلے۔ پھر میں بھی اپنے ناچیز خیالات کا اظہار کروں گا۔"

اظہار - بحث صرف یہ ہے کہ "تغزل اردو شاعری کی جان ہے اور اردو شاعری کو اعلیٰ مدارج پر پہونچانے کے لیے تغزل ہی کو ترقی دینی چاہیے"۔

عابد - احمد مرزا صاحب نے اُن اصحاب کے نام لیے تھے جنھوں نے تغزل کا اعلیٰ معیار قائم کر دیا ہے۔

محمود (راقم سے مخاطب ہو کر) اب آپ کہیے۔ آپ اس خیال سے متفق ہیں یا آپ اس کی تردید کے لیے تیار ہیں۔

راقم - میرے خیالات سے آپ صاحبان بخوبی واقف ہیں۔ میں تو اردو زبان کی ترقی کے لیے سرے سے شاعری ہی کو کچھ عرصہ کے لیے بند کرنا چاہتا ہوں اور نثر کے میدان میں ہر تعلیم یافتہ شخص کو یکہ تاز اور شہسوار دیکھنا پسند کرتا ہوں۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ لوگ اب تک غزل لکھے چلے جاتے ہیں حالانکہ اس صنف میں اب کچھ لکھنے کے لیے باقی نہیں رہا اور ہمارے بزرگ اساتذہ اس مضمون پر اس قدر خامہ فرسائی کر چکے ہیں کہ اب غزل لکھنا حماقت شعاری میں داخل ہو گیا ہے۔ مرزا غالب مرحوم کی تقلید میں اگر زور لگا کر اور عمر ضائع کر کے بعض اصحاب کچھ عمدہ شعر بھی کہ لیتے ہیں تو میرے نزدیک کوہ کندن و کاہ برآوردن کے مصداق ہیں۔ کیا ان کا حاصل عمر یہی ہے بہ قول مولانا حالی

کہ جب شعر میں عمر ساری گنوائیں تو بھانڈ اُن کی غزلیں مجالس میں گائیں

شاید آپ صاحبان کہیں کہ اب بھانڈ تو اُن کی غزلیں نہیں گاتے البتہ خود اپنی غزلیں ترنم کے ساتھ مشاعروں میں پڑھتے ہیں اور لوگ اُنکے اشعار پڑھ پڑھ کر سر دُھنتے ہیں۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو لیکن ایک زمانہ آئے گا جب ہماری آیندہ نسلیں ہماری اس غلطی کو کبھی معاف نہ کریں گی۔ ہم اپنے بزرگ اُستادوں کو اس وجہ سے معاف بھی کر دیتے ہیں کہ وہ اپنے زمانے کے حالات سے متاثر ہو کر اور اُس سوسائٹی میں رہ کر غزل لکھتے تھے جبکہ شاعری کا اصل مفہوم غزل ہی سمجھا جاتا تھا۔ مگر اب شاعری کا مفہوم غزل تک محدود نہیں رہا۔ اور نہ وہ حالات

رہے۔ شاعری میں ہر قسم کے جذبات و احساسات کے اظہار کے علاوہ ہر کیفیت کا نقشہ کھینچنا، ہر واقعہ کو اصل کی طرح کر دکھانا، ہر خیال کو اِس انداز سے بیان کر دینا کہ سادہ لفظوں میں اس کا اظہار اگرچہ دلکش نہ ہو تاہم شعر میں وہ نہایت مرغوب اور مطبوع خاطر ہو جائے۔ یہ سب باتیں شاعری میں داخل ہیں۔ ہمارے بزرگوں نے غزل، مثنوی، قصیدہ اور مرثیہ وغیرہ کو شاعری سمجھ رکھا تھا اب یہ صرف اصنافِ سخن میں سے ہیں۔ لفظ شاعری کا اطلاق ان پر نہیں ہوتا۔ ہمارے زمانہ میں خدا کا شکر ہے لوگ شاعری کو اُس کے حقیقی معنوں میں سمجھنے لگے ہیں۔ لیکن جس طرح انقلابِ فرانس اصلاحاتِ آئینِ حکومت کی بنا پر واقع ہوا تھا اور لوگ بادشاہت سے متنفر ہو کر بادشاہ اور اُس کی ملکہ کو قتل کر چکے تھے مگر ایک شخص نپولین بونا پارٹ کے زیر فرمان ہو کر وہ شہنشاہیت کو پسند کرنے لگے۔ اور نپولین کے زوال کے بعد بھی خاندان بوربون (جو صدہا سال سے فرانس پر حکومت کرتا چلا آتا تھا) سے ہمدردی ظاہر کرنے لگے۔ اُنکو پھر اپنا بادشاہ بنایا اور بعد ازاں انکی کمزوریوں سے تنگ آکر پھر نپولین سوئم (جو نپولین بونا پارٹ کا بھتیجا تھا) کے ہاتھ میں عنانِ حکومت دیدی یہاں تک کہ فرانس و پروشیا کی جنگ ۱۸۷۰ء نے فرانس میں جمہوری سلطنت مستقل طور پر قائم کر دی۔ اور اب فرانس برابر جمہوری سلطنت چلا آتا ہے۔ اسی طرح ہماری اُردو شاعری میں غزل کی بے نمکی، قصیدہ کے مبالغہ اور مثنوی کی تلخی نے اصلاح شاعری کا خیال پیدا کیا۔ کرنل ہالرائیڈ نے ہماری شاعری کے انقلاب میں روبسپیر کا کام انجام دیا۔ آزاد نے لیفٹ کا اور حالی ہماری شاعری کے زمانۂ انقلاب میں رفتہ رفتہ جنرل بونا پارٹ، پھر قونصل اول اور پھر شہنشاہ نپولین ہو گئے۔ جس طرح قدیم طرز حکومت کے دلدادہ فرانس میں برابر اپنی ریشہ دوانیاں کرتے رہے، اسی طرح ہماری زبان میں قدیم طرز شاعری کے دلدادہ اپنے رنگِ تغزل و ترنم سے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے رہتے ہیں۔ اصغرؔ ہوں یا فانیؔ، جگرؔ ہوں یا عزیزؔ ان کو خاندان بوربون کے افراد میں سمجھنا چاہیے اور اقبالؔ کو نپولین سوئم کہنا بجا ہے۔ لیکن جب تک ہماری شاعری کے دورِ حاضر میں کوئی جنگِ فرانس و پروشیا ۱۸۷۰ء واقع نہ ہوگی اُسوقت تک ہماری شاعری کی جمہوری سلطنت مستقل طور پر قائم نہ ہوگی یعنی جو اصلاحات ہم اپنی شاعری میں کرنا چاہتے ہیں اور جو مشروطہ ہم کو زمانۂ انقلاب میں حالی کے مقدمۂ شعر و شاعری نے بخش دیا تھا اُس پر عمل درآمد مکمل طور پر اسی وقت

ہو سکتا ہے جبکہ قدیم طرزِ شاعری کی فرانسیسی افواج کو موجودہ اسلوبِ بیان پروشیا کی افواج کی طرح شکستِ فاش دے اور ہمیشہ کے لیے ہماری شاعری میں طرزِ نو کی جمہوری حکومت قائم کر دے ۔ اظہار صاحب کا یہ فرمانا کہ تغزل اُردو شاعری کی جان ہے اور اُردو شاعری کو اعلیٰ مدارج پر پہونچانے کے لیے تغزل ہی کو ترقی دینی چاہیے، کہاں تک درست کہا جا سکتا ہے ۔ نہ تغزل اُردو شاعری کی جان ہے اور نہ اُردو شاعری کو اعلیٰ مدارج پر پہونچانے کے لیے تغزل کی ضرورت ہے ۔ کیا یہ افسوس کا مقام نہیں ہے کہ ہماری زبان تغزل کے اعلیٰ نمونے پیش کر سکے، لیکن دیگر اصنافِ سخن میں وہ صفر کے برابر ہو؟ ۔ خدا اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے حالیؔ کو جس نے مدوجزر اسلام اور چند مقبول خلائق نظمیں یادگار چھوڑیں جو ہمیشہ ہمیشہ حقیقی شاعری کی طرف متوجہ کرنے میں نشانِ راہ کا کام دیتی رہیں گی بیشک غزل کے ایک شعر میں ایک خیال نظم ہو سکتا ہے لیکن نیچرل نظمیں ایک شعر میں نہیں کھپ سکتیں جن کے لکھے جانے کی ہماری زبان میں سخت ضرورت ہے ۔

اظہار ۔ مشکل یہ ہے کہ تنہا صاحب تغزل سے اس قدر بدظن ہیں کہ غزل میں کوئی خوبی ہی نہیں پاتے ۔ کیا یہ کم تعریف کی بات ہے کہ جب تغزل میں بقول تنہا صاحب کوئی مضمون ہی ادا کرنا باقی نہ رہا تھا ہمارے نوجوان شعراء نے اپنی نئی طرز نکالی اور پرانے مضامین کو خیرباد کہہ کر نئی نئی تراکیب اور نئی نئی تشبیہات پیدا کر کے اپنے خیالات جدیدہ کو نئے انداز سے بیان کیا ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تنہا صاحب نے داغِ جگر، روحِ نشاط اور باقیاتِ فانی کو نہیں دیکھا ورنہ تغزل کی نسبت اُن کی ایسی سخت رائے قائم نہ ہوتی ۔

احمد مرزا ۔ خدا کا شکر ہے کہ اظہار صاحب! آپ میرے ہم خیال نکلے ۔ میں تو تنہا صاحب کی تقریر سے ڈر گیا تھا کہ انقلاب فرانس کی مثال دیتے ہوئے کہیں تنہا صاحب عہد ہولناک نہ قائم کر دیں اور ہمارے دل پسند شعراء اصغر و جگر و فانی کو محبوب پھانسی کے حوالے کر دیں ۔

عابد ۔ آپ کا خوف بیجا نہیں ہے

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا   آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

محمود ۔ لیکن مجھے تنہا صاحب کی تقریر کے لفظ لفظ سے اتفاق ہے ۔ میں آپ صاحبان سے پوچھتا ہوں کیا شاعری اسی کا نام ہے؟ اور اِن اصحابِ ثلاثہ کے مداحان و ہوا خواہان

جو غالب و مومن کی شاعری کو نقش اول اور اِن حضرات کی شاعری کو نقش ثانی اور بہتر قرار دیتے ہیں صحیح رستہ پر ہیں؟

اصغر۔ رند جو ظرف اُٹھالیں وہی ساغر بنجائے　　　　جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی میخانہ بنے

یعنی رند جس برتن میں شراب پی لے وہی اُس کا پیالہ ہے اور جس جگہ بیٹھ کر پی لیتا ہے اُس کے نزدیک وہی میخانہ ہے۔ آجکل بیٹھ کے کی جگہ بیٹھ کر استعمال ہوتا ہے۔

غالب۔ جب میکدہ چھُٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید　　　　مسجد، مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

" پلادے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے　　　　پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

کیوں صاحبان! اصغر کے نقش ثانی نے غالب کے نقش اول میں کیا اضافہ فرمایا؟

جگر مرادآبادی:

عرش تک ہو نہیں سکتی جو رسائی نہ سہی　　　　یہی انساں کی ہے معراج کہ انساں ہو جائے

غالب۔ بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا　　　　آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

شاید جگر کے نقش ثانی نے غالب کے نقش اول کو مٹا دیا!

اصغر۔ وہ شوخیوں سے جلوہ دکھا کر تو چل دیے　　　　اُنکی خبر کو جاؤں کہ اپنی خبر کو میں

غالب۔ پھر بیخودی میں بھول گیا راہِ کوے یار　　　　جاتا وگرنہ ایکدن اپنی خبر کو میں

شاید یہاں بھی نقش ثانی نقش اول سے سبقت لے گیا۔ اس غزل میں اصغر صاحب نے غالب کے قافیوں کو سجا سجا کر اپنے قافیے نظم کیے ہیں۔ صرف خبر اور رہگذر کا قافیہ دونوں کے یہاں بندھا ہے۔ اسی غزل میں اصغر کا ایک شعر ہے جو عجیب معلوم ہوتا ہے۔

" آشوب گاہِ حشر مجھے کیوں عجیب ہو　　　　جب آج دیکھتا ہوں تری رہگذر کو میں

"عجیب ہو" کا ٹکڑا میری سمجھ میں نہیں آیا۔ شاید آپ صاحبان مجھے سمجھا سکیں۔ کم از کم محاورۂ اہلِ زباں تو یہ نہیں ہے۔ "عجیب معلوم ہو" یا "عجیب دکھائی دے" کہتے ہیں۔ "عجیب ہو" آج ہی سُنا ہے۔ بے شک یہ ضرور کہتے ہیں کہ "تم بھی عجیب آدمی ہو" مگر اس موقع پر "عجیب ہو" کا استعمال عجیب و غریب ہے۔ ایک مرتبہ تجلی اپریل ۲۶ء میں اصغر صاحب کے اس شعر پر اعتراض کیا گیا تھا جو یہ تھا

" میں دیوانہ ہوں اصغر مجھکو شوقِ عریانی　　　　کوئی کھینچے لیے جاتا ہے خود جیبِ گریباں کو

اعتراض تھا کہ جیب اور گریباں ایک ہی معنی کے دو لفظ ہیں جنکو واوِ عطف سے مربوط کیا گیا ہے اگر جیب و گریباں کے بجائے میرے گریباں کر دیں تو اعتراض جاتا رہے۔

اصغر صاحب فرماتے ہیں

وہ لذتِ الم کا جو خوگر سمجھ گئے   اب ظلم مجھپہ ہے ستم گاہ گاہ کا

یہ ستمِ گاہ گاہ کا ظلم کیا معنی؟ ظلم کا ظلم بے معنی بات ہے اس سے تو ظلم کے بجائے لطف ہوتا تو بہتر ہوتا۔

غالب۔ واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ   ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر

الغرض اصغر کیا جگر کیا اور فانی کیا سب کے کلام میں نقشِ ثانی، نقشِ اول سے بہت پست پایا جائے گا۔ آجکل تعلیم یافتہ اصحاب یا مدح خواں اشخاص سرقہ کو نقشِ ثانی کہکر حضرات شعرا کی ہمت افزائی فرماتے رہتے ہیں۔ فانی کا کوئی شعر مجھے یاد نہیں ورنہ اُسکا موازنہ بھی غالب بیچارے سے کر دیا جاتا۔ بیشک ہم لوگوں پر مردہ پرستی کا الزام ہے لیکن جواب میں یہی عرض کیا جا سکتا ہے کہ گلستان سعدی کا جواب ممکن نہ تھا اور نہ ہے۔ اسی طرح دیوان غالب کا جواب نہ ممکن تھا اور نہ ہے۔ کیا غالب کے اس شعر کے مقابلہ میں داغ جگر، نشاطِ روح اور باقیاتِ فانی ارزاں نہیں ہیں؟

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی   چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

دوسرا لاجواب شعر سنیئے

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر   کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے

ایک تیسرا شعر اور سنیے

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں   موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

احمد مرزا۔ ہم میں سے ایک شخص بھی یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ اصغر یا جگر یا فانی، غالب و مومن سے سبقت لے گئے۔ ایسا کہنا نافہمی کی دلیل ہے۔ سبقت لیجانا کیا معنی اُنکے عشر عشیر بھی نہیں۔ لیکن میں اِن صاحبان کی شاعری کا ایک اور وجہ سے معتقد ہوں۔

ہم جیسے مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور   عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

اصل یہ ہے کہ مرزا داغ کے شاگردوں نے محاورات اور روزمرہ کی بندش میں وہ صفائی دکھائی کہ حقیقی شاعری کوسوں دُور ہو گئی۔ ایسے پُرشور زمانہ میں اوّل اقبال نے صدائے احتجاج بلند کی۔

بعد ازاں فانی، جگر اور اصغر نے اپنے شگفتہ اور بلند کلام سے تغزل کی مٹی پلید ہونے سے بچالی۔ میں تو صرف اس وجہ سے انکے کلام کو پسند کرتا ہوں۔ بے شک یہ لوگ غالب کی ترکیبیں باندھتے ہیں، غالب کے نقش قدم پہ چلتے ہیں، غالب کے انداز پر ترکیبیں تراشتے ہیں اور فانی صاحب غالب کی تقلید میں کبھی مہمل بھی فرما دیتے ہیں۔ مثلاً

موت ہستی پہ وہ تہمت تھی کہ آساں نہ اٹھی　　　زندگی مجھ پہ وہ الزام کہ مشکل سے اٹھا

یا۔ جبر قبول عام کرتا کا رِ فغاں تمام کر　　　غیرتِ غم کو رام کر آف کی مجال رہ نہ جائے

وصل خبر بڑھا گئی عمر کے باب راز میں　　　یا د وصال مختصر دل کے شب دراز میں

یا۔ زہر ہے یا دِ دلے دل وہ ہیں کہ موت ہی قریب　　　رعشہ مری نظر میں ہے یا کفِ چارہ ساز میں

با ایں ہمہ ان صاحبان کے کلام میں خوبیاں زیادہ اور عیوب کم ہیں۔ نقائص سے کسی کا کلام خالی نہیں۔ خود غالب کا نسخۂ حمیدیہ زبانِ حال سے کہہ رہا ہے کہ حضرت کے کلام میں کسقدر مہملات ہیں۔ اور صاف اور سادہ کلام میں بھی عیوب ہیں۔ مثلاً

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں　　　عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائینگے کیا

یہ "عذر لانا" اردو زبان کا کونسا محاورہ ہے؟ "عذر کرنا" بولتے ہیں۔ میرے نزدیک لوگوں میں تناسب کا خیال کم ہے اس وجہ سے وہ ان اصحابِ ثلاثہ کو غالب و مومن سے نسبت دیتے ہیں۔ ورنہ ان حضرات کو

غالبِ نکتہ داں سے کیا نسبت　　　خاک کو آسماں سے کیا نسبت

اظہار۔ واہ احمد مرزا صاحب واہ! آپ بھی فانی وغیرہ کے خوب معتقد نکلے۔ اس سے زیادہ بدعقیدہ اور کون شخص ہو سکتا ہے جو اپنے ممدوح کی مذمت کرے۔ حضرت! ذرا کلام فانی پڑھیے۔ اُس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ فانی کی شاہراہ غالب کے رستہ سے علیحدہ ہے۔ غالب اور فانی کا موازنہ ایک بے جوڑ سی بات ہے۔ غالب کچھ اور کہتا ہے، فانی کچھ اور۔ مثلاً

فانی۔ آسماں بھی ترے کوچہ کی زمیں ہے لیکن　　　وہ زمیں جس پہ ترا سایۂ دیوار نہیں

یہ ایک شعر ایک غزل کے برابر ہے۔

عابد۔ خوب! بہت اچھا شعر ہے اگرچہ ہماری سمجھ میں مطلب نہیں آیا۔ آپ صاحبان شاید کہیں کہ پھر تعریف کیوں کی؟ میں نے الفاظ کی نشست کی تعریف کی ہے مطلب اظہار صاحب بیان کریں گے۔

اظہار - ہم اس مسئلہ پر متانت کے ساتھ گفتگو کر رہے ہیں - اگر مزاح کو دخل دیا جاتا ہے تو یہ گفتگو موقوف کیجیے - خوش کپی کے لیے بھی ہم تیار ہیں -

عابد - واللہ! اظہار صاحب آپ خفا نہ ہوں - فی الواقع اس شعر کا مطلب سمجھنے میں مجھے دقت ہوئی - میں کہتا ہوں اگر تیرے کوچے کی ضمیر کا مرجع خدا ہے تو اُس کی ذات دیوار اور مکان سے منزہ ہے - دوسرے مصرع میں ترا سایۂ دیوار کیا معنی رکھتا ہے - اور معشوق مجازی سے مراد ہے تو آسمان کو اس کے کوچے کی زمین کیسے کہہ سکتے ہیں - اگر رہگذر کی زمین کہتے تو بیشک مطلب صاف ہو جاتا - کوچہ کے لفظ کے ساتھ مکانات کا تخیل لازمی ہے - پھر سایۂ دیوار نہ ہونا کیا معنی؟ بلا شبہہ رہگذر کی زمین نہیں کہہ سکتے صرف رہگذر کہنا کافی ہے - غرض اسی قسم کے شبہات اس شعر کو سُن کر پیدا ہوے - آپ اس شعر کا مطلب ارشاد فرمائیں اور اسکی خوبی بیان کریں - مجھے غالب کا شعر یاد آگیا - آپ دونوں کا موازنہ فرمائیں

غالب - کرتے ہو مجھکو منعِ قدمبوس کس لیے　　کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

میرا خیال ہے کہ فانی صاحب نے اپنے اس شعر میں غالب کے شعر سے استفادہ کیا ہے - بہرحال اب آپ فرمائیے آپ کا کیا خیال ہے؟

اظہار - عابد صاحب! اس شعر کا مطلب صاف ہے - اتنا اوق نہیں جتنا آپ نے اپنی کم توجہی سے اسے بنا دیا ہے - کہتا ہے - جس طرح تیرے کوچے کی زمین تیرے قدومِ میمنت لزوم کی رہینِ منت ہے اسی طرح آسمان بھی ہے فرق صرف یہ ہے کہ تیرے کوچے کی زمین پہ تیرا سایۂ دیوار بھی ہے اور آسمان کو یہ شرف حاصل نہیں - معشوق کے کوچے کی زمین کو آسمان پر فوقیت دیتا ہے لیکن کس خوبی کے ساتھ! غالب کے شعر کا مطلب اور ہے - اُسکو اس شعر سے کیا واسطہ؟

عابد - اچھا صاحب! آپ نے اس شعر کا مطلب تو سمجھا دیا اور اب میں بھی اسکو اچھا شعر کہتا ہوں لیکن غالب کی طرح جو فانی صاحب نے غزل لکھی ہے اُس کے چند اشعار پیش کرتا ہوں جو ہم قافیہ ہیں

فانی - جلا نہ دل، نہ تیرگیِ شامِ غم گئی　　یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں

غالب - لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے　　یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

فانیؔ۔ گم کردہ راہ ہوں قدمِ اولیں کے بعد — پھر راہبر سمجھ نہ ملا راہبر کو میں
غالبؔ۔ جاتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ — پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں
فانیؔ۔ ہر نقشِ پا کو دیکھ کے دھنتا ہوں سر کو میں — پہچانتا نہیں ہوں ابھی رہگذر کو میں
غالبؔ۔ جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار — اے کاش جانتا نہ تری رہگذر کو میں

اب آپ انصاف سے فرمائیے کہ فانی صاحب نے کیا غالبؔ کی غزل کا پیرہن نہیں اُتارا۔ بہت سے الفاظ غالبؔ کے بدستور قائم رکھے ہیں۔ کہیں کہیں کچھ فرق کر دیا ہے جب غالبؔ کی غزل کو بار بار پڑھا جائے گا تو کوئی نہ کوئی مضمون نئے پیرایہ میں ادا ہو جانا کچھ مشکل نہیں۔ تنہا صاحب کبھی غزل نہیں کہتے مگر ایک مرتبہ غالبؔ کی غزل آزار دیکھکر دیوار دیکھکر پڑھی تو اُنھوں نے بھی ایک شعر کہہ دیا جو اچھا خاصہ ہے

تنہاؔ۔ یہ کب کی دشمنی تھی فلک کو ہمارے ساتھ — ملتا ہے اُسکو پر سرِ آزار دیکھکر

پس یہ حضرات جو غزل گوئی کو اپنا ماحصلِ عمر سمجھتے ہیں غالبؔ کے دیوان کو بار بار پڑھ کر کسی نہ کسی رنگ سے قافیوں کو باندھ لیتے ہیں تو اِس میں اِن کی جدّت و ندرت کچھ نہیں۔ فانیؔ کے پہلے شعر میں بھلا نہ دل کیسا بے جوڑ ٹکڑا ہے۔ تیسرے شعر میں نقشِ پا کو دیکھ کر سر دُھننے سے کیا مطلب؟ سجدہ کرنا موزوں تھا۔ مومنؔ فرماتے ہیں

اُس نقشِ پا کے سجدہ نے کیا کیا کیا ذلیل — میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

رہگذر کے لیے پہچانتا موزوں نہیں بلکہ جانتا ہی موزوں ہے جیسا کہ غالبؔ نے باندھا ہے۔

احمد مرزا۔ ہم لوگ اصل بحث سے کسی قدر دُور جا پڑے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ غزل اُردو شاعری کی جان ہے یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اب تک جو کچھ سرمایہ ہمارے بزرگوں نے ہمارے لیے چھوڑا ہے وہ زیادہ تر غزل ہی کا ہے۔ بلاشبہ اب تک تغزل اُردو شاعری کی جان رہا ہے۔ لیکن آیندہ ہم کو دیگر اصنافِ سخن کی طرف بھی متوجہ ہونا پڑے گا۔ اور زمانہ بزبانِ حال کہہ رہا ہے کہ اگر اپنی زبان کی ترقی دوست چاہتے ہو تو ہر قسم کے خیالات اپنی شاعری میں داخل کرو۔ صرف معشوقوں سے باتیں کرنے ہی پر اکتفا نہ کرو یعنی غزل کے علاوہ مثنوی، قطعہ، رباعی سب کچھ کہو۔ دریا، پہاڑ، میدان، بادل وغیرہ سب پر نظمیں لکھو۔ قومی ضروریات بیان کرو، دلچسپ پیرایہ میں سیاسیات پر بھی نظمیں لکھو۔ غرض کوئی پہلو نہ چھوڑو۔ استقامِ لفظی پر خواہ مخواہ نکتہ چینی نہ کرو اور متروکات کی فہرست نہ بڑھاؤ

بلکہ توسیع زبان میں کوشش کرو تاکہ ہر خیال عمدگی کے ساتھ بآسانی منظوم ہو سکے۔ ہمارے بزرگ جو متروکات کی فہرست میں اضافہ فرماتے رہتے تھے اُس کی وجہ یہ تھی کہ اُنکی جولاں گاہ غزل کا ایک محدود میدان تھا۔ لیکن اگر آپ کو نیچرل شاعری کی طرف قدم بڑھانا ہے تو متروکات میں اضافہ نہ کیجیے۔ کوئی لفظ بذاتہ بُرا یا بھلا نہیں ہوتا۔ کثرتِ استعمال و عدم استعمال پر اسکی فصاحت و غیر فصاحت موقوف ہوتی ہے۔ پس اب میرے نزدیک بھی تغزل کو ترقی نہ دینی چاہیے بلکہ بقول تنہا صاحب اس کا سدباب کرنا چاہیے تاکہ دیگر قسم کی شاعری کی طرف طبائع متوجہ ہوں۔

راقم۔ دیکھیے! ہمارے بچے جو عشق و حُسن کی گلکاریوں سے محض ناواقف ہوتے ہیں کس قدر متعجب ہوتے ہوں گے جب ہمارے ابو الشعراء میر تقی میر کا یہ شعر جو اُنکے بہتر نشتروں میں سے ہے پڑھتے ہوں گے اور یہ شعر اکثر کورس میں انتخاب بھی کیا جاتا ہے۔

مہر کی تجھ سے توقع تھی ستمگر نکلا　　موم سمجھے تھے ترے دل کو سو پتھر نکلا

اُستاد اس شعر کے عشق کو خدا کے عشق پر بھی محمول نہیں کر سکتا۔ مجبوراً اسکو عاشق و معشوق کی تصویر کھینچنی پڑتی ہے جو اُستاد کو بھی ناگوار ہوتی ہے اور شاگرد بھی حیرت زدہ ہو جاتے ہیں۔ کیا بچوں کو زبان سکھانے کا یہی طریقہ ہے کہ پہلے حُسن و عشق کا سبق پڑھایا جائے۔ نیچرل مضامین میر انیس کے مرثیوں میں بہت ہیں لیکن گھوڑے اور تلوار کی تعریف جو انکے یہاں ہے۔ اصلی تلوار اور اصلی گھوڑے کی تصویر کھینچنے میں معذور رہے دیگر مواقع کے نقشے اُنھوں نے اپنے زورِ قلم سے خوب کھینچے ہیں مگر وہ مرثیہ کا جزو ہیں اور ایک دو بند کے بعد حضرت امام حسین علیہ السلام اور اُن کے اعزہ و اقربا کا نام ضرور آجاتا ہے جسکی وجہ سے وہ عام دلچسپی کا سامان پیش کرنے سے قاصر رہتے ہیں اور اس لیے اُن کا انتخاب داخلِ کورس نہیں کیا جا سکتا۔ لے دے کر مولانا حالی ہی کی نظمیں رہ جاتی ہیں جو ہر کورس کے انتخاب میں شامل کی جاتی ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہماری اُردو شاعری میں برکھارُت۔ مناجات بیوہ وغیرہ جیسی بلند پایہ نظمیں اضافہ کی جائیں تاکہ کورس سے غزلوں کا انتخاب موقوف ہو سکے۔ اور غزلوں کو بی اے کورس سے پہلے طلباء کو نہ پڑھایا جائے۔

اظہار۔ میں اس بات سے ضرور متفق ہوں کہ بچوں کو واقعی غزلیں نہ پڑھانی چاہییں اور ہماری شاعری میں یہ سخت کمی ہے کہ ہم بچوں کے حسب حال نظمیں اُردو میں نہیں پاتے۔

حالی کے علاوہ نظیر اکبرآبادی کی نظمیں بھی خوب ہیں لیکن ہمارے اساتذہ نے اُسکو شاعر ہی نہیں مانا۔ ممکن ہے کچھ اسقام لفظی اُن کے یہاں ہوں لیکن وہ جذبات کی ترجمانی خوب کرتے ہیں اور بیانیہ شاعری کے اُستاد ہیں۔ روضۂ تاج گنج کی تعریف اور کیفیت کیا خوب بیان کی ہے؟ آدمی اور بنجارے کی بھی کیسی اچھی نظمیں ہیں؟

راقم۔ ان اسقام لفظی کی کیا شکایت کرتے ہو؟ میرا خیال ہے کہ اگر شاکسپیر ہمارے یہاں پیدا ہو جاتا، ظاہر ہے کہ وہ کم علم تھا اور بہت کم اُس نے تعلیم پائی تھی لیکن شاعری کا ملکہ اُسکی فطرت میں ودیعت تھا۔ تو ہمارے یہاں کے شعراء ہرگز اُسکو پنپنے نہ دیتے اور وہ بہت زور مارتا تو نظیر اکبرآبادی سے کچھ کم ہی رہتا۔ انگریزوں نے شکسپیر کی وہ قدر کی کہ اُسکو تمام دُنیا کا بہترین شاعر منوادیا۔ اور جو الفاظ وہ اپنی ناواقفیت اور کم علمی سے غلط استعمال کر دیتا تھا اُن کی جگہ اُسکے کلام کی تشریح و توضیح کے وقت صحیح الفاظ نہ لکھ کر اُن غلط لفظوں کے معنی بتائے ہیں بلکہ لغات شکسپیر کے نام سے علٰحدہ کتاب لکھی گئی اور اُس کے غلط محاورات اور غلط الفاظ کو بتلایا کہ شکسپیر کا ان الفاظ اور ان محاورات سے کیا منشا ہے؟ اِسکو کہتے ہیں قدردانی! یہی وجہ ہے کہ وہ ڈراما نویسی میں بلاشبہ بے نظیر ہے۔ انگریزی تعلیم یافتہ اصحاب جس مزے سے اُسکے پلیز (ڈرامے) پڑھتے ہیں ہرگز اپنی زبان کی نظموں کو نہیں پڑھتے۔ وجہ ظاہر ہے۔ اگرچہ انگریزی غیر زبان ہے لیکن شکسپیر ہر واقعہ کی تصویر صحیح کھینچتا ہے۔ جذبات اس عمدگی کے ساتھ ظاہر کرتا ہے کہ دل خواہ مخواہ اس کے مزے لینے لگتا ہے۔ ہماری زبان کی نظموں میں یہ بات نہیں پائی جاتی۔ کچھ تو قافیے اور زیادہ تر ردیف کی قید نے ہماری شاعری کو بیکار کر دیا ہے۔ خیالات و جذبات آسانی کے ساتھ نظم نہیں کیے جا سکتے۔ قافیہ اور ردیف کی وجہ سے حشو و زوائد نظم میں داخل کیے جاتے ہیں۔ انگریزی زبان میں جو بڑی بڑی نظمیں ہیں وہ قافیہ اور ردیف کی قید سے بالکل آزاد ہیں۔ ہمارے یہاں نظم غیر مقفیٰ کانوں کو خوشگوار نہیں معلوم ہوتی لیکن اب وقت آگیا ہے کہ نظم غیر مقفیٰ کو رواج دیا جائے۔ اسکی اجنبیت کو اسکی کثرت ہی دُور کریگی۔

اظہار۔ اقبال کی نظمیں تعلیم یافتہ اصحاب ضرور مزے لے کر پڑھتے ہیں اور اُسکے بلند خیالات کو بہت پسند کرتے ہیں۔ اگرچہ اُسکے یہاں بھی اسقام لفظی اور غلط محاورات موجود ہیں۔ اصل یہ ہے کہ خیالات ارفع ہوں اور عمدگی کے ساتھ بیان [illegible]

لطف کے ساتھ اُن کو پڑھے گا اور اُس کی نظر معمولی کمزوریوں پر نہ پڑیگی۔

راقم۔ اقبال کی اُردو نظمیں بیشک خوب ہیں۔ لیکن اب وہ اُردو کی بجائے فارسی شاعر ہونا چاہتے ہیں۔ این خیالست و محالست و جنوں۔ اہل زباں نے فیضی اور غالب کو فارسی کا شاعر نہیں مانا تو اقبال غریب کو یہ درجۂ امتیاز کیسے حاصل ہوسکتا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ آیندہ ہم لوگ بھی اقبال کو اُردو کا قادرالکلام شاعر نہ مانیں کیونکہ وہ اپنے خیالات معلوم ہوتا ہے اُردو میں اُس زور کے ساتھ بیان کرنے سے قاصر ہیں جو وہ ہمارے نزدیک فارسی زبان میں بیان کر جاتے ہیں۔

محمود۔ بیشک تنہا صاحب کا یہ خیال درست ہے۔ کیونکہ اُنھوں نے دو مثنویاں فارسی زبان میں تحریر فرمائی ہیں اور عذر یہ کیا ہے کہ امیر افغانستان کو پیش کرنے کے لیے فارسی زبان ہی کو ذریعہ اظہار مطالب بنانا ضروری تھا لیکن میں اُن کے اس عذر کو عذر لنگ سمجھتا ہوں اس وجہ سے کہ لارڈ بائرن نے اپنے اظہار مطالب کے لیے انگریزی زبان ہی کو ذریعہ قرار دیا، حالانکہ اُنھوں نے اپنی مشہور نظم چائلڈ ہیرلڈ اٹلی اور یونان کی آزادی کے لیے تحریر کی تھی اور وہ لاطینی زبان میں ایسی نظم لکھ سکتے تھے جو اہل اٹالیہ اور اہل یونان کے جذبات بھڑکانے میں تیل پر آگ کا کام دیتی۔ لیکن نہیں اُن کی انگریزی نظم ہی نے دونوں ممالک بلکہ یورپ میں اس سرے سے اُس سرے تک آگ لگا دی۔ اور یونان ترکوں سے آزاد ہوکر رہا۔ اور اٹلی متفق و متحد ہوکر آسٹریا ہنگری کے پنجے سے چھوٹا۔ اور پاپائے روما کو چاروناچار اپنا پایۂ تخت بادشاہ اٹلی کے حوالہ کرنا پڑا۔ افغانیوں سے زیادہ اپنے اہل ملک کے ساتھ ہمدردی کرنا ضروری ہے۔ اُنکے بھائی نہایت پست حالت میں ہیں اگر وہ اپنی نظموں سے اپنی قومی ذلت کو دُور کرا سکتے ہیں تو اُن کو اُردو ہی میں لکھنا چاہیے تاکہ اُن کے کلام سے اور اُن کے خیالات سے ہرکس وناکس مستفید ہوسکے۔ اور اُنکو سرسید کا اتباع کرنا چاہیے جو اپنے قومی تنزل سے گھبراکر مصر کو ہجرت کرتے تھے لیکن بعد ازاں اپنی قوم کی اصلاح پر کمربستہ ہوگئے۔ اور جو کچھ ان سے بن آیا ہندوستان ہی میں رہ کر کیا پس اُردو والے اصحاب کو اپنی زبان ہی میں لکھنا چاہیے اور غیر زبان میں ضرورت اور مجبوری کے سوا قلم اُٹھانا اپنے لیے ننگ و عار سمجھنا چاہیے۔

(گھڑی نے تن تن گیارہ بجائے)

راقم - اوہو - گیارہ بج گئے ہیں - مجھے اب یہاں سے جلد جانا چاہیے -
احمد مرزا - خیر ہے - ایسی جلدی کیا -
راقم - مجھے کچھ چیزیں خریدنی ہیں اور جلد واپس ہونا ضروری ہے -
احمد مرزا - کھانا تیار ہے - اب کھانا کھا کر جانا ہوگا -
راقم - مجھے تکلف کی عادت نہیں - کام ضروری ہے - اس لیے اس وقت معافی کا خواستگار ہوں - یار زندہ صحبت باقی -

احمد مرزا صاحب سے رخصت ہو کر اور چاندنی چوک سے چیزیں خرید کر فوراً نانی آباد واپس آیا - چونکہ یہ مکالمہ دلچسپ تھا اس لیے اسکو قلمبند کیا گیا تاکہ ایڈیٹر صاحب الناظر کے تقاضے سے سبکدوش ہو سکوں -

محمد یحییٰ تنہا (بی - اے ' ایل ' ایل ' بی)

نظم خیالات

لکھنؤ میں موسیقی کالج کھلا چوک کے استاد بھی ٹیچر ہوے
کیا ترنم ریز ہے تسلیم قوم جب سے گدی خاں پروفیسر ہوے

قوم بھی اب آپ کی ہے' ملک بھی اب آپ کا راج بھی سب آپ کا' سوراج بھی سب آپ کا
پوچھتے ہیں مالوی جی سے یہ کیوں - کے - بی - متر کیا سیاست آپ کی ہے' کیا ہے مذہب آپ کا؟

کام کرنا ہے کون سا پہلے پہلے ٹھیک اسکا تصفیہ کر لو
شوقِ اصلاحِ قوم اگر کچھ ہے نفس کا اپنے تزکیہ کر لو

ابو عمر

لکھنؤ کا موسیقی کالج

بڑے دنوں کی تعطیلوں میں ہم کو لکھنؤ جانے کا اتفاق ہوا۔ ہم مارس میوزیکل کالج کو دیکھنے گئے جس کا افتتاح گورنر صاحب نے کیا ہے۔ تعلقداران اودھ اسکے اخراجات کے کفیل ہیں۔ دیگر ذرائع سے بھی اسکو امداد مالی غالبًا ملتی ہے۔ تعطیلوں کے سبب طالب العلم تو وہاں ہم نہ دیکھ سکے نہ تعلیم کا طریقہ ہمارے مشاہدہ میں آیا۔ البتہ خوش نصیبی سے ہم کو پنڈت بھات کنڈے صاحب سے شرف نیاز حاصل ہوا۔ اُن سے مل کر طبیعت نہایت محظوظ ہوئی۔ واقعی یہ صاحب ہندی موسیقی کے مسلم الثبوت ماہر اور عالم ہیں۔ اُنھوں نے تیس سال اسکے تجسس اور تحقیق میں صرف کیے ہیں۔ قدیم اور جدید راگ کی سنگتیں انھوں نے بغور مطالعہ کیں اور اُن کا مقابلہ کیا ہے۔ یورپین موسیقی کے موٹے موٹے اصول بھی وہ جانتے ہیں۔ اُنکی رائے ہے کہ ایشیائی اور یورپین راگ کے جداگانہ طرز ہیں۔ انکا رنگ اپنا اپنا ہے۔ بقول اُنکے ہندی راگ میں ہارمنی خوش اسلوبی سے داخل نہیں ہوسکتی۔ ہم نے جو راگ سازوں اور گلے سے یورپ میں چند ماہ ہوے سُنے تھے اُنکی کیفیت اُنکے گوش گزار کی۔ ہم کو اس امر کے اعتراف کرنے میں ذرا تامل نہیں کہ نوتر دام *Notre dame* گرجے کے آرگن۔ پیرس کے گرینڈ آپرا *Grand opera* اور لندن کے تھیٹروں میں جو راگ گایا اور بجایا جاتا ہے ہمیں بہت پسند آیا۔ حقیقت یہ ہے کہ سائنس سے یورپ میں بہت کام لیا گیا ہے۔ ہماری دیسی موسیقی کی صدیوں سے ترقی مسدود ہے بلکہ اس میں اتنی آمیزش ہوگئی ہے کہ اسکے اصلی رنگ میں بہت فرق آگیا ہے۔ یہ کہنا بھی غالبًا صحیح ہے کہ جتنا کچھ تھا بھی وہ بھی فراموش ہوگیا۔ ہاں اب پھر اُسکا قدرے چرچا شروع ہوا ہے۔ آب ورجوآمد کے آثار نمودار ہیں۔

پنڈت صاحب موصوف دیسی راگ پر بہت احسان کر رہے ہیں۔ اُنکے فیضان صحبت کا نتیجہ ہے کہ راجہ نواب علی صاحب تعلقہ دار نے اسکو اردو جامہ پہنایا ہے، جسکا اُنکو اعتراف ہے۔ بمبئی میں اُن کا لکچر سنکر عطیہ بیگم رحمٰن نے حال میں ایک عمدہ کتاب ہندی موسیقی پر انگریزی میں تصنیف کی ہے۔ پنڈت صاحب دیسی راگ کے قلمبند کرنے میں بھی مصروف ہیں۔ [illegible] سے بتدریج طالب العلم فن موسیقی سیکھ سکتا ہے۔

علاوہ بریں اُنھوں نے تقریباً ڈیڑھ سو راگ اور راگنیوں کے سوتر اور اُنکے لکھشن بھی بنائے ہیں جو حافظہ کو امداد دیتے ہیں اور جن سے مختلف راگ اور راگنیوں میں تمیز ہو سکتی ہے۔ اُنکی ایک شاگرد نے ہم کو ایک راگنی کے سوتر اور لکشن سنائے جس سے ہم بہت محظوظ ہوئے

سوتر کا طریق سنسکرت زبان میں قدیم سے چلا آتا ہے مگر مدتوں سے متروک تھا پنڈت صاحب کا مزاج نہایت سادہ اور طبیعت میں انکسار ہے۔ اُنکی گفتگو ایسی دلکش ہے کہ اُنکے پاس سے اُٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ ہم نے کئی اصحاب سے وہاں سُنا کہ اُنکی طبیعت میں بخل قطعی نہیں۔ بہت گوَیے اور موسیقار اُن کے پاس آتے رہتے ہیں، وہ اُنکے شبہات رفع کرتے ہیں، اور جو معلومات مطلوب ہوتی ہیں بلا تامل اُنکو بہم پہونچاتے ہیں۔ ہم کو بھی اُن سے بہت باتیں معلوم ہوئیں۔ ہم کو جو کچھ معلوم تھا ہم نے اُن سے عرض کیا۔ اُسپر مباحثہ بھی ہوا۔ اُنھوں نے ہمیں ایک نقشہ بنا کر دکھایا جس میں صبح۔ دوپہر شام اور رات کے راگوں کی ترتیب دکھلائی۔ ہم نے اُن سے یہ درخواست کی کہ کسی Laboratory معمل خانے سے سُروں کے رنگ کی جو کتب سنسکرت میں مذکور ہیں تصدیق کرائیں۔

پنڈت صاحب نے موسیقی کے متعلق کتب کا معقول ذخیرہ جمع کیا ہے۔ ہم نے اپنا تصنیف کردہ رسالہ "ہندو راگ" اُنکی خدمت میں پیش کیا۔ کالج کے کتبخانہ میں اسکو شرفِ قبولیت عطا ہوا۔

شاید قیودِ مذہبی مانع ہوں ورنہ ایسے عالم کو ضرور یورپ جانا چاہیے اور وہاں یورپینوں کی روز افزوں ترقی کو دیکھنا چاہیے۔ ان کا کمال دیکھ کر انسان حیرت میں پڑ جاتا ہے۔

شائقان فن موسیقی کے لیے لازم ہے کہ ایسے کالج کو ہر نوع سے امداد کریں تاکہ یہ کالج سرسبز ہو اور فنِ موسیقی کو پھر تازگی اور ترتیب دے سکے۔

ہمیں اس بات کی تمنا رہی کہ ہم نے طریق تعلیم نہ سُنا۔ پنڈت صاحب فرماتے تھے کہ بی اے ایل ایل بی اور ہر مذاق کے لوگ شام کو وہاں سبق لینے آتے ہیں اور پانچ چھ د( ) میں تیار ہو جاتے ہیں

ہمیں راجہ نواب علی صاحب سے نیاز حاصل کرنے کا بہت شوق تھا۔ ہم اُنکی کوٹھی پر گئے۔ مگر وہ چند منٹ پہلے اپنے علاقہ کو روانہ ہو گئے تھے۔ اگر وہ ہمکو مل سکتے تو ہم اپنا ایک ایڈریس جو ہم نے لاہور کی موسیقی کانفرنس پر چند سال گزرے پڑھا تھا اُنکی خدمت میں پیش کرتے تاکہ تبادلۂ خیال ہو جاتا۔

شیو نرائن شمیم (لاہور)

شاہی چور

(۱)

ہجرت کو پانچ سو نواسی برس گزرے ہیں - قمری منزل دوسری ہے "عروس شب" سولہ مسافتیں طے کر چکی ہے - اسلام پر بدقسمتی اور مصیبت کا وقت شروع ہوتا ہے - شیر صفت صلاح الدین مرض تپ میں مبتلا ہے - مرض میں ترقی ہے - مملکت اسلام کے چپہ چپہ میں کہرام مچا ہے اور ہر ہر متنفس شیدائے اسلام شہنشاہ جلیل القدر پر اپنی عزیز جان قربان کرنے کے لیے ہمہ تن تیار رہے تاکہ وہ فدیہ ہو اور سلطان صحت یاب ہو سکے - صلیبی ممالک میں چراغاں ہوتا ہے، دشمنوں کے دل بڑھتے ہیں، جو صلے بند ہوتے ہیں - محاربات صلیبی کی یاد دوبارہ بیقرار کرتی ہے کہ آخرکار اس ماہ کی ستائیسویں (۲۷) علی الصباح پیام غم لیکر مسلمانوں کی امیدوں کو خاک میں ملا دیتی ہے - فاتح بیت المقدس کی جاں فروشی اور قومی عصبیت نے کلمہ گو طبقہ میں ایک روح پھونک دی تھی - تخت شاہی کی جگہ گھوڑے کی ننگی پشت اور بزم کی جگہ رزم اسکو زیادہ مرغوب تھی - ہر سپاہی فاتح ہیکل سلیمانی کے نقش قدم پر چلنا سعادت ابدی تصور کرتا ہے - جب جہاد کا اعلان عام ہوتا تو دور دور سے عالی قدر شہزادے اس نعمت عظمیٰ میں حصہ لینے کے لیے آتے - وادی نیل پر معرکہ آرائی تھی - صلیبی نشان ہر جگہ بلند تھے - عجیب ابتلا و مصیبت کا زمانہ تھا - اسی وقت جب اس جہاد کی خبر مصر سے ماوراء النہر تک پہونچی تو اس خبر کو سنتے ہی شہزادہ ناظر والی بدخشاں اور "شہزادہ سلجوق" والی طبرستان بھی بطور سپاہی کے باعزازانہ کلمۃ الحق کی تبلیغ کے لیے شریک ہو گئے -

(۲)

وادی نیل پر معرکہ آرائی ہے - ملک الاشرف موسیٰ مقدمۃ الجیش ہے اور مسلمانوں کی ہمت بدخشاں کے شہزادہ ناظر کی شمولیت سے دوگنی بڑھی ہوئی ہے - لڑائی خود بخود بند ہو گئی - صلیب پرست طبقہ نے پیام صلح بھیجے مگر "ہیکل سلیمانی" عسقلان، طبریہ، صدیہ وغیرہ مفتوحہ علاقہ جات واپس مانگے اور معبد قدس کی تعمیر کے لیے بھی رقم دینا نامنظور کی تو عساکر اسلامیہ جنگ کے لیے بیقرار ہو گئے - مسیحی فوج کثرت تعداد سے بے فکر تھی - قیامت ہو گئی - چند سر کٹ جاں فروش مسلمانوں نے دریائے نیل کو مختلف جگہوں سے

کاٹ دیا جس سے تمام پانی صلیبی محاذ میں جانے لگا۔ دلدل اور کیچڑ سے پریشان ہو کر فوج نے نقل و حرکت شروع کی۔ محض اب ایک راستہ باقی تھا اُس پر ملک الکامل اپنی فوج کا بہترین حصہ لیے ہوئے موجود تھا۔ مسلمانوں کو فتح ہوئی اور دمیاط مسلمانوں کے حوالہ کیا گیا۔ اسی خوشی میں مصر کے ایک گورنر نے اعلان کیا کہ جس "جاں فروش" نے اسلام کی اس قدر اہم خدمت انجام دی ہے اُسکی کنیزی میں لڑکی دینا میں اپنا فخر تصور کروں گا۔" مسلمانوں میں ہلچل مچ گئی۔ لیکن باوجود تجسس کے بھی "شاہی چور" کا پتہ نہ چلا۔

(۳)

"فرشتۂ جمال" جب "آتشیں رُخ" کھولتا ہے تو اُسکی روشنی تاریک سے تاریک مقامات کو بھی منور کر دیتی ہے۔ بجلی جب تک نہیں چمکتی اُسکی آواز سے کان اور چمک سے بصارت ناآشنائے محض رہتی ہے۔ جب ایک بار چمکتی ہے تو آنکھوں میں دیر تک خیرگی باقی رہتی ہے اور قوتِ سامعہ اُسکی صدائے مہیب سے متوحش! مشک جب نافہ سے نکلتا ہے تو شامہ اُسکے مشام سے مسرور ہوتا ہے۔ اور کوئی دنیاوی قوت نہیں ہوتی جو اُسکی بو نکلنے اور قوتِ شامہ کو مشام سے منع کر سکے۔ "نادرہ" جو ایک مرتبہ آفتاب بنکر طلوع ہو چکی تھی، جو ایک بار صاعقۂ ہوش رُبا بنکر چمک چکی تھی، جس نے ایک مرتبہ اپنے نافہ سے باہر قدم نکالا تھا۔ ناممکن تھا کہ اب دُنیا کی کوئی قوت اُس کا فی اُسکی پردہ داری کر سکتی۔ وہ بجلی بنکر چمکی آفتاب بنکر روشن ہوئی اور نکہت بنکر شامہ تک پہونچی۔ دل پر اُسکی ابرو کے خنجر چلے۔ روح نے اُسکی پذیرائی کی اور لبوں نے اُس کے رخساروں کی شراب کو پیا۔ کانوں نے اُسکی موسیقیت کو سُنا۔ آنکھوں نے اُسکی تصویر دلوں پر کھینچی۔ اس میں تو کلام نہیں کہ قرطاس عالم پر صدہا بلکہ کروڑہا نقوش صناعِ حقیقی کی صنعت گری کے موجود ہیں۔ لیکن "نادرہ" نے اپنے "حسن و شباب" کی بدولت جو شہرت حاصل کی تھی، وہ طبقۂ نسواں کے لیے ایک امتیازی نشان اعزاز تھا۔ اگر دَور جاہلیہ کی زلیخا اور کلیو پیٹرا، دَور متوسط کی نورجہاں اور پدمنی اُسکے عالمگیر حسن کا شہرہ سن لیتیں، تو یقیناً شرم سے پانی پانی ہو کر اپنے عنصر اصلی سے واصل ہو جاتیں۔ قصر جلالت کا کوئی متنفس ایسا نہ تھا جو اس شمع جمال کا پروانہ نہ ہوتا۔ بڑی بڑی عالی مرتبت وذی مرتبت ہستیاں اس بارگاہ ناز میں جبیں سائی کرنا فخر ابدی تصور کرتیں اور بھکاری کی حیثیت میں زکوٰۃ حسن لینے کے لیے ہمہ تن نیاز نظر آتیں، اسکی محبت کا دم بھرتیں اور تحسین و

توصیف کے لاتعداد ... جواہر سے اس گنجینۂ حسن کی قدر و قیمت کو دوبالا کرتیں انھیں وارفتگانِ الفت میں سے ایک شہزادہ سلجوق والی طبرستان بھی تھا

(۴)

آفتاب اپنی آتشیں مسافت کے بعد، دھیلی نقاب میں مستور ہوتا ہے۔ پرندوں کے غول آسمان پر دکھائی دیتے ہیں۔ تاریکی بڑھنا شروع ہوتی ہے۔ شہر کی چہل پہل میں اضافہ ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ "ایام شب" کی "دواویت" "نورانیت" سے متبدل ہونا شروع ہوتی ہے۔ گھڑیال ۱۲ کا اعلان کرتا ہے۔ قاہرہ کے تنگ و تاریک گلی کوچے جو چند ہی گھنٹے قبل تجارت پیشہ افراد کی دلچسپ تفریح گاہ بنے ہوئے تھے اب بالکل ویران اور سنسان نظر آنے لگے۔ فصیل اور شہر پناہ کے آہنی دروازے مقفل ہیں۔ چوکیدار کی تحکمانہ للکار کی آواز سے سکون مطلق متحرک ہوتا ہے۔ قاہرہ کا بچہ بچہ اطمینان و آرام کی میٹھی نیند سو رہا ہے۔ مگر حیرت پر حیرت اس وقت گورنر مصر کی اکلوتی شہزادی، سپہر حسن کا درخشندہ سیارہ، قصر شاہی کا تابندہ گوہر سلطنت مصر کی سرمایۂ ناز، جانشین زلیخا، نازش کلیوپیٹرا، باغ شاہی کے ایک سنسان گوشہ میں سبزۂ نودمیدہ کے فرش کمخوابی پر متفکر، متردد، متحیر اور مغموم مستقبل پر غور کر رہی ہے۔ "ناظر" کے فتح دمیاط میں نمایاں کارنامے غور کرنے کے، دیکھنے کا خواہ مخواہ شوق رکھتی ہے۔ چنانچہ ایک "سہیلی" جو اس کارخاص پر متعین کی گئی تھی مشعل کافوری لیے ایک جانب سے آتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شہزادہ ناظر بدخشاں کا ولیعہد ہے جو حسن میں لاثانی آفاق میں نامی شہزادی سمرقند کی زلف میں اسیر ہے۔ اس حور نژاد ہستی کا نام "عاصمہ" ہے۔ لیکن دقت یہ ہے کہ عاصمہ کی شادی کا وعدہ بچپن ہی سے خوارزم شاہ کے ہر دلعزیز بھانجے سلطان سلجوق کے ساتھ ہو گیا ہے۔

(۵)

سمرقند کی شہزادی "عاصمہ" دنیائے حسن میں آپ اپنی نظیر تھی اُسکو "سلطان سلجوق" سے محبت ہی نہیں عشق تھا۔ اور اس شہزادی سے شہزادہ ناظر کو بھی عشق کا دعویٰ تھا اور سلطان سلجوق نادرہ کا راندہ دربار تھا۔ عاصمہ کو ناظر اور سلجوق کی محبتوں کا حال معلوم ہوا تو اُس نے ایک امتحان مقرر کیا۔ اور امتحان بھی کس قدر سخت!

"قاہرہ کی حسین نادرہ کا بیش قیمت لعل ہر وقت اُسکے بالوں میں رہتا ہے جو اُسے

لانے گا ..... عاصمہ اُسی کی ہے"۔
دونوں "محبت کے مارے" جہادِ اکبر" پر روانہ ہوتے ہیں۔ کہیں راستہ میں یہ معلوم کرکے کہ مسیحی افواج نے بیت المقدس پر قبضہ کر لیا ہے، نفسانیت چھوڑ کر اللہ کی راہ میں بہترین دوست بن جاتے ہیں۔ عیسائیوں کی حلب پر چڑھائی اور شکست سے سبق لیکر ۵۸۳ہجری میں یہ دونوں شاہی چور" ملک الناصر کی فوج میں شامل ہو کر بیت المقدس کی فتح میں شریک ہوتے ہیں۔ اب تصویر ملاحظہ طلب ہے، سلجوق بستر علالت پر ہے بیت المقدس فتح ہو چکا ہے اور ناظر جو اسکا رقیب تھا واحد تیمار دار ہے۔

(۶)

قاہرہ سے ایک قاصد شہزادہ ناظر کی جستجو میں بیت المقدس پہونچتا ہے۔ اور ناظر سے ملاقات کے بعد پیام محبت پہونچاتا ہے۔ "ناظر" سخت پس و پیش میں ہے۔ وہ بذاتہ عاصمہ پر دل و جان سے مفتوں ہے اور نادرہ ناظر پر۔ پیغام کا یہ جواب "سلجوق" سے دریافت کرکے دیتا ہے کہ "اگر نادرہ اپنا بیش قیمت لعلِ شبچراغ بھیجدے تو ناظر نادرہ سے شادی کرلیگا"۔ اتفاق کی بات اس طرف "ناقہ سوار" جنگلوں میں غائب ہوا اور یہاں سلجوق کو شکار میں چوٹ آئی۔ جس سے جانبر نہ ہو سکا۔ موت کی خبر بجلی کی طرح سرعت سے سمرقند پہونچی۔ وفا کی پتلی عاصمہ نے "ہیرے کی کنی" سے اپنی عزیز جان قربان کردی۔

جان دیدی ترے کوچے میں تڑپ کر آخر
ہوگیا خاتمہ بالخیر وفاداروں کا

سلطان سلجوق اور شہزادی عاصمہ آج دونوں اس دنیا میں نہیں ہیں، لیکن آج بھی انکی محبت حقیقی کے اثرات سے دنیائے محبت متزلزل ہے۔ ارواحِ مقدسہ نے اُن کا استقبال کیا، سدا بہار انوار الٰہیہ کے برکات کی بچھاور ہوئی۔ شہزادی عاصمہ کی موت کی خبر نے ناظر کو وارفتہ کردیا۔ انتہائے رنج و افسوس سے جنگلوں کی راہ لے لی۔

(۷)

ایک برقعہ پوش خاتون محل میں آتی ہے اور شہزادہ ناظر کا پتہ پوچھتی ہے۔ لوگ سودائی ناظر کا پتہ تبلادیتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ فرطِ غم کی وجہ سے ناظر آبادی سے دور جنگلوں میں ایک قدیم متوحش قبرستان میں پڑا رہتا ہے اور شب و روز اسکو گریہ و زاری کے سوا کوئی کام

نہیں ہے۔ "نقاب پوش ساحرہ" تلاش ناظر میں نکلتی ہے اور جب ناظر ملتا ہے تو اسکی مطلوب شے یعنی "لعل شبچراغ" مع ایک پرچہ کے ڈال کر آناً فاناً دشت میں مستور ہو جاتی ہے۔ ناظر کو جب ہوش آتا ہے تو پرچہ اٹھا کر دیکھتا ہے جس میں معلوم ہوتا ہے کہ کسی نازنین نے اپنے قلم سے کچھ عبارت لکھی ہے

"ناظر .... عورت محبت ہی نہیں کرتی ...... اور جب محبت کرتی ہے تو دنیا کی دون شے سمجھتی کہ مذہب کی ایسی محترم بالذات چیز بھی آڑے نہیں آتی۔ یہ وہ آگ ہے جو نہ لگائے لگ سکتی ہے اور نہ بجھائے ... بجھ سکتی ہے ... محبت روحانی جذبہ ہے، اسکو مادیات سے مطلقاً تعلق نہیں ہے .... اب یہ نہ کہنا کہ عورت محبت میں صادق نہیں ہے ....

اچھا خدا حافظ .... ن ...... ہ"

شہزادہ ناظر فرطِ اشتیاق سے "لعل شبچراغ" اٹھاتا ہے، اور حیرت سے اسکو دیکھتے ہی دیکھتے بیہوش ہو جاتا ہے .... اور "نقاب پوش ساحرہ" قاہرہ کی تنگ و تاریک گلی کوچوں سے ہوتی ہوئی کشادہ اور وسیع مرغزاروں سے گذرتی ہوئی محل میں داخل ہو جاتی ہے تاورہ اسوقت غمگین اور حسرت و یاس کی تصویر بنی ہوئی ہے حوض کے قریب سرخ مچھلیوں کا منظر بے پروائی سے دیکھ رہی ہے اور ناظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر لوٹنے سکون ہے۔ دل میں کہتی ہے آہ میرا تفاخر حسن کیا ہوا۔ پندار کہاں ہے اور غرور کا کیا حشر ہوا۔ غضب تو یہ ہے کہ میں ہی اس حسین دیوتا سے عبکارن بنکر زکوٰۃ مانگتی ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ تفاخر نادرہ کو شکست ہوئی۔

(۸)

قاہرہ کے وسط میں جہاں اب ایک بڑا قہوہ خانہ تعمیر ہو گیا ہے ایک سنگی فرش بنا ہوا ہے۔ سورج کی شعاعیں اور چاندنی کی موجیں اس فرش کو بقعۂ نور بنائے رکھتی تھیں۔ اسکے قریب ہی کہا جاتا ہے کہ فراعنۂ مصر اور شہزادی زلیخا کی خوشنودی کے لیے آرام باغ بنے ہوئے تھے۔ جس میں ایک باغ شاہی اب بھی باقی ہے۔ شب کے خاموش اور خوفناک گھنٹوں میں جب تمام کائنات پر مکمل سکوت طاری ہوتا ہے۔ وہاں جانا فرشتۂ قضا سے بغلگیر ہونے کا مرادف سمجھا جاتا ہے۔ ضعیف العمر لوگ کمسن اولاد کو "وادیٔ فراعنہ" میں جانے سے ہمیشہ منع کرتے رہتے ہیں جو غیر آباد ہونے کی وجہ سے جانوروں کا مسکن ہو گیا ہے۔ اس وادی کے شمالی

حصہ میں کچھ قبریں ہیں جو شہید مردوں کی سمجھی جاتی ہیں۔ وہاں شہر کے اوباش، قطاع الطریق، جملہ افعال قبیحہ کے وسائل پر غور کرتے ہیں۔ اسی لیے سلطان سلیم عثمانی کے عہد میں جب مصر کی خلافت عباسیہ ترکوں کے حصہ میں آئی تو ترکوں نے ان باغات کو کھدوا ڈالا اور انکی جگہ پر بہت کشادہ خوبصورت پارک، ہوٹل، قہوہ خانہ، دارالمطالعہ، ادارۂ صحافت بنوا دیے۔ حیرت پر حیرت۔ اس سنسان اور تخیل سوز مقام پر ناظر اسوقت موجود ہے۔ دفعتاً اس تیرہ و تار مقام کی فضا متغیر ہونا شروع ہوئی، وہ پہلے بادلوں کا رنگ سیاہ ہوا۔ اور کرۂ سماوی سے ایک خوفناک جہندہ درخشندہ برق تڑپ کر وادیِ فراعنہ کے شمالی حصہ میں گری۔ ایک خوفناک چیخ کی آواز نکلی اور چشم زدن میں چرند و پرند، وحوش وطیور سب جل کر خاکستر ہو گئے۔ معاً اسی وقت شہزادہ ناظر سراسیمگی میں وادیِ فراعنہ سے بھاگا اور تاریکی میں وادی کے کنارے کنارے ہوتا ہوا نہر کبیر کے کنارے جو پائین باغ تھا اس میں داخل ہو گیا۔ پائین باغ اور وادیِ فراعنہ بہت دور نہ تھے۔ اتفاق یا حسنِ اتفاق، یہ باغ "نادرہ" کا خوابگاہ تھا۔ تھوڑی دیر میں مطلع صاف ہوا اور نگارِ آتشین سر کھولے ہوئے سقف مینائی پر طلعت ریزیاں کرنے لگا۔ اب شہزادہ ناظر کو اپنی اس خطرناک مقام کا احساس ہوا تو جسم میں رعشہ پڑ گیا مگر نہایت ہمت کر کے سردی کی وجہ سے اندر کی صحنچی میں داخل ہو گیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(۹)

شب کے ابتدائی منازل ختم ہو چکی ہیں، رات کی تاریکی بڑھتی جاتی ہے: فضائے لطیف خوابِ نوشیں سے لطف اندوز ہو رہی ہے چلمنیں پڑی ہوئی ہیں اور ایک زنانہ نشیمن پر وہ مسہری کے چاروں طرف قائم ہے۔ شمع روشن ہے اور اس کا عکس چھن چھن کر مسہری کے اندر ایک حسین و جمیل خاتون کے چہرہ پر پڑ رہا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جاگ رہی ہے۔ اور بہت مضمحل اور متردد ہے۔ حزن و ملال کے آثار بھی نمایاں ہیں۔ ہائیں۔ وہ تو خاموشی سے اشکباری میں بھی مصروف ہے۔ "یہ کون ہے ......؟" یہ مختصر جملہ تھا جو ناظر کی زبان سے نکلا اور بیہوش ہو گیا۔ ایک گرنے کی آواز آئی .... دھماکا ہوا۔ چور چور کی آوازیں بلند ہوئیں۔ سب پہرے والی دوڑیں۔ لیکن کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ شہزادہ ناظر کے ساتھ بے ادبی سے پیش آسکتا۔ جب زیادہ دیر ہوئی تو نادرہ خود اٹھ کر "چور" کے معائنہ کے لیے گئی .... ہائیں یہ تو ناظر ہے ...... یہاں کیسے .... ؟

نادرہ کا یہ جملہ ہوا میں گونجا ..... ناظر ہوش میں آیا ..... اُس نے بھی یہ الفاظ سُنے
کہا "ہاں میں ہی ناظر ہوں"......
..... اس جملہ کی ادائگی سے سحرستان ناز میں تہلکہ مچ گیا، خاموشی مسلط ہوگئی۔ ہر شخص کی
ہمت نے جواب دے دیا۔
نادرہ نے نہایت شکست آمیز جرأت اور شکیب فروز استخفاف سے کہا کیا شہزادہ بلخستان؟
"ہاں"۔
دونوں جانب سے مُہر سکوت لگ گئی۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے کہ باڈ
سے نادرہ نے کہا "ناظر کیا تم وہی ناظر ہو جسکے درخشندہ کارنامے ماہتاباں کی طرح روشن و منور
ہیں، اور ایک بدباطن "چور" کی حیثیت سے ایک نامحرم کی خوابگاہ میں موجود ہو۔ کیا ناظر کو
نہیں معلوم کہ اسکی جان اسوقت کس کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ چیونٹی سے زیادہ وقعت نہیں،
چاہوں تو ابھی تلوؤں سے مسل دوں۔ سمجھا کیا ہے۔ کوئی مذاق ہے۔ (خواصوں سے) کیا دیکھتی
ہو۔ اس "چور" کو گرفتار کرلو۔ اور علی الصباح اس بدباطن کمینہ کو جلاد کے سپرد کردو، وہ سر اُتار کر
دمشقی دروازہ پر لٹکا دے تاکہ راہگیروں کو عبرت ہو، اور اس کا خون پیالوں میں میرے ہاتھ
رنگنے کے لیے لاؤ۔ جب تک اسکے خون سے ہاتھ نہ رنگ لونگی مجکو سکون نہ ملیگا۔ تاکہ
معلوم ہو کہ نامحرم عورتوں کو دیکھنے کی یہ سزا ہے۔ آخری الفاظ بشکل کرہ ہوا میں غائب
ہوئے تھے کہ شہزادہ ناظر "شاہی چور" بات کی بات میں گرفتار ہو کر پائیں باغ کے ایک گوشہ میں
نظر بند کردیا گیا اور زنگی کلیدار تلواروں کا سنگین پہرہ مقرر ہو گیا۔
نادرہ کہنے کو تو کہہ گئی مگر دل میں بہت شرمندہ ہوئی اور خواصوں کو بلا کر حکم دیا کہ خبردار
ناظر کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ یہ سزا تادیباً ہے نہ کہ تعذیباً۔ بلکہ تم لوگ اُسکا دل بہلاؤ، ہر ممکن طریقہ
سے اُس کا دل ہاتھ میں لو اور میری جانب اُس کے قلب کو مائل کرو۔ خبردار کسی قسم کی تکلیف
نہ ہو۔ ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔

(۱۰)

چاندنی ہر طرف چھٹکی ہوئی ہے، تارے اپنی عارضی روشنی شب ماہ کے بسیط نور میں جذب
کر رہے ہیں۔ اور شہزادہ "ناظر مجرم کی حیثیت سے پائیں باغ کے ایک محفوظ گوشہ میں نظر بند کر
وقت گذرتا ہے۔ راتیں ختم ہو ہو کر صبحوں میں تبدیل ہوتی ہیں، لیکن ناظر کے کرب و اضطراب میں مطلقاً

کمی نہیں ہوتی - خواصیں برابر ناظر کو چھیڑتی ہیں، دق کرتی ہیں، اُسکے قلبِ محزوں کو بہلانے کی لاطائل کوششیں کرتی ہیں لیکن ناظر کی سراسیمگی میں کوئی فرق نہ ہونا تھا، نہ ہوا۔ ....

خواصوں کا دق کرنا رنگ لایا - آخر ایک دن وہ یہ کہنے پر مجبور ہوا کہ

"مُردہ مُردوں کے لیے ہیں اور زندہ زندوں کے لیے" اب میں بھی اس اصول پر کاربند ہوکر نادرہ سے محبت کروں گا - مگر محبت تو ایک ہی سے ہوسکتی ہے - محبت غیر منقسم ہے - محبت کو بدنام تو نہیں کرسکتا، ہاں یہ ممکن ہے کہ میں شادی نادرہ سے کرلوں - فرق صرف اس قدر ہے کہ "عاصمہ" کا میں طالب تھا اور نادرہ میری طالب ہے - اسی قسم کے خیالات نشو و نما پاتے رہے اور شہزادہ ناظر کئی ہفتوں تک نظربند رہا - اس عرصہ میں کبھی گھنٹہ کبھی آدھ گھنٹہ دن کبھی شب و روز برابر نادرہ ناظر کے پاس رہنے لگی اتصال نظری رنگ لایا - حسنِ سامری باثمر ہوا جذب دل نے تاثیر دکھائی آنکھوں نے اظہارِ حال کیا - لبوں نے شکوہُ و شکایت کی - جذبات نے پذیرائی کی اور دونوں جانب ہیجان فطری پیدا ہوا........ اب گیا تھا - یہ طے ہوچکا تھا کہ نادرہ میری ہے اور میں نادرہ کا ...."

(۱۱)

عروس شب نے اپنی مضطرب و لرزاں شعاعیں خمیدہ و متوازی ناظر کے قلب پر ڈالیں کیوپڈ کا تیر بے خطا چلا - کرشن جی کی بانسری بجی - قلوپطرہ اور زلیخا کی سیلیاں پھڑکیں - محبت کی دنیا میں ہل چل مچی - خوشگوار ہوا کے جھونکے مہکتے ہوے دماغ عفیف میں سرایت کرگئے اور فرحت بخش اثرات پیدا کرنے میں کامیاب ہوے - دو شرمندہ نظریں، دو منتظر قلب، دو دردمند دل، دو محبت کرنے والی ہستیاں اتصالِ خیالی کے لیے تیار ہوگئیں کہ ملحقہ شہ نشین کی غلام گردش میں دفعتاً برقِ حسن اپنے پورے جاہ و جلال سے چمکی - فلکی شمعیں جھلملا گئیں - منظر میں ایک لطیف رنگینی پیدا ہوگئی - یعنی نادرہ نشۂ حسن میں سرمست فتنہ خیزی اور محشر خرامی سے آتی ہوئی دکھائی دی - معلوم ہونے لگا گویا فطرت مسکرا رہی ہے - بھائی نظام دادو دو - ایک ہجراں نصیب دل کے لیے یہ آفتِ ناگہانی، بلا خیز رعنائی جمال کیا کچھ سامان غارتگری کی حامل نہ تھی .... کہ ناظر کا دردمند و زخم رسیدہ دل ضبط کرسکتا، اُدھر گھٹے کو ٹھیلنے کا بہانہ بہت تھا - ایک سیلاب تھا کہ دونوں جانب اُمنڈ رہا تھا..... اب ناظر آزاد تھا...... ... اور مطلقاً آزاد ....

(۱۲)

نادرہ شنجوابی کے بیش قیمت ملبوس میں تھی۔ اُس کا نازک نازک صبیح گلابی رنگ ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ گویا "فانوس احمر" میں شمع حسن فروزاں ہے ..... تنہائی تھی۔ دونوں وارفتگانِ الفت کا شباب اور شب تھی۔ ایک عالمِ کیف تھا جس کا تعلق وجدان سے ہے۔ قلوب میں دھڑکن اور اجسام میں رعشہ موجود تھا۔ فرطِ اشتیاق میں آنکھیں قریب قریب بند تھیں۔ حیا مانع تھی۔ رعب حسن سے جرأت نہ ہوئی .... زبان سے کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن خدا معلوم کیوں لبوں پہ مہر سکوت ثبت تھی۔ .... اور دونوں ایک دوسرے کو خاموش نیم باز نظروں سے دیکھ رہے تھے ...... نیم شگفتہ غنچوں کی نکہت نے آکر اٹکھیلیاں کیں اور ختم ہو گئیں۔ ایک نئی قسم کی روح دونوں مریضانِ محبت میں عود کر آئی۔ چاہتے تھے کہ کچھ کہیں لیکن زبان نے یاری نہ کی اور "دل" کے شعلے زبان تک نہ آسکے۔ مہکتی ہوئی ہوائیں آئیں اور چلی گئیں۔ مگر دو تڑپتے ہوئے دلوں کے تلاطم اور جوشِ محبت میں خدا معلوم کس قسم کی کیفیت طاری ہو گئی کہ دیر تک لبوں پر مہر سکوت رہی ....آخر ناظر سے نہ رہا گیا۔ پیمانۂ صبر و ضبط چھلک اُٹھا اور ایک حسرت انداز لہجہ میں کہا

"......... ناظر۔ وہ ناظر جس نے نادرہ کو کبھی عاصمہ کے تلووں کے برابر بھی نہ سمجھا، آج وہی ناظر تمہارے سامنے حاضر ہے اور وہ اپنے دل میں نادرہ کی محبت موجزن پاتا ہے۔ ...."

یہ محبت انگیز الفاظ نادرہ کے لیے کافی تھے

نادرہ۔ ناظر تم کو اسوقت اختیار کلی حاصل ہے کہ مجھ ناآشنائے راحت کو "بیوفا" "سرد مہر" "ستمگر" کہو۔ مگر میں تم سے بصد ادب معافی مانگتی ہوں، اور یہ تبلا دینا چاہتی ہوں کہ میرے سینہ زار الفت میں ایک عورت کا "دل" ہے۔ جس میں محبت کے لطیف جذبات ہمیشہ متلاطم نظر آتے ہیں۔ فرق اس قدر ہے کہ یہ محبت کی چنگاریاں عشق و الفت کی بیتابیاں انتہائی ضبط سے امکانی قوت سے نہاں خانۂ دل میں مستور ہیں۔ بے اختیاری و اضطراب کا ذکر نہیں۔ ہماری شریعت میں یہ حکم ہے کہ مثل شمع گھل گھل کر اپنی جان فنا کر دو۔ پھول کی طرح سکوت سے زندگی گزار دو مگر رازداری کو ہمیشہ شیوۂ عمل رکھو۔ بلبل اور پروانہ سے کے اضطراب انگیز رویہ سے سبق نہ لو۔ ہم محبت کے بیتاب شعلوں کو سینہ سے لگائے ہیں اور

خاموشی سے کنج عزلت میں رہ کر اپنی حیات مستعار کے ایام گزارتے ہیں، تڑپتے ہیں اور جان نثار کرتے ہیں - مگر مردوں نے اس کا یہ صلہ دیا ہے کہ اس دردمندانہ ضبط مسترحم صبر کا نام ظلم وستم رکھ چھوڑا ہے - عورت ایک نگاہ محبت پر اپنی جان اپنی آسایش حتی کہ عزیز شے مذہب قربان کردیتی ہے لیکن یہ نہیں دیکھ سکتی کہ اُس کے محبوب کا سوال خالی جائے - بہر حال یہ حقیر نادرہ - تمھاری راندۂ درگاہ —— تم دُور دُور بھاگے ہیں تم سے زیادہ قریب ہوئی - تمھاری محبت کی وارفتہ اور تم پر میرے نظریہ میں تم سے زیادہ تمھاری شفیتہ اس وقت حاضر ہے - جو سزا چاہو اسکو دو - یہ اس محل شاہی میں نظر بندی میں تمھارے رخ انور کی زیارت کی سوا اسکے اور کوئی ترکیب میری سمجھ میں نہیں آئی —— معاف کرو اقتضائے وقت یہی تھا - اگر یقین نہ آئے تو اجازت دو کہ اپنے قلب بسمل کے چند مجروح ٹکڑے بھی تمھارے سامنے نکال کر رکھ دوں اور پھر شہزادۂ ناظر کو معلوم ہو جائے کہ محبت کے خونچکاں زخم اور عشق کے زہر میں بجھے ہوے تیروں کے پیکان ایسے ہوا کرتے ہیں - تڑپنے اور تڑپانے، جلنے اور جلانے، مٹنے اور مٹانے کے راز اس وقت اُن پر منطراب اجزائے دل مجروح سے دریافت کرنا ہے —— میں یقین دلاتی ہوں کہ اگر اب میں زندہ ہوں تو تمھاری پرستش محبت کے لیے، اور اگر سانس لیتی ہوں تو تمھاری آرزومندیوں کی خاطر —— معاف کرو —— للہ ناظر معاف کرو -

ناظر - نادرہ - شہزادی نادرہ - بیشک میں نے تمھاری تذلیل کی - معاف کرنا تمھارے عہد شباب کی میں نے قدر نہ کی - آہ - عاصمہ اب اس عالم میں نہیں ہے - اُس کی پاک روح سے میں شرمندہ ہوں - مگر تمھاری مصیبت اور حرماں نصیبی بھی دیکھی نہیں جاتی - میں یقیناً تمھاری خاطر اپنی نفسانی خواہشات کے لیے نہیں بلکہ ایک محبت کے نعم البدل میں یہ حقیر زخم رسیدہ مجروح و فگار دل تمھاری نذر کرتا ہوں —— ہاں مجھ کو اعتراف ہے کہ چند ہفتے قبل تمھاری محبت سے نفرت تھی، تمھارے نام سے چڑھ تھی، تمھارے ذکر سے حقارت ٹپکتی تھی لیکن اس ہفتہ میں خدا معلوم میرے قلب کو کس نے پلٹ دیا کہ تمھاری محبت میرے رگ و پے میں سرایت کرگئی ہے - میں، یقین مانو، محبت کا مبہم لفظ استعمال کرتے بہت ڈرتا ہوں، کیونکہ محبت ایک خوفناک نقاب پوش ساحرہ ہے - محبت جسکو عموماً سب محبت کہتے ہیں وہ صرف خود غرضی ہوتی ہے - عورتیں عموماً اپنے جذبات

کو پہچاننے میں غلطی کرتی ہیں اور اسوقت نادرہ تم بھی اسی غلطی کا شکار ہو رہی ہو۔ اگر تم آفتاب کو نقطہ نصف النہار پر قائم کر سکتی ہو۔ اگر حرکت کو سکون سے اور سکون کو حرکت سے بدل سکتی ہو، اگر شب چار دہم میں روز روشن کے جلوے دنیا کو دکھا سکتی ہو، تو ہاں تم کو یقیناً اس بات کا بھی حق حاصل ہے کہ تم محبت کرو ——— بہر حال مجکو بذاتہٖ تم سے کوئی شکایت نہیں، میں تمہاری ہی زبان میں اس "محبت" کی قدر کرتا ہوں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اب تم سے ایک دلی تعلق پیدا ہو گیا ہے"۔

بھائی کلیم۔ تصویر ملاحظہ طلب یہ ہے کہ آواز بھرا گئی۔ محبت کے پینگ بڑھنا شروع ہوئے اور فرطِ بیتابی بحران شوق نے زبان پکڑلی۔ جسم مرتعش ہوئے۔ عروس شب معجزہ ربانی دکھا رہی ہے، بادِ نسیم کے خوش آیند جھونکے چل رہے ہیں۔ نادرہ، معصوم نادرہ، حسین نادرہ مخمور شباب میں لغزش ہوئی۔ اضطراب میں اضافہ ہوا۔ اور ایک ادائے بیخودی جس پر ہزار ہا خودیاں قربان!!! بغیر کسی مزید گفتگو کے ساعد سیمیں ناظر کی صراحی دار گردن میں حمائل ہوتی نظر آئیں۔ منور فرشتۂ جمال کی شعاعیں اس منظر لطیف سے لرزیں۔ دونوں مجروح شکستہ قلوب جوش الفت سے لبریز ہوئے۔ فضائے بسیط کا ہر ذرہ، کائنات کا ہر حصہ اور جنت ارضی کا ہر ہر ریزہ اس ادائے دلفریب سے مرتعش ہوا۔

(۱۴)

ملک سنجر عسقلانی کو معرکۂ نیل کا وعدہ یاد دلایا جاتا ہے۔ شہزادہ ناظر بدخشانی کی درخواست محبت شرف قبولیت بخشتا ہے۔ ایک حسین و جمیل صبح کو جب وہ تاج شاہی سر پر رکھے ہوئے نمایاں ہوئی۔ مرغان خوش الحان اپنی نغمہ سرائی سے فضائے بسیط کو مترنم بناتے ہیں۔ نسیم سحری کے خوش آیند جھونکے کائنات کو مسرور و متبسم کرتے ہیں، دربار عام کے ایک مخصوص کمرے میں جہاں ہر ہر چیز اور ہر ہر سر رشتہ قاعدہ و قرینہ سے آراستہ ہے بڑے بڑے بیش بہا استنبولی قالین، ایرانی غالیچے، عربی چادریں بچھی ہیں، فراعنۂ مصر کی قیمتی تصویریں اور مناظر دلکش کے نقوش دیواروں پر آویزاں ہیں۔ دروازوں پر اطلس و دیبا کے زرکار پردے، دیواروں پر حلبی آئینے جڑے ہوئے تھے۔ وہیں نادرہ بصد ناز و انداز ایک حسین و جمیل چہرہ میں آتی ہے جسکو دیکھ کر یہ گمان ہوتا تھا کہ سیلاب حسن آیا ہے یا قات کی خیالی پریاں آج دنیا میں اتر آئی ہیں۔ خوش آمدید و حبذا کے نعرہ ہائے مسرت بلند ہوتے ہیں۔ اور قاہرہ کا مفتی اعظم

شہزادہ ناظر اور شہزادی نادرہ کو شرعی حدود میں داخل ہونے کی اجازت دیتا ہے۔ مبارک و سلامت کے شادیانے بجتے ہیں فضائے آرزو و جہانِ تمنا اس "عہد شباب" پر شاہد ہوتی ہیں۔ "نظام کائنات" اس "مظہر حسن" کے طور پر "کلیم وش" منتظر جلوہ بنکر مبارک باد دیتا ہے۔ شجر و حجر غرضکہ جمیع کائنات سدا بہار خلوص کے خوشنما ہار ناظر و نادرہ پر نچھاور کرتے ہیں۔ ارواح مقدسہ تحفۂ تبریک پیش کرتی ہیں اور طرفین کے مرتعش لبوں پر ایک ہلکی برق وش مسکراہٹ نمودار ہوتی ہے اور تھوڑی سی نظری جھجک کے بعد دونوں روئے حیا میں مستور ہو جاتے ہیں ———"

مشیر احمد علوی۔ بی اے

بادۂ سرجوش

(غزل) از تراوش فکر جناب مولوی رضی احمد صاحب رضیؔ بدایونی

اک سکونِ اضطراری پردہ دارِ جوش تھا — تیرا دیوانہ ازل سے بے نیازِ ہوش تھا
گم تھا نظارہ بھی جلووں کا یہاں تک جوش تھا — مژدۂ دیدار پیغامِ وداعِ ہوش تھا
حسنِ خود بیں جب حجابِ ناز میں روپوش تھا — نغمے خوابِ ناز میں تھے سازِ کُن خاموش تھا
دل نے ہلچل ڈال دی کُل کائناتِ دہر میں — اک لہو کی بوند میں اللہ اتنا جوش تھا
صدقے جذبِ بیخودی کے اب وہ ہے زیبِ کنار — جو نگاہِ جستجو سے آج تک رُوپوش تھا
کہنے کی باتیں ہیں کس کا جلوہ کیسی برقِ حُسن — ایک نیرنگِ نظر تھا اک فریبِ ہوش تھا
بے زبانی تھی محبت میں زبانِ آرزو — ہر نفس سازِ نوائے نغمۂ خاموش تھا
شکر ہے دونوں محبت میں ٹھکانے لگ گئے — دل عذابِ زندگی تھا سر وبالِ دوش تھا

توڑ دی ہمت رضیؔ ناکامیِ منصور نے
ورنہ میرے جام میں بھی بادۂ سرجوش تھا

تنقیدیں

اقتباسات سیرۃ النبی (انگریزی) مترجمہ مسٹر سید علی پروفیسر عثمانیہ انٹرمیڈیٹ کالج - ۶۰ صفحے - غالباً مصنف سے مل سکتی ہے -

علامہ شبلی نعمانی کی مشہور تالیف سیرۃ النبی ادبی، تاریخی، اور مذہبی تینوں حیثیتوں سے اس قابل ہے کہ دیگر ملکی اور غیر ملکی زبانوں میں بھی اسکے تراجم شائع کیے جائیں - مسٹر سید علی نے اسے انگریزی لباس پہنانے کا بیڑا اُٹھایا ہے - پہلی اور دوسری جلد کا کچھ حصہ ترجمہ کر چکنے کے بعد صاحب موصوف نے ترجمہ کے بعض اقتباسات ایک رسالہ کی صورت میں شائع کیے ہیں تاکہ ملک کے اہل قلم کے سامنے بغرض اظہار رائے و مشورہ پیش کریں - ترجمہ لفظی ہے، اور انگریزی محاورہ کی پابندی کے باوجود اصل کتاب کا ادبی لطف بڑی حد تک باقی ہے - یہ بڑی جاں فشانی کا کام اور ترجمہ کا کمال ہے - رحمۃ للعالمین کے سوانح حیات کو ایک عالمگیر زبان کے ذریعہ دنیا کے سامنے پیش کرنے کی نیت مبارک ہو!

حقیقت اسلام جب مولوی احمد حسین خاں، ایف آر، اے ایس، چیف سکرٹری سرکار نظام کے بچے انگلستان میں تعلیم پا رہے تھے، تو ایک پادری کی بحث نے اُنکے ایمان میں کچھ شکوک پیدا کر دیے - بزرگ باپ اپنی فرصت کے اوقات میں اسلام کے بہترین مذہب ہونے کے ثبوت میں چند یادداشتیں انگریزی میں لکھ کر اپنے ہفتہ وار خطوط کے ساتھ اپنے بچوں کو بھیجتے رہے - اور بعد میں "نوٹس آن اسلام" کے نام سے انھیں شائع کیا - اور مولوی علی بشیر صاحب نے اسے اُردو کا لباس پہنایا - اس کتاب میں مذہب کیا ہے، حقیقت اسلام کیا ہے، اسلام کیوں بہترین مذہب ہے، اور مسلمانوں کی قومی اصلاح وغیرہ پر بہت دلچسپ بحث کی گئی ہے - جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلام سائنس جدید کے مطابق بہترین مذہب ہے - ترجمہ کی دشواریوں کو دیکھتے ہوے یہ کہا جا سکتا ہے کہ زبان بھی اچھی ہے - گمراہ تعلیم یافتہ طبقہ کی اصلاح کے لیے اس نوع کا لٹریچر شائع کرنا نہایت ضروری ہے -

نقاشی کے نکتے مولفہ چودھری محمد علی صاحب تعلقدار ردولی - حجم پاکٹ سائز کے ۸۰ صفحے قیمت ۴ر پتہ: تعلقدار پریس - لکھنؤ -

اس کتاب میں سر رابرٹ مکلیر مون وٹ کی تصنیف سے مصوری کے تمام اصول اخذ کر کے شائع کیے گئے ہیں - آخر میں ہندوستانی طرز کے خصوصیات سے بھی بحث کی گئی ہے - مگر جناب مؤلف نے اس اختصار سے کام لیا ہے کہ کتاب کا مقصد ہی فوت ہو گیا - بغیر اس خیال کے کہ فن مصوری سے ناواقف پڑھنے والے کی سمجھ کہاں تک اخذ مطالب میں یاوری کر سکیگی، مصوری کے سارے اصول بلا تردد گنا دیے گئے ہیں - کتاب کے ساتھ اگر کوئی تصویر ہی شامل ہوتی تو شاید کچھ سمجھ میں آتا - جو فن کے جاننے والے ہیں اُنکے لیے یہ ابتدائی رسالہ ظاہر ہے کہ کوئی افادی حیثیت نہیں رکھتا - بہر حال اُردو زبان میں اس دلچسپ موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے - اور اگر اسکے مطالعہ سے ایک بھی اہل قلم اس طرف متوجہ ہو گیا تو بھی مصنف کو اپنی مشقت کا صلہ مل جائیگا -

براوننگ　از سید وقار احمد بی اے (عثمانیہ) ضخامت پاکٹ سائز کے ۷۰ صفحے - قیمت ۸؎
مصنف سے (نظامت منزل کنگ کوٹھی روڈ حیدرآباد دکن) طلب فرمائیے۔

براوننگ انگریزی زبان کا ایک دشوار گو شاعر ہے - اور اس کی مشہور نظم "ربی بن عذرا" خاص طور پر مشکل ہے - عثمانیہ یونیورسٹی کے ایک ہونہار گریجویٹ سید وقار احمد صاحب نے بڑی محنت سے اسکا اردو ترجمہ شائع کیا ہے مترجم کا مقصد یہ ہے کہ اردو شعرا کے سامنے انگریزی ادب کی اچھی نظمیں پیش کیجائیں۔ براوننگ بڑھاپے کو انسانی روح کی انتہائی تکمیل کا زمانہ سمجھتا ہے اور جو مایوسی اور شکستہ دلی بڑھاپے سے متعلق ہے اُسے رفع کرنے کی کوشش کرتا ہے - اس نظم کا پہلا ہی بند یوں شروع ہوتا ہے :-

"نوجوانو! میری طرح تم بھی بڑھاپے کا تجربہ کرو - یہ عمر کا بہترین زمانہ آنے والا ہے۔ اسی کی تیاری کے لیے ہمیں پہلے جوانی کا زمانہ عطا کیا گیا - ہماری زندگی کا مالک وہی ہے جو کہتا ہے کہ میں نے انسان کو اچھی شکل پر پیدا کیا ہے" جوانی تمہاری زندگی کا صرف آدھا زمانہ دکھاتی ہے : تم اپنے مالک پر بھروسا کرو ، اپنی زندگی کی پوری بہار دیکھ لو اور بڑھاپے کی آمد سے ہراساں نہ ہو"

ترجمہ کی عبارت بامحاورہ ہے اور اصل نظم کا لطف ترجمہ میں بھی باقی ہے - جناب مترجم اس کامیابی کے لیے مبارکباد کے مستحق ہیں - شروع میں براوننگ کی مختصر سوانح عمری اور اسکی شاعری پر بھی بحث کی گئی ہے (سہیل)

رنگ زمانہ　منشی نوبت رائے نظر لکھنوی کے شاگرد منشی برج بھوکن لال محب ، عبد الماجد صاحب کے ہموطن اور ہمارے دیرینہ عنایت فرما ہیں - جن کا کلام الناظر میں کبھی کبھی شائع ہوا ہے - کتاب زیر تنقید آپ کا مجموعۂ افکار ہے جو بلحاظ مضامین اسم بامسمیٰ کہا جا سکتا ہے - اس کا مسودہ ۱۹۱۸ء میں کسی مطبع کو بغرض طبع دیا گیا تھا - ۱۹۲۳ء میں کتاب چھپ کر تیار ہوئی تو کثرت اغلاط کے باعث محب صاحب کو پسند نہ آئی اور بہ بال زوال تک مطبع میں پڑی رہی - اب مجبوراً کتاب شائع کی گئی ہے - اور امید ہے کہ آیندہ ایڈیشن میں تمام غلطیاں دور کر دی جاویں گی -

لڑائی کے زمانہ میں کاغذ بھی بہت گراں تھا ، اس لیے شاید رنگ زمانہ کو سفید کاغذ بھی نہ میسر آیا اور مٹیالے کاغذ ہی پر قناعت کرنا پڑی - کلام محب کے چند نمونے ، ادھر اُدھر سے ، درج کیے جاتے ہیں تاکہ ناظرین کو رنگ زمانہ کا کسی قدر اندازہ ہو جائے -

گُڈ مارننگ ہر اک سے کہو ہیٹ اتار کر　　دستور اب یہی ہے سلام و نیاز کا
ہوگیا سہل سفر ریل کے باعث اے خضر　　رہبر شوق ہے اب عشق میں انجن اپنا
قسمت کو نہیں سمجھے اس گرانی میں غریب　　ستو بھی روکھی روٹیوں سے پیٹ جس دن بھر گیا
قلی درکار ہے مجھ ناتوان عشق نیشن کو　　کہ اس کشش پہ خود ہاتھوں سے بستر اٹھ نہیں سکتا
اب تو اپنے لیے مغرب کے طریقے ہیں مفید　　مشرقی طرز میں ہے خطرۂ انجام بہت
اور رہ لیں عورتیں پردہ کے اندر چند روز　　ہند میں قائم ہے یہ سد سکندر چند روز
کہہ رہی ہے تربیت اپنی زبان حال سے　　سادہ صورتوں کی قدر تعظیم قلندر چند روز
قیس کو پیارا رہے گا لیلیٰ کا طوق　　دوستوں کو فیشنی کالر عزیز

داں جما رنگِ عیش محنت سے — ہم لنگوٹی میں کھیلتے ہیں پھاگ
ہم اپنے دل میں سمجھیں بادشاہت ہفت کشور کی — کلرکی کی جگہ مل جائے گر صاحب کے دفتر میں
نگاہیں اس بتِ رعنا کی آمادہ ہیں شوخی پر — رقابت بڑھتی جاتی ہے ہم شیخ و برہمن میں
آپ کیوں ہر سال رہتے ہیں پریشاں اے عجب — ووٹ کم آتے ہیں شاید ممبری ملتی نہیں
سرجن کی ڈاکٹری کی ہے توقیر آجکل — عزت نہ بید کی ہے نہ قدرِ طبیب ہے
کیجیے بے دین ہو کر کوچۂ مغرب کی سیر — اہل مذہب کو یوں ہی گمراہ رہنے دیجیے
یہ تو ظاہر ہے کہ حضرت خیر خواہِ قوم ہیں — پھر بھی بیجا ہے یہ چندہ کا تقاضا ہر گھڑی
بنے تھیٹر کے ایکٹر وہ نئے فیشن کے صدقے میں — نہ داڑھی ہے نہ مونچھیں ہیں نہ چندن ہے نہ چوٹی ہے
مل کے آپس میں نہ کوئی کام کرنا چاہیے — کارخانے پڑے رہیں کے ہم کو مرنا چاہیے

ڈیڑھ سو صفحے کے اس مجموعہ میں اس قسم کے بکثرت اشعار ہیں۔

مجموعہ کی ترتیب و تہذیب، صحتِ املا و الفاظ کے متعلق سب صاحب خود حد درجہ غیر مطمئن ہیں اس لیے کسی قسم کی شکایت فضول ہے۔ شاعرانہ تصرفات و تسامحات کے بارے میں حضرات شعرائے کرام کی رائے زیادہ وزندار ہو سکتی ہے۔

امید ہے کہ طبع ثانی کے وقت اس مجموعہ کی حالت ہر حیثیت سے بہتر ہو جائے گی۔ قیمت ۱۰ر

ملنے کا پتہ:۔ منشی برج بھوکن لال صاحب۔ دریاباد ضلع بارہ بنکی۔

دیوان نوشاد خدا بخشے مرحوم راجہ نوشاد علی خاں تعلقدار میلارائے گنج کو، تعلقہ داران اودھ میں وہ اپنی آپ نظیر تھے۔ ذہانت و طباعی، ذوقِ علمی و شوقِ ادبی، عالی حوصلگی و فیاضی، جوشِ قومی و حبِ وطن، نفاست پسندی و خوش مزاجی، خلق و انکسار، محبت و مروت، غرضکہ ایک رئیس میں جتنی خوبیاں تلاش کی جاتی ہیں وہ سب اُن میں موجود تھیں۔ اور جہاں رئیسوں کی خوبیاں تھیں وہاں اُنکے مخصوص معائب سے بھی وہ محروم نہ تھے۔ جن میں سب سے زیادہ نمایاں اُنکی شاہ خرچی تھی۔ جس کے بدولت علاقہ تک آخر میں زیح ہو گیا۔

نوشاد مرحوم خود بھی شعر کہتے تھے اور اکثر رئیسوں کی طرح دوسرے شاعروں کے جو شعار پسند آتے وہ بھی اپنا لیا کرتے تھے۔ راجہ اعجاز رسول خانصاحب تعلقدار جہانگیر آباد نے اُنکا دیوان شایع کرادیا ہے۔ اور کسی چھپے رستم نے انکے نام سے ایک عجیب دیباچہ بھی اضافہ کردیا ہے۔ کلام میں لکھنؤ کا وہ رنگ تغزل نمایاں ہے جسے اب لکھنؤ والے خود چھوڑ چکے ہیں۔ پھر بھی بہت سے اشعار صفائی و شوخیِ بیان کے لحاظ سے اس قابل ہیں کہ پڑھے اور یاد رکھے جائیں۔

ایڈیٹر

(بقیہ صفحہ ۵۹)

یعنی خبریں قرآن شریف کی تمام عالم اور قیامِ قیامت پر صاف روشنی ڈالنے والی آیتیں خرق اور التیام اجرامِ فلکیہ پر نہایت وضاحت سے دلالت کر رہی ہیں تو کیا اسلام کا دم بھرنے والے یا آسمانی ادیان کا اقرار کرنے والے اس میں متامل ہو سکتے ہیں۔ ......"

مشیر قادری

پچھلے مہینے کے رسالے

جو رسالے وقت تحریر تک کسی سبب سے موصول نہیں ہوتے، خواہ شایع نہ ہوں یا شایع ہوں اور دفتر الناظر میں نہ پہونچیں، اُن کا ذکر ان اوراق میں رہ جاتا ہے۔ ایڈیٹر

ہمایوں

میاں بشیر احمد بی اے (اکسن) اڈیٹر رسالۂ ہمایوں نے مسلسل پانچ نمبروں میں ایک دلچسپ مضمون لکھا ہے جس میں تقریباً تمام مذاہب عالم پر اجمالی نظر ڈالی گئی ہے۔ مضمون کے آخری دو نمبروں میں "اسلام" پر بحث کی گئی ہے اور آخری قسط کے دوران میں "اہلِ بہاء" کے متعلق چند سطور میں جس صفائی سے بعض تعلیمات بہائی کی تصریح کی گئی ہے وہیں ایک دو اصولی اشتباہات ہو گئے ہیں جنکے رفع کرنے کے لیے مولانا میر محمد خاں شہاب مالیر کوٹلوی نے ایک مضمون "دنیا کے مذہبی و معاشرتی تاریخ اور اہلِ بہا" کے عنوان سے "اگست" کے رسالہ میں شایع کیا ہے جس سے اہلِ بہا کا عقیدہ معلوم ہوتا ہے۔ صاحب مضمون لکھتے ہیں :-

.... اہلِ بہاء کا اعتقاد یہ ہے کہ ہر قوم و ملت اور ہر قانون کے لیے ایک وقت ہوتا ہے۔ تغیر و تبدیلی فطرت انسانی کا خاصہ ہے۔ نوع بشر ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل ہوتی ہے اور اسکی احتیاجات بدلتی رہتی ہیں۔ پہلے قوانین جو اپنے وقت میں مناسب اور حق بجانب تھے اُن میں تغیر کی حتمی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ اگر لفظاً اس حقیقت کا اقرار نہ کیا جائے تو لوگ نئی نئی تفسیروں کے ذریعہ سے پُرانے قوانین کو نئی ضروریات کے مطابق بنانے کی متواتر کوششوں سے قانون کی تجدید کی ضرورت کا عملی اعلان کرتے رہتے ہیں۔

لیکن ایسی کوششیں پراگندہ ملتوں کو ایک نقطہ پر جمع کرنے کے بجائے پہلے سے زیادہ اختلاف و انشقاق کا موجب ثابت ہوتی ہیں، اس لیے اہل بہا اس حقیقت کو پیش کرتے ہیں، کہ ہمیشہ سے خدا تعالیٰ کا یہ طریق ہے کہ انقلاب زمانہ اور تغیر حالات کے بعد وہ ایک آسمانی کتاب کے بجائے دوسری الٰہی کتاب نازل فرماتا ہے۔ جو آیندہ سیکڑوں سال کے لیے آنے والی نسلوں کی روحانی، اخلاقی، وجدانی اور سیاسی و معاشرتی رہنمائی کا کام اپنے ذمہ لیتی ہے

...... معلوم ہوا کہ مذہبی زندگی، روحانی بیداری، دینی حیات، جو انبیا و مظاہر الٰہی کے ذریعہ سے منصۂ شہود پہ جلوہ گر ہوتی ہے، اُس سے اس قسم کے اصلاحی مساعی

کہ جو مذاہب و ادیان کے اندر بلا استثنا ...... ہوتی رہتی ہیں ..... اہل بہا کا اعتقاد ہے کہ سیکڑوں سال مثلاً ہزار سال یا اس سے کم و بیش مدت کے بعد نوع بشر میں ایک ایسا عظیم الشان انسان پیدا ہوتا ہے جو نئی کتاب، نیا پیغام، نئی زندگی دنیا کے لیے لاتا ہے۔ اسکی صداقت کی سب سے بڑی دلیل خود اُس کا وجود، اس کا پیغام اور اس کا نفوذ ہوتا ہے ..... حضرت بہاء اللہ مذہبی اصطلاح کے مطابق صرف موعودِ اسلام ہی نہیں بلکہ موعودِ جمیع ادیان اور مربی عالم ہیں .... اگر دین و مذہب کی اصطلاحات سے قطع نظر کرکے بھی دیکھا جائے تو آپ کی تعلیمات میں وہ ہدایات اتم و اکمل طور پر موجود ہیں۔"

مخزن جناب حفیظ جالندھری مدیر مخزن کا بیان ہے کہ کارپردازان مخزن شروع ہی سے ہمیشہ یہ کوشش کرتے رہتے ہیں کہ مخزن کی ہر جدید اشاعت اپنے مقاصد کے لحاظ سے ایک خاص نمبر ہو اور "مخزن کی یہ اشاعت صرف ایک بزم ماتم ہے اور بس" جس کا نام "گرامی نمبر" یا "یادگار گرامی" ہے۔ آفتاب سخن کے غروب ہو جانے پر کون سی آنکھ ہے جو پرنم نہیں ہے کون سا قلب ہے جو حزیں نہیں ہے۔ اس سانحۂ عظمیٰ پر ہر مذہب و ملت کے اہل قلم نے جس طرح اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ موت گرامی پر اظہار الم کیا ہے وہ آپ اپنی نظیر ہے شرکائے غم کا ہر ہر نوحہ تیر و نشتر کا کام کرتا ہے۔ چنانچہ ایک مختصر مرثیہ نثر میں جناب محمد امیر صاحب بی اے نے سپرد قلم فرمایا ہے جسکے اقتباسات ناظرین کی آگاہی کے لیے یہاں پیش کیے جاتے ہیں :—

"......... مرنے والے کا غم ہی ایک ایسا غم ہے جو کبھی بھلایا نہیں جاسکتا ..... یہ وہ زخم ہے جسے اہل درد ہمیشہ ہرا کھتے ہیں ...... آہ آسمانِ ادب کا ایک درخشاں ستارہ ڈوب گیا .... یہ کسے توقع تھی کہ اس گلستان شاعری کی بہار بہت جلد ختم ہو جائے گی .... جو ہر عثمانی کی کرن سے نکھار رہا تھا۔ آہ! آج شعرا کی امت بیوہ ہو گئی۔ شاعر اپنی غیر فانی شاعری کے ذریعہ انسانوں کے حافظہ میں زندہ رہتا ہے۔ یہی اُس کی شاعری کا معراج ہے ..... جس طرح بچہ شام ہوتے ہی اپنی ماں کی گود میں جاکر سو جاتا ہے اسی طرح تو بھی اپنی شام زندگی کے آغاز پر مادرِ گیتی کے آغوش میں جاکر ہمیشہ کی نیند سو رہا ہے ......"

نیرنگ خیال مولانا محمد آدم کنجاہ مرحوم ضلع گجرات (پنجاب) کے باشندے اور دورِ عالمگیری کے ایک مشہور فارسی شاعر تھے، غنیمت تخلص فرماتے تھے

نواب کرم خاں کے حاشیہ نشینوں میں تھے۔ چنانچہ نواب صاحب کے صاحبزادہ میاں "عزیز" اور اُن کی منظورِ نظر "شاہد" کے حسن و عشق کی داستان کو مثنوی نیرنگ عشق لکھ کر حیاتِ جاوید عطا کی ہے۔ مثنوی بہت مقبول ہے۔ اس مثنوی پر میر ولی اللہ صاحب وکیل نے ایک مبسوط تبصرہ کیا ہے جو نیرنگ خیال کے اگست نمبر میں شایع ہوا ہے۔ مثنوی بہت ہی مؤثر اور سوز و گداز سے پُر ہے۔ خواہ مخواہ دل چاہتا ہے کہ کچھ شعر نقل کروں۔

بنامِ شاہدِ نازک خیالاں عزیزِ خاطرِ آشفتہ حالاں
زمہرش سینہ ہا جولاں گہِ برق دلِ ہر ذرہ در جوشِ انا المشرق
جگرسوزی چراغِ خانۂ او تپشہا شوخیِ پروانۂ او
دلِ مستانِ عشق خود تماشش شکستِ رنگہا مہتاب باشش
امیدِ تماشائے نگارے نمودم جانبِ مکتب گذارے
برآمد بر درِ مکتب خروشم کہ من سیپارۂ دل می فروشم

سراپا کردہ رفتم یک قدم پیش بلاگردانِ لطفِ طالعِ خویش

بارِ منت چو غنیمت نتوانیم کشید اینکہ احساں نہ نمودند چہ احساں کردند

اگر این ست عمرِ انتظارِ صبحِ وصلِ او کہ می گوید کہ فردائے قیامت دیر می آید؟

نیرنگ خدا معلوم یہ کیا مرض متعدی ہوتا جاتا ہے کہ روزانہ نت نئے نمبر نکلتے ہیں۔ چنانچہ معلوم ہوا ہے کہ لکھنؤ میں ایک رسالہ کا ایڈیٹر نمبر نکلنے والا ہے۔ نیرنگ کا بھی یہ تنقید نمبر نکلا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ "تنقید" ابھی تک ہندوستان میں عنقا ہے۔ آج کل تنقید کا مقصد محض یہ ہے کہ اگر ہمارے کسی عزیز۔ اُستاد، یا دوست کی کتاب ہے تو اُسکی تعریف ہوگی، اگر کسی "جنس مخالف" کی کتاب ہے تو خواہ وہ "آسمان کے تارے" بھی توڑ کر لایا ہو" پھر بھی خراب ہے۔ بہر حال نیرنگ نے تنقید نمبر نکالا ہے اور حضرت امیر مینائی رحمتہ اللہ علیہ کا فوٹو بھی شایع کیا ہے۔ ایک مضمون جو فی الواقع اس قابل ہے کہ پڑھا جاوے وہ موازنۂ امیر و داغ ہے۔ امیر و داغ کے موازنہ پر حقیقت یہ ہے کہ آج تک کوئی عمدہ کتاب نہیں لکھی گئی۔ حالانکہ بہت ضرورت ہے۔ دونوں مسلّمہ اُستاد ہیں۔ ایک آفتاب ہے اور ایک ماہتاب۔ کسی کو دن کی ضرورت ہے اور کسی کو رات کی۔ لیکن جہاں تک فن کا تعلق ہے

امیر و داغ سے کون بہتر ہیں۔ داغ و امیر کا صحیح موازنہ اب تک ہوا ہی نہیں ہے۔ تاثیر صاحب نے مخزن کے دورِ جدید (اپریل ۲۶ء) میں داغ و امیر کے عنوان سے ایک مضمون شایع کیا تھا۔ اُنھوں نے موازنہ نفسیاتِ شاعری کی رو سے کیا ہے اور ثابت کیا کہ داغ سے بہتر امیر نہیں ہو سکتے اور یہ بھی ثابت کرگئے ہیں کہ "امیر نے داغ کے طرز کو نباہ بھی لیا ہے تو یہ درحقیقت داغ کی کامیابی ہے"۔ اس مضمون کا جواب جناب عشرت رامپوری نے نیرنگ کے تنقید نمبر میں دیا ہے لیکن ایمان کی بات یہ ہے کہ یہ مضمون بھی جواب شافی نہیں ہے۔ ایک جگہ فاضل مقالہ نگار تحریر فرماتے ہیں کہ

> ....."امیر نے داغ کا طرز ..... اختیار [illegible] کی شان ملاحت آڑے تھی۔ لیکن اگر ایسا کیا بھی تھا تو یہ کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ امیر کی کامیابی داغ کی کامیابی ہے۔ جاحظ کی کامیابی خواجہ [illegible] کی کامیابی نہیں کہلاتی۔ شیکسپیر کی کامیابی، مارلو کا گرین اور [illegible] کی کامیابی نہیں کہی جا سکتی۔ حالانکہ یہ مسلّم ہے کہ اپنے ڈراموں کا مسالہ شیکسپیر نے انھیں ڈراما نگاروں کی تصانیف سے حاصل کیا تھا ..... داغ کے کلام میں زبان کا چٹخارہ ضرور پایا جاتا ہے لیکن جس خوبی زبان کی بنا پر داغ کا کلام ایک کرامت سمجھا جاتا ہے وہ کم و بیش ہر شاعر [illegible] جن [illegible] زندگی [illegible] ہیں [illegible] کے تجربے [illegible] رہتے ہیں [illegible] اگر [illegible] شعر [illegible] کے [illegible] ان میں [illegible] کچھ [illegible] ہوتا ہے ..... [illegible] معشوق [illegible] کو منظوم کرنے میں صرف ہو جاتی ہے اگر داغ کے دواوین [illegible] تو [illegible] اردو [illegible] دہلی کے محاوروں [illegible] اور کسی قسم کی کمی [illegible] سکتی مگر دہلی کی زبان کی [illegible] ہے۔ داغ کا کلام امیر سے بہتر نہیں کہا جا سکتا۔ [illegible] رکھتے ہیں .....

معارف تازہ نمبر میں مولانا ابو الخیر صاحب مودودی رکن دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ نے اپنے بے نظیر مقالہ "ہندوستان کی معاشی حالت پر کمپنی کا اثر" کا دوسرا حصہ پیش کیا ہے۔ مضمون بہت ہی موثر اور دلکش ہے۔ اس قابل تھا کہ حرف بحرف نقل کیا جاتا لیکن رسالہ کے محدود اوراق اسکے نقل کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ بہر حال بخوف طوالت چند اقتباسات یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔ یہ حصہ تاریخ ہند کے ہر تحقیق پسند طالب علم کے لیے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ امید ہے کہ مولانا موصوف اس مبحث پر ایک مستقل کتاب تحریر فرمانے کی جرأت

گوارا کریں گے۔ جس سے معلوم ہو سکے گا کہ بدنصیب ہندوستان پر کیسے کیسے استبدادی دور گذر گئے۔ پہلے نمبر میں کمپنی کی تدریجی ترقی پر اجمالی تبصرہ کیا گیا تھا۔ فلسفۂ تاریخ کے نقطۂ نظر سے ان ۲ ½ صدیوں کے واقعات کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ کمپنی اس مدت میں اپنی تاریخ کے پانچ دوروں سے گذری ہے۔ یہ پانچ دور حسب ذیل ہیں

(۱) ۱۶۰۰ء سے ۱۷۵۷ء تک۔ پلاسی کی فتح کے بعد تنہا مالک بنتی ہے۔

(۲) ۱۷۵۷ء سے ۱۷۷۲ء تک۔ یہ کلایو اور ہیسٹنگز کے جنگی اقدامات اور سیاسی دسایس کا زمانہ تھا۔

(۳) ۱۷۷۲ء سے ۱۸۱۸ء تک۔ میسور کی فتح، مرہٹوں کا استیصال، مہاراشٹر کا الحاق، اس دور کے اہم واقعات ہیں۔

(۴) ۱۸۱۸ء سے ۱۸۳۳ء تک۔ یہ امن و صلح، نظم و نسق، اصلاح و اقتصاد کا عہدِ زریں ہے۔

(۵) ۱۸۳۳ء سے ۱۸۵۸ء پر ختم ہوتا ہے۔ یہ وہ اہم عہد ہے جب ہندوستان کی حکومت کا پانسہ پلٹتا ہے اور ایک شاہی مجرم بغاوت کے الزام میں رنگون کے قید خانہ میں نظر بند کر دیا جاتا ہے اور اورنگ برطانیہ کا پرچم قصر معلّی (آہ!) پر لہراتا ہے! ہندوستان کی ان دوروں میں کیا حالت تھی اور کس طرح روز بروز خراب ہوتی گئی؟ اسی کا نوحہ ہے جو فاضل مقالہ نگار نے اس دوسرے مضمون میں پیش کیا ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے:-

"...... اکبر و شاہجہاں کے وقتوں کا تو ذکر ہی نہیں ...... کہ کمپنی گورنمنٹ کے عہد سے وہ وقت بھی بدرجہا بہتر تھا جب حکومت کی باگ عالمگیر کے نااہل جانشینوں کے ہاتھ میں تھی اور جب کسی مستقل نظام حکومت کے نہ ہونے سے ...... ملک پر بدامنیوں، خانہ جنگیوں طوائف الملوکیوں کا راج تھا۔ صنعتیں برباد ہو رہی تھیں، اہل ہنر کا کوئی قدردان نہ تھا۔ لوگ خوشحالی کو ترسنے لگے تھے۔ اگلے وقتوں کو یاد کر کے روتے تھے۔ تاہم اس تباہی بخش و پر از اضطراب زمانہ میں بھی ہر قسم کی صنعتی پیداوار کی اتنی کثرت تھی کہ نہ صرف گھر کی ضروریات ہی پوری ہوتی تھیں بلکہ باہر کی ضرورتیں بھی یہیں سے پوری ہوتی تھیں...... لیکن کمپنی گورنمنٹ کے آتے ہی ہوا بدل گئی، اہل حرفہ کے گلے گھونٹ دیے گئے، صنعتیں بیٹھ گئیں۔ تجارت کی کساد بازاری ہو گئی، زراعت پر اوس پڑ گئی، کسانوں پر عرصۂ زندگی تنگ ہو گیا۔ زرعی و صنعتی روح بیدردی سے کچل ڈالی گئی اور ظالم خود غرضوں نے اس غریب (ہندوستان) کو ضرورت کی ایک ایک چیز سے محتاج کر کے اپنے ملک کی فلاح کے لیے خام پیداوار کی ایک ایسی قحط زدہ منڈی بنا دیا کہ تنہا "زرعی ملک کا جفاکش کسان، آج دنیا میں سب سے زیادہ محنتی ہونے کے باوجود سب سے زیادہ

مفلس ہے اور انتہا یہ ہے کہ غریب اپنے اس خرمن کے کم ازکم فوائد سے بھی محروم ہے۔ جسے وہ اپنے خون سے سینچتا ہے۔"

اتنی جلدی ایسا عظیم الشان انقلاب کیسے ہوگیا؟ اسکا جواب بھی کسی مشرقی زبان سے نہیں بلکہ مغربی قلم سے سنئیے:-

......" ولسن لکھتا ہے" یہ ایک واقعہ ہے کہ انگریزی صنعت کو فروغ دینے کے لیے ہندوستانی صنعت کو انتہائی ناانصافی سے مٹایا گیا ہے۔ اگر برطانوی صناع ہندوستانی صناع سے صرف صناع کی حیثیت سے مقابلہ کرتا تو ہرگز کامیاب نہ ہوسکتا"

شور لکھتا ہے:-

...." ہندوستان کے اچھے دن گزر گئے۔ وہ دولت جسکا کبھی وہ مالک تھا لوٹ لی گئی وہ قابلیت و ذہانت جس کا دنیا جہان میں شہرہ تھا تباہ و برباد کردی گئی۔ اور ظالمانہ طریق حکومت سے اسکے فوائد کو اپنے فوائد پر قربان کردیا گیا"

...." لیکن سب سے زیادہ حیرت انگیز زراعت کی تباہی ہے جس نے اس بدنصیب ملک کے باشندوں کو مردوں سے بھی بدتر کردیا ہے۔ آج اسکے بچے معصوم بچے مٹھی بھر اناج کے لیے ایڑیاں رگڑتے ہیں اور نہیں پاتے سکتے ہیں اور مرجاتے ہیں"۔

..... اس معاشی ظلم نے ہندوستانی کسان کو ہلاک کردیا۔ اس میں جان نہ رہی۔ پھر اس پر مصیبت و فلاکت برسنے لگی۔ قرض میں بوٹی بوٹی بندھ گئی۔ اور غریب پیسہ پیسہ کو محتاج ہوکر ان حالوں کو پہونچ گیا کہ اسکے بچے بھوکوں مرنے، جاڑوں ٹھٹھرنے لگے۔ پہلے وہ ایک فصل بوتا تھا اور چین سے زندگی بسر کرتا تھا۔ اب بارہ مہینے اپنی ہڈیاں پیلتا اور خون پسینہ کرکے مٹکا تا ہے مگر پھر بھی روٹی کپڑے کو محتاج رہتا ہے۔ ....
جب اس کے پاس کچھ نہیں ہوتا تو وہ گھر بار چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے۔ اور کبھی اپنے بال بچوں کو (بھی) بیچ ڈالتا ہے"۔

....." یہ حقیقت کس درجہ تلخ و افسوسناک ہے، جو ملک دنیا کا بہترین صنعتی ملک ہو، جسکی مصنوعات سارے جہان کی مصنوعات پر سبقت لیگئی ہوں، جسکی خام پیداوار کا دور دور شہرہ ہو، جہاں اجناس کی اتنی ریل پیل ہو کہ ایک کھانے والے پر گھر کے گھر پلتے ہوں، جسکی زمین سونا اُگلتی ہو اور جہاں دولت کی نہریں بہتی ہوں، وہ ملک ایک صدی کے اندر اندر اتنا مفلس، اتنا قلاش، اتنا بدحال اور فلاکت زدہ ہوجائے کہ اسکی آبادی کا ایک تہائی حصہ نان شبینہ کو محتاج ہو، اور پوری نصف آبادی جاڑے گرمی میں ڈھنگ کا کپڑا نہ پہن سکے! کیا کسی قوم کے لیے جو الفاظ انسانیت، شرافت، تہذیب اور نوع انسان کی ہمدردی و غمخواری کی علمبردار مجسمہ ہونے کی دعویدار ہو، اس سے زیادہ کوئی بات شرمناک ہوسکتی ہے؟

جامعہ

"ترکیۂ جدید میں تمدنی تحریک" کی پہلی قسط کے اقتباسات گذشتہ نمبر میں دیے جا چکے ہیں۔ اس بار سلسلہ قائم رکھتے ہوے قسط دوم کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔ ترکی معاملات سے جو دلچسپی آجکل مشرق میں لی جا رہی ہے اُسکو دیکھتے ہوے امید ہے کہ یہ مضمون دلچسپی سے پڑھا جائیگا۔ پہلی قسط میں فاضل ادیب نے دکھلایا تھا کہ نئی تحریک سے جو انقلاب پیدا ہوا وہ ایک نئے تصور کائنات وحیات کی شکل میں اور دوسری طرف ایک جدید سیاسی ومعاشی تنظیم کی صورت میں رونما ہوا۔ اگر "دنیاے جدید" کے مظاہر تکوین پر سلسلہ وار اجمالی نظر ڈالی جائے تو یہ جدید تصور کائنات وحیات مندرجۂ ذیل صورتوں میں نظر آئے گا (۱) انسان اور اُسکی عقل کی قدر (۲) زندگی اور دنیا کی طرف انسان کا رویہ (۳) فرد اور جماعت کا تصور اور جدید ریاست اور نئی تقننیت کے مظاہر میں ایک نئی سیاسی ومعاشی تنظیم۔ یہ واقعات ذرا تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ ہم بھی چند اقتباسات پیش کریں گے جنسے ان ہرسہ ادوار پر ایک مجمل روشنی پڑیگی۔

......"قدیم ترکوں کا تصور کائنات اسلامی کا تصور تھا۔ لیکن عثمانی ترکوں نے جب اسلام کو قبول کیا ہے تو یہ کافی تاریخی نشو ونما پا چکا تھا اور اپنی اصلی ہیئت سے کافی ہٹ چکا تھا۔ اصل اسلام میں انسان کو کائنات میں سب سے بلند جگہ دی گئی تھی لیکن تاریخی نشو ونما کے دوران میں انسان کی یہ شاہانہ شوکت مدھم پڑ چلی تھی ......

قدیم اسلام میں انسان کو کائنات میں جو تفوق دیا گیا تھا اور عالم کی جو حکمرانی عطا ہوئی تھی اُسے تاریخی اسلام نے یا تو بھلا دیا یا اسکی غلط توجیہیں کیں۔ قرآن کے تصور کائنات میں انسان کو جو بلند مرتبہ دیا گیا ہے اسکے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اسکی تشکیل میں جماعتی اور سیاسی عناصر کا اثر ہے یا وہ نبی اسلام کے احساس جماعتی کا نتیجہ ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ بعد کو چل کر اس پر سیاسی وجماعتی حالات نے اثر ڈالا، اس میں کمی کی اور بالآخر اسے بالکل ہی مٹا دیا۔ ایک طرف اسلامی ممالک کی جابرانہ حکومت تھی جس نے انسان کو اتفاقات اور بادشاہوں کے مزاج و وہم کے لیے کھلونا بنا دیا اور سیاسی ومعاشی انحصار کا دائمی عذاب اسکے سر ڈال دیا تھا، دوسری طرف تمدن وتہذیب کے انحطاط نے اسے قدرت کی بے رحم طاقتوں کا دست نگر کر دیا تھا۔ اور یہ دونوں حالتیں ایسی نہ تھیں کہ عظمت بشری کا قرآنی تخیل اس میں قائم رہ سکتا۔ ہاں خود ان نئے حالات میں قیام کی صلاحیت تھی۔ قدیم دنیا میں جبتک یہ قوت باقی تھی کہ اپنے اثر کو قائم رکھ سکے۔ اسوقت تک افراد کے لیے سوا اسکے اور کیا چارہ تھا کہ رضا وتسلیم کے ساتھ اسکے ساتھ ساتھ چلیں لیکن جب پھر وقت آیا تو انسانیت نے اپنا حق حاصل کی

کرنے کی کوشش کی ..... عثمانی سلطنت کے سیاسی انقلابات مغربی تمدن سے تعلق اور یورپی انسانیت سے واقفیت ان سب چیزوں نے مل کر ایسی مدد کی کہ مدت کا دبا ہوا اور بہت بڑا عقل کی حقارت کا جذبہ تاریخی اسلام میں متصوفین کے یہاں پیدا ہوا انھوں نے شریعت کی رسمی پابندیوں اور متکلمین کی عقلیت کے خلاف علم بلند کیا۔ ادھر دوسرے حلقوں میں عقل سے مراد وہ صاف حسیت نہ رہی جس کا مطالبہ قرآن اور رسول نے کیا تھا، کہ ہمیشہ از سر نو تحلیلی طور پر ایمان و عقیدہ کو تازہ رکھا جائے بلکہ اسے فرائض انسانی کی وجہ بنا کر چھوڑ دیا گیا ....

..... اس انقلاب ذہنی کا تیسرا عنصر یعنی ارتقا کا تصور اسلام اور ترکوں کے تصور کائنات میں بالکل نئی چیز ہے۔ پرانے خیال کے مطابق خدا کی مخلوق دنیا پوری اور مکمل ہے ...... جدید معنوں میں وہاں امکان نہیں ہے"

نظام المشائخ نظام المشائخ کا اگست و ستمبر کا پرچہ بطور رسول نمبر شایع ہوا ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ نمبر بہت بہتر ہے کئی مضامین بہت ہی اچھے ہیں۔ خدا بخشے سرسید اعظم مرحوم کو جنھوں نے میدان میں بونہ بٹ کے اسلام پر بہت بہتر اور مسکت جواب عیسائیوں کے لیے لکھا یا چنانچہ مولانا ناصر نذیر صاحب فراق دہلوی جانشین حضرت میر درد دہلوی نے "قرآن اور رسول سے اعتذار" کے چند اقتباسات رسول نمبر میں شایع کیے ہیں۔ ایک جگہ اس مشہور اعتراض کا بھی جواب دیا ہے کہ "اسلام تلوار سے پھیلا ہے"

..... یہ اعتراض کہ حضور سرور کائنات صلعم نے اپنا مذہب (حقہ) بزور شمشیر پھیلایا اور اس طریقہ سے کثیر حصہ انسان کے خون کا ضائع ہوا اور بہت سی تباہیاں عمل میں آئیں۔ اس میں شک نہیں کہ سرکار دو عالم (محمدؐ) نے اکثر لڑائیاں لڑی ہیں، مگر وہ حضرت موسیٰؑ کی لڑائیوں سے مختلف تھیں۔ کیونکہ حضورؐ کا مدعا ان سے تخریب نہ تھا بلکہ یہ غرض تھی کہ عرب کی قوم ایک ہو جائے اور بت پرستی زائل ہو جائے ۔۔ اور خدائے واحد کی بندگی سکھائی جائے۔ حضور سرور دو عالم نے ان لوگوں کے ساتھ بہت ہمدردی برتی جو کہ اسکے قانون کے تحت میں آ گئے۔ ضدی لوگوں کو بےشک قتل کیا گیا مگر کسی خاتون یا معصوم بچوں کا خون نہیں بہایا گیا مختصر طور پر اپنے ماتحتوں کو حکم دیا کہ جو لوگ قرآن کو مانیں اور اسیر ہوں انھیں ہرگز تباہ و برباد نہ کیا جائے بلکہ ان سے برادرانہ برتاؤ کیا جائے۔ حضرت موسیٰ نے اسکے خلاف تمام قوم کو بغیر خرائط رحم کے مانتے ہوئے یا پیش کیے ہوئے غارت کیا۔ اور ایسی مثال حضور سرور کائنات سے کبھی عمل میں نہیں آئی "

گیت جناب سید عطاء الرحمن صاحب نے گیت کے تازہ نمبر میں معرفت کائنات کے

عنوان سے ایک دلچسپ فلسفیانہ مضمون لکھا ہے - اس مضمون کا مقصد یہ ہے کہ ہم کائنات کی ہر شے کا احساس اسی طرح کریں جس طرح خود اپنا کرتے ہیں اور کائنات کی ہر شے اور ہر ذی روح کے ساتھ اسی لطف و اعتنا کا اظہار کریں جیسا اپنے ساتھ کرتے ہیں .... اور معرفت کائنات میں معرفت الٰہی بھی شامل ہے - ایک جگہ صاحب موصوف تحریر فرماتے ہیں کہ

"..... ہر مذہب حیوانیت سے انسانیت کو فروغ دینے کے لیے آیا ہے - ہر علم دین نے اپنے اصول منضبط کیے ہیں اور انسانی کو جبلّی پستی ذلت اور خود غرضی سے نکالکر علو و شرف کی جانب مائل کرنے کے دعوے کا اعلان کیا - قدیم ہندوستان کے رشی کنجِ تنہائی میں زندگی گزارتے تھے - وہ مدنی زندگی سے احتراز کرتے تھے کاروبارِ ارضی اور معاملاتِ دنیاوی میں حصہ لینا انکے اصولِ حیات کے منافی تھا وہ حیوانیت کو مغلوب کرنے اور قوائے مخفی کو ابھارنے کے لیے تنہائی کے گوشوں اور ویرانوں میں چلے جاتے تھے لیکن وہ اس حقیقت کے ادراک سے قاصر رہے کہ خداشناسی جو انکی منزلِ مقصود ہے چند ایسے فرائضِ انسانیت اور اخلاقِ حسنہ پر مشتمل ہے جنکی پرورش اور بالیدگی براہِ راست انسانوں سے اشتراک و ارتباط پر منحصر ہے ...... اگر تم خود سعی و اکتساب سے گریز کرتے ہو تو دوسروں کی کمائی یا ثمراتِ عرقریزی کو کشادہ پیشانی سے صرف کرنا فیاضی نہیں کہلایا جا سکتا - فیاضی کے لیے غیروں کے منت پذیر نہ ہو، بلکہ فیض رسانی کے ذرائع خود اپنی دیانت اور جفاکشی سے پیدا کرو .... امورِ خیر اور رفاہِ عام کے کاموں میں حصہ لو - یہ ہے حقیقی فیض رسانی اور کیا یہ جنگلوں میں ممکن ہے ؟ ...."

القاسم

القاسم کے ربیع الاول نمبر میں "معراج و سائنس" کی دوسری قسط شایع ہوئی ہے - اسکا پہلا حصہ گذشتہ ماہ میں شایع ہو چکا ہے مضمون دلچسپ ہے اسلیے مختصر اقتباس پیش کیا جاتا ہے :-

"..... یہ بھی شبہہ دامنگیر ہوا کہ معراج کی وہ کیفیت جو کہ آیتوں اور حدیثوں میں ذکر کی گئی ہے جب ہی قابلِ تسلیم ہو سکتی ہے کہ آسمان میں خرق و التیام کو مانا جا سکے اور اسمیں دروازہ وغیرہ مسلّم ہو - مگر فلسفہ قدیم اس کا منکر ہے - یہ شبہہ ایک ایسا واہی ہے کہ سوا دہری اور ملحد کے جو کہ کسی آسمانی مذہب کو نہیں مانتا، کوئی شخص تسلیم نہیں کر سکتا - فرشتوں کا عروج و نزول وحی کا اترنا بغیر آسمان کے اندر گذرگاہوں کے ممکن نہیں - پھر قیامت کی

اردو رسائل کے خاص مضامین

(اگست سنہ ۱۹۲۶ء)

معارف - اعظم گڈھ

(۱) مسلمان عورتوں کے حقوق کا مسئلہ
(۲) امریکہ کولمبس سے پہلے معلوم تھا
(۳) معتزلہ کی ایک قدیم تصنیف
(۴) ہندوستان کی معاشی حالت پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا اثر

جامعہ - دہلی

(۱) ترکیۂ جدیدہ میں تمدنی تحریک
(۲) عنفوان شباب کی مجموعی نفسی سیرت
(۳) شادی کا پیغام (افسانہ)

نظام المشائخ - دہلی

(۱) این اپالوجی فار محمد اینڈ قرآن
(۲) دنیا اور اسلام
(۳) برگزیدہ رسول کے نکاح

اردو - اورنگ آباد دکن

(۱) ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی
(۲) قدیم اردو
(۳) صبح بنارس (نظم)

مخزن - لاہور

(۱) کلام گرامی
(۲) نثر (مرثیہ)

ہمایوں - لاہور

(۱) فلسفی
(۲) قربانی (فسانہ)
(۳) معاشرتی تاریخ اور اہل ہا

نیرنگ خیال - لاہور

(۱) غنیمت
(۲) اختر و زہرہ (فسانہ)

کیف - اجمیر

(۱) معرفت کائنات
(۲) ہر دوار

مرقع - لکھنؤ

(۱) سانپ
(۲) ترانۂ بلبل (نظم)

نظرے خوش گذرے

جولائی نمبر میں تاریخ انگلستان کا تعارف کراتے ہوے وعدہ کیا گیا تھا کہ مصنف کی خود نوشت جو کتاب کے آخر میں ہے وہ انشاء اللہ الناظر کے ذریعہ شایع کی جائے گی ۔ اس ماہ سے اُسکی اشاعت شروع کردی گئی ہے ۔ ناظرین کرام ان اوراق کو رسالہ سے الگ کرکے رکھتے جائیں تاکہ آخر میں مکمل کتاب تیار ہو جائے ۔

یہ سال ہوا خواہان اُردو کے لیے نہایت درجہ صبر آزما ثابت ہوا ۔ مولانا شرر، حضرتِ شاد اور مضطر خیر آبادی جیسے محسنین اُردو کے انتقال سے جو صدمہ ونقصان پہونچا تھا اُس میں گذشتہ مہینے اور اضافہ ہوا یعنی شمس العلما مولانا نذیر احمد دہلوی کے نامور خلف و جانشین مولوی بشیر الدین احمد نے بعارضۂ فالج انتقال کیا ۔ مرحوم نے اپنے قیام حیدر آباد ہی کے زمانہ میں، جہاں وہ ڈپٹی کمشنری کے عہدہ پر فائز تھے تصنیف و تالیف کا شغل شروع کر دیا تھا ۔ اقبال دولھن، حسنِ معاشرت، تاریخ بیجاپور، حرز طفلاں، نشاطِ عمر، اور عصائے پیری وغیرہ اسی عہد میں شایع ہو کر حسن قبول اور خراجِ تحسین حاصل کر چکی تھیں ۔ پنشن لیکر اطمینان سے وطن میں رہنے کا موقع ملا تو نہ صرف اُنھوں نے اپنے والد ماجد مرحوم ومغفور کی تمام تصانیف کو نہایت خوش اسلوبی سے چھپوانے اور شایع کرنے کا اہتمام کیا بلکہ شمع ہدایت، لختِ جگر، تین بسیط جلدوں میں واقعاتِ تاریخ دہلی، دیوان وانشائے بشیر، فرامین شاہی، حکایاتِ لطیفہ ولطائفِ عجیبہ وغیرہ کے اضافہ سے زبان اُردو کو مالامال کیا ۔ اور یہ سلسلہ برابر جاری رہتا، اگر فالج نے گذشتہ سال سے بالکل ہی مجبور نہ بنا دیا ہوتا ۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائیں، اور اُنکے پسماندگان کو توفیق صبر ۔ اُمید ہے کہ مرحوم کے صاحبزادہ مسٹر محمد منظر بی لے ایل ایل بی اپنے اب وجد کی ادبی خدمات کے سلسلہ کو جاری رکھیں گے اور مرحوم کے اُن مسودات کی تکمیل و اشاعت میں ساعی رہیں گے جو فالج کی مہلک بیاری میں مبتلا ہونے کے باعث نامکمل رہ گئے ہوں ۔

ہندوستانی اکیڈمی سے براہِ راست ہمیں کوئی تعلق نہیں، اس لیے کہ وہ ایک خالص سرکاری محکمہ کی حیثیت رکھتا ہے جس سے مہاتما گاندھی کے متبعین کو کوئی سروکار نہیں ہو سکتا۔ تاہم اردو کے ایک ادنیٰ خادم ہونے کی حیثیت سے، ان اوراق پر ہم برابر اسکا تذکرہ کرتے رہے ہیں۔

خیال تھا اور حالات کا تقاضہ بھی یہ تھا کہ صوبہ کے جو مصنفین و اہلِ قلم ہندوستانی اکیڈمی کے رکن بنائے گئے ہیں اکیڈمی کے سارے کام انھیں کی رہنمائی اور مشورہ سے انجام پائیں گے لیکن اب تک جو کارروائی ہوئی ہے اُس سے اندیشہ ہوتا ہے کہ ان حضرات کی شرکت محض برائے نام رہیگی اور عملاً مجلس منتظمہ تمام امور میں مختارِ کل ہوگی۔ بے شبہ اُس مجلس میں بھی سید سجاد حیدر اور منشی دیانرائن نگم، ایڈیٹر زمانہ جیسے خادمانِ اردو موجود ہیں، لیکن ایسے زمانہ میں جبکہ اہلِ ملک حکومت کے ہر شعبہ کے نظم و نسق کو جمہوری اصولوں پر چلانے کے خواہاں ہیں، کسی محکمہ کے تمام امور کا انصرام ایک مختصر سی مجلس منتظمہ کو تفویض کر دینا کسی طرح برمحل نہیں ہو سکتا۔

مجلس منتظمہ، یقیناً اُن تمام انتظامات کی ذمہ دار رہے گی جو اکیڈمی کو حصول مقاصد کے لیے عمل میں لانا ہوں لیکن اکیڈمی کو ملک کے لیے پوری طرح مفید بنانا ہے تو مجلس منتظمہ کو طریقِ کار متعین کرنے سے قبل ضروری تجاویز کی منظوری اکیڈمی کے عام ارکین سے حاصل کرنا چاہیے۔ اس سے تو کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا کہ سال میں ایک دو دفعہ ان ارکین کو جمع کیا جائے اور جو کارروائیاں مجلس منتظمہ نے بغیر اُسکے مشورہ اور منظوری کے انجام دی ہوں اُنکی روداد پیش کر دی جائے۔

سال رواں کے متعلق جو طریقِ کار مجلس منتظمہ نے طے کیا اور جس طرح سرکاری امداد کو صرف کرنا تجویز کیا ہے، بہت ممکن ہے کہ عام ارکین بھی اُسی کی تائید کرتے اور منظوری دیتے، لیکن چونکہ اُن سے مشورہ نہیں کیا گیا اس لیے یہ امر یقینی ہے کہ اُسکے ثمرات و نتائج کی ذمہ داری اُن پر عائد نہیں ہو سکتی، اور احتمال ہے کہ جو لوگ اسکی شرکت کو اپنے لیے ذریعۂ عزت نہیں سمجھتے بلکہ خدمت کا ایک اچھا موقع خیال کر کے اس میں شریک ہوئے ہیں وہ اس طریقِ کار سے بددل ہوں اور اسے اپنی خودداری کے خلاف سمجھیں۔

ہمیں امید ہے کہ اکیڈمی کے محترم صدر اور مجلس منتظمہ کے دیگر ارکین اس مسئلہ پر پوری توجہ فرمائیں گے اور مطلق العنانی کے ساتھ کام کرنے کے غلط طریقہ کو رواج دینے سے پرہیز کرینگے۔ صوبوں اور حکومت ہند کے ارکین، یا یونیورسٹیوں، میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے ارکین جس طرح اپنے اپنے سالانہ بجٹ رائے عامہ کے نمائندوں کے روبرو پیش کرتے ہیں اسی طرح ہندوستانی اکیڈمی کو عام ارکین کے روبرو اپنی تمام تجاویز اور بجٹ پیش کر کے منظوری حاصل کرنا چاہیے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خاتمہ کتاب کا جس مین کچھ کوایف اور سوانح اپنے اس کتاب کے مؤلف نے لکھے ہین تاکہ اُس کے پڑھنے والے مفصل اُس کے نام ونشان سے آگاہ ہوجاوین اور چونکہ ہرقسم کی تصنیف اورتالیف باقیات سے زمان دراز تک ہے اگرچہ دائمی تھو مگرممکن ہے کہ انسان کی اپنی اوراس کی اولاد کی عمرسے اُس کی عمر بہت طویل ہو۔ اور آدمی جوجبلت سے حریص اپنی پایندگی کا ہے۔ اوراُس کو محال سمجھ کے اسی پر قانع ہوتا ہے کہ نام ہی پایندہ رہے۔ اس نظر سے یہ ضمیمہ ضرور معلوم ہوا۔ الغرض نام اس بے نام ونشان کا محمد مسیح الدین ہے اور پیدا ونشا اُس کا ایک قصبہ ہے جس کو کاکوری کہتے ہین وہ لکھنؤ سے پچھم طرف قریب پانچ کوس کے بادشاہی مکانات سے واقع ہے۔ زبانی بزبان مدت سے ہم سنتے چلے آئے ہین کہ ہم لوگ علوی ہین محمد ابن حنفیہ کی اولاد سے اور مادری نسب ہمارا عباسی ہے جس کی تشریح نسب نامون سے معلوم ہوگی جو آیندہ مذکور ہونگے۔ اب بیان پہلے ہم کو ضرور ہے کہ کچھ مختصر حالات اپنے اجداد کا جہان تک کہ ہم کو معلوم ہے وہ ہم لکھین۔ پس راقم محمد مسیح الدین ابن مولوی محمد علیم الدین خان بہادر ابن قاضی القضات

خاتمہ کتاب کا مؤلف کے حالات کے ذکر میں

مؤلف اس کتاب کا باپ کی طرف سے علوی اور ماں کی طرف سے عباسی ہے اور وہ ... کا ... ہے

مولوی نجم الدین علی خان بہادر ابن مولوی حمید الدین ابن مولوی غازی الدین ابن ملا محمد غوث مرحومین ہے لقب ہم لوگون کا ملکزادے مشہور ہے۔ ملک کا خطاب سلاطین دہلی۔ خلجی یا غلزئی کی طرف سے بڑے بڑے امرائون کو اُن کے عہد کے ہوا کرتا تھا۔ مگر یہ ہم کو نہین معلوم ہے کہ کس بزرگ کو ہمارے اجداد مین سے کس بادشاہ کی طرف سے یہ خطاب عطا ہوا تھا

ملا محمد غوث مغفور اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ کے عہد مین بہت رشد رکھتے تھے اور بڑے عالم باعمل تھے۔ اول اُن کو منصب وکالت مرزا کام بخش شہزادے کا مفوض ہوا اس واسطے کہ اُس عہد مین ظاہرا دستور تھا۔ سب شاہزادون کے سارے عقود بیع اور شرا وغیرہ شریعت کے طریقے پر ہوتے تھے تو شاید ایجاب و قبول کے واسطے کوئی وکیل مقرر ہوتا ہوگا۔ یا شاید اگر عدالت مین اُن پر کسی کچھ دعوے ہو یا اون کو کسی کے اوپر کچھ دعوے ہو تو انجام جوابدہی کا یا اثبات دعوے کا وکلا سے متعلق ہوگا۔ غرض تفصیل اس کی راقم کو نہین معلوم ہے کہ وکلا سے کیا کام متعلق تھا۔ صرف تعلق اس منصب کا پرانے کاغذات سے معلوم ہوا۔ اس عہدے سے ترقی ہوئی تب محتسب مستقر الخلافت بلدہ اکبراباد کے مقرر ہوے۔ خدمت احتساب کی غالب ہے کہ اکثر لوگون کو معلوم ہوگی کہ واسطے ممانعت جمیع منہیات شرعیہ کے اُس شہر مین جہان محتسب مقرر ہوا کرتا تھا۔ اُس عہدے سے پھر ترقی ہوئی تو صدر الصدور صوبۂ اکبراباد کے مقرر ہوے۔ یہ خدمت سلاطین تیموریہ کے عہد مین واسطے تحقیقات اور تجسس مدد معاش اور التمغا کے مقرر ہوتی تھی۔ کیا کیا کام اون سے اس باب مین متعلق تھا یہ ہم کو مفصل نہین معلوم ہے مگر ظاہرا یہ غرض ہوگی کہ اوس کے اسناد مین جعل اور تلبیس نہ واقع ہو اور دوامی مدد معاش وغیرہ ورثہ شرعیہ پر تقسیم ہو اون کے باہم نزاع نہ ہونے پاوے اور مادام الحیات اور مشروط خدمت مین کچھ فتور اور خیانت نہو۔ اوس عہدے سے بھی ترقی ہوئی تو صوبۂ اودھ کے جزیہ کی تحصیل کے واسطے مقرر ہوے۔ ان چارون مین سے ایک کسی خدمت مین

ملا محمد غوث [illegible] عہد [illegible] والا
در زمان سلطنت [illegible] عہد [illegible] مفصل [illegible]

دو صد و پنجاہی منصب تھا بعضے کاغذات سے یہ امر ثابت ہوا مگر یہ نہین معلوم ہوا
کہ یہ منصب پہلی خدمت کا تھا یا کسی بیچ والی خدمت کا یا اخیر خدمت کا اور آئین اکبری
سے معلوم ہوا کہ دو صد و پنجاہی منصب مین نو سو روپیہ درماہے کے حساب سے جاگیر
عطا ہوتی تھی بعد اکبر بادشاہ کے سب مناصب مین کچھ کچھ ترقی ہوئی۔ اس منصب
مین بھی کچھ ہوئی ہوگی۔ اور یہ بھی بالیقین نہین معلوم ہوا کہ ان چارون منصبون کے سوا
کوئی اور منصب نہین متعلق ہوا۔ اس واسطے کہ جب عالمگیر بادشاہ بارہ برس دکن کے
اطراف مین رہے تب جناب ممدوح بادشاہ کے ہمراہ تھے مگر کچھ معلوم نہین ہوا کہ اوس
عرصے مین کون خدمت متعلق تھی۔ اس واسطے کہ تین خدمتون مین تو اختصاص مکانات
اقامت کا معلوم ہوتا ہے۔ یا اکبر آباد یا الہ آباد یا اودھ تو بادشاہ کی ہمراہی مین یا مرزا
کام بخش کی وکالت ہوگی یا کوئی دوسرا عہدہ ہوگا مگر غالب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وفات
آپ کی صوبۂ اودھ کے جزیئے کی تحصیل کی خدمت مین ہوئی ہے اور یہ بھی حکایت زبان بزبان
بزرگون سے سنی ہے کہ عالمگیر بادشاہ کا ارادہ تھا حدیث کی کتابین آپ سے پڑھنے کا
اتفاق آپ کو [illegible] تک نہین کی تھی اس واسطے بادشاہ نے آپ کو
حکم دیا کہ لاہور مین جا کے ملا یعقوب بنانی سے جو بڑے محدث اوس عہد کے مشہور تھے
حدیث سند کر کے آیئے چنانچہ آپ وہان تشریف لے گئے اور حدیث سند کی لیکن کچھ ایسا
تفرقہ واقع ہوا کہ بادشاہ کو آپ سے سند کرنے کی نوبت نہ پہونچی جناب ممدوح نے ۲۶ صفر
سنہ ۱۱۱۱ھ مین باسٹھ برس کی عمر مین قضا کی ہے وہی زمانہ پس و پیش عالمگیر کے قضا کرنے کا بھی
تھا۔ شاید اسی سبب سے نوبت نہ آئی ہو۔ ہم نے اپنے بزرگون کے وصایا سے سنا ہے
کہ جو شخص عزم راسخ گناہون کے ترک کا صداقت سے بغیر مکر اور ریا کے کرے تو اللہ تعالی
اوس کو ایسی توفیق دیتا ہے کہ کسی گناہ کے ابتلا مین اوس کو مجبور نہین کرتا۔ اور اسی وصیت
پر نقل جناب غفران مآب ملا محب اللہ ... کے سننے مین آئی کہ آپ کو شریعت کے اوامر اور

ص۵ حاشیہ چھوٹ گیا۔ ۱۲

نواہی پر اتنی استقامت تھی کہ کوئی مندوب ترک نہین فرماتے تھے اور کوئی مکروہ عمل
مین نہین لاتے تھے ۔ اتفاقاً دکن کے سفر مین چونکہ جاگیر مواجب کی وطن مین تھی بسبب
بُعد کے اور اوس عہد کی راہون کے خراب ہونے کے سبب سے روپیہ وطن سے نہین
پہونچ سکتا تھا آپ سودی قرض لینے مین مجبور ہوے اس سبب سے آپ کو بہت ملال تھا
اس واسطے کہ جیسا سود لینا ہماری شریعت مین ممنوع ہے سود دینا بھی ممنوع ہے اگرچہ
نہایت ضرورت کے وقت متاخرین نے فتوا اوس کے جواز کا دیا ہے مگر ظاہراً آپ کے
نزدیک جایز نہ ہوگا ۔ اتفاقاً قبل اس کے کہ اوس مین مبتلا ہون آپ کے خیال مین آیا کہ
جیسے ہم وطن سے خرچ نہین منگوا سکتے جو لوگ ہمارے جوار کے رہنے والے لشکر مین نقدی
کے نوکر ہین وہ خرچ اپنے اہل وعیال کے واسطے بھیج نہین سکتے تو ایسے لوگون کی تلاش
کر کے اون سے آپ نے کہا کہ تم ہم کو روپیہ دو ۔ وطن مین بغیر کچھ صرف کے وہی روپیہ
تمھارے اہل وعیال کو ہم پہونچا دین گے ۔ اتنا روپیہ جمع ہو گیا کہ جاگیر کا روپیہ بشکل
کافی اوس بھیجے ادا کرنے کے واسطے ہوا اور آپ سودی قرض لینے سے محفوظ رہے ۔ ایک
حکایت جناب ممدوح کے الہ آباد کے ہنگام قیام کی ۔ ایک بزرگ نے ہمارے قصبہ کاکوری
کے باشندون کا ایک تذکرہ لکھا ہے اوس مین نقل کی ہے ۔ وہ لکھتے ہین کہ اوس عہد
مین جب آپ الہ آباد کے صدر الصدور تھے ۔ علی ابراہیم خان نام ایک ولایتی وہان کے
صوبہ دار تھے اون کا مذہب شیعہ تھا اور ظاہر متعصب بھی تھے مگر اوس عرصہ مین سب
امرا ایرانی اپنے مذہب کو چھپاتے تھے ۔ اتفاقاً عید کا دن تھا ایک رسالہ دار جس کا مذہب
اہل سنت وجماعت تھا وہ صوبہ دار کے نذر دینے کو جاتے تھے ۔ راستہ مین ایک اونھین
کے رسالہ کے سوار نے جس کا مذہب شیعہ تھا تنخواہ کے نہ پانے سے تنگ ہو کے اور
اون کی کمر مین ہاتھ ڈال کے اون کو روکا اور خلفاے ثلثہ رضوان اللہ علیہم سے تبری
مشروط کی یعنی کہنے لگا کہ اگر آج تم ہماری تنخواہ نہ دلوا دو تو تبرائی پر لعنت ہے ۔ رسالہ دار

صہ حاشیہ چھوٹ گیا ۔ ۱۲

بہرصورت اوس سے پیچھا چھوڑا کے ناظم تک پہونچا اور اُن سے اس حرکت کا اشغاثہ کیا ناظم نے جبرًا اور کرہًا صرف بادشاہ کے خوف سے اوس سوار کو گرفتار کرکے پابجولانہ مقید کیا لیکن اس فکر مین پڑا کہ کسی نہج سے اوس کی رہائی ہو اور بادشاہ کی طرف سے اون پر الزام نہ آوے۔ تمام شہر کے علما کو اور قاضی اور مفتی کو ناظم نے جمع کیا کہ اوس سوار کے مقدمہ مین تحقیق اور تجویز شرعی اون کے سامنے ہو۔ ملامان بنارسی ایک شخص بڑے فاضل متقی تھے۔ ظاہرا ناظم نے خلوت مین اون سے ایسا کیا تھا کہ کسی طرح سے اوس کی رہائی ہو۔ وہ ملامان ظاہرا ارباب دنیا سے تھے۔ الغرض ناظم نے اوس مجلس مین جناب غفران ملا محمد غوث کو بھی اصرار سے بلایا۔ اگرچہ آپ نے عذر بہت کیا کہ اس مجلس مین ایسے لوگون کی شرکت چاہیے جن کا عہدہ علم کا ہو میرا علم اتفاقی ہے۔ میرے عہدے مین علم کا ہونا ضرور نہین ہے مگر ناظم نے ہرگز عذر آپ کا قبول نہ کیا اور اصرار سے طلب کیا جب مجلس جمع ہوئی قاضی اور مفتی نے فتوے قتل کا اوس سوار کے واسطے لکھا۔ ملامان بنارسی نے یہ تقریر کی موجب قتل ایک مرد مسلمان کا یہ سبب اوس کی اوس دن کی تقریر کے ہے جو عید کے دن رسالہ دار سے اوس نے کی تھی کہ آپ لوگون کے نزدیک اوس نے سب خلفائے ثلثہ کیا لیکن وہ سب واقع نہین ہوئی کہ الفاظ سب کے قضیہ شرطیہ کے تالی مین ہین اور تالی کا وقوع بدون وجود مقدم کے نہین ہوتا اور اوس وقت مقدم کا وجود نہ تھا۔ اس صورت مین تالی کا حکم اوس وقت واقع نہین ہوا۔ اور اگر رسالہ دار اوس دن تنخواہ دیدیتا تو ہرگز واقع نہ ہوتا اس صورت مین وقوع سب کا جس کو موجب قتل کہتے ہو وہ اوس شخص کے فعل سے نہین واقع ہوا جس کو مجرم قرار دیتے ہو بلکہ وہ رسالہ دار کے فعل سے واقع ہوا۔ اس تقریر سے سب علما بند ہوگئے مگر جناب ملا محمد غوث مغفور نے فرمایا۔ حضرات جرم ٹھیرایا گیا ہے سب خلفا کا جو موجب قتل ہے۔ پہلے معنے سب کے لغت مین دیکھیے بعد اوس کے بنظر معنے کے تجویز فرمائیے کہ اوس کلام سے جو مجرم نے کہا سب واقع

ہوئی یا نہین۔ سب لوگ اس پر راضی ہوے۔ معتبر کتب لغت کے منگوائے اور سب کے معنے دیکھے گئے یہ نکلے اَلسَّبُّ مَا لَحِقَ بِهِ الْعَارُ یعنی سب نام ہے اوس کا کہ کسی کو ایسی بات کہی جس مین اوس کی سبکی ہو۔ اوس وقت جناب ممدوح نے ملا مان کی طرف متوجہ ہو کے کہا۔ اگر کوئی شخص کسی کو گالی معلق اور مشروط ایک امر محال پر کر کے دیوے مثلاً کہے کہ اگر آج نصف شب کو آفتاب نکلے تو تیری جورو فاحشہ ہے۔ تو یا وجود اسکے کہ وجود مقدم کا محال ہے البتہ وس شخص کی سبکی ہوئی۔ اسی طرح سے اگر خلفائے ثلثہ زندہ ہوتے تو عیاذاً باللہ لعن کے انتساب سے اون کی طرف اون کی سبکی ہوئی۔ اس نظر سے اوس شخص کی زبان سے سب واقع ہوئی۔ ملا مان بنارسی نے ظاہراً ایسا سمجھا تھا کہ ناظم نے جس طرح سے سفارش وس شخص کی رہائی کی اون سے کی اور وان سے بھی کی ہوگی۔ ۔ ۔ ناظم کی طرف متوجہ ہو کے کہنے لگے پھر ہم یہان کاہیکو آئے تھے۔ جناب ملا محمد غوث نے اس کے جواب مین مبادرت کی اور ایک ایہامی جواب دیا یعنی فرمایا بندہ فاعل مختار ہے۔ آپ خود جانتے ہون گے کہ آپ کس واسطے آئے تھے۔ غرض اس ... سے یہی کہ شیعہ کے عقیدے مین بندہ فاعل مختار ہے۔ حضرت مولانا نے اشارہ اس امر کی طرف کیا ... مقدمہ مین شیعہ کی اعانت کرنے سے معلوم ہوا کہ آپ شیعہ ہین۔ الغرض اوس وقت مجلس برخاست ہوئی اور تجویز اوس مقدمہ کی دوسرے دن پر رہی اور سوانح نگار نے ساری کیفیت اس مقدمہ کی مع روئداد سارے مباحثات کے جو اوس مجلس مین واقع ہوئے تھے بادشاہ کے حضور مین لکھ بھیجے۔ وہان سے حکم قتل کا اوس شخص کے واسطے صادر ہوا۔ اور یہ بھی سنا ہے کہ کسی کی ... تہدید یا تعزیر ناظم پر بھی بنظر مداہنت کے اجرائے حکم شریعت مین واقع ہوئی شاید معزولی یا تبدیلی ہوئی۔

چونکہ ہم لوگون مین تحریر کوائف اور سوانح گذشتہ خاندانی کی عادت بہت کم ہے اور حالات تفصیلی سے جیسے تاریخ ولادت وغیرہ حضرت ملا معظم کی ۔ ۔ معلوم نہین ہوئی اور

ـــه کچھ عبارت حاشیہ پر بڑھائی گئی تھی جو چھوٹ گئی ہے ۔ ۱۲

جو کچھ پچھلے کاغذات سے معلوم ہوتا وہ بسبب انقراض دہور کے باقی نہین رہے اور چونکہ دستور اوس عہد کا تھا کہ مال اموال مفسداروں کا جو قضا کر جائین سلطنت مین ضبط ہوجاتا تھا اور کچھ تھوڑا سا اہل وعیال کے کھانے کے واسطے مقرر ہوجایا کرتا تھا اوس کا بھی مفصل حال کچھ نہین معلوم ہوا۔ سب اعقاب کا بھی مفصل حال نہین معلوم ہوا۔ ہمارے اجداد

مولوی غازی الدین مغفور بن ... صاحب کا ذکر

مین آپ کے ایک بیٹے مولوی غازی الدین مغفور تھے۔ ظاہرا چھ سات برس کی عمر کے تھے جب آپ نے قضا کی عہ۔ اپنے سن شباب مین تعلیم اور تربیت پانے کے لیے دلی مین تشریف لے گئے تھے وہان کسی مدرسہ مین پڑھتے تھے کہ طلبہ مین آپس مین خانہ جنگی ہوئی۔ آپ رفع فساد کے واسطے بیچ مین پڑے اوس حالت مین قتل عمد یا قتل خطا سے شہید ہوگئے پچھلے کاغذات سے اون کی تاریخ ولادت اونیسوین رجب ۱۱۸۰ھ اور تاریخ وفات اٹھاروین ذیقعدہ ۱۲۰۳ھ معلوم ہوئی۔ اور وہ ایک بیٹے بحالت صغر السن مولوی حمید الدین مغفور کو

مولوی حمید الدین محمد ... صاحب کا ذکر

وطن مین چھوڑ گئے تھے کہ وہ بہت رشید ہوئے جو والد ہمارے جد کے تھے کو انف اور سوانح جناب ممدوح کے علم وعمل کے ہمارے جوار اور دیار مین ایسے مشہور ہین کہ حاجت اون کے لکھنے کی نہین ہے مگر مختصر کچھ ہم لکھتے ہین جس سے عظمت شان جناب ممدوح کی معلوم ہو اور اون کی رفعت مرتبے کے بیان کے واسطے صرف ذکر اس حکایت کا کافی ہے کہ جناب حضرت شاہ کاظم قدس سرہ جو ہمارے بزرگون مین مشائخ کبار سلسلۂ قلندریہ سے تھے اگرچہ عمر مین آپ سے کچھ چھوٹے تھے اور تلمذ بھی آپ سے اون کو تھا بسبب ریاضات شاقہ سے اور تصوف کے علم وعمل سے بہت بڑے رتبۂ عالی پر پہونچے تھے ایک دن حضرت شاہ کاظم ممدوح خواب مین یا اپنے اون اشغال معمولی مین مشرف صحبت بابرکت حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئے اوس حالت مین حضرت صلعم سے استفسار کیا کہ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيمٍ

عہ کچھ عبارت حاشیہ پر رہ گئی تھی جو چھپنے [illegible] صہ ۵ حاشیہ چھوٹ گیا ۱۲

جو قرآن شریف مین آپ کی شان مین نازل ہوا ہے۔ مین امیدوار کہ اوس کی مجھکو کچھ
تعلیم فرمائیے۔ اوس کے جواب مین آپ نے ارشاد فرمایا کہ مولوی حمید الدین سے پوچھو
یا فرمایا سیکھو۔ اوسی وقت حضرت شاہ صاحب ممدوح ہمارے جناب جدا علے کے پاس
تشریف لائے اور کہا کہ مین حضرت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مامور ہوا
ہون کہ علم اخلاق آپ سے سیکھون اس واسطے بموجب امر کے آپ نے ایک رسالہ مختصر
فارسی زبان مین تحریر فرمایا ہے۔ راقم کی نیت ہے کہ بغرض احراز سعادت اور برکت کے واسطے
اوس رسالہ کو تمام اپنی اس کتاب کا کرے۔ ایک حکایت نہایت تعجب اور حیرت افزا
آپ کے تقوے کی مشہور ہے کہ نواب آصف الدولہ نے سارے باغات آم کے تمام ممالک
محروسہ کے یا لکھنؤ کے متصل گرد و پیش کے سب ضبط کر لیے تھے اور سب آم سارے باغات
کے لوٹ کے سرکار مین چلے جاتے تھے مگر بازار دلی مین آم کچھ کچھ بکا بھی کرتے تھے۔ اور
ظاہر ہے کہ وہ سب آم یا چوری کے ہوتے تھے۔ یا اگر سرکار کے حکم سے بکتے ہون تو غیر کا مال
چھینا ہوا ظلم سے بکتا تھا۔ قریب آٹھ برس کے یہ ضبطی عام رہی۔ اس سارے ایام ضبطی
مین حضرت نے بالکل آم نہین کھائے۔ ایک روز آپ موضع دیکھیا اپنی زمینداری کے
گانون مین تشریف لیگئے تھے وہان کے کاشتکار نے آم کی چٹنی پسوا کے کھانے کے
وقت آپ کے دسترخوان پر رکھی۔ اور ہر چند اوس نے اصرار کیا کہ آپ ہی کے باغ کے آم
کی مین نے یہ چٹنی پیسی ہے آپ نے ہرگز وہ چٹنی بھی نہین کھائی۔ یہ حکایت بعینہ اوسی
طرح کی ہے جو حضرت ابی حنیفہؒ کی احتیاط کی مشہور ہے کہ کسی شخص کی بکری کھو گئی تھی
حضرت نے اس نظر سے کہ عمر طبعی بکری کی بارہ برس ہے۔ بارہ برس تک گوشت
بکری کا نہین کھایا۔ ایک حکایت آپ کے اخلاق اور مروت کی مشہور ہے کہ کسی سفر
مین ایک دن غلس کے وقت رستے مین ایک مقام پر آپ نماز پڑھ چکے تھے مگر جائے نماز
پر بیٹھے ہوے وظیفہ پڑھ رہے تھے ایک کوئی صاحب ارباب تعارف سے گھوڑے پر سوار

عــہ و صــہ حاشیہ چھوٹ گیا۔ ۱۲

اور ایک برچھا ہاتھ مین اون کے تھا کسی طرف سے آتے تھے آپ کو دیکھ کے گھوڑے کو روک لیا کچھ باتین کرنے لگے اور برچھا زمین مین گاڑ دیا۔ چونکہ اندھیرا تھا اتفاقاً وہ برچھا آپ کے ہاتھ کی اپشت پر گڑگیا۔ دو تین دقیقے جب تلک وہ صاحب کھڑے ہوے باتین کرتے رہے آپ نے اُف نہ کیا۔ صرف اس نظر سے کہ اُن کو ندامت ہوگی۔ جب وہ برچھا اوکھاڑ کے چلے گئے تب آپ نے زخم کو دھو کے باندھا۔

اور حکایتین آپ کے تقوے کی او اخلاق کی سیکڑون ہین۔ سب کے نقل کرنے سے کتاب بہت بڑھجائیگی۔ الغرض بعد وفات ملا محمد غوث مغفور آپ کے جد کے کچھ نقدی روزینہ بعض ضبطی جاگیرات وغیرہ کے غالباً دو روپیہ روزانہ اہل و عیال کی پرورش کے واسطے سلطنت سے مقرر ہوگئے تھے اوس کے عوض مین حضرت جد اعلے نے سند معافی موضع دگھیائی حاصل کی تھی او بتدریج اوس گاؤن کی زمینداری بھی مول لے لی تھی۔ جب اوس گاؤن کی معافی ضبطی عام مین شجاع الدولہ نے ضبط کرلی تب مدار معاش کی صرف اوس گاؤن کی زمینداری پر رہ گئی تھی۔ جس پر جناب ممدوح مغفور نے اپنے ایام حیات تک مع اعقاب کے اور چند طالب علمون کے بسر کی اور درس تدریس جاری رکھی۔ اگرچہ بنظر شدت تقوے کے اور اس نظر سے کہ شاعریت علما کے واسطے بڑا کمال نہین ہے اوس کی طرف بہت توجہ نہ تھی مگر طبیعت نہایت موزون تھی۔ کبھی کبھی کچھ ارشاد فرماتے تھے لیکن جیسا شعرا کا دستور ہے تخلص بھی اپنا نہین قرار دیا اور نہ اپنے کلام کو کبھی جمع کیا مگر قصاید کے معنے ایسے نازک اور دقت کے ساتھ بیان فرماتے تھے کہ دوسرا کوئی نہ کہہ سکیگا۔ اور یہ ہمیشہ ارشاد ہوتا تھا کہ اگر کوئی مثنوی غنیمت کی مجھ سے پڑھے تو کیسی ہی اوس کی طبیعت غیر موزون ہو نظم کرنا مین اوس کو سکھا دون غرضکہ باوصف آپ کے قلت شغل کے شاعریت کی طرف اور اپنا کلام جمع نہ فرمانے کے بھی کچھ تھوڑے بہت اشعار مشہور ہین صرف تبرکاً یہان ایک شعر جو احتضار کے وقت مین آپ کی زبان سے

ص حاشیہ چھوٹ گیا۔ ۱۲

نکلا ہے مین لکھا ہون ؎

از بہر قطع کردن نخل حیات من　　چون ارّہ دو دم نفس اندر کشاکش است

اور ایک دن آپ مظفر الدولہ بخشی الممالک ابو البرکات خان بہادر تہور جنگ عباسی جو آپ کی پھوپھی کے بیٹے تھے اون کی ملاقات کے واسطے تشریف لیگئے۔ شام کا وقت تھا کہ آفتاب کا قرص فاقد النور نظر پڑتا تھا بخشی صاحب نے کہا کہ ایک مصرع اس وقت موزون ہوگیا ہے دوسرا مصرعہ ہر چند مین فکر کرتا ہون اب تک خیال مین نہین آیا وہ مصرعہ یہ ہے مصرعہ می توان دیدن بوقت شام سوئے آفتاب ÷ آپ نے فے البدیہہ ارشاد کیا ؎ باخط شبرنگ دیدم روے او را بے حجاب ÷ می توان دیدن بوقت شام سوے آفتاب ÷ ولادت جناب جد اعلےٰ کی ساتوین رمضان سنہ ۱۱۳۲ھ تھی اور آپ نے غرّہ ذیقعدہ سنہ ۱۲۱۵ھ مین قضا کی۔ ۸۴ برس ایک مہینا پچیس دن کی عمر پائی۔ اور علوم کی تصانیف کی طرف کبھی آپ نے توجہ نہین فرمایا۔

ذکر مولانا و سیدنا قاضی القضات مولوی نجم الدین علی خان بہادر مغفور کا

اور آپ کے اعقاب مین تین صاحبزادے رہے سب سے بڑے ہمارے جدّ بزرگوار قاضی القضات مولوی محمد نجم الدین علی خان بہادر مغفور تھے۔ کمال علم اور فضل اور رساحت زیادہ آپ کے اگر مجموع نقل کیے جاوین تو ایک کتاب مبسوط ہو جائے کچھ تھوڑے سے اوس مین سے یہان ہم نقل کرتے ہین۔

پندرہ برس کی عمر مین حضرت جد امجد جمیع معقولات و منقولات سے فارغ التحصیل ہوے

پندرہ برس کی عمر مین جو درس معمولی معقولات اور منقولات کا ہمارے بلاد مین ہے اوس سے آپ فارغ ہو کے تدریس کی طرف مشغول ہوے اور وفور ذہن و ذکا سے ہر علم مین کمال حاصل کیا اور فیض عام آپ کی تعلیم کا تمام جوار و دیار مین دور دور تک جاری اور ساری ہوا اور بہت سے آپ کے شاگردون مین سے علمائے نامی ہوے۔ شوق تالیف و تصنیف بہت نہ تھا مگر معقولات کے کتب پر کچھ کچھ حواشی متفرق دیکھنے مین آئے ہین کوئی کتاب بالاستیعاب معقولات

مین نہین لکھی۔ مگر جنایات فقہ فارسی زبان مین سلطنت انگریزیہ کے حکم سے
ایک کتاب لکھی تھی جو سرکار کے حکم سے چھپی بھی تھی اور جب تک ہندوستان
مین اجراے حدود اور قصاص کا شریعت محمدیہ علی صاحبہا الصلوۃ والسلام
پر رہا مفتیان عدالت کے واسطے بہت بڑی ہدایت کی کتاب تھی۔ اور
ایک رسالہ بحث جبر یہ جبر اور مقابلے مین منظوم مع شرح کے نثر مین آپ نے
لکھا ہے، وہ بھی کلکتہ مین چھپا ہے۔ اور بہت عمدہ آپ کے تصنیفات مین
ایک کشکول ہے جو بنام بیاض رشک ریاض مشہور ہے۔ جمیع علوم مروجہ سے
کچھ کچھ اوس مین بحث ہے اور تقسیم اوس کی محافل پر ہے مثلاً محفل اول علم تفسیر
مین محفل دوم علم حدیث مین۔ علیٰ ہذا القیاس پندرہ یا اٹھارہ محفل اوس مین
ہین۔ اوس کو اور بڑھانا اور مرتب کرنا منظور تھا اس واسطے کہ وہ صرف
بطور کشکول کے مسودہ آپ کے ہاتھ کا ہے۔ مگر زمانے نے فرصت نہ دی اور
نہ ہم لوگون مین سے کسی کو اب تک توفیق ہوئی کہ اوس کو چھپوائین۔ جناب
ممدوح مغفور کو شوق شعر اور سخن کا بھی بہت تھا۔ بہت سے اشعار عربی اور فارسی اوسی
بیاض رشک ریاض مین مندرج ہین۔ کچھ کلام آپ کا اور کوائف کے ذکر کے بعد
منقول ہوگا۔ تاریخ آپ کی ولادت کی کسی نے لکھی تھی (نجم ثاقب است) جو پندرھوین
ربیع الاول ۱۱۷۵ھ مین واقع ہوئی۔ اسی تاریخ کی نظر سے ظاہراً آپ کا نام نامی
نجم الدین مقرر ہوا۔ اور آپ نے تخلص اپنا شاعریت مین ثاقب مقرر کیا۔ یا نام اور تخلص
کو جمع کر کے کسی نے شاعریت کی کہ تاریخ آپ کی ولادت کی اوس سے نکالی۔ اس کا
حال مفصل راقم پر نہین کھلا۔
ایک حکایت جناب ممدوح کی کچھ ترقی دنیاوی کی ذکر کے قابل ہے۔ نواب
شجاع الدولہ والی اودھ کو علم جفر کا بہت شوق تھا۔ ایک کتاب کوئی اس فن کی دانا کو

تصنیفات جناب ممدوح کے۔ جنایات فقہ فارسی اور رسالہ جبر و مقابلہ منظوم مع شرح اور بیاض رشک ریاض

[illegible]

ملی تھی کہ وہ بہت غلط تھی اوس کو وہ صحیح کرانا چاہتے تھے مگر یہ نہین روا رکھتے تھے کہ
کتاب باہر جائے جناب حضرت جد امجد مغفور کو فیض آباد مین اونھون نے طلب کیا
اور خاص دیوانخانے مین حکم اقامت کا دیا کہ وہین اون کے سامنے اوس کتاب کو صحیح
کرین اور ایک خوشنویس آپ کے ساتھ مامور ہوا کہ جس قدر آپ اوس کتاب کو صحیح کرتے تھے
وہ اوس کی نقل کرتا تھا۔ اور شجاع الدولہ کو اتنا اہتمام اوس کے اخفا مین تھا کہ وہان پہرا رہتا
تھا کہ کوئی ورق یا صفحہ اصل یا نقل دیوانخانے سے باہر نہ نکلے اور ہر روز تین چار مرتبہ
صبح سے شام تک خود دیوان خانے مین آ کے آپ کی پیٹھ کے پیچھے کھڑے ہوکے اور
دونون ہاتھ آپ کے شانون پر رکھ کے اور جھک کے کھڑے ہوتے تھے۔ اور جو آپ
لکھتے جاتے تھے اوس کو دیکھتے تھے۔ اور تعظیم کرنے سے منع کرتے تھے۔ اور ظاہرا آپ
اوس کتاب کو صحیح بھی کرتے تھے۔ اور کچھ اوس کے مضامین مجملہ کی شرح بھی کرتے تھے اور
اور جو اون کی سمجھ مین نہین آتا ہوگا اوس کو تحقیق بھی کرتے ہون گے۔ جب اوس کتاب
کی تصحیح اور شرح قریب تمامی کے پہونچی تب حضرت جد امجد نے یہ چاہا کہ اوس کے صلہ
مین درخواست معافی موضع دگھیا کی جو اون کے والد ماجد کی معافی مین تھا اور ضبطی عام
مین ضبط ہوگیا تھا پیش کرین۔ چنانچہ اس امر کا تذکرہ آپ نے صورت سنگھ سے جو
نواب شجاع الدولہ کے دیوان تھے اور اون کے مزاج مین محیط تھے کیا۔ اس واسطے کہ
وہی ظاہرا مقرب بھی آپ کے ہوئے تھے۔ صورت سنگھ نے اوس کے جواب مین کہا
کہ حضور آپ کی اس خدمت سے اتنے راضی اور خوش ہوئے ہین اگر آپ صلہ اس کا
حضور ہی کی رائے پر چھوڑ دیتے تو حضور کچھ بیش قرار موا جب آپ کے واسطے مقرر کرین گے
اور کوئی خدمت معقول آپ کو سپرد کرین گے۔ اور گاؤن کا معاف کرنا بسبب عہد مصمم
کے کہ ایک چپہ زمین کسی کو معاف نہ کرین گے بہت دشوار معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ ممکن ہے
بنظر نہایت خوشنودی کے آپ سے معاف کر دیوین چونکہ آپ کو کسی دنیوی خدمت کے

انجام سے حصول گاؤن کی معافی کا نہایت مرجح تھا تا کہ اپنے گھر مین بیٹھے ہوئے تدریس
کیا کرین۔ دیوان صورت سنگھ سے آپ نے اوسی کی سعی اور سفارش کے واسطے اصرار
کیا۔ اونھون نے کہا کہ یہ درخواست حضور نے قبول بھی کی تو اور صلے اور عطا سے
حرمان ہو جائیگا۔ خیر آپ درخواست لکھ کے مجھے دیجیے بعد اوس صلے کے عطا کے
جو حضور خود تجویز کرین کوئی محل دیکھ کے مین درخواست آپ کی پیش کرون گا۔ آپ
اپنے ہاتھ سے ہرگز درخواست نہ دیجیے گا۔ آپ نے وہ درخواست اوسی خوشنویس سے
لکھوائی جو آپ کے ساتھ مامور ہوا تھا۔ اور ایک قصیدہ نواب شجاع الدولہ کی مدح مین اور
ایک حسابی صنعت مین آپ نے تصنیف کیا تھا کہ نواب شجاع الدولہ کے نام کے عدد
جس نام کو عالم مین فرض کیجیے اوس کے عدد سے مساوی ہو جاتے ہین۔ یہ قصیدہ بھی
اوسی خوشنویس سے لکھوایا۔ ان دونون کو یعنی گاؤن کی معافی کی درخواست کو اور اوس
قصیدے کو عمداً آپ نے اوس کتاب کے ساتھ رکھدیا تھا کہ نواب جب وہان آتے
تھے اوس کتاب کو اوٹھا کے دیکھنے لگتے تھے تا کہ وہ دونون ازخود نواب کی نظر مین
گذر جائین یا آپ کے بلاخواہش صاف نویس نے اوس کتاب کے ساتھ رکھدیا تھا
سنا یہی ہے کہ آپ کے بغیر اطلاع کے صاف نویس نے اوس کتاب کے ساتھ رکھا تھا
مگر راقم کا گمان بعضے قراین سے یہ ہے کہ آپ ہی نے عمداً رکھ دیے تھے اس واسطے کہ آپ کو
حضوری دائمی جو درصورت کسی عہدہ کے مقرر ہونے کے ہوتی وہ پسند نہ تھی خانہ نشینی
مین معافی کو مرجح جانتے تھے اور یہ بھی خیال ہو گا کہ درصورت عطا اور صلے کے شاید یہ
درخواست نامنظور ہو جائے۔ اور صورت سنگھ کی راے معلوم ہو گئی تھی کہ وہ قبل اور صلے
کے ملنے کے وہ درخواست پیش نہ کرتے۔ اس واسطے آپ نے خود عمداً اوس کتاب کے
ساتھ وہ قصیدہ اور درخواست دونون کو رکھ دیا تھا۔ غرض نواب وہان آئے بیٹھ گئے
اور کتاب کو ہاتھ مین لیکے دستور کے موافق اوس کو دیکھنا شروع کیا دفعتہً وہ قصیدہ پہلے

ہاتھ مین آیا اوس کو خوب غور سے دیکھا بعد اوس کے خود آپ کی اعانت سے حضرت سید الانبیاء و سید الاولیاء و سبطین کرام صلوات اللہ علیہم اجمعین کے نامون کے عدد نکال کے اوس قاعدے کے بموجب عمل کیا تو اون کے نام کے عدد کے ساتھ برابر ہو گئے نہایت خوش ہوے اوسی خوشی کی حالت مین وہ درخواست ہاتھ مین آئی اوسکو پڑھا فوراً پڑھتے ہوے رنگ چہرے کا بدل گیا اور نہایت غیظ مین آکے تھوڑی دیر سکوت مین رہے۔ بعد اوس کے دوات اور قلم کو طلب کیا اور عرضداشت کی پیشانی پر دستخط کیے۔ عرضداشت بحضور اعلے و اقدس بدرخواست معافی موضع دگھیا بنام سائل ارسال کردہ شود۔ یہ دستخط کر کے کسی کو دیا کہ دفتر مین دیدو اور خود اوٹھ کھڑے ہوے۔ چونکہ اوس زمانے مین نواب شجاع الدولہ اپنے تئین وزیر اعظم بادشاہ کا سمجھتے تھے۔ رئیس مستقل اپنے تئین نہین سمجھتے تھے۔ اور اس جنس کے احکام بموجب فرامین شاہ عالم بادشاہ کے جاری ہوا کرتے تھے سو ہان ارسال ہوا۔ وہ گاؤن تو معاف ہوا اور دوسری ضبطی مین ظاہراً نواب سعادت علی خان کے شروع عہد کے پھر ضبط ہو گیا۔ اور جیا صورت سنگھ نے کہا تھا اور صلے سے محرومی رہی۔ مگر حضرت جد امجد مغفور نے شاکر اور قانع اوس معافی پر ہو کے وطن مین مراجعت کی اور ظاہراً غالباً اوس زمانے کے بعد یا شاید کچھ اوسکے قبل نواب الماس علی خان خواجہ سرا نے جو قریب ایک کرور روپیے کے ملک کا اودھ کی سرکار سے اجارہ دار تھا ایک گنج قریب قصبۂ آسیون کے جو قریب بارہ کوس کے پچھم طرف لکھنؤ سے ہے ڈالا تھا۔ اوس مین ایک مدرسہ بھی مقرر کیا تھا۔ اوس مدرسے مین جناب ممدوح کو مدرس اول مقرر کیا۔ اوسی قریب زمانے مین جو اواخر اٹھارھوین صدی عیسوی اور شروع تیرھوین صدی ہجری کے تھے کمپنی انگریزی کی سلطنت مین ایک منصب قاضی القضات کا بنگالے مین قرار پایا جس کی شرح کچھ باجمال تیسرے باب مین ہندوستان کے ذکر

نواب الماس علی خان نے میان گنج مین ایک مدرسہ مقرر کیا تھا اور اوسمین حضرت جد امجد مدرس اول مقرر ہوئے تھے

مین ہوئی ہے اوس منصب پر آپ کا تقرر ہوا۔ قریب پچیس برس کے جناب ممدوح نے اس عہدے کو انجام کیا اوس کے بعد مستعفی ہوے۔ اوس عہدے کو جس دیانت اور امانت سے آپ نے انجام دیا اوس کی شرح کے واسطے دو حکایتون کا ذکر کرنا کافی ہے۔ ایک حکایت یہ ہے کہ ابتدا مین تقرر جمیع قضات کا سارے ممالک محروسہ مین آپ ہی کو سرکار کی طرف سے مفوض ہوا چنانچہ کتنے آدمیون کو آپ نے اپنے عزیزون مین سے اور بعضے اپنے شاگردون کو جو جو لوگ جہان جہان کے رہنے والے تھے وہین کا قاضی اون کو مقرر کیا

تقرر حضرت صدر اکبر کا منصب قاضی القضا بنگالہ پر از نظام ممالک محروسہ کے قاضیون کا تقرر آپ کے اختیار مین تھا

اور جب ابتدا مین آپ مامور ہوئے تو بنگالے مین ایک صاحب بڑے نامور اور بہت دولتمند تھے جن کا نام منشی صدرالدین مشہور تھا وہ ایک روز آپ کی ملاقات کے واسطے آئے اور بموجب پچھلے دستور کے وہ سمجھے تھے کہ جو انتفاع قاضی القضاتی کا ہے وہ آپ بھی لین گے اس واسطے اونھون نے بعد ملاقات کے ایک کاغذ جو لکھ کے لائے تھے وہ آپ کو دیا اوس مین لکھا تھا کہ اگر تقرر قضات کا میری تجویز کے بموجب ہو تو ہزار روپیہ سال مین داخل کرونگا۔ شرح اوس کی یہ کہ چونکہ یہ عہدہ قاضی القضاتی کا اول ناظم بنگالے کے اختیار مین تھا۔ جب سرکار کمپنی نے ناظم کو بے دخل کرکے ملک مین اپنا تسلط کیا تو اوسی پچھلے دستور کے بموجب وہ عہدہ بھی قائم رکھا اور ایک وہی کام قاضی القضاتی کا جو مفصلات مین قاضیون کا مقرر کرنا تھا وہ بھی بدستور مفوض کیا تو پچھلے دستور کے بموجب جب سے سلطنت تیموریہ مین فتور آیا اور عالم مین بددیانتی شائع ہوئی تو قاضی القضات کو ان قاضیون کے مقرر کرنے مین بہت کچھ انتفاع ہوتا تھا وہ انتفاع اگرچہ شرعاً رشوت نہ تھی مگر امر محظور اور ممنوع البتہ تھا اور اب انگریزی قوانین کے بموجب اوس پر بھی اطلاق لفظ رشوت کی ہوئی جس کے واسطے اوس عہدے پر تقرر کے وقت حلف نامے پر مہر کروائی گئی تھی کہ کسی نہج کی رشوت ہم نہ لین گے آپ نے منشی صدرالدین سے کہا منشی صاحب

ص ۵ حاشیہ چھوٹ گیا ہے۔ ۱۲

آپ کو غلطی واقع ہوئی کہ آپ نے مجھکو مرتشی تصور کیا۔ اور وہ فرد بھیا
اور اون سے کہا کہ میرے تصور مین آپ نے مجھے گالی دی۔ لیکن چونکہ آپ
میرے مکان پر تشریف لائے ہین۔ اخلاق مقتضی نہین ہے کہ مین اس سے
کرون۔ بنظر پچھلے دستور کے آپ کو غلطی واقع ہوئی ہے کہ جب یہ عہدہ ناظر کے
تو لوگ اوس کو اجارہ لیا کرتے تھے۔

تمام ممالک محروسہ کے قضات کے تقرر کا جو حضرت جد امجد نے خود درخواست کرکے اپنا اختیار چھوڑ دیا

دوسری حکایت یہ ہے کہ بہت مدت تک تقرر قضات کا آپ
رہا اس عرصے مین ایک امر کروہ پیش آیا جو نہایت آپ کے خلاف
کسی شخص نے قاضی القضاتی کے کارگزارون مین ایک سند جعلی بد
اضلاع کے کسی جگہ کے قاضی کے تقرر کے واسطے جاری کردی۔ او
کس طرح سے مہر قاضی القضاتی کی اوس پر ثبت کی اور دستخط آپ کے
جب آپ کو اوس کی اطلاع ہوئی تو وہ سند طلب کر کے منسوخ کی لیکن
ایک درخواست لکھ کے صدر عدالت کے صاحب رجسٹر کے پاس
کے پاس گذران دیجیے۔ اوس درخواست مین لکھا۔ چونکہ ممالک سر
وسیع ہو گئے اون سب ممالک دور دراز مین اتنی دور بیٹھے ہوے کسی شخص
تحقیقات مین نہین کر سکتا۔ اور اگر امتحان کے واسطے یہان طلب کیجیے تو اوگوا
ہو گی اور بغیر امتحان کامل کے اس ذمہ واری عظیم کو مین نہین چاہتا کہ میرے
اس واسطے مین چاہتا ہون کہ تقرر قضات کا صاحبان جج اضلاع کو یا جسے
مناسب سمجھے اوس کو مفوض ہو کہ وہ مقرر کر کے درخواست یعنی رپوٹ کیا کر
اون کی رپوٹ کے مین سند لکھدیا کرون گا۔ صاحب رجسٹر اوس وقت سٹر
صاحب تھے اور آپ کے بہت دوست اور خیر طلب تھے وہ درخواست پڑ
نے کہا۔ قاضی صاحب آپ ناحق اپنا اختیار ہاتھ سے دینے مین یہ درخوا

مرزا رجب علی بیگ سرور مرحوم
- فسانۂ عجائب عہ
- انشائے سرور ۶
امیر مینائی مرحوم
- امیر اللغات نامکمل عہ
- صنم خانۂ عشق عا
- مرآۃ الغیب عہ
- محامد خاتم النبیینؐ ۸
- مینائے سخن عہ
- مکاتیب امیر مینائی عا
جلال مرحوم
- سرمایۂ زبان اردو عا
- مضمونہائے دلکش عہ
- نظم نگارین عہ
- رسالہ تذکیر و تانیث ۸
- افادۂ تاریخ ۸
- قواعد المنتخب ۴
مرزا محمد عباس ہوش مرحوم
- فسانۂ نادر جہان عہ
- پیاری سہیلی ۱۲
- دفتر سحر ۸
- الیمون ۱۲
منشی فضل حسین ثابت
- حیات دبیر للعہ
- دربار حسین ے

پنڈت رتن ناتھ سرشار
- فسانۂ آزاد ۴ جلد عہ
- سیر کہسار ے
- خدائی فوجدار عا
- جام سرشار عا
- الف لیلیٰ کبطرز ناول صہ
- کامنی عہ
- بچھڑی دلہن ۶
منشی سجاد حسین مرحوم
- احمق الذین ۸
- حاجی بغلول ۸
- پیاری دنیا ۸
- کایا پلٹ ۸
- میٹھی چھری ۶
- طرحدار لونڈی عہ
- طلسمی فانوس ۱۲
منشی جوالا پرشاد برق
- مرزالنی ۱۲
- مار آستین ۱۲
- بنگالی دلہن ۱۲
- معشوقۂ فرنگ ۱۲
- پرتاب ۸
- زہنی ۱۲
پریم چند
- پریم بتیسی للعہ
- بازار حسن عا

مولانا عبدالحلیم شرر
- حبید بغدادی عہ
- خواجہ معین الدین چشتی ۶
- تذکرہ مشاہیر عالم عا
- مخدرات عہ
- قیس و لبنیٰ عہ
- مقدس نازنین عہ
- ایام عرب عا
- فتح اندلس ۵
- ماہ ملک عا
- حسن کا ڈاکو عہ
- دربار حرام پور ۱۰
- الفانسو ۱۲
- مفتوح فاتح عہ
- فلپانا عہ
- زوال بغداد عہ
- لعبت چین عہ
- کینی کا پھل / جویائے حق عہ
- بابک خرمی عہ
- طاہرہ عہ
- شوقین ملکہ عہ
- یوسف و نجمہ عہ
- گزشتہ لکھنؤ عا
- شاعرانہ و عاشقانہ مضامین عہ
- آغاز و ختم سال عہ
- سیر رجال ے
- تاریخی و جغرافی مضامین عہ
- مینا بازار عا

حکیم محمد علیخان مرحوم
- رام پیاری کامل عہ
- عبرت کامل ے
- حسن سرور کامل للعہ
- اختر حسینیہ عا
- ڈیول دیوتی عہ
- جعفر و عباسہ ۱۲
شوق قدوائی مرحوم
- ترانۂ شوق عہ
- قاسم و زہرہ عہ
- نیرنگ جمال ۴
- گنجینہ ۱۲
- سیکفرن اور لوسی ۲
خواجہ عبدالرؤف عشرت
- زبان دانی ۶
- اصلاح زبان اردو ۶
- قواعد میر ۶
- اصول اردو ۶
- جان اردو ۶
- شاعری کی پہلی کتاب عہ
- ” دوسری کتاب عہ
- ” تیسری کتاب عا
- لغات اردو ے
منشی محمد حسن وحشی
- محبوب گذشت عہ
- جام زہر عہ

مولانا حکیم عبدالحی مرحوم
- یاد ایام عہ
- تذکرۂ گل رعنا عہ
حکیم احمد حسین الہ آبادی
- تاریخ ابن خلدون جلد اول عا
- ” ” دوم عا
- ” ” سوم عا
- ” ” چہارم عا
- ” ” پنجم ے
- ” ” ششم عا
- ” ” ہفتم ے
- ” ” ہشتم ے
- ” ” نہم عا
- ” ” دہم عا
- ” ” یازدہم عا
- سلطان صلاح الدین عہ
- نور الدین محمود عہ
مولوی محمد حلیم انصاری
- الاسلام و النصرانیہ ۱۲
- فتح اندلس عا
- ابو مسلم خراسانی عا
- تاریخ عرب صہ
مولوی حبیب الرحمن خان شروانی
- سیرۃ الصدیق عہ
- علمائے سلف عہ
- تذکرۃ الشعراء میر حسن عا

حافظ اسلم جیراجپوری
- سیرۃ الرسول عہ
- خلافت راشدہ عا
- خلافت بنو امیہ عا
- خلافت بنو عباس عا
- عباسیۂ بغداد عا
- علوم عرب عہ
قاضی محمد سلیمان منصورپوری
- رحمۃ للعالمین ے
- سفرنامۂ حجاز عا
مولوی خلیل الرحمن
- اخبار الاندلس جلد عہ
- تاریخ مولدین عا
- مختصر تاریخ اسلامی عا
- عذرا ۱۲
مولوی محمد انشاء اللہ
- سیرۃ الرسول ۱۰
- تاریخ آل عثمان للعہ
- حالات عراق عرب و ایران عا
- حالات قسطنطنیہ عہ
- تاریخ طرابلس و مغرب اقصیٰ عا
منشی سعید احمد مارہروی
- آثار اکبری ے
- حیات خسرو عہ
- امرائے ہنود عہ

گوتم بدھ - مہاتما بدھ کی مختصر سوانحعمری اور ان کی مذہبی تعلیم نہایت دلکش انداز میں لکھی گئی ہے۔ قیمت صرف ..

ملنے کا پتہ - الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

مولوی عزیز مرزا مرحوم
خیالات عزیز عمار
ذکر ماروی عہ
خواجہ عباد اللہ اختر
صدیق اکبر ۱۲ر
حضرت زید ۶ر
مشاہیر اسلام
بغداد عار
دمشق ۔ے
دیوان حافظ مع شرح عہ
مفتی انوار الحق ایم اے
تاریخ ابو البشر
تذکرۃ الحبیب عہ
حقایق اسلام عار
میر ولی اللہ بی اے
بندگی عمار
کاس الکرام ۔ے
لسان الغیب جلد اول
" دوم عار
" سوم
" چہارم
مسٹر ایس مسعود بی اے
نصاب اردو
جاپان کا تعلیمی نظم ۔ے
انتخاب زرین

مولانا حسرت موہانی
شرح دیوان غالب
کمل دیوان حسرت
سید سجاد حیدر بی اے
خیالستان
ثالث بالخیر ۸ر
زہرا ۱۲ر
جلال الدین خوارزم شاہ ۱۲ر
مسٹر ظفر عمر بی اے
حور ن کا کلب ۹ر
نیلی چھتری
بہرام کی گرفتاری عہ
مستقبل اسلام
پروفیسر فیروز الدین مراد
تحفہ سائنس ۔ے
بادل کے نیچے عہ
خونابہ عشق عہ
حکیم احمد شجاع بی اے
باپ کا گناہ عمار
حسن کی قیمت
منشی عبد المجید سالک بی اے
راہ و رسم منزلہا ۸ر
چھپا دو ادبی افسانے
چترا (ٹیگور) ۱۲ر

منشی احمد علی بی اے
تاریخ تمدن
شباب لکھنؤ
مولوی عبد الماجد بی اے
فلسفہ جذبات
مکالمات برکلے
پیام امن
تصوف اسلام عہ
فلسفیانہ مضامین
زود پشیمان ۸ر
منشی محمد لطیف بی اے
اکبر
اورنگ زیب
رنجیت سنگھ
لارڈ کلایو
پروفیسر نول ابی ایم اے
معارج الدین
تذکرۃ المصطفیٰ
صحف سماوی ۔ے
شمع سخن ۱۰ر
پروفیسر الیاس برنی ایم اے
جذبات فطرت چار حصہ للعہ
معارف ملت للعہ
مناظر قدرت للعہ
علم المعیشت

مولوی سید سلیمان ندوی
ارض القرآن للعہ
سیرۃ عایشہ
حیات امام مالک عہ
خلافت عثمانیہ اور اسلام
خلافت اور ہندوستان
مولوی عبد السلام ندوی
اسوہ صحابہ ۲ جلد ۔ے
سیرۃ عمر بن عبد العزیز
انقلاب الامم
تاریخ الحرمین الشریفین عار
نقرائے اسلام
نظرت نسوانی
شعر الہند ۲ جلد
مولوی عبد الباری ندوی
مبادی علم انسانی
برکلے کا فلسفہ
مولوی سعید انصاری
سیر الصحابہ جلد اول
سیر الانصار ۲ جلد ۔ے
سیر الصحابیات
مولوی عبد الرزاق ندوی
اسوہ حسنہ
کتاب الوسیلہ
ٹرکی اور یورپ ۹ر

خواجہ حسن نظامی
قرآن آسان قاعدہ عہ
میلاد نامہ عہ
محرم نامہ عہ
فاطمی دعوت اسلام ۔ے
ذکر غوث پاک ۱۲ر
کرشن جیون
شاہی جہاد
سیپارہ دل
کم ٹوموٹ
چٹکیاں اور گدگدیان ۱۲ر
اتالیق خطوط نویسی
روزنامچہ
بیوی کی تعلیم
بیوی کی تربیت عہ
اولاد کی شادی عہ
جگ بیتی کہانیاں ۱۰ر
آپ بیتی
چونی کہانیاں ۱۲ر
سیر دہلی ۱۲ر
سفرنامہ ممالک اسلامیہ
غدر دہلی کے افسانے
یزید نامہ
طمانچہ بر رخسار یزید عہ
اردو دعائیں ۸ر
تسکین احساس ۸ر
روزنامچہ ہند ۱۲ر
اسلام کا انجام ۶ر
تسخیر مہر و قہر ۱۰ر

مولوی عبد الرشید الخیری
الزہرا ۱۲ر
صبح زندگی
شام زندگی عہ
شب زندگی
نوحہ زندگی ۱۲ر
در شہوار ۱۰ر
منازل السائرہ
سراب مغرب ۸ر
بنت الوقت ۸ر
قطرات اشک
جوہر عصمت
عروس کربلا
یاسمین شام
تیغ کمال
ماہ عجم
محبوب خداوند
سودہ ۸ر
نیاز فتح پوری
گہوارہ تمدن
نگارستان
صحابیات
تاریخ الدولتین
یاس عظیم آبادی
چراغ سخن
نشتر یاس ۸ر

تاریخ اندلس یعنی مرہٹوں کے استقلال مسلمانوں کی شجاعت اور انگریزوں کی حکمت کا آئینہ از خافی خان، قیمت ۱۲ر

ملنے کا پتہ - الناظر بک ایجنسی - لکھنؤ

هو المستعان

رجسٹرڈ نمبر اے ۸۰۶

الناظر

ایڈیٹر — ظفر الملک علوی

الناظر پریس لکھنؤ میں باہتمام اسحاق علی علوی چھپا

قیمت سالانہ للعہ

قیمت فی پرچہ ۸ر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اُردو کی بہترین کتابیں

محصول معاف
عـ۵ کی روانگی پر آدھا
اور
عـ۱۰ کی روانگی پر پورا

ہدیہ تیہ لیجیے
عـ۵ کی روانگی پر الحاظ ایک
اور
تمام کی روانگی پر عـ۱۰ کی کتابیں

مرزا غالب مرحوم
- اردوے معلی
- عود ہندی
- دیوان غالب
- اکمل دیوان غالب

سرسید مرحوم
- خطبات احمدیہ
- اکمل مجموعہ لکچر
- اسباب بغاوت ہند
- سیرت فریدیہ
- خطوط سرسید

نواب محسن الملک مرحوم
- مضامین تہذیب الاخلاق
- اکمل مجموعہ لکچر
- تقلید و عمل بالحدیث
- کتاب المحبت و الشوق
- مکاتیب
- مسلمانوں کی تہذیب

خلیفہ محمد حسین مرحوم
- اعجاز التنزیل
- سفرنامہ ... جلد

مولانا آزاد مرحوم
- آب حیات
- دربار اکبری
- سخندان فارس
- نگارستان فارس
- نیرنگ خیال
- سیر ایران
- ڈرامہ اکبر
- مجموعہ مکتوبات آزاد
- مجموعہ نظم آزاد
- نصیحت کا کرنپھول
- جانورستان
- بیاض آزاد
- تذکرۂ علما
- لغت آزاد
- دیوان ذوق مرتبہ آزاد

پروفیسر شہباز مرحوم
- زندگانی بے نظیر
- خیالات شہباز

مولوی سید ممتاز علی
- تذکرۃ الانبیا
- شیخ حسن

مولانا نذیر احمد مرحوم
- حمائل شریف مترجم
- الحقوق و الفرائض
- بنات النعش
- مراۃ العروس
- توبۃ النصوح
- موعظۂ حسنہ
- رویائے صادقہ
- ایامیٰ
- فسانۂ مبتلا
- ابن الوقت
- مصائب غدر
- مجموعہ نظم بے نظیر
- اکمل مجموعہ لکچر ۲ جلد
- منتخب الحکایات
- چند پند
- مبادی الحکمۃ

مولانا شرر مرحوم
- حیات انیس
- الشیائی شاعری
- نورجہاں بیگم
- ٹیپو سلطان
- حیدر علی سلطان

مولانا حالی مرحوم
- یادگار غالب
- حیات سعدی
- مقدمہ شعر و شاعری
- حیات جاوید
- دیوان حالی
- مسدس حالی
- مجموعہ نظم حالی
- بیوہ کی مناجات
- شکوۂ ہند

مولوی بشیر الدین احمد
- واقعات دار الحکومت دہلی
- تاریخ بیجاپور
- حرز طفلان
- نشاط عمر
- عصاے پیری
- لخت جگر
- حسن معاشرت
- اصلاح معیشت
- اقبال دلہن
- شیخ ہدایت
- افسانۂ بشیر
- دیوان بشیر

مولانا شبلی مرحوم
- سیرۃ النبی جلد اول
- سیرۃ النبی جلد دوم
- سیرۃ النبی جلد سوم
- الفاروق
- سیرۃ النعمان
- الغزالی
- المامون
- سوانح مولانا روم
- سفرنامہ مصر و روم و شام
- علم الکلام
- الکلام
- رسائل شبلی
- مقالات شبلی
- شعر العجم جلد اول
- شعر العجم جلد دوم
- شعر العجم جلد سوم
- شعر العجم جلد چہارم
- شعر العجم جلد پنجم
- موازنۂ انیس و دبیر
- مضامین عالمگیر
- آغاز اسلام
- مجموعہ کلام شبلی اردو
- کلیات شبلی فارسی

مولانا ذکاء اللہ مرحوم
- تاریخ ہندوستان جلد
- تاریخ عہد سلطنت انگلشیہ
- کرزن نامہ
- آئین قیصری
- صحیفۂ فطرت
- تعلیم الانتظام
- محاربات عظیم
- جغرافیہ ریاضیہ
- جغرافیہ طبعی
- اہل عرب کا جبر و مقابلہ
- رسالہ علم مناسب
- معاون الحساب
- مساحت مادہ منتشر

سید محمود مرحوم
- کتاب الطلاق
- کتاب الشفعہ
- لکچر
- شرح قانون شہادت

مولوی عبد الحمید انصاری
- الذخیرۃ الاسلام
- تحریر المراۃ

بسمہ اللہ

فہرست مضامین بابت ماہ اکتوبر ۱۹۲۷ء

نمبر ۴ — جلد ۳۳

ظ

معذرت

بعض اسباب کی بنا پر تاخیر ہو جانے کے سبب سے یہ پرچہ صرف ۶۴ صفحہ پر شایع کیا جا رہا ہے۔ سفیر اودھ کے ۱۶ صفحے صرف اس بنا پر روک لینا پڑے کہ اگر باقی صفحات کا انتظار کیا جاتا تو یہ پرچہ وقت کے اندر شایع ہو سکتا۔ انشاء اللہ آیندہ پرچہ میں سفیر اودھ کے ۳۲ صفحے کا ضخیم جزو کر دیا جائے گا اور اس طرح موجودہ کمی کی تلافی ہو جائیگی۔

مظفر الملک

نئی کتابیں

خلفاے راشدین

یعنی سیر الصحابہ کے حصہ مہاجرین کی پہلی جلد جس میں خلافت راشدہ کے خصائص و حقائق، خلفاے اربعہ کے سوانح حیات، اُنکے سیاسی، انتظامی، مذہبی، اخلاقی، اور علمی کارناموں کی تفصیل اور اُنکے عہد کی ملکی فتوحات کا تذکرہ ہے۔ از مولوی حاجی معین الدین ندوی سابق رفیق دار المصنفین۔ حجم ۲۴ جزو۔ کاغذ ولایتی و طباعت اعلیٰ۔ قیمت عہ

کتاب الفلاحت (جلد اول)

علامہ ابو زکریا بن محمد اشبیلی رحمۃ اللہ علیہ کی قابل قدر کتاب کا ترجمہ۔ از مولوی سید محمد ہاشم ندوی جس میں فن باغبانی و کاشتکاری کے اصول و طرق بیان کیے گئے ہیں۔ اور جس کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ہمارے اسلاف نے اُن فنون میں کیا کمال بہم پہونچایا تھا جنھیں ہم آج تک اہل مغرب کی ملک واحد تصور کر رہے ہیں۔ حجم ۷۶۰ صفحے۔ قیمت ...

تذکرۂ مشاہیر کاکوری

جس طرح صوبجات متحدہ ہندوستان میں اسلامی تمدن کا مرکز سمجھا جاتا ہے اسی طرح یہاں کے قصبات درحقیقت اس صوبہ کی شائستگی و تہذیب کا اصلی منبع ہیں۔ انھیں قصبات میں نواح لکھنؤ کی چھوٹی سی بستی کاکوری ہے۔ جہاں کے ۲۵۰ ارباب فضل و کمال کا یہ تذکرہ ۵۰۰ صفحے پر تمام ہوا ہے۔ ان میں عالم و فاضل، فقیہ و محدث، مشائخ و درویش، امراء عمدہ داران حکومت، ادیب و شاعر ہر قسم کے لوگوں کا حال ہے۔ کتابت و طباعت اعلیٰ درجہ کی۔ قیمت عہ

ائمہ اسلام - شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے ایک رسالہ کا ترجمہ۔ جس میں اس امر پر بحث کی گئی ہے کہ شرعی معاملات میں علما و مجتہدین سے جو غلطیاں واقع ہوئی ہیں، وہ مواخذہ سے بری بلکہ موجب اجر ہیں۔ سید ریاست علی ندوی رفیق دار المصنفین نے نہایت خوبی سے ترجمہ کیا ہے۔ قیمت

نجد و حجاز - علامہ رشید رضا ایڈیٹر المنار مصر نے خاندان شریف اور سلطان نجد کے جنگ کے اسباب و علل اور دنیاے اسلام اور دنیاے اسلام کو اس بارے میں کیا روش رکھنا چاہیے، ان امور کے متعلق الاہرام اور المنار میں جو مضامین لکھے تھے یہ اُن کا ترجمہ ہے۔ قیمت عہ

ملنے کا پتہ :- الناظر بک ایجنسی۔ لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۴ جلد ۲۳ — اکتوبر ۱۹۲۷ء

چین میں آفت پر آفت

"آدم زاد" پھر بڑھتا ہے اور سلطنت جزائر جاپان کو مدافعت پر مجبور کرتا ہے"

رقم زدۂ ہنری کٹرج نارٹن ——— مترجمۂ محمد فخر الزماں

جب کبھی حدو د چین کے اندر کوئی فتنہ اُٹھ کھڑا ہوتا ہے تو سبب محرک معلوم کرنے کے لیے اکثر ملک کے گرد و نواح پر نظر کرنا کارآمد ثابت ہوتا ہے - اگر زیادہ نہیں تو کم سے کم گذشتہ تیس سال سے ہم مقام شورش پر کھڑے ہوکر روس اور جاپان کی ان متضاد مساعی کی طرف اشارہ کر سکتے ہیں جو منچوریا اور منگولیا کے شمال میں فوجی نقل و حرکت سے ظاہر ہوتی ہیں - چنانچہ اس نازک وقت میں بھی چین میں ابتدائی قوم پرستی کی اہمیت آنے والے حرفتی انقلاب، طلبا کی پُرجوش تحریک، یا تجارتی، مذہبی اور تمدنی شہنشاہیت کے خلاف جائز اظہار ناراضی کو بے قدر ٹھہرائے بغیر ہم کو اُسی شمالی سرزمین میں تجسس کرنے سے غور و فکر کے لیے بہت مسالا ملے گا -

روس و جاپان کی جنگ سے دونوں ممالک کی باہمی نزاع کا تصفیہ نہ ہوا - بلکہ یہ صرف پہلی شکست تھی جس نے روس کو مشرق کے گرم پانی کی طرف مسلسل پیشقدمی سے باز رکھا - بغیر کسی لڑائی اور بے فوج کشی کے دریاے آمور کے شمال اور وسودی کے مشرق میں کر دیا [illegible]

چین میں آفت پر آفت

منچوریا [illegible] پایا گیا۔ یہاں تک کہ ۱۹۰۴ء کے آغاز میں اس علاقہ پر [illegible] اجارہ
[illegible] سڑکوں پر جو منچولی سے ولاڈی ووسٹاک اور [illegible] سے پورٹ آرتھر
اور اس [illegible] جاتی ہیں پوری طرح قابض ہوگیا۔ آخرکار نوبت روس [illegible]
[illegible] (یعنی) [illegible] جو قتل انسانوں کے جاتا ہے) خوش خوش اپنے پیچھے گرم پانی
سے [illegible] نکلا۔

لیکن جاپان نے اس امر کو فراموش نہیں کر دیا تھا کہ یہ روس ہی تھا جس نے اسکو
[illegible] کے لاؤتنگ پر جس سے پورٹ آرتھر [illegible] تھا متصرف ہونے سے روکا تھا۔
[illegible] جاپانی [illegible] اس خطرہ سے بے خبر تھے جو ایشیائی ساحل پر اس ریچھ کی آمد سے
جاپان کی مستقبل عظمت کو لاحق ہوگیا تھا۔ اہل جاپان ان چالوں کو بغور دیکھ رہے تھے
جن سے روس منچوریا [illegible] روز افزوں اقامت کی مدت کو بڑھا رہا تھا۔ وہ اس کو شبہ کی
نظر سے دیکھتے تھے کہ چین نے روس کو جو قلیل عرصہ کے لیے قیام کی اجازت دیدی تو اب
باوجود چین کی طرف سے احتجاج بلند ہونے کے روس نے ایک غیر محدود مدت تک ٹھہرنے کا
ارادہ کر لیا ہے۔ جس وقت ریچھ کے پنجے کوریا میں دکھائی دینے لگے چین کے ساتھ جاپان
بھی صدائے احتجاج میں شامل ہوگیا۔ لیکن جاپان نے جب دیکھا کہ سینٹ پیٹرس برگ میں
اس احتجاج سے تجاہل عارفانہ برتا جاتا ہے تو اس نے بھی جان توڑ مقابلہ شروع کر دیا۔
اور انجام کار یہ ہوا کہ بحر الکاہل کی حکومت کا خواب روسی دماغ سے ایک مستقبل بعید کے لیے
نکل گیا۔ نہ صرف روس [illegible] سے جنوبی منچوریا سے نکال دیا گیا بلکہ جاپان نے اسکو جزیرہ نمائے
لاؤتنگ کی اجارہ داری اور ریلوے سے بھی محروم کر دیا۔

روزویلٹ نے صلح پورٹسماؤتھ کو محض التوائے جنگ سے تعبیر کیا۔ اور انکی پیشنگوئی
تھی کہ روس پھر آ موجود ہوگا۔ روس و جاپان کے درمیان امور متنازعہ کا طے ہونا تو درکنار
البتہ باہمی رقابت جو ایشیا میں غلبۂ تفوق کے لیے جد و جہد کا لازمی نتیجہ تھی اس جنگ سے واضح
ہوگئی۔ ادھر روس نے تہیہ کر لیا کہ وہ اپنی سلطنت بحیرۂ زرد کے ساحل تک بڑھا کر رہے گا۔
کیونکہ ایک کروڑ روسیوں کے لیے جو سائبیریا میں پہلے سے موجود تھے اور اور کئی لاکھ کے واسطے
جو اس رقبہ میں آباد ہونے والے تھے مشرقی سمندر تک آزاد اور مستقل سلسلۂ مذاکرات اقتصادی
[illegible]

اور اقتصادی عظمت کو معرض خطر میں ڈالا جاتا ہے اُسکے جہاز رستے قریب کے ساحلوں پر ہرگز نہ پہنچنے پائے۔ ایشیائی ساحل پر قابو اور اُس کے بندرگاہوں سے [illegible] آزاد تجارت کی سرداری جاپان کے لاکھوں آدمیوں کے لیے جن کی تنگ جزیروں میں گنجان آبادی تھی ویسی ہی ضروری تھی جیسے روسیوں کے لیے سمندر سے قربت۔

اس طرح نقشہ مکمل کھینچ لیا گیا اور انھیں لائنوں پر ٹوکیو اور سینٹ پیٹرس برگ کے درمیان بین الاقوامی بساط پر چالیں چلتے رہے۔ منچوریا میں ریلوے کی تکمیل کے بارے میں امریکہ کی سچی [illegible] تجویزوں پر اس امکان کا اظہار کردیا کہ مبادا دونوں اپنی مستحکم گرفت کھو بیٹھیں۔ [illegible] ۱۹۰۷ء میں دونوں ایک دوسرے سے بغلگیر ہونے پر مجبور ہو گئے۔ روس نے جنوبی منچوریا کو جاپانی حلقۂ اثر کی حیثیت سے تسلیم کر لیا۔ اور اسی طرح اپنے مفاد کو شمالی منچوریا میں تسلیم کرالینے کی [illegible] کی۔ اب زار کی دونوں نے [illegible] کی اُس جہاں گشت ریلوے اسکیم کی مخالفت [illegible] زمین کے اس خطے [illegible] متحدہ مقابلہ کے لیے آمادگی ظاہر کی [illegible] ۱۹۰۹ء [illegible] آف اسٹیٹ نے منچوریائی ریلوں کو بین الاقوامی بنانے کی تجویز پیش کی [illegible] اس سے بھی زیادہ گہرا استحکام ہو [illegible] ملوکیت پسند حکومتیں [illegible] تقسیم پر راضی ہو گئیں۔ لیکن دونوں سمجھتے تھے کہ اس قسم کی کوئی مفاہمت عارضی ہے [illegible] بیرونی مداخلت سے [illegible] حاصل کرنے کے بعد ہی ایک فیصلہ کن لڑائی [illegible] لڑنا پڑیگی۔ اس [illegible] روس اور اطراف میں بعد وجہ سے غافل نہ تھا۔ اگر اتفاق سے اُس کا منچوریا سے ہوکر پہنچنے والا راستہ منقطع ہو جائے تب بھی اُسکے حصول [illegible] کے لیے ایک دوسرا طریقہ موجود تھا۔ بیکال سے جو راستہ ارگا اور کالگن ہوتا ہوا ٹین تسن کے قریب سمندر کو جاتا ہے گو ایک ریگستانی سرزمین کو طے کرتا ہے تاہم منچوریا والے راستہ سے زیادہ قریب اور [illegible] کے اعتبار سے زیادہ قابل قدر ہوگا کیونکہ اس طرح سے خود پیکن روسی حلقہ میں آجائے گا۔ روس کی ریشہ دوانیوں سے متاثر ہو کر منگولیا کا جوش بڑھنے لگا۔ اہل منگول نے چین کے آخری فرماں روا خاندان مانچو کی اطاعت قبول کرلی تھی۔ لیکن انھوں نے کبھی اپنے کو چین کا ایک جزو نہیں خیال کیا اور ایک بڑی حد تک آزاد رہے۔ لہذا چینی [illegible] ان سرگرمیوں سے جو انقلاب سے قبل ظہور میں آئیں وہ لوگ ناراض تھے [illegible] مزید چینی افسران اور

مزید چینی باشندے گویا شاہان منگول کی خداوندی کے لیے تہدید تھے۔ لامحالہ روس کی
طرف متوجہ ہوئے کیونکہ وہی چین کی اس مداخلت بیجا کے خلاف انکی حمایت و معاونت
کرسکتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۱۱ء میں جب انقلاب نے شاہان مانچو کے دست و بازو کو مفلوج کردیا
تو روس نے فوراً منگولیا کی خود مختاری تسلیم کرلی۔ اور منگولی علاقہ میں اپنے مفاد کے حصول کے
لیے گفت و شنید شروع کردی یہ ۱۹۱۲ء میں پختہ ہوگئی اور سینٹ پیٹرس برگ کو منگولین
ریلوے کی تعمیر میں فیصلہ کن حق رائے دہندگی حاصل ہوگیا۔

لیکن جنگ عالمگیر روس پر پہلے ہی سے نازل تھی۔ اُدھر جاپان کے باخبر مدبر جنوبی
منچوریا میں اپنی فتوحات کی مضبوطی کرنے کے بعد اور آگے بڑھنے پر تلے ہوئے تھے ۱۹۱۵ء
میں اکیس مطالبات کے ذریعہ سے انھوں نے پورے منچوریا، مشرقی اندرونی منگولیا، شان
ٹنگ اور فیوکن پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ وہ لوگ جنگ یورپ میں روس کی حالت
کو توجہ سے دیکھ رہے تھے۔ اور جب ۱۹۱۶ء میں انھوں نے دیکھا کہ اب روس خوب اُلجھا ہوا
ہے تو موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے روس سے اُن تمام پیشقدمیوں کو جو ابتک عمل میں آئی
تھیں مستحسن قرار دینے کی درخواست کی۔ اور روس کو اس پر مجبور کیا کہ وہ جاپان کو چینی
مشرقی ریلوے کا وہ حصہ تفویض کردے جو جنوبی منچورین ریلوے کے جنکشن اور دریائے
سنگاری کے درمیان واقع ہے۔

اسکے بعد ہی انقلاب روس رونما ہوا۔ بالشویکی شورش کے بعد جو بدنظمی پیدا ہوئی
اُسکو جاپان نے اپنے خطوط پیش قدمی کی اور دور تک مغرب میں توسیع کا وسیلہ خیال
کیا۔ اپریل ۱۹۱۸ء میں نکولائسک جو دریائے آمور کے دہانے پر واقع ہے چھین گیا۔
اور بحری فوجیں روسی بندرگاہ ولاڈیواسٹاک میں اُتار دی گئیں۔ امریکہ نے اگست میں
متفقہ مداخلت میں شرکت کی دعوت دی جو بے شبہ ایک بڑے بھاری خطرے کی علامت
تھی۔ اس عہدنامہ کی آڑ میں کہ جاپان اور امریکہ ہر ایک کو سات ہزار اور دیگر دول کو
برائے نام فوجیں بھیجنا چاہیے جاپان نے ستر ہزار سے زیادہ آدمیوں کی فوج سائبیریا
میں لا ڈالی۔ اور اوباش روسی کرایہ کے ٹٹوؤں کی وساطت سے تمام مغربی علاقہ جھیل
بیکال تک قابض ہوگیا۔ اس عام پیشقدمی کے سلسلہ میں جاپان نے چینی مشرقی ریلوے
بھی ہڑپ کرنے کی متواتر کوشش کی۔ لیکن یانکی طریقت اکثریت سے بدگمان ہو رہے تھے

لہٰذا اس قسم کی حرکات کا سد باب کرنے کے لیے انھوں نے ایک بین الاتحادی ریلوے کمیٹی کا تقرر کر دیا جس میں فنِ جنگ کے اعتبار سے تمام بڑے بڑے عہدوں پر امریکن انجینیر مقرر ہو گئے۔

اس اثنا میں چینیوں کی حکومت منگولیا میں بحال ہو گئی تھی اور مشرقی ایشیا میں روسی اثر و اقتدار کا آفتاب جس کا زوال سنہ ۱۹۱۶ء سے شروع ہو گیا تھا سنہ ۱۹۲۰ء کے اوائل گرما میں غروب ہو گیا۔ پیکن میں یا کہیں اور روسی حکومت نہیں تسلیم کی جاتی تھی۔ اہل چین نے منگولیا سے روسی اثر معدوم کر دیا تھا، اور جاپان پورے منچوریا اور تمام مشرقی سائبیریا پر چھایا ہوا تھا۔ کچھ عرصہ کے لیے "آدم زاد" اپنے غار میں بھگا دیا گیا۔

ایک مرتبہ پھر واقعات نے پلٹا کھایا۔ اور طاقتور ریچھ مغرب اور جنوب میں اپنے چھیڑنے والوں سے پیچھا چھڑا کر مشرق کی طرف پھرا۔ سنہ ۱۹۲۰ء کے موسم بہار میں حلیف فوجیں ہٹا لی گئی تھیں۔ امیر البحر کولچک کی حکومت جس کا دارومدار بحیثیہ خارجی امداد پر رہتا تھا کچل ڈالی گئی۔ اور اُسکے قائد اعظم نشانۂ تفنگ بنائے گئے۔ روسی رسالداروں کے دستوں نے جاپانیوں کو اور اُنکے کوسک مؤیدین کو صوبجات ٹرانسبیکال اور آمور کے اُس پار نکال دیا۔ موسم سرما تک کل روسی علاقہ بجز اُس خطہ کے جو دریائے آمور اور سخالن کے دہانے پر ولاڈیواسٹک سے ملحق ہے ان لوگوں سے پاک ہو گیا۔ اس خطہ پر سوویٹ گورنمنٹ نے اپنا قبضہ نہیں جمایا تھا بلکہ جمہوریتِ مشرق بعید قائم ہو گئی تھی اور یہی عارضی طور پر اسکا انتظام کرتی تھی۔

اسی اثنا میں مزاحمتی فوجیں ایک کوسک ایڈر کی کمان میں دار السلطنت منگولیا سے چینیوں کو نکالنے اور وہاں روسی علاقہ کے خلاف اساس کار قائم کرنے میں کامیاب ہو گئی تھیں۔ سنہ ۱۹۲۱ء کے موسم گرما میں دریائے سلنیگا کے کنارے کنارے چل کر فوج نے جس حملے کا اقدام کیا تھا اُسکو روس اور جمہوریتِ مشرق بعید کے لشکر نے شکست دی۔ اِس فاتح لشکر نے بھاگتے ہوئے مزاحمین کا تعاقب کیا۔ کچھ کو قید اور بقیہ کو منتشر کرنے کے بعد انھوں نے ارگا میں تسلط قائم کر لیا۔

روس نے یہ فتح اپنے قوتِ بازو سے حاصل کرنے کے بعد حکمت عملی کی طرف رخ کیا۔ اُس وقت سے اُسکی رفتار دھیمی پڑ گئی تھی لیکن برابر جاری رہی۔ روسی مدبرین نے سوویٹ حکومت کے تسلیم کرانے کی آرزو میں چینی دار السلطنت کا ناطقہ بند کر دیا۔ پہلی چال یہ تھی کہ زار کی ملازمت سے جو حقوق وراثتاً انکو ملے تھے ان سے دست بردار ہو گئے۔ ماسکو نے پیکن سے کامل

چین میں آفت پر آفت

جو علاقہ زاران روس کے وقت میں دبا
ساویانہ سلوک منظور کیا اور ذیل کے شرائط پیش کیے (۱) جو علاقہ زاران روس کے وقت میں دبا لیا گیا تھا واپس کر دیا جائے گا (۲) چینی مشرقی ریلوے بلامعاوضہ چین کے حوالہ کر دی جائیگی۔
(۳) تاوان باکسر سے دست برداری لکھ دی جائے گی (۴) روسیوں کے لیے مزید ارضی مراعات منسوخ کر دی جائیں۔ (۵) اور جس قدر معاہدے عہد شاہنشاہی میں روس نے جاپان یا دوسرے
دول سے چین کے خلاف کیے تھے سب ناجائز قرار دیے جائیں گے۔
اب تھی واقعی معقول بات چیت جسکے سننے کے لیے لوگ تیار تھے۔ چین کو ابھی حال ہی میں دول مغربی اور جاپان کے متعلق جو تجربہ ہوا تھا اُس سے چین کو ان ممالک سے لگاؤ یا
اُنکے اغراض و مقاصد میں اعتماد ہونے کی اُمید نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس نے جرمنی کے خلاف
جنگ میں محض دول متحدہ امریکہ کی منت و سماجت پر حصہ لیا اور اس خیال سے بھی کہ صلح کانفرنس
پیرس میں دوسرے رفقا کے ساتھ اُسکی برابر کی حیثیت ہوگی۔ اور واپسی شانٹنگ کی طرف سے
اطمینان ہو جائے گا۔ مگر اسکے بجاے اُس نے کیا دیکھا کہ شانٹنگ میں وہ حقوق جو جرمنی کو حاصل
تھے جاپان کی طرف منتقل کر دیے گئے اور چینی جذبات ناراضی کو خس و خاشاک کی طرح بہا دیا
گیا۔ صرف یہی نہیں کہ چین کو معاہدہ صلح سے کوئی فائدہ نہیں ہوا بلکہ اُسکے قیتی دستور رہنے
اُسکو ان قیادت اور پیشوائی کی زنجیروں سے جنہیں تین چوتھائی صدی سے جکڑ رکھا تھا آزادی
دینا بھی گوارا نہ کیا۔ علاقہ جات اجارہ داری اداے تاوان، مزید ارضی وسعت، سفارتی ہمراہ
ڈ رکھانے اور تجارتی محصول سب جیسے کے تیسے رہے۔ ان سب باتوں سے چین تلخکام ہو رہا تھا
کہ اس موقع پر روس آپہونچا اور ان تمام حقوق سے دست برداری اور چین کے ساتھ ہمسرانہ سلوک
کے شرائط پیش کیے۔ لہذا اہل چین نے اگر روسی تجاویز کو توجہ سے سنا تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔
لیکن اس قسم کی پیش قدمی کا چاہے عوام الناس نے خیر مقدم کیا ہو، چینی عملہ ضرور خائف
تھا۔ چین کے لیے روسی دوستی ہمیشہ سے مہنگی ثابت ہوئی۔ چنانچہ جاپان کو جزیرہ نماے لاشتنگ
لینے سے باز رکھنے میں جو امداد روس نے دی تھی اُسکے بدلہ میں چین کو پورے منچوریا سے ہاتھ
دھو لینا پڑا تھا۔ روس کے اظہار رفاقت کے بعد ہی اخراجات کا بھاری بل بنا لازمی تھا۔
لہذا یہ امر بہتر معلوم ہوا کہ روس کی بظاہر فیاضانہ تجویز کو قبول کرنے سے پہلے اس کا اطمینان کر لیا
جائے کہ روس اسکے صلہ میں کس بات کی اُمید رکھتا ہے۔ ماسوا اسکے آیا ان پیش کردہ مراعات
کے حاصل کرنے کے لیے کوئی معاوضہ وغیرہ کی ضرورت ہے بھی ؟ کیا اسکی وجہ سے دوسری اقوام

سے معاملہ کرنے میں ایک بُری مثال قائم ہو جانے کا اندیشہ نہیں ہے؟ کیا چین ازروے حق ان تمام چیزوں کا مستحق نہیں ہے؟ یہ باتیں سوچ کر چینی عمال نے حسب دستور اپنی پرانی چال یعنی لیت و لعل سے کام لیا۔ سوویٹ حکومت کو تسلیم کرنے کی زحمت سے باز رکھا گیا اور روس کی پیش کردہ بخششیں ایک ایک کرکے بطور حقیت حاصل کر لی گئیں۔ ملکی مراعات بند کردیے گئے باکسر کے تاوان کا خاتمہ ہوگیا۔ روسیوں کے لیے مزید ارضی وسعت کی جگہ نہ رہ گئی۔ یہ سب جمہوریۂ ملیۂ اشتراکیۂ روس کو بے کسی قسم کے معاوضہ کے۔

اس طرح جہاں پکن میں سوویٹ ڈپلومیسی کو زیادہ کامیابی نہیں ہو رہی تھی وہاں ایک دوسرے اثر کی بدولت روسی مقاصد کو تقویت پہونچ رہی تھی۔ امریکی ذہنیت بالشویکی طرز حکومت کو نظر پسندیدگی نہیں دیکھتی تھی کیونکہ اُس کا خیال تھا کہ یہ محض انقلاب کا ایک عارضی منظر ہے۔ اور ایک دن دوسرا اور بالکل مختلف روس اُسکی جگہ لے لیگا۔ اس مبہم روس کے لیے جو آنے کو تھا، امریکہ ایک طرح امین ہوگئی۔ اس روس کے لیے اُس نے اپنی ڈپلومیسی کی قوت ایشیا میں شہنشاہیت جاپان کے خلاف صرف کی۔ واشنگٹن کانفرنس منعقد کی گئی اور سوویٹ کے مطالبۂ شرکت سے اغماض کیا گیا لیکن انجام اُنکے موافق ہوا اور اُنکو شکایت کا کوئی موقع نہیں ملا۔ اُنکے مفاد کی کافی طور سے حفاظت کردی گئی جس سے انھوں نے جلب منفعت کیا۔ روسی ایک سال کے اندر آمور کے دہانے پر ولاڈیواسٹک میں واپس آگئے اور جمہوریت مشرق بعید کا پورا علاقہ سوویٹ روس نے ضم کرلیا۔ بجز شمالی سخالین کے روسی زمین ایک انچ بھی جاپانی قبضہ میں نہیں رہ گئی

چین نے اپنے حقوق کا دوبارہ دعوے کرتے وقت ایک بات کرنے کی جرأت نہیں کی تھی۔ حتیٰ کہ اُن دول نے بھی جو واشنگٹن کانفرنس میں شریک تھے اِس معاملہ کو نہ چھیڑنا ہی مصلحت سمجھا۔ اور وہ تعرض تھا چینی مشرقی ریلوے کے بابت سے۔ اس میں دست اندازی کرنا گویا سوتی بھڑوں کو جگانا تھا اور آتش حسد و ہوس کی دبی ہوئی چنگاریوں کو مشتعل کرنا۔ جسکو کانفرنس ہمیشہ کے لیے بجھا دینا چاہتی تھی۔ لیکن روس حتیٰ کہ سوویٹ روس نے ایک لمحہ کے لیے بھی اس مسئلہ کو نظر سے اوجھل نہ ہونے دیا۔ اور نہ طاق نسیاں پر رکھنے دیا۔ اس کہنے سے کہ چین کو بغیر معاوضہ ریلوے حوالہ کردی جائے روس کا کیا مطلب تھا، اسکی تشریح واضح طور پر

[illegible]

ضروری ہونے کی حیثیت سے اس لائن میں روسی اہم مفاد کو نظرانداز کر دیا جائے۔ لہذا چین اس بارے میں عہد و پیمان لینے پر مُصر تھا۔ آخرکار چین کے عہدۂ وزارت خارجیہ پر ڈی کے ویلنگٹن آیا، جو صورتِ معاملہ کو روسی دوربین سے دیکھنے پر مائل کیا جا سکتا تھا۔ ۳۱ مئی ۱۹۲۴ء کو چین اور روس نے ایک بار پھر رشتۂ عہد و پیمان قائم کیا۔ چینی پندار و نخوت کے لیے روسی تملق آگ پر تیل کا کام کر گیا۔ اور اپنا ذاتی اثر و اقتدار بڑھانے کے لیے کراخان کو جو کسی دولت مغربی سے بھیجے گئے تھے بطور اپنے نمائندے کے سفیرِ اول بنا کر بھیجا۔ جبکہ دیگر دول کی نمائندگی وہ سفیر کرتے تھے جو وزیر مختار کے کمتر عہدے پر مامور تھے۔ اس سفیر نے جس معاہدے پر دستخط کیے اُسکی رو سے چین نے سوویٹ حکومت کو روسی حکومت تسلیم کر لیا۔ اور روس نے اُن تمام مراعات سے باضابطہ دست برداری لکھ دی جو چین نے اُس سے نکال لی تھیں۔ لیکن کل معاہدے کا دار و مدار چینی مشرقی ریلوے کے مسئلے پر تھا اور اس میں روس کو کامیابی نصیب ہوئی۔ اینٹی سوویٹ نگرانی کو جو انقلاب سے پہلے قائم تھی اب سائنو سوویٹ کی مشترکہ نگرانی کے لیے جگہ خالی کرنی پڑی۔ بورڈ آف کنٹرول پانچ چینی اور پانچ روسی ارکان پر مشتمل تھا۔ لیکن خاص سڑک کے انتظام میں اس شرط کے ذریعے سے روسیوں کو غلبہ حاصل ہو گیا تھا کہ منیجر اور منجملہ دو کے ایک اسسٹنٹ منیجر روسی ہونا چاہیے۔

بظاہر روس شاندار ترقی کر رہا تھا لیکن یہ گراں بہا شرائط نامہ افسرانِ متعینہ پیکن سے ہوا تھا۔ اور چینی مشرقی ریلوے منچوریا سے گذرتی ہے جہاں کا فرمانروا چانگسولن اُس وقت اور اب بھی پیکن سے کشیدہ خاطر تھا۔ اور مرکزی حکومت کی اطاعت اُسی حد تک کرنے کو تیار رہتا جہاں تک احکامِ بالا اُسکی ذاتی خواہشات سے متصادم نہیں ہوتے تھے۔ چانگ کے گہرے تعلقات اہل جاپان سے روز روشن کی طرح آشکارا ہیں۔ اُس کا یہ ارادہ ہرگز نہ تھا کہ وہ ریلوے لائن روس کے حوالے کر دے جو اُسکے اور جاپانی مفاد دونوں کے منافی ہے۔ اُس نے معاہدہ اور نفاذِ معاہدہ کے لیے نمایندگان روس و پیکن کی مساعی سے قطعاً اغماض کیا۔

تاہم روس جس موقع کی تلاش میں تھا وہ جلد اُسے مل گیا۔ اگست ۱۹۲۴ء میں چانگ اور پیکن کے درمیان کھلم کھلا جنگ چھڑ گئی۔ عوام کے دکھانے کے لیے سوویٹ عمال نے اغیار کو متنبہ کر دیا کہ وہ کہیں چین کی پُرآشوب فضا سے فائدہ اُٹھا کر اُسکو مزید دست درازیوں

کا حیلہ نہ قرار دیں۔ ادھر ماسکو میں فوجیں ترتیب دی جا رہی تھیں اور ادھر "چین سے الگ رہنا" کے مطالبات مشرق میں خوب مشتہر کیے جا رہے تھے۔ گو اُن سرخ افواج کی تہدید خیز موجودگی کو شہرت نہیں دی جاتی تھی جو چانگ کے عقب میں پڑی ہوئی تھیں۔ لیکن منچوری فرماں روا ان سے بےخبر نہ تھا اور انکی اہمیت خوب سمجھتا تھا۔ اُسکے لیے دو ہی راستے کھلے ہوئے تھے۔ یا تو ریلوے سے ہاتھ دھولے یا بالکل اپنا قلع قمع کرا دے۔ ایک ایسی خود منکی سے جو نہ چینی کہی جا سکتی ہے اور نہ باریک بینی سے منسوب کی جا سکتی ہے اُس نے کمزور پہلے کی بُرائی پسند کی۔ ستمبر میں ماسکو اور بحیثیت حاکم "خود مختار صوبجات شرقیہ" چانگسولن کے مابین ایک مصالحت نامہ کا اعلان کر دیا گیا جسکی رو سے آخر الذکر نے اپنی رضامندی اُس انتظام سے ظاہر کر دی جو پیکن سے بابت مشترکہ نگرانی چینی مشرقی ریلوے کیا گیا تھا۔

اس طرح اُس عظیم شریان ریلوے پر (جسے ریلوے کی جان کہنا زیبا ہے) جو مملکت روس کے وسیع اندرونی علاقے کو بندرگاہ ولاڈیواسٹک سے ملاتی ہے اور جنوب میں اس سے بھی زیادہ دور دراز بندرگاہوں سے ملانے کا امکان رکھتی ہے روس کو پھر قابو حاصل ہو گیا۔ جس سے بے شبہہ اُسکے کثیر اقتصادی اور عسکری منافع وابستہ ہیں۔ سفیر کراخاں نے ۱۵۔ اکتوبر کو کہا "چینی مشرقی ریلوے پر سوویٹ یونین کے استحقاق کی بحالی چین کی اقتصادی اور سیاسی شرکت کے لیے کشادہ راستہ کھول دیتی ہے فی الحال اُس اہم ترین پوزیشن کی وساطت سے جو سوویٹ یونین کو حاصل ہے اور جس سے اُسکے اعدا اسکو محروم کرنا چاہتے ہیں مشرق بعید میں دولت اشتراکیہ روس کے قدم مضبوطی سے جمتے جا رہے ہیں۔"

متذکرۂ بالا چینی شرقی معاملے کے متعلق روس کا طریق عمل بالآخر ہر اہل نظر پر اس حقیقت کو بے نقاب کر رہا ہے کہ مشرق بعید میں سوویٹ پالیسی کا ماحصل اپنے اصلی ارادوں میں قدیم شاہی پالیسی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ آلۂ کار مختلف ہیں۔ طرز بدلی ہوئی ہے۔ لیکن مقصد ایک ہی ہے۔ ہر نئی پالیسی فطری انوار ہے اُس طاقتور اقتصادی جذبے کا جو روس انبوہ کو کھلے ہوئے سمندر سے آزادانہ قربت حاصل کرنے پر اُبھارتا ہے۔ طرز حکومت محض ایک سطحی چیز معلوم ہونے لگتی ہے اور چاہے جو حکومت کسی خاص زمانے میں ہو اُسکے عقب میں سابق روس اپنی ہمسایہ سلطنتوں پر وہی تشدد کرتا ہوا اور آہستہ آہستہ

اُن حدود فاصل کو جو اُسکو باہر نکلنے سے باز رکھنے کے لیے قائم کیے گئے ہیں توڑتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اب سوویٹ پالیسی محض بالشویکی پروپگینڈے ہی کا اظہار نہیں معلوم ہوتی ہے بلکہ گہرے معنوں میں یہ روس کے قومی مطالبات کا انکشاف کرتی ہے۔ اگر اور کہیں نہیں تو کم سے کم مشرق بعید کی پالیسی میں سوویٹ عمال روسی مدبرین کے جلا وطن گروہ کا مشورہ ضرور لیتے ہیں جو خوشی سے نہیں دیا جاتا ہے۔ روس میں اب کوئی اور انقلاب یا تبدیلی نہیں ہونے والی ہے جس سے یہ امید کی جا سکے کہ حکومت برسر اقتدار مشرق بعید میں اس سے کم غاصبانہ رویہ اختیار کرے گی۔ مشرقی ایشیا میں خرس روس تجیرۂ زرد کی خوشگوار لہروں میں پھر اپنے پنجے ڈبوتے پر تلا ہوا ہے خواہ وہ ٹوپی جو وہ پہنے ہوے ہے زاری ہو یا بالشویکی، کیڈٹ کی ہو یا منشویک کی

لیکن روسی اپنا اصلی مقصد چھپانے میں ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ مدبرین ماسکو نے جن کی قابلیت کا یہ عالم ہے کہ بعض اوقات وہ اعلیٰ تربیت یافتہ اشخاص جو دوسرے دول کی پالیسی تراشتے ہیں اُس سے مرعوب ہوے بغیر نہیں رہ سکتے ایشیا میں جارحانہ کارروائیوں کا ایک ایسا طریقہ نکالا ہے جو تین پہلو لیے ہوے ہے۔ اول یہ کہ روس کسی ملک کی بظاہر بہت سی باتوں اور واقعتاً چند باتوں کو جائز قرار دیتا ہے تاکہ ملک متعلقہ کی "پامال رعایا" کے ساتھ بے پایاں اظہار ہمدردی کا وجود دکھانے کا موقع ملے۔ دوم یہ کہ دوسرے ممالک کے ساتھ کیے ہوے معاہدوں سے منحرف ہونے کے لیے اُس ملک کی کسی نہ کسی تحریک کی مادی اعانت کرتا ہے۔ اور اُن ممالک میں شہنشاہیت، عسکریت اور سرمایہ داری کے طومار باندھ دیتا ہے۔ اس طرح روس اپنی دوستی پر مائل کر لیتا ہے اور دوسرے ممالک کی طرف سے عداوت کا بیج بو دیتا ہے۔ اس خاطر خواہ موقع کی آڑ میں روس تیسری کارروائی کرتا ہے۔ یعنی حصول مقاصد ذاتی۔ پہلی دو کارروائیوں پر اس قدر شد و مد کے ساتھ زور دیا جاتا ہے کہ تیسری بکمال خوبی پوشیدہ رہتی ہے۔ اور روس دیگر دول کو بے بس کر دینے اور بعض اہم امور کے تسلیم کرا لینے میں بڑی حد تک کامیاب ہوا ہے۔

ان سب باتوں کی تصریح چین کے معاملے میں بہت مؤثر طریقے سے ہوتی ہے۔ چین کی محبت، چینی مزدوروں سے محبت، انصاف سے محبت، الغرض بجز زمین، ریلوے جات اور بندرگاہوں کے ہر چیز سے محبت کے پُر جوش دعووں کی بوچھار ساری دُنیا پر کی جاتی ہے۔

ماسکو چین کے انقلاب حریت کو اسی عاشق مزاجی پر محمول کرتا ہے۔ دوسری قسم کے پروپگنڈے سے انکار کی صدائیں مختلف روسی مصدر مقامات سے بڑی ہم آہنگی کے ساتھ آرہی ہیں پیغمبر کرڈاخاں کہتا ہے " اگرچہ یہ امر بالکل فطری ہے کہ اس مسئلہ کو کہ چین کی قومی انقلابی تحریک میں سوویٹ یونین کا ہاتھ ہے بہت وقعت دینی چاہیے تاہم یہ اثر سوویٹ پروپگنڈے کا نتیجہ نہیں ہے جیسا کہ عموماً غلطی سے لوگ کہتے ہیں۔ بلکہ اس کا باعث اس سے کہیں زیادہ مؤثر اور وقتی امر واقعہ ہے یعنی سوویٹ کی منصفانہ پالیسی زبانی اور عملی دونوں حیثیتوں سے جسکو اس نے سوویٹ چینی عہدنامے اور چین سے متعلق اپنی تمام کارروائیوں میں ملحوظ رکھا ہے۔"

غالباً یہ امر پوشیدہ نہ ہوگا کہ سفیر موصوف نے سوویٹ پروپگنڈا کے متعلق جو کچھ بیان کیا ہے اس سے لوگوں کو اختلاف ہوگا۔ کینٹن کا بالشویت پسندی کی جانب رجحان عالم آشکارا ہے اور کینٹن میں چینی کسانوں کی کانگریس کے قیام پر ازوستیا نامی ایک جریدہ صدائے اہلاً وسہلاً ومرحبا بلند کرتا ہے۔ اس کانگریس کے اراکین نے جو اشتہارات ملک بھر میں تقسیم کیے ہیں وہ دنیا میں ماسکو کی دست اندازی کی تشہیر آبادی زبانیں کرتے ہیں:-

" آؤ کسانو! بین الاقوامی سوویٹ کے جھنڈے کے نیچے اپنی تنظیم کرو۔ سب کے سب ہتھیار بند ہو جاؤ۔ اپنی حفاظت کے لیے گاؤں گاؤں کمیٹیاں بناؤ۔ مزدوروں اور کاشتکاروں کے اتحاد پر خوشیاں مناؤ۔ کیونکہ اس سے چین کی آزادی وابستہ ہے۔ کسانو! کچھ کارنامے دکھاؤ! اپنی اشتراکی جماعتیں بناؤ! ملوکیت پسند مشنریوں اور انکے گرجاؤں سے دور دور! ہماری زمین لینے سے پرہیز کرو! چینی کسانو متحد ہو جاؤ۔"

خیال کرو۔ چینی کسانوں کی ایک ٹولی اپنے بھائی بندوں کو یہ حریت پسند ترانے رزمیہ انداز میں سناتے ہوں۔ اس سماں کی تصویر کھینچنے کے لیے کس قدر تیز تخیل سے کام لینا پڑے گا۔

ایک دوسرا واقعہ چینی معاملات سے الگ تھلگ رہنے میں ماسکو کی مسکینی اور اتقا کو واضح کرتا ہے۔ ٹریڈ یونین کی بین الاقوامی کمیٹی ماسکو سے اسٹرائک کمیٹی شنگھائی کو ہزار روبل (سکۂ روسی) بھیجے جانے کی اطلاع دیتی ہے۔ اسٹرائک کمیٹی اس امدادی رقم کی رسید کا بایں الفاظ اقرار کرتی ہے " دنیا کے آزاد ترین مزدوروں کو ہم تہ دل سے مبارکباد دیتے ہیں! چین کے مظلوم مزدور پیشہ طبقہ کا وعدہ ہے کہ وہ آخر دم تک لڑیں گے "

چین کے حالات نے روسی پروپگنڈے کی نشر و اشاعت میں حیرت انگیز سہولیت بہم پہونچائی ہے۔ حکومت یکے بعد دیگرے ایسے جنگجو لوگوں کے ہاتھ میں رہی جن کا واحد مقصد پیکن پر قابو حاصل کرنے میں استعمال طاقت اور حصول دولت (جس پر قبضہ کے ساتھ ہی دسترس ہوجاتا ہے) ہوتا ہے۔ اس قسم کے وسائل جو جمہوریت کی "مایۂ ناز" حکومت کی سطح پر نمایاں ہیں اغیار و اجانب کو غیر محتاط سازشوں اور ناقابل محسوس دست درازیوں کی مستقل دعوت دیتے ہیں۔

اسی اثنا میں واقعات کے تسلسل نے عوام کی ذہنیت کو اس مقام پر پہونچا دیا ہے جہاں وہ اندیشے سے ایک خاص طور پر متاثر ہوتی ہے۔ سالہا سال کی کارروائی نے جن کے دوران میں دول خارجہ نے چین کے حقوق سے اغماض کیا اور اپنی مرضی کا نفاذ بزور شمشیر کیا بالآخر اپنا ناگزیر ثمرہ دکھا دیا ہے۔ چینی رعایا میں اہل علم و اہل فہم جنھوں نے اپنی اپنی سیاسی اور اقتصادی زندگی کو ہر بار بیرونی مداخلت کا شکار ہوتے دیکھا بالآخر ایک پرجوش قومی تحریک کی صورت میں اپنے دلی جذبات کا اظہار کر رہے ہیں۔

مطالبۂ آزادی پر تو وہ صدر درجہ مصر ہیں۔ لیکن کوئی اس گتھی کو نہیں سلجھا سکا کہ کیا کرنا چاہیے اور کس طرح کرنا چاہیے۔ صرف ایک امر کا انکو کامل یقین ہے یعنی یہ "دول" ہیں جو چین کی تمام مصیبتوں کا باعث ہیں۔ لہذا دول پر قطعی حملہ ہونا چاہیے۔

دوران جنگ میں اور اسکے بعد جاپانی عسکریت پسندوں سے جو ساعی تھے اپنی ارضی مقبوضات کی توسیع کے لیے چینی اور روسی مفاد کے منافی ظہور میں آئیں اس نے جاپان کی اس دست درازی کو ایک صریح اور آسان نشانے حملہ قرار دیدیا۔ باوجود اس تغیر کے جو حال میں جاپان کی پالیسی میں ہو گیا ہے اور جس کی رو سے وہ چین سے دوستی پیدا کرنے اور اسکی رضا جوئی کرنے کا واقعی متمنی ہے۔ جنوب میں جہاں قبضۂ ہانگ کانگ و کولون کی یاد و نیز حال کے قضیوں کے باعث برطانیہ عظمیٰ بھی جاپان سے کم سفاک دراز دست نہیں سمجھی جاتی ہے حملے کا رخ آسانی کے ساتھ استعماریوں کے خلاف پھر گیا۔ علاوہ ان سیاسی چیرہ دستیوں کے جاپانی اور انگریزی سرمایہ دار چین کے مختلف حصوں خصوصاً شنگھائی میں فیکٹریاں چلا رہے ہیں جہاں مزدوری پیشہ طبقے کی حالت سے ماہر شورش پسندوں کو حسب دلخواہ رنگ آمیزی کا مسالا ملتا ہے۔ گو ان کی حالت ملک کے عام معیار سے شاید

اور بے شبہ ولیسی کارخانوں سے کسی طرح بدتر نہ ہوگی۔

پورا بالشویکی نقشۂ عمل جاپان اور اُس کی ہمدم دیرینہ (اور غالباً آئندہ ہمدم ہونیوالی) برطانیہ عظمی پر اسی حملے کے مطابق اور موافق کیا جا سکتا تھا اور کیا گیا۔ فوجی دست درازی اور سرمایہ دارانہ جلب منفعت جو چین میں نہایت قبیح صورت میں پائے گئے ہیں نقشۂ عمل نے ان دونوں کے استیصال کامل کا مطالبہ باواز بلند کیا۔ اس میں مظلوم اقوام کی حریت اور مظلوم بنا عتوں کی آزادی پر بہت زور و شور کے الفاظ میں اصرار تھا۔ چین کے جو تعلقات "دوَل" سے تھے، اُن پر اثر ڈالنے کے لیے یہ مطالبہ بھی بہ خصوصیت موزوں تھا۔ اسکی تصریح کہیں نہ کی گئی کہ سوویٹ عمل اور بالشویک قول میں ذرہ برابر بھی مناسبت نہیں پائی جاتی۔ اور اگر کسی نے ادھر توجہ سے اس تناقص اور عدم مطابقت پر توجہ منعطف کرانا چاہی تو اُنکے احتجاجی نوٹ یا تو ناقابل یقین کہکر خارج کردیے گئے یا چرب زبانی سے اُس بین الاقوامی منصفانہ پالیسی کے حوالے دے کر جو نئے روس کی خاصیت بتائی جاتی ہے پس پشت ڈال دیے گئے۔

صورت معاملات مخصوص طور پر حسب منشا ہو جانے کے باعث روسی کارروائیاں چین کی بہت سی تحریکوں میں روح پھونکنے اور اُنکو تقویت پہونچانے کے قابل ہوگئی ہیں۔ یہ تحریکیں باوجود قابل وقعت اور عظیم الشان ہونے کے ایک طویل میعاد لڑائی جاری رکھنے کے لیے از خود مشکل سے کام کر سکتی تھیں۔ چین میں تمام آفت کا الزام بالشویکی یا بعد میں کمیونسٹ کارروائیوں کے سر تھوپنا بھی غلطی ہے کیونکہ اس سے کہیں زیادہ پیچیدگی ہے ملوکیت اغیار کے خلاف جذبۂ نارضی شامل ہے جو برسوں سے اُبھرتے اُبھرتے اب ایسے درجے پر پہونچ چکا ہے جہاں سے زبردست خطرہ لاحق ہوگیا ہے۔ بالشویکی کارروائی صرف ترغیب دہی اور ہمت افزائی تک محدود رہی ہے جس نے اس جسم لحیم میں جان ڈال دی اور اُسکو متحرک کردیا۔ بمشکل سے یقین آتا ہے کہ روسی چین کی ناموافق زمین میں کمیونزم کو سرسبز دیکھنے کی بڑی امیدیں رکھتے ہوں۔ لیکن قوم پرستی کا آلہ اُنکے ہاتھ لگ گیا ہے جسکو وہ ویسی ہی مستعدی سے استعمال کرتے ہیں جیسے کمیونزم۔ لہذا وہ (بالتخصیص چینی) قوم پرستی کی پرورش کی جانب اپنی تمام کوششوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔

سوویٹ طرز کی آڑ میں عہد زار کی پرانی اسکیم پر عمل کرنے کا نہایت عمدہ موقع ملتا ہے ... دو خاص روسی اسکیم یعنی سازبازہ اور ریشہ دوانیاں جو ابواب مشرق کو دیکھ کی پیشقدمی کیلیے

کھول دینے کی غرض سے کی جاتی ہیں۔

روس کا جو طرز عمل چین کے ساتھ رہا ہے اُسکے ممنون منت ہونے کا اعتراف اہل چین کرتے ہیں۔ بادی النظر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ روس کے دعاوی محبت و خوش معاملگی کو محض اُنکی ظاہری صورت پر قبول کر لیتے ہیں۔ وہ اسی خیال میں مگن ہیں کہ روس نے تمام مراعات، تاوان باکسر، مزید اراضی، وسعت وغیرہ سب سے دست برداری لکھ دی ہے۔ گویا روس نے سچے دل سے اور نادم ہوکر ان چیزوں کو چھوڑ دیا ہے۔ لیکن ہم میں سے جو لوگ چین میں اُسوقت موجود تھے اُنکو یاد ہوگا کہ چین نے جب انھیں روسی حقوق کو بغیر اس امر پہ استفسار کیے ہوئے منسوخ کر دیا تو روس اور جاپان نے کس قدر زور و شور سے سر لے احتجاج بلند کی تھی۔ مشکل سے اس کا یقین آتا ہے کہ چینیوں کی سی ناہموار سلطنت، ورنہ دوراندیش قوم نے روس کی تجویز دوستی بے تامل منظور کر لی۔ یقیناً چین کے معمر اور کارآزمودہ افراد نے روسی چالوں کو اُنہیں کے زاویۂ نظر سے دیکھا ہے۔ وہ وطن پرست نوجوان طلبا کی جماعت جو اجتماعی حیثیت سے "ینگ چینا" (جدید چین) بناتی ہے اور جو قومی تحریک کی اعانت عقل سے نہیں بلکہ جوش سے کرتی ہے ممکن تھا کہ پہلی بار بہک جاتی۔ لیکن ان لوگوں کو بھی عرصے تک دھوکے میں نہیں رکھا جا سکتا تھا۔

بہرکیف چین قدیم ہو یا جدید پُرانی چینی اسکیم یعنی اغیار کو ایک دوسرے کے خلاف کھڑا کر دینے کی پالیسی پر عمل پیرا ہونے کے لیے ممکن ہے وہ بالکل تیار ہو۔ ممکن ہے چینی رہنمایان قوم دیگر دول کو یہ امر تسلیم کرانے کے لیے بالکل مستعد ہوں کہ روس عمداً اپنے حقوق سے دست بردار ہو گیا اور اگر پھر چین کی نظر عنایت اُنپر ہوئی تو اُنکو لازم ہے کہ جو کچھ روس نے کیا وہی وہ بھی کریں۔ ممکن ہے اس دھمکی سے فائدہ اُٹھا کر کہ "چین بالشویک ہو جائیگا" دیگر دول کو اپنے حقوق سے دست بردار ہو جانے کے لیے گھبرا دیں۔ بالفاظ دیگر چین قدیم ہو یا جدید دیگر دول سے جو کچھ بھی حاصل کر سکتا ہے ممکن ہے روسی ہوا کے ذریعہ سے حاصل کر لے اور بعد ازاں روس کے خلاف اُن کی مدد کا طالب ہو۔

تاہم باستثناء جاپان دول خارجیہ میں روس ہی ایک ایسا ملک ہے جو چین میں واشنگٹن کانفرنس کے بعد سفاکانہ دست درازیوں کا مجرم کہا جا سکتا ہے۔ اس بات کی تصدیق کے لیے کہ اُس نے بہت اور بڑی بڑی دست درازیاں کی ہیں دنیا کے سامنے قلمبند واقعات موجود

ہیں۔ ان کا تعلق ایک ملعون ملک میں محض تباہ کن بالشویکی پروپگنڈے ہی تک محدود نہیں رہا ہے، بلکہ پرانی طرز کی ملکی چیرہ دستیاں بھی ہوئیں جن پر زار کے عہد کا روس تو خوب ہی فخر کرتا۔

سب سے پہلے منگولیا کو لو۔ اس صوبے میں سوویٹ فوجیں ۱۹۲۱ء میں داخل ہوئیں جبکہ انجران کے بھاگتے ہوے حملہ آوروں کا تعاقب ہو رہا تھا۔ ان کو منتشر کرنے اور اُنکے لیڈر کو گولی مار دینے کے بعد بھی روسیوں نے مراجعتِ وطن کا قصد نہ کیا۔ سائبیریا میں انھوں نے "حکومتِ انقلابیہٴ عامہٴ منگولیا" پہلے سے قائم کر رکھی تھی۔ کامریڈ باڈو جو ارگا میں دفتر قنصل جنرل میں ٹائپسٹ کی حیثیت سے کام کر چکا تھا اور سائبیریا کی آبادی سے کئی اور چیدہ نیم تعلیم یافتہ منگولی اس کے ارا کین تھے۔ سوویٹ فوجوں کے قدم ارگا میں جمتے ہی کامریڈ باڈو مع اپنے مصاحبین کے طلب ہوے اور مجلس وزراء کی صدارت مرحمت ہوئی۔ ساتھ ہی ساتھ نئی منگولی سوویٹ ریاست کے وزیر خارجہ کا جلیل القدر عہدہ بھی آپ ہی کو تفویض ہوا۔ اس نام نہاد "خود مختار حکومت" نے فوراً ایک سرکاری عرضداشت اس مضمون کی ماسکو بھیجی کہ "علاقہ منگولیا سے سوویٹ افواج اُسوقت تک نہ ہٹائی جائیں جبتک دشمن کی طرف سے ذرا بھی خطرہ باقی رہے"۔ ماسکو سے جواب ملا کہ اُنکی درخواست کے موافق کارروائی کی جائے گی۔ چنانچہ پارٹیزن اور کوسک جنھوں نے شہر پر قبضہ کر رکھا تھا انکی جگہ لینے کے لیے مستقل سرخ سپاہ کی ایک رجمنٹ بھیجدی گئی۔ بعد کو یہ فوج کم کر کے ایک پلٹن کر دیگئی۔ اور "باہمی مصالحت نامہ کی رو سے" صرف برائے نام منگولی محکمۂ جنگ کے زیر نگرانی ہوگئی۔ ارگا میں ان لوگوں کا قیام کم سے کم مارچ ۱۹۲۵ء تک رہا۔ جبکہ سفیر کراخاں نے چین کو سرکاری طور پر مطلع کیا کہ سرخ افواج ہٹالی گئی ہیں۔ اور یہ اس لیے کیا کہ پکین میں ریشہ دوانی کرنے کے لیے روس کا فائدہ اسی میں تھا کہ وہ منگولیا پر چینی شہنشاہیت تسلیم کرے۔ ممکن ہے اس کارروائی نے چین کی پریشانی اور تلون مزاجی کو سکون بخشا ہو۔

اب سننا چاہیے کہ مسٹر چیچرن اپنی رپورٹ میں کیا فرماتے ہیں جو آپ نے ۳۔ مارچ کو طفلس میں بین الاقوامی معاملہ کی انتظامیہ کمیٹی کے سامنے پیش کی۔ آپ کہتے ہیں "ہمارا اتصال منگولیا سے بہت زیادہ پیوستہ ہے۔ ہم اس جمہوریت کو جمہوریت چین کا ایک جزو تسلیم کرتے ہیں لیکن ہم اُسکی خود مختاری کو بھی قبول کرتے ہیں جو اس قدر وسیع ہے کہ منگولیا نہ صرف چین کی طرف سے اپنی اندرونی زندگی میں کسی قسم کی مداخلت روا نہیں رکھتی ہے بلکہ اپنی خارجی پالیسی

میں بھی آزاد ہے"۔ بے شبہہ مسٹر چیمبرلن چین کے لیے جو شہنشاہیت چھوڑتے ہیں اُس کی مثال بعینہ ایک چھریاں پڑے ہوئے پوست کی ہے۔

روس کے بین الاقوامی انصاف کے دعووں کا پول دکھانے کی اس سے زیادہ بمشکل ضرورت ہوگی۔ یہ واقعہ ہے کہ روس نے منگولیا کو چین سے بالکل جدا کر دیا ہے اور پورے طور پر اپنے پنجۂ اقتدار میں لے آیا ہے۔ آرگا میں موجودہ "حکومت" خودساختہ سوویٹ حکومت ہے جسکو روسی سنگینوں نے قائم کیا ہے اور جو اُنھیں کی حمایت کی دست نگر رہتی ہے۔ اگر یہ سچ ہے کہ متعینہ فوجیں ہٹالی گئیں (کیونکہ یہ امر ہنوز درجۂ یقین کو نہیں پہونچا ہے) تو بھی موقع کو قابو میں رکھنے کے لیے کافی تعداد محافظین سفارت خانہ اور فوجی معلمین کی رہ گئی ہے۔ منگولیا اب چین کی سرپرستی میں نہیں ہے بلکہ سوویٹ حکومت کے ماتحت ہے۔ اگر اِس حیثیت کے بدلنے کی کوشش کی گئی تو سوویٹ سپاہ جو سرحد سے دو سو (۲۰۰) میل سے کم فاصلہ پر ہے آرگا میں اپنے مقام پر واپس کر دی جا سکتی ہے۔

روسی دست درازی کی دوسری مثال منچوریا والی ہے جسکی بحث اس سے قبل چینی مشرقی ریلوے کے سلسلہ میں کی جا چکی ہے۔ روس نے چانگسولن سے ریلوے پر روسی قبضہ تسلیم کرنے کا معاہدہ کرانے کے وقت چینی جذبات اور چین کی راستبازی کو اپنے قول کے مطابق ملحوظ رکھنے میں جس خلوص کا اظہار کیا ہے اسکا ثبوت چانگ سے بحیثیت فرمانروائے "خود مختار سہ صوبجات مشرقیہ" گفت وشنید کرنے میں ملتا ہے۔ منچوریا کو جمہوریت چین سے جدا کرنے کی کوشش میں چانگ کو اگر کسی دولتِ خارجیہ سے کبھی کوئی تائید ملی تو صرف یہی تھی۔

روسی دست درازی دوردراز صوبوں تک محدود نہیں ہے۔ اُدھر جلیل القدر عیسائی جنرل فنگ یو شنگ نے اپنے سابق کمانڈر وو۔ پی۔ فو کو دغا دی نہیں کہ پیکن کی ملکیت کے لیے چانگسولن سے لڑائی کے منصوبوں میں اُسکو روس کی شہ ملنے لگی۔ فنگ مع اسّی ہزار آدمیوں کے پیکن کے شمال مغرب میں قدم جمائے ہوئے ہے اور ایسے علاقہ پر قابض ہے جہاں فوجی رسد رسانی کے کافی ذرائع نہیں ہیں۔ تاہم اُسکو بڑی مقدار میں رسد پہونچ رہی ہے۔ ریگستان گوبی میں موٹر کار سے سفر ملتوی ہے لیکن فنگ کو روسی اسلحہ وسامان حرب پہونچانے کے لیے موٹریں برابر دوڑائی جا رہی ہیں۔ کالگن میں ایک بہت بڑی

میگزین قائم ہو چکی ہے اور وولن نور میں اس سے بھی بڑھی - جو افواج متعینہ پیکن کی تاخت سے زیادہ محفوظ ہے - فنگ کے مفاد کے لیے روسی فکر و قلق کا خاتمہ ہیں پر نہیں ہو جاتا ہے ستر ہزار منگولی فوج بھرتی ہوئی ہے اور مسلح کر دی گئی ہے ، جس کی تربیت پانچ ہزار روسی افسران کرتے ہیں جسوقت فنگ کو دشمن کے مقابلہ میں اپنی مدافعت کی یا چانگسولن کو دیوار کے اُس پار بھگانے کی ضرورت پڑیگی ، یہ امدادی سپاہ اُسکے حوالے کر دی جائے گی - باوجود سفارتی تبلیغ و تلقین کی ایسی باتیں محض محبت کی وجہ سے نہیں کی جاتی ہیں اور فنگ جانتا ہے کہ اگر کسی وقت پکین پر پورا دست قدرت حاصل ہو جائے گا تو اُسے یا چین کو کس قسم کا صلہ دینا ہو گا -

روس واپس آرہا ہے ریچھ کے توقف کا زمانہ قریب اختتام ہے - اور چین کی شمالی فوجی نقل و حرکت میں "آدم زاد" بے پانوں بڑھتا ہوا دکھائی دیتا ہے - منچوریا کا سفر متعلقہ چینی مشرقی ریلوے سے ہو کر طے کر رہا ہے - منگولیا کی دارالسلطنت ارگا میں اُسنے اپنا غار بنا رکھا ہے - نیچے اُتر کر گوبی میں وہ ایک ایسے منگولی انبوہ کے ہمراہ مصروف خرام ہے جو چنگیز خاں کے وقت سے اب تک دیکھنے میں نہیں آیا - پکین کے پھاٹک تک وہ ایک چینی جنگجو کے بازو کی آڑ میں جسکو وہ اپنے پنجۂ آہنی سے مرعوب کیے ہوئے ہے پانوں گھسیٹتا جا رہا ہے - دور دراز جنوب میں جہاں ریچھ کی آواز اس سے قبل نہیں سُنی گئی اُسکو ساٹھ ہزار کینٹونیوں پر بھروسہ ہے کہ وہ لوگ اُس کے انگریز رقیبوں کو ہانگ کانگ میں لوٹ لیں گے -

اس طرح صرف یہی نہیں ہے کہ چین کو فی الحال منگولیا سے ہاتھ دھولینا پڑا ہے بلکہ خود چین اور منچوریا کو ۱۹۰۴ء کے بعد سے زیادہ خطرہ روسی غلبہ کی طرف سے لاحق ہو گیا ہے - جنگ عالمگیر کے بعد سے کسی قوم نے اپنے دوائر اثر کو اس قدر وسیع نہیں کیا ہے - کسی حکومت نے اپنی قاصدانہ پالیسی کو اس قدر ترقی نہیں دی ہے جسقدر جدید روس کی حکومت وعید امن و انصاف نے - چینی راستبازی کو خطرہ عیاں ہے - جاپان کی سلامتی کو کچھ کم خطرہ نہیں ہے - سلطنت جزائر جاپان پھر مدافعت پر ہے اور خرس روس کی پیشقدمی کا مقابلہ کرنے کو قدم بڑھانا ضروری ہے -

کیا امام اعظمؒ پٹھان تھے؟

شہاب الدین احمد بن حجر الہیتمی نے ایک کتاب خیرات الحسان فی مناقب الامام ابو حنیفۃ النعمان امام اعظمؒ کے مناقب میں لکھی ہے ۔ جس کا ایک قلمی نسخہ اسوقت کاتب الحروف کے پیش نظر ہے اس کتاب کی تصنیف کی وجہ زیادہ تر یہ ہوئی تھی کہ بعض متعصب فقہائے مذاہب غیر نے امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی ذم بالایہ تشنیعات کی تھی اور بعض جاہلوں نے محمود غزالی معتزلی کے کلام کو جو امام اعظمؒ کی ذم میں تھا ، امام حجۃ الاسلام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب کرکے امام اعظم کی مخالفت میں گویا ایک بڑے آدمی کو اپنے ساتھ شریک کر لیا تھا ۔ شہاب الدین نے جب یہ دیکھا تو کیا بنظر رد تشنیع مخالفینِ امام اعظمؒ اور کیا بنظر برأت امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ یہ مختصر کتاب تالیف کی ۔

اس کتاب میں امام صاحب کے حسب و نسب کے متعلق دوسری فصل ہے ۔ جس کا ترجمہ درج ذیل کیا جاتا ہے :۔

"دوسری فصل آپ کے نسب کے ذکر میں ۔ اس میں بہت سے لوگوں نے اختلاف کیا ہے ۔ اکثر کا یہ قول ہے اور محققین کے نزدیک یہی صحیح ہے کہ آپ عجم کے تھے ۔ خطیب (بغدادی) نے آپ کے صاحبزادے حمّاد کے بیٹے عمر سے روایت کی ہے کہ آپ کے والد ماجد کا نام ثابت بن زوطی (بضم زاء بروزن موسیٰ ۔ یا بفتح زاء بروزن سلمیٰ) بن ماہ تھا ۔ ماہ کابل (بضم الموحدہ) کے رہنے والے تھے جو ہندوستان کے قریب ایک ملک ہے ۔ اور بنو تیم اللہ بن ثعلبہ کے غلام تھے ، جب ایمان لائے تو انھیں آزاد کر دیا ۔ ثابت آپ کے والد مسلمان پیدا ہوئے ۔"

" ایک قول یہ بھی ہے کہ آپ انبار (بفتح الہمزہ) کے رہنے والے تھے ۔ وہاں سے نسا (بفتح اولیہ و بالقصر) منتقل ہو گئے ۔ وہاں ابو حنیفہ پیدا ہوئے ۔ جب بڑے ہوئے تو انھیں ہمراہ لیکر دوسری جگہ انتقال مکان فرمایا ۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ آپ ترمذ کے تھے ۔ اور یہ بھی محال نہیں معلوم ہوتا کہ آپ ان چاروں شہروں سے نقل کرتے رہے ہوں ۔ اور جہاں جہاں جاتے اپنے ساتھ ابو حنیفہ کو لیجاتے ۔ ترمذ (بتثلیث اولیہ بضم میم مع ذال معجمہ) دریائے جیحون کی طرف ایک شہر ہے ۔ نیز عمر مذکور کے بھائی اسمٰعیل ابن حماد

سے مروی ہے کہ (امام صاحب کے والد ماجد کا سلسلۂ اجداد یہ تھا) ثابت بن نعمان بن مرزبان (بفتح فسکون وضم الزای) اور ابناء فارس کے ایک معرب رئیس اور آزاد تھے۔ اور خدا کی قسم غلامی سے ہماری آزادی حاصل کرنے کا کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ ثابت حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ تعالیٰ وجہہ کی خدمت مبارک میں صغیر سنی میں حاضر ہوے تھے اور حضور نے آپ کی اور آپ کی اولاد کے لیے برکت کی دعا فرمائی تھی۔ ہمیں اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ وہ دعا قبول ہوئی۔ نعمان نے نیروز (نوروز) کے دن جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں فالودہ بھیجا تھا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ ہمیں ہر روز نوروز ہے۔ نیز ایک یہ قول ہے کہ مہرجان (عربی محبۃ الروح) کے دن کا یہ واقعہ ہے اور حضرت علیؓ نے فرمایا کہ ہمارا مہرجان ہر روز ہے۔ اخیر کے ان دو قولوں سے ہمیں اختلاف ہے کہ ثابت کے والد کا نام نعمان یا زوطی تھا، بلکہ انکے جد کا نام مرزبان یا ماہ تھا۔ اس اختلاف کے بارے میں ہمارا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے کہ ایک شخص کے دو نام ہوں جیسے کہ ایک نام ہوا کرتا ہے اور ایک لقب۔ یا زوطی سے مراد نعمان اور مرزبان سے مراد ماہ ہو۔ غلامی سے آزادی حاصل کرنے کے متعلق جو انکار ہے اسکا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ آزادی حاصل کرنا انکے جد کے لیے ثابت ہے اور انکار انکے باپ کے متعلق ہے۔ کیونکہ یہ ثابت شدہ واقعہ ہے اور ان کا غلام ہونا اور کابل سے آئے ہوے قیدی ہونا ثابت ہے۔ انھیں بنی تیم اللہ کی ایک عورت نے خرید کرکے آزاد کر دیا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ثابت کے باپ کا نام طاؤس بن ہرمز تھا جو بنی ساسان میں کا ایک بادشاہ گذرا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ عربی النسل تھے اور زوطی کے باپ یحییٰ بن زید بن اسد تھے۔ ایک نسخہ میں ابن راشد (زاہد؟) انصاری لکھا ہے۔ اس سب کا رد ہو چکا ہے اور اصحاب مناقب کی ایک جماعت اسی قول کی طرف گئے ہیں جو اوپر بیان ہو چکا ہے۔"

شہاب الدین کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جو امور تسلیم شدہ ہیں وہ یہ ہیں:-

(۱) امام اعظم کے جد عجمی تھے۔

(۲) کابل سے آئے تھے۔

(۳) آپ کے والد کو جناب مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی صحبت حاصل ہوئی تھی۔

کابل میں اس زمانہ میں مغل، شیخ و سید کا مجمع ابھی نہیں آیا اور بالکل اصلی قدیم باشندے وہاں

آبا و اجداد تھے جنھیں پٹھان کہتے ہیں۔ پھر کیا یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ امام اعظم کے اجداد پٹھان تھے؟ اور اور کیا جس طرح ہندوستان میں پٹھان آکر ہندوستانی پٹھان ہو گئے ہیں، کوفہ میں جاکر کوئی پٹھان نہیں ہو سکتے؟

پٹھانوں کے ایمان لانے کا زمانہ حضرت عثمانؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا زمانہ بیان کیا جاتا ہے، مگر یہ سلسلہ حضرت سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کے زمانہ تک رہا ہے اور بعض لوگ جو اُس وقت اسلام نہیں لائے تھے، رفتہ رفتہ زمانۂ مابعد تک اسلام لاتے رہے۔ مگر حضرت امام اعظمؒ کے اجداد کے ایمان لانے کا زمانہ وہی ہے جو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا زمانہ ہے اور یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ وہ اہل کابل سے تھے جو اُس زمانہ میں سب کے سب پٹھان تھے۔ تو پھر کیا اُنکے پٹھان ہونے سے کوئی شخص اختلاف کر سکتا ہے؟

م۔ ح۔ خان

غزل رتسم لکھنوی

دل کیا ہے، جان کیا ہے، مرا جسمِ زار کیا
اے حسنِ یار تجھ پہ کروں میں نثار کیا

آکر نسیم چھیڑتی ہے بار بار کیا
افسردہ خاطروں کو خزاں کیا بہار کیا

فرقت کا کوئی دن بھی قیامت سے کم نہیں
کیا چیز روزِ حشر ہے روزِ شمار کیا

انساں کی سرکشی کی کوئی انتہا بھی ہے
اُڑ جائے گا فلک پہ پشتِ غبار کیا

ساقی نہ کر شراب کے دینے میں پیش و پس
میں ہوں خدا نخواستہ پرہیزگار کیا

دیں عرض حال پر تو ستمگر نے گالیاں
ہے اور خواہش اے دلِ اُمیدوار کیا

کہلا کے تیرا بندہ ہوں محتاج غیر کا
منظور ہے تجھے مرے پروردگار کیا

اب تو دعا بھی کرتے ہوئے شرم آتی ہے
دوہرائیں ایک بات کو ہم بار بار کیا

حقگوئی پر ہے ناز بہت آپ کو رتسم
پھر تازہ ہوگا قصۂ منصور و دار کیا

بجلی کا قمقمہ

(ایک اتفاقی حادثہ سے ایک کروڑ ڈالر سالانہ کی بچت)

کلیولینڈ کانفرنس کا اجلاس منعقد ہے، سیکڑوں علماء و ماہران سائنس جمع ہیں، ڈاکٹر مارون پیکن اُٹھا، اور ۶ عدد الکٹرک لائٹ بلب (برقی روشنی کے قمقمے) میز پر رکھ دیے - پھر اُنکو ایک اشارہ سے نیچے گرا دیا - یہ اشارہ اعلان تھا اس امر کا کہ اہل امریکہ کو ایک کروڑ ڈالر سالانہ کی بچت ہو سکتی ہے -

ایک عامی کی نظر میں یہ تجربہ ناقابل التفات ہوگا - ڈاکٹر کانفرنس میں چند قمقمے لیکر آیا تھا جو سُن کیے ہوے اور ہلکے سبز رنگ کے تھے، اور بجائے بیرونی جانب کے اندر کی طرف سُن کیے گئے تھے - لیکن اس میں قابل اعتنا بات کیا ہے؟

واقعہ یہ ہے کہ ڈاکٹر مارون پیکن نے وہ کام کیا ہے جسکے امکان پر علمائے سائنس بیس سال سے خندہ زن تھے - ڈاکٹر نے اپنی ایجاد سے اُس صنعت کو مکمل کر دیا جو ہر سال تیس کروڑ بجلی کے لمپ امریکہ کی دوکانوں اور مکانوں کے لیے ساخت کرتی ہے - ڈاکٹر نے ایک کروڑ ساٹھ لاکھ امریکی خاندانوں کے لیے بہتر و ارزاں تر روشنی مہیا کر دی - اپنے لیے چارلس اے کافن والا قیمتی انعام حاصل کیا اور اپنی کمپنی کے لیے شہرت دوام پیدا کر دی - ایڈیسن کے سب سے پہلے کاربن لیمپ کے بعد سے پچاس سال کے اندر روشنی میں جس قدر ترقی ہوئی اُسکو ڈاکٹر پیکن نے اپنے ایجاد سے درجہ تکمیل کو پہونچا دیا اور آج روشنی کا اس سے بہتر ذریعہ موجود نہیں ہے

ڈاکٹر پیکن نے جو کچھ کیا وہ ایک معاملۂ عشق و محبت، ایک پریشاں کن ٹیلیفون، ایک نیم مکمل قمقمے کے اتفاقی حادثہ کا ممنون ہے - ڈاکٹر پیکن نے زمانۂ شباب فلوریڈا میں گذارنے کے بعد الاباما پولی ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ میں تعلیم حاصل کی، اور کیمیکل انجنیرنگ میں خاص مہارت پیدا کر لی - لیکن اسکو پہلا کام سڑکوں کی تعمیر کا دیا گیا - جنگ عظیم کے دوران میں اس نے فوجی خدمت کے لیے اپنے آپ کو پیش کیا اور علم کیمیا میں مہارت خاص رکھنے کی وجہ سے اس کو نیلا پارک بھیجدیا گیا - جہاں چچا سام (امریکہ) جرمنی کے مہلک گیس کے جواب و مقابلہ کی تیاری میں مصروف تھے -

فاتمۂ جنگ کے بعد پیکن کی ملازمت جاتی رہی۔ لیکن خوش قسمتی سے نوکری کے بدلے اسکو بیوی مل گئی۔ یعنی کلیولینڈ کی ایک لڑکی سے اس نے شادی کرلی۔ پیکن نے اپنی بیوی سے فلوریڈا کی آب وہوا اور مناظر قدرتی کی بڑی تعریف کی اور وہاں کے قیام پر اُسکو آمادہ کرنا چاہا۔ لیکن بیوی نے کلیولینڈ کی حمایت کی اور وہیں کے قیام کو ترجیح دی۔ چنانچہ کلیولینڈ میں سکونت اختیار کی گئی۔ اگر آج بجلی کے لیمپ ہمیشہ سے زیادہ ارزاں اور بہتر ہیں تو یاد رکھنا چاہیے کہ اس ترقی میں مسز پیکن کا بڑا حصہ ہے۔ کیونکہ اُسی کی ترغیب و اصرار سے پیکن نے کلیولینڈ کا قیام پسند کیا تھا۔

کلیولینڈ میں نیلا پارک واقع ہے جو نیشنل لیمپ ورکس کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ جس شخص کو مکان، دکان، اسکول، یا بازار کی روشنی کا معمّٰی حل کرنا ہوتا ہے سیدھا وہیں پہونچتا ہے۔ اور اُسکو اپنی مشکل کا حل تیار ملتا ہے۔ دنیا کے تمام حصوں سے بارہ ہزار آدمی ہر سال مشورہ کے لیے وہاں آتے ہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ "نیلا پارک وہ مقام ہے جہاں کل کی روشنی آج چمکتی ہے" یعنی روشنی کے مسئلہ کا ہر عقدۂ دشوار وہاں پہلے ہی سے حل کرلیا جاتا ہے۔ نیلا پارک کے انجنیروں اور محققین خصوصی نے کروروں ڈالر تجارت امریکہ کی نفع خیزی اور معیشت قومی کی راحت رسانی کے لیے صرف کیے ہیں۔ پچاس برس قبل صرف شمع کی روشنی بصارت نوازی کی کفیل تھی۔ لیکن اب بجلی کی روشنی شمع سے بدرجہا ارزاں ہے۔ بجلی کی روشنی ایڈیسن کے پہلے لیمپ سے اکیس گنی روشنی دیتی ہے اور دنیا بھر کی کسی کمپنی نے روشنی کی ترقی میں اس قدر نمایاں اور قابل قدر کام نہیں کیا جتنا نیلا پارک نے کیا ہے۔

پیکن نے کلیولینڈ میں سکونت اختیار کرنے کے بعد جب جستجو کی کہ لیمپ لیبوریٹری کے متعلق اسکی خدمات کی ضرورت ہے یا نہیں، تو اُسکو مشورہ دیا گیا کہ بجلی کے قمقموں کو اندر کی جانب سے سُن کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اب تک قمقمے باہر کی طرف سے سُن کیے جاتے تھے۔ لیکن خرابی یہ تھی کہ ان پر گرد جم جاتی تھی، اور صاف ہونا تقریبًا ناممکن تھا۔ چنانچہ اب ڈاکٹر پیکن نے تجربہ شروع کردیا۔ باقی داستان پیکن کی زبانی سنیے جو وہ مسٹر پین سے بیان کرتا ہے:-

"ہم اس اصول پر نہایت سختی سے کاربند تھے کہ تجربہ کے دوران میں قمقموں کو ضائع نہ ہونے دیں۔ یعنی اگر ایک تجربہ کسی قمقمے پر ناکام ثابت ہو تو اُسی قمقمے کو صاف کرکے

دوسرا تجربہ کیا جائے۔ اور یہی اصول اندر سے سُن کرنے کی کامیاب ترکیب کا باعث ہوا۔
موجودہ لیمپ ایجاد کرنے کے لیے جن تدابیر پر عمل کیا گیا وہ ظاہر ہیں۔ ڈاکٹر ڈبلیو ڈی کولج نے بجلی کے تار جو پہلے نہایت نازک چیز کے ہوتے تھے مضبوط دھات کے بنائے جو قدیم کاربن کے تاروں کے مقابلہ میں آٹھ گنی زیادہ روشنی دینے لگے۔ ایڈیسن نے اپنے ابتدائی تجربات میں نائٹروجن سے بھرے ہوئے لبب (قمقمے) استعمال کیے اور یہ فیصلہ صادر کر دیا کہ برقی لیمپ کے اندر نائٹروجن کے سوا کوئی چیز نہ ہونی چاہیے۔ لیکن ہم ڈاکٹر اروِنگ لینگ میور کے ممنون ہیں کہ اُس نے بعض اور قسم کے گیس لبب میں بھرے جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ تار زیادہ بلند ٹمپریچر تک گرم ہو سکتے ہیں اور لبب کو صدمہ نہیں پہونچتا۔ اسی طرح بےشمار ایجادیں کی گئیں اور بازار مختلف وضع و قطع کے قمقموں سے پٹ گیا۔ آخرکار صنّاعوں کی ایک کمیٹی مقرر کی۔ اور ایک جدید و سہل العمل لیمپ کی ایجاد پر غور کیا گیا تاکہ کاریگروں کو اوضاعِ مختلفہ کی ساخت اور خریداروں کو تذبذب انتخاب کی زحمت سے نجات ملجائے۔
لبب کی ہوا نکالنے کے لیے قدیم نوکدار مُنہ کی جگہ گردن کی طرف سے خالی کرنے کا طریقہ ایجاد کیا گیا۔ سیدھے تاروں کی بجائے مُڑے تار بنائے گئے۔ غرض اب لیمپ کی ساخت اس نقطہ پر آگئی تھی کہ ایک مکمل لیمپ ایجاد کیا جا سکے۔ لیکن تکمیل ناممکن نظر آتی تھی
"ہر شخص چاہتا تھا کہ نئے لیمپ سے اُتنی ہی روشنی حاصل ہو جتنی شفاف شیشے کے لبب سے ہوتی ہے۔ اور آنکھیں تیز روشنی سے ایسی ہی محفوظ رہیں جیسی سُن کیے ہوے لبب سے رہتی ہیں۔ اوپر سے سُن کیا ہوا لبب نہ صرف جلد مَیلا ہو جاتا ہے۔ بلکہ پوری روشنی بھی نہیں دیتا اور روشنی کی مقدار لبب کے اندر رُک جاتی ہے۔ لیکن اگر اندر کی جانب سے سُن کیا جا سکے تو بیرونی سطح صاف اور چکنی رہے گی اور روشنی بھی کافی دیگا اس لیے کہ جو مقدار روشنی کی لبب کے اندر رُک جائے گی وہ غیر محسوس ہو گی۔
"جب میں نے لوگوں سے اس تدبیر کے امکان عمل کا ذکر کیا تو ہر شخص نے خندۂ ہمت شکن سے اس کا جواب دیا۔ اور ایک کاریگر کا حال بیان کیا کہ اس نے ریلوے کمپنی کو پچاس ہزار اندر سے سُن کیے ہوے لبب مہیا کرنے کا ٹھیکہ لیا تھا۔ لیکن اس معاملہ میں اُس کا دیوالہ نکل گیا۔ اس لیے کہ دَورانِ ساخت میں پچاس فی صدی لبب ٹوٹ گئے۔
بہرحال میں نے اپنے تجربات جاری رکھے۔ اور مختلف قسم کے ایسڈ کا مختلف وضع کے قمقموں

پر تجربہ کرتا رہا۔

قاعدہ یہ ہے کہ بلب بنانے کے بعد اسکے اندر ہائڈروفلورک ایسڈ کا قوی مرکب لگانے سے بلب اندر کی جانب سے سُن ہو سکتا ہے۔ اس ترکیب سے سُن کرنے کے بعد اگر ایک ہلکا مرکب بلب کے اندر ڈال کر تھوڑی دیر چھوڑ دیا جائے تو سُن کیا ہوا حصہ صاف اور شیشہ حسب سابق شفاف ہو جاتا ہے۔ اور پھر اُس پر نیا تجربہ کیا جا سکتا ہے۔ میں اسی طرح اکثر بلب صاف کر لیا کرتا تھا اور اُنکو ضائع نہ ہونے دیتا تھا۔ ایک دن میں اپنے کمرے میں تجربہ کر رہا تھا۔ ابھی صاف کرنے والا عرق بلب میں ڈالا ہی تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی پریشان کن آواز سے بجی۔ میں گھبرا کر اُٹھا۔ جلدی میں اتفاق سے بلب پر ہاتھ لگا اور وہ اُلٹ گیا۔ اور عرق بلب کے صاف ہونے سے پہلے ہی گر گیا۔ جب میں ٹیلیفون کے پاس سے واپس میز پر آیا تو ابکے پھر بلب کو ہاتھ لگا اور اس مرتبہ وہ اندر سے سُن کیا ہوا نیم صاف شدہ بلب لُڑھک کر زمین پر گر پڑا۔ بلب گرتے ہی ٹوٹ جانا چاہیے تھا۔ شفاف شیشے کا بلب بھی اس صدمہ کا متحمل نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ بلب جو سُن ہونے کی وجہ سے پہلے سے زیادہ نازک ہو گیا تھا بھاری آواز کے ساتھ زمین پر گرا اور بالکل صحیح و سالم لڑھک کر میز کے نیچے چلا گیا۔ بس یہی واقعہ میری ایجاد اور بلب کی تکمیل کا باعث ہوا۔"

اس کے بعد ڈاکٹر پکن نے چند قمقموں پر تجربہ کیا۔ اور جب اطمینان ہو گیا تو چند بلب ایک جلسے میں پیش کیے۔ سب کو میز پر ایک قطار میں رکھا اور پھر سب کو ایک ایک کر کے گرا دیا۔ پہلا بلب حاضرین کی توقع کے مطابق ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور لبوں پر تبسم نمودار ہوا۔ لیکن اسکے بعد تین بلب گر کر بالکل سالم رہے۔ آخری دو بلب کو ڈاکٹر نے زور سے فرش پر دے مارا۔ بلب گرتے ہی اُچھلے اور مجمع کا خندۂ زیرِ لب بھی غائب ہو گیا۔

لوگوں نے حیرت سے اس ایجاد کا راز دریافت کیا۔ ڈاکٹر نے صداقت کے ساتھ اقرار کیا کہ مجھے خود علم نہیں۔ میں اس کے صحیح سبب سے قطعی ناواقف ہوں کہ بلب ناقابلِ شکست کیونکر بن گئے۔ البتہ میں اس طرح کے بلب اور تیار کر سکتا ہوں۔ چنانچہ اُس نے تیار کیے اور اب ہر سال کروڑوں بلب اسی ترکیب سے بنائے جاتے ہیں۔

دیکھیے معمولی سا اتفاقی حادثہ کس درجہ مفید ایجاد کا سبب بن گیا!

حامد حسن قادری لکچرار فارسی و اُردو۔ سینٹ جانس کالج آگرہ

وکیل کا کارنامہ

(بنگال کے مشہور فسانہ نگار مسٹر پربھات کمار بیرسٹر کے ایک دلچسپ بنگالی افسانہ کا ترجمہ)

(۱)

بھوانی پور میں سبودھ چند رچار برس تک وکالت کرتے رہے، لیکن انکی وکالت نہ چمکی۔ انھوں نے جب قانون کا امتحان پاس کیا تھا تو لوگوں کا خیال تھا کہ آدمی ہوشیار ہے جلدی نام پیدا کریگا لیکن ان لوگوں کی امید یاس سے بدل گئی۔ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ علم اور عقل کی کمی سے سبودھ بابو کی وکالت نہیں چمکی، کیونکہ بابو صاحب عقلمند ہونے کے ساتھ ہی بہت بڑے عالم بھی تھے۔ اب سبودھ بابو نے بھوانی پور کو چھوڑ کے وناج شاہی ضلع میں جاکر وکالت کرنے کا تہیہ کیا، کیونکہ انکو معلوم ہوا کہ وناج شاہی میں مقدمے بہت ملتے ہیں، وہاں وکیلوں کی تعداد بھی بہت زیادہ نہیں ہے۔ سفر سے پہلے بھوانی پور کے ایک مشہور وکیل کے پاس سبودھ بابو گئے اور اُن سے کہا "میں آپ کے واسطے کچھ تحفہ لایا ہوں، آپ کو قبول کرنا پڑے گا"

جہاں دیدہ پرانے وکیل نے مسکراکر کہا "کیا تحفہ لائے ہو؟ ذرا میں بھی تو دیکھوں"

سبودھ بابو نے آہستہ سے اپنا بیگ کھولا اور اُس میں سے ایک سیاہ الپکے کا گون اور ایک نئی عمدہ پگڑی نکال کر وکیل صاحب کے سامنے رکھ دی اور کہا "یہ دونوں چیزیں آپ کے نذر کرتا ہوں"

وکیل صاحب نے کچھ سوچ کر کہا "اس کا کیا مطلب ہے؟"

سبودھ بابو نے ہنس کر جواب دیا "اِن دونوں نئی چیزوں کو لیکر براہ کرم آپ اپنا پُرانا گون اور پگڑی دیدیجیے"۔

اب وکیل صاحب سبودھ بابو کا مطلب سمجھ گئے اور قہقہہ مار کر کہنے لگے "واہ سبودھ بابو واہ، تم کو تو بڑی دُور کی سوجھی"۔

سبودھ بابو بولے "جی ہاں مجھے نئی جگہ جانا ہے، ایک تو یوں ہی بہت سے وکیل ہوگئے ہیں، اس پر اگر موکل نئی پگڑی اور نیا گون دیکھیں گے تو پاس بھی نہ آئیں گے"۔

وکیل صاحب نے سبودھ بابو کی تعریف کرتے ہوئے کہا "مجھے پوری امید ہے کہ تمھاری

وکالت خوب چمکے گی، تم اپنے باپ کے ہونہار لڑکے ہو۔"

اسکے بعد گون اور پگڑی کا تبادلہ ہوگیا۔ اپنی نوجوانی کو چھپانے کے لیے سبودہ بابو ایک دیدکی دوکان سے اپنے سر کے کچھ بال سفید کرنے کے لیے کوئی تیل بھی لے آئے، لیکن اپنی ناتجربہ کاری سے اس کا راز اپنی بیوی سے کہہ دیا۔ دوسرے دن سُنا کہ بلّی نے اس تیل کی شیشی کو میز پر سے گراکر توڑ ڈالا۔ اس تلخ تجربہ کے بعد سبودہ بابو کو پھر تیل لانے کی جرأت نہ ہوئی۔ سبودہ بابو اپنی بیوی کو ساتھ لے کر دیناج شاہی پہونچ گئے، لیکن ان کی بدقسمتی نے وہاں بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ سبودہ بابو ایسے ہوشیار اور عقلمند وکیل کو متواتر چار برس تک دیناج شاہی کی بار لائبریری میں حاضری دینے پر بھی کوئی موکل نہ ملا۔

(۲)

صبح کا وقت تھا۔ سبودہ بابو اپنی بیٹھک میں بیٹھے ہوئے چینی موجود نہ ہونے کے باعث گڑ کی چاے پی رہے تھے۔ سودیشی کی محبت کی وجہ سے سبودہ بابو گڑ ہی کی چاے پیا کرتے تھے۔ اور اپنے احباب سے فخریہ کہا کرتے تھے "دوکاندار بے ایمان ہوتے ہیں۔ یہ لوگ ولیسی کے نام سے جو چینی بیچتے ہیں وہ اصل میں جاوا کی چینی ہے۔ اس سے میں گڑ ہی کو اچھا سمجھتا ہوں"۔ چاے پی کر سبودہ بابو پیالہ لیجانے کے لیے "مہاراجن! مہاراجن" کہہ کر پکارنے لگے، لیکن کسی نے جواب نہ دیا۔ تب آپ ہی پیالہ اُٹھا کر مکان کے اندر رکھنے کے لیے چلے گئے۔ اندر جاکر بیوی سے معلوم ہوا کہ مہاراجن اپنی تنخواہ کے لیے جو کئی مہینے سے نہیں دی گئی تھی جھگڑا کرکے غصہ میں نوکری چھوڑ کر چلی گئی ہے اور کہہ گئی ہے کہ نالش کرکے سب وصول کرلونگی۔ ایک لمبی سانس لیکر سبودہ بابو نے اپنے ہاتھ سے چلم بھری اور گھر سے باہر چلے آئے۔ بعض مشہور وکیلوں کو حقہ پیتے دیکھ کر سبودہ بابو بھی حقہ پینے لگے تھے۔ کچھ عرصہ تک تو روپیہ سیر والی تمباکو پیتے رہے لیکن جب روپیہ سیر کی تمباکو بھی پی کر انکو آمدنی نہ ہوئی تو ایک دن غصہ میں آکر تمباکو پینا چھوڑ دیا لیکن تمباکو نے ان کو نہ چھوڑا۔ دو ایک دن کے بعد پھر حقّے کو مُنہ لگانا پڑا، لیکن اب جو تمباکو پیتے ہیں وہ چار آنے سیر کی ہے۔

اتوار کا دن تھا۔ سبودہ بابو اطمینان سے بیٹھک میں آکر حقہ پینے لگے اور اپنی قسمت کے پیچ میں کھو گئے۔ ان کے پاس جو کچھ روپیہ تھا وہ سب خرچ ہوچکا تھا۔ بیوی کا گہنا بکنا شروع ہوگیا تھا۔ سبودہ بابو سوچنے لگے "اس طرح سے کیسے گذارا ہوگا۔ کیا ترکیب کروں، کچھ سمجھ میں

نہیں آتا۔ کئی جگہ نوکری کی درخواست بھی بھیجی لیکن کچھ حاصل نہ ہوا۔ دن بدن خرچ بڑھ رہا ہے۔ اور آمدنی بالکل نہیں۔ پہلے تو کمیشن ہی سے کچھ مل جاتا تھا لیکن اب وہ بھی نہیں ملتا۔" جس طرح آسمان کی سطح کا اندازہ نہیں، جیسے دریا کے پانی کی مقدار معلوم نہیں، سبودھ بابو کے خیالات بھی اسی طرح بے انتہا تھے۔ بغیر موکل کے اکیلے کمرے میں بیٹھ کر سبودھ بابو نے چار آنے سیر والی تمباکو کی ایک چلم دھیرے دھیرے اُڑا ڈالی، لیکن پھر بھی ان کے خیالات کا سلسلہ منقطع نہ ہوا۔ دفعتاً باہر کسی کے پاؤں کی آواز سُنائی دی "کون آتا ہے، کوئی موکل تو نہیں ہے" یہ سوچ کر سبودھ بابو نے بوسیدہ الماری سے ایک پُرانی "نظیر کی کتاب" نکال لی اور بڑے دھیان سے پڑھنے لگے۔

کمرے کا دروازہ کھلا اور سبودھ بابو کے ایک دوست جگت بابو ہاتھ میں اخبار لیے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ جگت بابو دیناج شاہی کے مشہور وکلاء میں سے تھے ان کی حالت سبودھ بابو سے بہت اچھی تھی۔

کتاب الگ رکھ کر سبودھ بابو اپنے دوست کو خوش آمدید کہنے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ "آئیے آئیے آج سویرے ہی سویرے اس طرف کیسے نکل آئے؟"

جگت بابو نے جواب دیا "کیا کریں بھائی آج اتوار کا دن ہے، گھر میں بیٹھے بیٹھے جی گھبرایا تو آپ کے پاس گپ شپ کرنے کے لیے چلا آیا"

"بہت اچھا ہوا آپ آ گئے۔ میرا بھی جی گھبرا رہا تھا۔ آپ کے ہاتھ میں کیا آج کا بنگالی ہے، دیکھوں تو سہی"۔ یہ کہ کر سبودھ بابو جگت بابو سے اخبار لیکر "ضرورت ہے" دیکھنے لگے۔

جگت بابو نے سبودھ بابو سے کہا "میں نے سُنا ہے کہ پرسوں فلر صاحب ۲ بجے صبح کی گاڑی سے دیناج شاہی میں آ جائیں گے"۔

سبودھ بابو نے مسکرا کر کہا "کیا ہمارے گھر نہ آئیں گے"

"اگر آ جائیں تو کیا کوئی تعجب ہے"۔

"نہیں بھائی، ہمارا گھر سودیشی ہے وہ یہاں کیسے آ سکتے ہیں، اور اگر وہ آ بھی جائیں تو اُن کی خاطر کیسے ہو گی"۔

"سبودھ بابو ایک بات ہے، اگر تم فلر صاحب کی خاطر تواضع کر دو تو تمہارا بڑا فائدہ ہو، آجکل تقسیم بنگالہ کی وجہ سے فلر صاحب کی کوئی آؤ بھگت نہیں کرتا۔ کوئی میونسپلٹی ایڈریس نہیں دیتی، کوئی ڈسٹرکٹ بورڈ خیر مقدم کے لیے تیار نہیں ہوتا"۔

سبودھ بابو ٹھٹھا مار کر بولے "خاطر کرنے سے اگر نوکری مل جائے تو میں ہی ایڈریس دے ڈالوں"
جگت بابو نے کہا "کیا تم نے نہیں سنا کہ مشرقی بنگال میں ایک وکیل صاحب فلر کی شان میں ایک قصیدہ لکھنے کی وجہ سے گورنمنٹ پلیڈر بن گئے"

سبودھ بابو کی زندگی میں ایک انقلاب ہونے لگا۔ ہنسی میں جو بات کہی تھی وہ دل میں لگی۔ تھوڑی دیر کچھ سوچ کر بولے "اگر واقعی کچھ فائدہ ملنے کی امید ہو تو مجھے بھی کوئی ترکیب بتاؤ"

جگت بابو نے سمجھا کہ سبودھ بابو مذاق کر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا "انگریزی میں نظم لکھ سکتے ہو؟"

"میں نے کبھی تک بندی نہیں کی"

"جس طرح بھی ہو کوشش کر کے ایک نظم لکھو اور پھر اس کو خوبصورت کاغذ پر چھپوا کر جس روز فلر صاحب یہاں آئیں تقسیم کرا دینا۔ اور اس نظم کی ایک کاپی فلر صاحب کے پاس بھی بھیج دینا۔ فرید سنگھ کے ایک سرکاری وکیل نے میونسپلٹی کے چیئرمین ہو کر بھی فلر صاحب کو ایڈریس نہیں دیا۔ اگر تم میرے کہنے پر عمل کرو گے تو ان کا عہدہ تم کو مل جائے گا"

سبودھ بابو نے اس کا کوئی جواب نہ دیا بلکہ سر پہ ہاتھ رکھ کر کچھ سوچنے لگے۔

جگت بابو نے پہلے کی طرح ہنسی میں کہا "کاغذ قلم لاؤ میں ابھی ایک قصیدہ لکھے دیتا ہوں۔ مذاق نہیں کرتا یقین مانو، کالج کا ہال سالانہ جلسوں میں میرے قصیدوں سے گونج اٹھتا تھا۔ مجھے کوئی معمولی شاعر نہ سمجھو"

سبودھ بابو نے آہستہ سے کہا "کیا تم مجھ کو پچاس روپیہ ادھار دے سکتے ہو؟"

جگت بابو مصنوعی غصہ کر کے بولے "تم بڑے گاؤدی ہو۔ میں تو بات چیت کر رہا ہوں نظم کی اور آپ فرماتے ہیں "روپیہ ادھار دے سکتے ہو" تم شاعروں کی قدر کرنا نہیں جانتے۔ تم کو معلوم نہیں ہے کہ شاعر بڑے نازک مزاج ہوتے ہیں، جاؤ اب میں تمھارے لیے کوئی نظم نہ لکھوں گا"

سبودھ بابو نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہا "مذاق نہیں کرتا، مجھے پچاس روپیہ دے دو میں نے ایک ترکیب سوچی ہے"

"ذرا میں بھی تو سنوں"

"میں گورنمنٹ سے چال چل کر اپنا مطلب نکالوں گا۔ کامیابی یا ناکامیابی خدا کے ہاتھ میں ہے"

"آخر تم کیا کرنا چاہتے ہو"

"فلر صاحب کا استقبال کروں گا"

"کیا پاگل ہو گئے ہو۔ آخر تم کس شمار میں ہو۔۔۔ نہ جج نہیں، زمیندار نہیں، کسی بڑے عہدہ پر نہیں۔ تم کو تو شاید اسٹیشن پر جانے کے لیے بھی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اجازت نہ دیں گے، دربار تک پہنچنا اور گورنر سے ملاقات کرنا تو امرِ محال ہے"

"یہ سب کچھ ٹھیک ہے، پھر بھی میں ایسا راستہ اختیار کروں گا کہ فلر صاحب کی نگاہ مجھ پر ضرور پڑ جائے گی اور پھر میرے سب کام بن جائیں گے"

جگت بابو کے چہرے پر اب ہنسی کا نشان نہ تھا۔ وہ بولے "کیا بے وقوفی کر رہے ہو۔ تمھارے ہم وطن تو ان صاحب کا استقبال نہ کریں گے۔ ایسی حالت میں کیا تم فلر صاحب کا استقبال کر کے اپنے ہم وطنوں کو اپنا دشمن بنانا چاہتے ہو؟"

سعود بولے "جگت بابو! تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ تمھارا کیا خیال ہے۔ میں چار برس سے یہاں وکالت کر رہا ہوں۔ بیوی کا گہنا بیچ کر گھر کا خرچ چلا رہا ہوں۔ کیا کبھی کسی لیڈر نے مجھے بلا کر اتنا بھی پوچھا ہے کہ "وکیل جی تمھارے گھر میں کچھ کھانے کو ہے کہ نہیں"۔ چھوٹے بچے نے کپڑے کے لیے [illegible] وقت پر تنخواہ نہیں دے سکتا اس سے کوئی خادمہ بھی نہیں ملتی۔ کنویں سے پانی بھرتے بھرتے اور برتن مانجھتے مانجھتے میری بیوی کے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے ہیں۔ اس حالت میں اگر میں موقع پاکر اپنی بہتری کی کوئی راہ نکالوں تو کیا حرج ہے۔ اگر میں گورنمنٹ کو مغالطہ دے کر سرکاری وکیل بن جاؤں تو کیا برائی ہے۔ آخر میں کہاں تک بنیوں کے تقاضے سہوں۔ پھٹا جوتا، پھٹے کپڑے پہن کر تو اب مجھ سے باہر نہیں نکلا جاتا۔"

جگت بابو سعود بابو کا حال سن کر بولے "خیر تم نے کیا سوچا ہے؟"

"میں اپنا مکان خوب سجاؤں گا"

"اس سے کیا تمھارا مطلب پورا ہو جائے گا؟"

"یہ میری کامیابی کی پہلی سیڑھی ہے۔ دیکھنا میرے سب کام حسبِ مرضی ہو جائیں گے"

"کامیابی تو نہ ہوگی لیکن بدنامی بہت ہوگی"

"اس کے متعلق تو تم کوئی فکر نہ کرو، اب تم یہ بتاؤ کہ میری مدد کرو گے یا نہیں؟"

"میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

"جیسا میں کہوں گا تم ویسا ہی کرنا۔ میرے مکان کی آرایش کے بعد تم میری جگہ خوب بُرائی کرنا"

"یہ کام تو مشکل نہیں ہے مجھے منظور ہے۔"

"لیکن یہ خیال رہے کہ کوئی یہ نہ جان سکے کہ ہم تم دونوں دوست ہیں۔"

"اسکے لیے خاطر جمع رکھو"

"بس تو اب مجھے کچھ کہنا نہیں ہے۔ اب آپ آج ہی پچاس روپئے کا انتظام کر دیجیے۔"

"بہت اچھا، میں گھر جا کر آپ کو روپیہ بھیجدوں گا" یہ کہکر جگت بابو اُٹھ کھڑے ہوے۔ سبودہ بابو بھی ان کے ساتھ باہر تک آئے، رخصت ہوتے وقت جگت بابو نے کہا "مجھے تمہاری کامیابی میں شک ہے"

سبودہ بابو بولے "ایشور کی کرپا سے آسام گورنمنٹ کی ایسی ہی عقل تھوڑے دن بنی رہی تو میری کامیابی میں کوئی شک نہیں ہے۔ آگے میری قسمت۔"

"تمہاری کامیابی میں میرا بھی حق ہے" کہتے ہوے سبودہ بابو سے جگت بابو نے ہاتھ ملایا اور ہنستے ہوے اپنے گھر چلے گئے۔

(۳)

آج دوشنبہ ہے کل سویرے لاٹ صاحب دیناج شاہی میں رونق افروز ہوں گے لیکن شہر والے استقبال کی کوئی تیاری نہیں کر رہے ہیں۔ تقسیم بنگالہ کا صدمہ اور رنج سب کو ہے۔ اسی سے سب نے لاٹ صاحب کے استقبال میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ میونسپلٹی کے غیر سرکاری ممبروں نے ایڈریس نہ دینے کا ریزولوشن پاس کیا۔ ڈسٹرکٹ بورڈ میں بھی مجسٹریٹ کو کوئی کامیابی نہ ہوئی وہاں بھی ووٹ نہ ملنے سے ایڈریس دینے کا سرکاری ریزولوشن پاس نہ ہو سکا۔ دیناج شاہی کے بڑے بڑے تعلقدار و رئیس جو ہمیشہ ہر کام میں حصہ لیتے تھے اچانک بیمار پڑ کر ہوا بدلنے کے لیے دوسرے شہروں میں چلے گئے۔

دوشنبہ کے دن صبح کے وقت شہر والوں کو ایک عجیب سین دکھائی دیا۔ سبودہ بابو کے مکان کی آرایش ہو رہی ہے۔ دس بارہ آدمی کام پر لگے ہوے ہیں۔ دیوار اور جھاؤ کی پتیوں سے دیواروں پر قسم قسم کی بیلیں بنائی گئی ہیں۔ سبودہ بابو کے دروازہ پر بانس کا پھاٹک بنایا گیا ہے

اور اسکی زینت کیلیے کے پتوں اور گیندے کے پھولوں سے بڑھائی گئی ہے۔ رنگین کاغذ کی جھنڈیاں مکان کے چاروں طرف لگائی گئی ہیں۔ پھاٹک کے سامنے سڑک کے کنارے ہرے بھرے گملے رکھے ہوئے ہیں جنکو سرسبز رکھنے کے لیے ایک آدمی پانی چھڑک رہا ہے، دن کے ایک بجے تک سبودھ بابو اپنے مکان کو سجاتے رہے اس کے بعد کھانا کھاکر ایک درخواست لکھ کر پولیس کے دفتر میں پہونچے۔ درخواست میں لکھا تھا" لاٹ صاحب بہادر کے خیر مقدم کی خوشی میں کل رات کو مجھے اپنے مکان کے سامنے آتشبازی چھڑانے کی اجازت دی جائے" درخواست پیش ہوتے ہی فوراً منظور ہوگئی اور سبودھ بابو اپنے گھر واپس ہوئے۔ یہاں آکر وہ پھر اپنے مکان کو سجانے لگے۔ ایک تختہ پر خوشنما سفید کاغذ چڑھاکر سنہرے حروف میں لاٹ صاحب کو "خوش آمدید" لکھ رہے تھے کہ کالج کے کچھ لڑکے ان سے ملنے کیلیے آئے۔ ایک لڑکے نے سبودھ بابو کو سلام کرکے بڑے ادب سے کہا" یہ آپ کیا کر رہے ہیں"

سبودھ بابو نے بڑی نرمی سے جواب دیا" کل لاٹ صاحب آئیں گے انکے آنے کی خوشی میں اپنا مکان سجا رہا ہوں۔"

"یہاں کا کوئی آدمی بھی تو اپنا مکان نہیں سجاتا، آپ کیوں سجاتے ہیں۔"

"مکان سجانے میں تو کوئی حرج نہیں ہے۔"

"تقسیم بنگالہ سے سب لوگوں کے دل دکھے ہوئے ہیں، یہ بھی کوئی خوشی کرنے کا موقع ہے؟"

"رنج کس بات کا، مجھے تو سب لوگ ہنسی خوشی میں مگن دکھائی دیتے ہیں۔"

"کیا آپ تقسیم بنگالہ سے خوش ہیں؟"

اب سبودھ بابو بڑی مشکل میں پڑے۔ تھوڑے دن ہوئے شہر میں ایک جلسہ ہوا تھا اُس میں سبودھ بابو نے کہہ دیا تھا کہ جب تک تقسیم بنگالہ کا بدلہ سرکار سے نہ لیا جائے گا اُس وقت تک کسی کو خوشی حاصل نہیں ہو سکتی۔ سبودھ بابو نے لڑکوں کو کوئی جواب نہ دیا تو وہ سب ان کی خوشامد کرنے لگے" ہم سب آپ کے پاؤں چھوتے ہیں، آپ اپنا مکان نہ سجائیے"

سبودھ بابو نے جواب دیا" مکان کے سجانے میں میرا بہت خرچ ہوا ہے۔"

لڑکے بولے" سچ بتائیے آپ کا کتنا خرچ ہوا ہے۔ ہم لوگ اسکول میں چندہ کرکے آپ کا نقصان پورا کردیں گے۔ اگر اجازت ہو تو ہم ابھی آپ کی آرائش کو خراب کردیں۔"

سبودھ بابو کو بہت برا لگا، غصہ میں بولے" جاؤ یہاں سے بھاگ جاؤ، دق مت کرو۔

تم لوگ خواہ مخواہ ہر ایک کام میں کود پڑتے ہو۔ جاؤ پڑھو لکھو تعلیم حاصل کرنا ہی تمہاری زندگی کا مقصد ہونا چاہیے" لڑکے ناامید ہو کر واپس چلے گئے۔ سبودہ بابو نے سوچا کہ لڑکے بہت شریر ہوتے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ رات کو آکر آرائش کو بگاڑ دیں۔ یہ خیال کرتے ہی سبودہ بابو اسی وقت پولیس سپرنٹنڈنٹ کے بنگلہ کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں جاکر معلوم ہوا کہ صاحب بہادر مجسٹریٹ صاحب کی کوٹھی پر گئے ہیں۔ سبودہ بابو مجسٹریٹ صاحب کے بنگلہ پہ پہنچے اور اپنا کارڈ اندر بھیج دیا۔

سبودہ بابو فوراً اندر بلا لیے گئے۔ مجسٹریٹ صاحب کے کمرے میں سپرنٹنڈنٹ صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ سبودہ بابو نے دونوں افسروں کو جھک جھک کر سلام کیا۔

سپرنٹنڈنٹ۔ "کیوں بابو کیا چاہتے ہو؟"

سبودہ۔ "حضور کل لاٹ صاحب کے آنے کی خوشی میں میں نے اپنا مکان سجایا ہے۔ کئی آدمیوں سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ اسکول اور کالج کے لڑکے رات کو میری تمام آرائش کو خراب کر دیں گے۔"

سپرنٹنڈنٹ صاحب کچھ سوچ کر کہنے لگے "کیا آپ ہی نے آج آتشبازی چھوڑنے کی اجازت مانگی تھی؟"

"جی حضور"

سپرنٹنڈنٹ صاحب نے مجسٹریٹ صاحب سے مخاطب ہو کر کہا "انہیں بابو صاحب کے متعلق میں ابھی آپ سے ذکر کر رہا تھا۔

"سبودہ بابو آپ اس کے متعلق کوئی فکر نہ کریں۔ آپ کے مکان کے سامنے رات بھر پہرہ دینے کے لیے چار کانسٹبل تعینات کر دوں گا۔"

مجسٹریٹ صاحب نے سبودہ بابو سے مسکرا کر پوچھا "آپ بنگالی ہیں؟"

"جی حضور"

"آپ کے دل میں سرکار کی محبت دیکھ کر مجھے خوشی معلوم ہوتی ہے۔ آپ بہت عقلمند معلوم ہوتے ہیں۔ کیا آپ کل دربار میں جانے کی خواہش رکھتے ہیں؟"

سبودہ بابو نے بڑے ادب سے جواب دیا "جی حضور۔ یہ تو میری بڑی خوش قسمتی ہوگی"

"بہت خوب۔ میں آپ کو دربار کا کارڈ دیتا ہوں۔ آپ کا نام ———"

سبودہ بابو نے اپنا نام بتایا اور مجسٹریٹ صاحب نے کارڈ پر سبودہ بابو کا نام لکھ کر انکو دے دیا۔ سبودہ بابو نے جھک کر سلام کیا اور کارڈ لیکر خوش خوش گھر واپس ہوئے۔

دوسرے دن ٹھیک وقت پر لاٹ صاحب بہادر تشریف لائے۔ جس وقت لاٹ صاحب کی موٹر سبودہ بابو کے مکان کے سامنے آئی سبودہ بابو نے سر جھکا کر سلام کیا۔ لاٹ صاحب نے دونوں ہاتھوں سے سلام کا جواب دیا۔ سبودہ بابو کے آراستہ پیراستہ مکان کے پھاٹک پر سنہرے حرفوں میں لکھا ہوا تھا

"خوش آمدید - زندہ باد لارڈ فلر"

لاٹ صاحب بہادر کی بھی اس پر نظر پڑی اور وہ مسکرائے۔ موٹر نظر سے اوجھل ہوگئی اور سبودہ بابو اپنے گھر میں گھس گئے۔

(۴)

دس بجے دربار کا وقت تھا۔ سبودہ بابو کرایہ کی گاڑی میں بیٹھ کر وہاں ۹ بجے ہی پہونچ گئے اور گاڑی واپس کردی۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ واپسی میں پیدل ہی چلیں گے"

دربار میں بہت کم آدمی آئے تھے۔ تعلقداروں اور زمینداروں کی بہت کم تعداد تھی۔ زیادہ تر ملازمت پیشہ لوگ دکھائی دیتے تھے۔ جج، ڈپٹی، منصف وغیرہ سرکاری نوکروں سے دربار بھرا ہوا تھا۔ دربار بھرنے کے لیے کچہری کے عملہ کو بھی کارڈ دیدیا گیا تھا اس سے اُن غریبوں کی جان بڑی مصیبت میں تھی۔ بیچاروں کی کم تنخواہ، اسی میں کسی طرح روپیٹ کر گزارہ کرتے تھے۔ کچہری جانے کے لیے کل ایک جوڑا کپڑا تھا، وہ بھی دربار کے لایق نہیں بہتوں نے مانگ کر کپڑے اکٹھا کیے، جن کو مانگنے پر بھی نہیں ملے وہ اپنے پھٹے پرانے کپڑے ہی پہنے دربار میں حاضر ہوے، کیونکہ غیر حاضری کرنے میں برخاست ہو جانے کا ڈر تھا۔ وقت پر سفید بالوں والے ہنس مکھ فلر صاحب نے دربار میں قدم رنجہ فرمایا۔ ہندو لوگ فلر صاحب کی "جے" کہکر کھڑے ہوگئے اہل اسلام نے "مرحبا" کہکر اپنی خوشی ظاہر کی۔ لاٹ صاحب نے انگریزی میں لکچر دیا۔ اسکے بعد رسم تعارف عمل میں آئی۔ مجسٹریٹ صاحب ایک ایک کر کے بڑے آدمیوں کو لاٹ صاحب کے سامنے پیش کرنے لگے۔ سبودہ بابو بھی ہمت کر کے مجسٹریٹ کے سامنے جا کھڑے ہوے۔ مجسٹریٹ صاحب نے انکو بھی لاٹ صاحب سے ملا دیا۔ فلر صاحب سبودہ بابو سے ہاتھ ملا کر بولے "کیا تم نے بھی میری آمد پر مکان سجا کر اپنی خوشی کا اظہار کیا تھا؟"

"جی حضور"

"تمہارا مکان خوب سجا ہوا تھا۔ میں تمہاری خوشی کی قدر کرتا ہوں۔ تم وکیل ہو؟"

"جی حضور"

"وکیل حکومت کے بڑے دشمن ہوتے ہیں۔ اُن سے میں بہت ناخوش ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم کو سریندر بابو کے اشارے پر بندر کی طرح ناچنا پسند نہیں ہے۔ تم مجھے سمجھدار معلوم ہوتے ہو"

"میں نے دوسروں کے بہکانے سے اپنا رویہ ترک نہیں کیا"

"بہت ٹھیک۔ تم شام کو ہم سے گورنمنٹ ہاؤس میں خاص ملاقات کرو" یہ کہکر فلر صاحب نے سبودہ بابو کو رخصت کیا۔ اس کے بعد دوسروں کی باری آئی۔ پھر دربار برخاست ہوا۔ سبودہ بابو جس وقت دربار سے باہر نکل رہے تھے اسوقت مجسٹریٹ صاحب نے دوڑ کر سے آکر لاٹ صاحب کی "خاص ملاقات" کا کارڈ دیا اور کہا "تمہاری قسمت اچھی ہے۔ لاٹ صاحب نے تم کو خود طلب کیا ہے۔ ٹھیک وقت پر پہونچ جانا" سبودہ بابو نے "اچھا حضور" کہکر سلام کیا۔

"خود بخود یہ کیا ہوگیا" دو تین دن ہوئے جگت بابو نے مذاق میں کہا تھا "دربار کا کارڈ ملے گا "خاص ملاقات" ہوگی۔ یہ تو سب کچھ ہوگیا۔ اب سرکاری وکیل ہی ہونا باقی رہ گیا ہے" تعجب کی بات ہے جو خواب میں بھی نہیں سوچا تھا وہ ہوگیا۔ معلوم ہوتا ہے اب میرے اچھے دن آگئے" اسی قسم کی دل سے باتیں کرتے ہوئے سبودہ بابو اپنے گھر پہونچے۔ اور مکان کے سامنے کھڑے ہوکر آرایش دیکھنے لگے۔ لاٹ صاحب نے سجاوٹ کی تعریف کی تھی۔ ٹکٹکی لگا کر سبودہ بابو اپنی کارگزاری دیکھنے لگے۔ اس وقت ایک اُفتاد پڑی۔ سبودہ بابو کے مکان کے قریب ہی ایک وکیل کا مکان تھا۔ اُسکی چھت پر سے کچھ شریر لڑکوں نے ایک گملہ جس میں گوبر اور کیچڑ ملا ہوا تھا، سبودہ بابو کے سر پر پھینک دیا۔ سبودہ بابو نے چونک کر اوپر آنکھ اٹھائی۔ کوئی ہنس ہنس کر کہہ رہا تھا "تمہارے باپ کو دھونے کیلئے گوبر کا پانی پھینکا گیا ہے، ایشور تمہارا منہ کالا کرے"

گوبر اور کیچڑ ملا ہوا پانی سبودہ بابو کی پگڑی سے بہہ کر اُنکے کوٹ پر گرا اور وہاں سے ہوتا ہوا وہ گندہ پانی پتلون کو خراب کرتا ہوا جوتوں میں بھر گیا۔ سبودہ بابو جوتا چھپ چھپ کرتے ہوئے جس قدر جلد ہوسکا اپنے گھر میں گھس گئے۔

(۵)

سبودہ بابو کے پاس ایک ہی سوٹ تھا۔ اب کیا پہن کر خاص ملاقات کے لیے جائیں۔ کچھ سوچ کر سبودہ بابو مسٹر ناتھ ڈپٹی مجسٹریٹ کے مکان پر گئے اور انکو اپنی حالت دکھا کر ایک سوٹ عاریتًہ مانگا۔

ڈپٹی صاحب نے کہا "بھائی صاحب آپ کے پاس پوشاک نہ ہو تو میں بڑی خوشی سے دیدوں گا لیکن یہ تو بتائیے کہ آپ کے سر پر بھوت کیوں سوار ہے۔ ہم لوگ غلامی کرتے ہیں ہمکو مجبورًا سب کچھ کرنا پڑتا ہے لیکن آپ نے کیوں مکان سجایا تھا، دربار میں جانے کی کون ضرورت تھی۔ خاص ملاقات کے لیے آپ کو کیوں خلش ہے؟"

سبودہ بابو یہ سُن کر سُست ہوگئے اور کہنے لگے "میں کیا کروں۔ لاٹ صاحب بہادر نے خود بُلایا ہے۔ اب اگر نہ جاؤں گا تو بہت بُرا ہوگا"۔

ڈپٹی صاحب کے دل میں اچانک یہ بات پیدا ہوگئی کہ سبودہ بابو سے اس قسم کی باتیں کرنا ٹھیک نہیں ہوا، اگر یہ جاکر مجسٹریٹ صاحب سے کہدیں تو میری نوکری جاتی رہیگی، اس سے ذرا سنبھل کر بولے "اگر آپ کو لاٹ صاحب نے خود بلایا ہے تو ضرور جانا چاہیے، ٹھہریے میں آپ کو ایک عمدہ سُوٹ لائے دیتا ہوں"

مختصر یہ کہ لاٹ صاحب سے سبودہ بابو کی "خاص ملاقات" ہوگئی۔ رات کو انکے مکان میں آتشبازی بھی چھوٹی۔ قریبًا ۱۰ بجے رات کو جگت بابو سر پر چادر لپیٹے ہوئے سبودہ بابو سے آکر ملے اور کہنے لگے "شاباش! تم نے تو کمال کر دیا۔ جو کچھ کہا تھا وہی ہوا۔ کیا لاٹ صاحب سے گورنمنٹ پلیڈری کا ذکر چھیڑا تھا؟

سبودہ بابو نے جواب دیا "کیسی بے وقوفی کی باتیں کرتے ہو۔ ابھی سے اگر میں نوکری کی درخواست کروں گا تو سب معاملہ خراب ہو جائے گا۔ زیادہ خوشامدی بننا بھی اچھا نہیں ہے ابھی تو مجھے بہت کچھ کرنا ہے"۔

"اب کیا کروگے؟"

"تار کا فارم ہے؟"

"ہے" جگت بابو نے تار کا فارم دیا۔ سبودہ بابو نے کہا "بنگالی" "امرت بازار پتر کا" اور "بندے ماترم" کو تار بھیجوں گا"

"کس بات کا؟"

آپکی کارگذاری کا"

"یہ مطلب تو پورا ہوچکا ہے، کیونکہ "بنگالی" کے ایڈیٹر سکمار بابو نے تو لکھدیا ہے کہ دیناج شاہی کے وکیلوں میں صرف سبودھ بابو نے اپنے مکان کو سجایا تھا اور دربار میں گئے تھے۔

"اور گوبر والی بات؟"

"شاید اس کا ذکر نہیں کیا"

"خاص بات تو یہی ہے۔ سکمار بابو نے اپنے اخبار میں مجھے بہت سی گالیاں بھی دی ہیں۔ حالانکہ اسکی سخت ضرورت ہے۔ لڑکوں کا میرے اوپر گوبر اور کیچڑ ملا ہوا پانی پھینکنا، میرا مذاق اڑانا، گالی دینا، یہ ایسی باتیں ہیں جن کو اخباروں میں چھپ جانا چاہیے" یہ کہکر سبودھ بابو نے تار کا مسودہ کیا، اور للت بابو نے نقل کرکے اسی وقت روانہ کر دیا۔

دوسرے دن جب سبودھ بابو سوکر اٹھے تو دیکھا کہ کوتوالی کے دو دارو غہ حاضر ہیں۔ سبودھ بابو نے جب اُن سے آنے کی وجہ پوچھی تو انھوں نے کہا "جناب والا! ہم نے سنا ہے کہ کل جب آپ دربار سے واپس آرہے تھے تو کسی نے چھت پر سے آپ کے اوپر گوبر کا پانی پھینک دیا تھا؟"

"جی ہاں"

"اسکی خبر صاحب لوگوں کو بھی مل گئی ہے۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب بہادر نے ہم لوگوں کو حکم دیا ہے کہ اگر آپ مقدمہ چلانا چاہیں تو ہم لوگ گواہ اکٹھے کردیں۔ افسوس ہے کہ یہ معاملہ پولیس خود نہیں چلا سکتی، ورنہ آج ہی ہم لوگ مناسب کارروائی کرلیتے اور جن لوگوں نے آپ کے ساتھ شرارت کی ہے انکو حوالات میں بند کر دیتے۔ خیر آپ آج ہی نالش کر دیجیے"

سبودھ بابو نے کہا "میں نے تو کسی کو گوبر کا پانی پھینکتے نہیں دیکھا، کس کے خلاف مقدمہ دائر کروں"

ایک دارو غہ جی بولے "جس مکان سے آپ کے اوپر پانی پھینکا گیا ہے اُس میں جو لڑکے رہتے ہیں اُنکے نام معلوم کرکے ہم آپ کو بتائے دیتے ہیں۔ انکے باپ وکیل صاحب نے ضرور اُن لڑکوں کو [illegible] ہوگی، ان کا نام بھی لکھا دیجیے"

"سبودھ بابو نے تھوڑی دیر سوچ کر کہا" سپرنٹنڈنٹ صاحب سے میرا سلام کہنا اور کہدینا کہ میں نے کسی کو نہیں دیکھا، شناخت کے وقت پہچان نہ سکونگا اس وجہ سے نالش کرنے میں

کوئی فائدہ نہیں ہے"۔

دونوں داروغہ رنجیدہ ہوکر واپس چلے گئے۔ سبودہ بابو حقہ پینے لگے اور سوچتے رہے کہ جن لڑکوں نے میرے اوپر گوبر پھینکا ہے اُنھوں نے میری بڑی ہتک کی ہے، اسکی خبر اب تک شاید کلکتہ پہونچ گئی ہوگی۔ ان سب باتوں سے میرا کام نکل جائے گا۔ بدنام اگر ہونگے تو کیا نام نہ ہوگا"

سبودہ بابو نے جو سوچا تھا آخر کار وہی ہوا۔ تین دن کے اندر ہی گوبر والی بات مُلک کے چاروں طرف پھیل گئی۔ بنگالی اخباروں کے ایڈیٹروں نے گالی سے بھرے آرٹیکل لکھے۔ کسی نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ "سبودہ بابو ایسے غدار کا اور قوم کے دشمن کو سوسائٹی سے الگ کردینا چاہیے" ایک ہزل گو شاعر نے سبودہ بابو پر ایک نظم لکھی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ "گوبر بڑی ناپاک چیز ہے، لاٹ صاحب سے ہاتھ ملاکر سبودہ بابو نے پاپ کیا تھا لیکن وہ گوبر کے پانی سے دھل گیا" انگریزی اخباروں نے سبودہ بابو کی تعریف کی اور لکھا "مشرقی بنگال میں اب بھی بہت سے پڑھے لکھے آدمی سرکار کے سچے خیر خواہ ہیں"

دیناج شاہی میں بھی سبودہ بابو کی بڑی ذلت ہوئی۔ جب یہ بار لائبریری میں جاتے تھے تو وکلاء انکو جلی کٹی باتیں سنایا کرتے تھے۔ سبودہ بابو کی عدم موجودگی میں ایک وکیل نے جگت بابو سے کہا "کیوں جی تمھارے دوست کا کیا مطلب ہے۔ داروغہ بننا چاہتے ہیں یا ڈپٹی کلکٹر۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا"

جگت بابو نے غصہ میں جواب دیا "بھئی اُس کمبخت کا نام نہ لو، مجھے تو اُس سے نفرت ہے"

"تمھارے ساتھ تو بڑی دوستی"

"بالکل جھوٹ۔ میں ایسے آدمی سے دوستی کرنا بھی اپنی ہتک سمجھتا ہوں"

"کبھی تم نے اس پاگل سے کوئی بات چیت بھی کی ہے کہ نہیں"

جگت بابو نے منہ بناکر جواب دیا "میں نے تو اُسی دن سے بات چیت کرنا ترک کردی ہے جس دن اس نے لاٹ صاحب کا خیر مقدم کیا ہے"

(۶)

لاٹ صاحب کے جانے کے ایک ماہ بعد دیناج شاہی میں ایک مشہور وکیل کشوری موہن کے لڑکے کا بیاہ ہوا۔ کشوری بابو بہت نیک اور ملنسار آدمی تھے۔ سبودہ بابو کا جب سے جگ

مذاق اُڑاتے تو یہ اکثر سبودہ بابو کی طرفداری کیا کرتے تھے اور کہا کرتے "اس میں کوئی شک نہیں کہ سبودہ بابو نے اچھا کام نہیں کیا۔ جسکی وجہ اُنکی ناتجربہ کاری ہے۔ تم لوگ انکو زیادہ نہ دق کیا کرو۔ اخبار والوں نے ہی بیچارے کو اتنی گالیاں سُنائی ہیں کہ اگر کوئی اَور ہوتا تو پاگل ہوجاتا۔ بہت کافی ہتک ہوچکی ہے اب زیادہ شرمندہ نہ کرو" غرضکہ جب کشوری بابو کے لڑکے کے بیاہ کا نیوتہ بانٹا جانے لگا تو انکے احباب نے بہت چاہا کہ سبودہ بابو کو شادی کی تقریب میں نہ بُلایا جائے لیکن نیکدل کشوری بابو نے ان لوگوں کا کہنا نہ مانا اور سبودہ بابو کو بھی نیوتہ بھیجدیا۔

شام کا وقت تھا۔ سبودہ بابو اپنی بیٹھک میں حقہ پی رہے تھے کہ اتنے میں اپنے منہ کو چادر سے چھپائے ہوئے انکے دلی دوست جگت بابو آ گئے۔

"آؤ بھائی آؤ۔ آج کل تو آپ کے درشن ہی نہیں ہوتے۔ کہیئے کیا حال ہے"

جگت بابو نے کہا "تم نے ایسا کام ہی کیا ہے جسکی وجہ سے تمھارے پاس آتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا ہے کہ کہیں مجھے تمھارے پاس کوئی دیکھ نہ لے۔ اچھا اب یہ بتاؤ کہ تمھیں سرکار سے کچھ فائدہ بھی ہوا یا یوں ہی تمھاری قسمت میں گالی کھانا لکھا تھا۔"

"فائدہ ضرور ہوگا، استقلال سے سب کام بن جاتے ہیں۔"

"میں نے اخبار میں پڑھا ہے کہ فریدسنگھ کے سرکاری وکیل برخاست ہونیوالے ہیں، تم اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دو، فوراً ایک درخواست لکھ کر قسمت آزمائی کرو۔"

"نہ بھائی، اتنی بدنامی اُٹھا کر اب مجھے وکالت سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ سرکاری وکیل ہونے سے میری عزت نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ وکلا مجھ سے نفرت کریں گے، وکالت سے اب مجھ کو دلی خوشی حاصل نہیں ہوسکتی۔"

"تب کیا کروگے؟"

"اگر ڈپٹی کلکٹری مل جائے تو بہت اچھا ہو، کیونکہ اُس میں بڑی عزت ہے"

"تو پھر ڈپٹی کلکٹری ہی کی درخواست کیوں نہیں کرتے۔"

"ابھی نہیں، ذرا اور کارروائی کرلوں"

"اب کیا باقی رہ گیا ہے"

"تم لوگ مجھے برادری سے خارج کردو۔ اسکے بعد میرا مقصد حاصل ہو جائیگا اور

ڈپٹی کلکٹری مجھے بڑی آسانی سے مل جائے گی"

"میں اسکیلے تمھیں برادری سے خارج کر دوں تو اس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا"

"کشوری بابو نے اپنے لڑکے کی تقریب میں تھیں مدعو کیا ہے یا نہیں؟"

"ہاں - میں تو وہاں ضرور جاؤں گا، اور کیا تم نہ جاؤگے؟"

"ضرور جاؤں گا"

"تھارے باپ ... میں لوگوں نے اعتراض کیا تھا لیکن کشوری بابو نے کسی کی ... نہیں مانی"

"یہ تو بڑا ... اب تم ایک کام کرو۔ جس وقت سب لوگ کھانا کھانے بیٹھیں تو تم کھڑے ہو جانا ... میں بغیر کھائے ... کشوری بابو کے یہاں سے چلا آؤں گا اور اپنے گھر آ کر اس کی خبر ... کو بھیج دوں گا"

جگت بابو نے کہا "سبودھ بابو جانے دو اب معاملہ کو زیادہ نہ بڑھاؤ یہ کام مجھ سے نہ ہوگا" بہت کہنے سننے سے جگت بابو راضی ہوئے اور ایک پیالی چاء پی کر رخصت ہوئے۔

دوسرے دن کشوری موہن بابو کی دعوت میں سبودھ بابو کی منشا پوری ہوئی۔ جگت بابو نے جب دیکھا کہ سبودھ بابو کھانے کے لیے بیٹھے تو اُنھوں نے کھڑے ہو کر برادری سے کہا "بھائیو معاف کرنا میں یہاں بھوجن نہ کروں گا۔ سبودھ بابو جیسے قوم و ملک کے دشمن کے ساتھ بھوجن کرنا پاپ ہے" یہ سنتے ہی اور بھی کئی لوگ یہ کہتے ہوئے "ہم بھی سبودھ بابو کے ساتھ بھوجن نہ کریں گے" اُٹھ کھڑے ہوئے۔ سبودھ بابو یہ رنگ دیکھ کر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے "ایک آدمی کے واسطے آپ لوگ برادری سے کیوں باہر ہو رہے ہیں۔ اس سے تو یہی بہتر ہے کہ میں خود ہی یہاں سے چلا جاؤں تاکہ میری وجہ سے برادری کی بدنامی نہ ہو" یہ کہتے ہوئے سبودھ بابو جلدی سے باہر نکل گئے۔ لیکن کشوری بابو نے اُنھیں روک کر کہا "سبودھ بابو، آؤ میں تمھیں الگ کھلا دیتا ہوں"

"اتنی بے عزتی مجھ سے برداشت نہ ہوگی" کہکر سبودھ بابو نے کشوری بابو سے زبردستی اپنا پیچھا چھڑایا اور اپنے گھر پہونچے۔ وہاں جا کر اُنھوں نے دوسرون کے نام سے کشوری بابو کے یہاں کا حال لکھ کر بھیج دیا۔ اخباروں نے چھپ شروع کیا۔ بنگالی اخباروں نے لکھا "دنیا ج شاہی والوں نے جو سلوک سبودھ بابو کے ساتھ کیا وہ ہر طرح سے قابل تحسین ہے"

(۷)

ایک مہینہ اور بھی گذر گیا۔ اپنے مکان میں بیٹھے ہوئے سبودہ بابو، جگت بابو کو "انگلشمین" کا تازہ نمبر دکھا رہے ہیں، اس میں لکھا ہوا ہے "ہم کو معتبر ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ دیناج شاہی کے مشہور وکیل سبودہ چندر لہدار کو آسام گورنمنٹ نے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کے لیے نامزد کیا ہے۔ پولیس کے محکمہ میں ایسے قانون داں وکیلوں کی سخت ضرورت ہے"۔

سبودہ بابو نے کہا "جگت بابو مجھے سخت افسوس ہے کہ اتنی آفت اٹھائی گالیاں کھائیں، اسکا انعام یہ ملا کہ پولیس کی نوکری نصیب ہوئی"۔

جگت بابو بولے "گورنمنٹ نے تو اچھا ہی سمجھ کر تم کو یہ عہدہ پیش کیا ہے۔ میرے خیال میں تو ڈپٹی کلکٹری سے پولیس کا یہ عہدہ بڑھ کر ہے۔ اس میں تنخواہ بھی زیادہ ہے"۔

سبودہ بابو۔ اس میں شک نہیں کہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کی تنخواہ زیادہ ہے۔ لیکن جب وقت آپڑتا ہے تو بڑی مصیبت اٹھانی پڑتی ہے۔ تم خود دیکھو کہ میں نے تھوڑے ہی دن گورنمنٹ کی مصنوعی خیرخواہی کی ہے اسی میں میرا ناک میں دم آگیا ہے۔ پولیس کی نوکری کرنے سے تو مجھے علانیہ ملک کا دشمن بنا پڑے گا۔ کسی نے ولایتی نمک کہیں پھینکدیا "جاؤ پکڑ لاؤ" کسی لڑکے نے "بندے ماترم" کہا "گرفتار کر لو" انہیں وجوہ سے مجھے پولیس کی نوکری پسند نہیں ہے۔ اس سے تو وکالت میں میرا بھوکا مرنا اچھا ہے"۔

جگت بابو۔ میرے خیال میں تو اگر گورنمنٹ کو معلوم ہوجائے کہ تم ڈپٹی کلکٹری سے خوش ہوجاؤ گے تو وہ تمکو یہی عہدہ پیش کریگی۔ بہتر ہے کہ تم اپنی رائے سے گورنمنٹ کو مطلع کردو یا شیلانگ جاکر تم خود ایکدفعہ چیف سکرٹری سے مل آؤ"۔

"ابھی تو گزٹ میں کوئی اعلان نہیں ہوا۔ "انگلشمین" کا یہ نوٹ دیکھ کر میں کیسے کوئی کاروائی کرسکتا ہوں"

"انگلشمین" کا یہ نوٹ ہی تم سرکاری نوٹ کے برابر سمجھو"۔

آخرکار یہی بات سبودہ بابو نے مان لی اور اسی دن انھوں نے شیلانگ کا سفر کیا۔ دوسرے ہفتے کے آسام گزٹ میں سرکاری طور سے اعلان کردیا گیا کہ سبودہ بابو ڈپٹی مجسٹریٹ بنا دیے گئے۔

آجکل سبودہ بابو ڈھاکہ کے ڈپٹی مجسٹریٹ ہیں۔ خوش نصیبی سے اسوقت تک انکو کوئی سیاسی مقدمہ نہیں کرنا پڑا۔ اب وہ گڑ کی چائے نہیں پیتے بلکہ عمدہ کاشی پور کی چینی استعمال فرماتے ہیں اور دو روپیہ سیر والی تمباکو کے کش لگاتے ہیں۔

اعظم کریوی، سابق ایڈیٹر اکبر

میزانِ رباعی

رباعی کے متعلق جتنے امور مشہور ہیں وہ یہ ہیں کہ بحر ہزج مثمن سے اختراع کی گئی ہے۔ اسکے دس رکن ہیں۔ ایک سالم مفاعیلن اور نو مزاحف مفعولن اخرم مفعول اخرب فاعلن مقبوض مفاعیل مکفوف فاعلن اشتر فعل مجبوب فعول اہتم فع ابتر فاع ازل۔ ان میں سے چار وزن فع، فاع، فعول، فعل عروض و ضرب کے ساتھ مخصوص ہیں۔ چار مفاعیلن، مفاعلن، مفاعیل فاعلن حشو کے ساتھ مخصوص ہیں بقیہ دو مفعول مفعولن صدر و حشو میں عام ہیں۔ اگر انکو آپس میں ضرب دی جائے تو دو سو اٹھاسی وزن پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں سے کچھ اوزان کی نشستِ ارکان نامانوس ہے اس لیے ع

وتد پئے وتد است و سبب پئے سبب است

کا کلیہ قائم کیا گیا۔ یعنی جس رکن کا آخر وتد ہو اُس کے رکن مابعد کا آغاز وتد سے ہو اور جو رکن سبب پر ختم ہو اسکے بعد والے رکن کی ابتدا سبب سے ہونا چاہیے اور مندرجہ ذیل چوبیس وزن مروج ہیں:—

اوزان اخرب الصدر و الابتداء

(۱) مفعول مفاعیل مفاعیل فعل
(۲) مفعول مفاعیل مفاعیل فعول
(۳) مفعول مفاعیل مفاعیلن فع
(۴) مفعول مفاعیل مفاعیلن فاع
(۵) مفعول مفاعلن مفاعیل فعل
(۶) مفعول مفاعلن مفاعیل فعول
(۷) مفعول مفاعلن مفاعیلن فع
(۸) مفعول مفاعلن مفاعیلن فاع
(۹) مفعول مفاعیلن مفعول فعل
(۱۰) مفعول مفاعیلن مفعول فعول

اوزان اخرم الصدر و الابتداء

(۱) مفعولن مفعولن مفعولن فع
(۲) مفعولن مفعولن مفعولن فاع
(۳) مفعولن مفعولن مفعول فعل
(۴) مفعولن مفعولن مفعول فعول
(۵) مفعولن مفعول مفاعیل فعل
(۶) مفعولن مفعول مفاعیل فعول
(۷) مفعولن مفعول مفاعیلن فع
(۸) مفعولن مفعول مفاعیلن فاع
(۹) مفعولن فاعلن مفاعیل فعل
(۱۰) مفعولن فاعلن مفاعیل فعول

(۱۱) مفعول مفاعیلن مفعولن فع (۱۱) مفعولن فاعلن مفاعیلن فع
(۱۲) مفعول مفاعیلن مفعولن فاع (۱۲) مفعولن فاعلن مفاعیلن فاع

اس کلیہ کے الحت چند اوزان تذکرۂ صدر غلط ہیں۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ مفعولن اور مفاعیلن دونوں سبب پر ختم ہوتے ہیں لہذا انکے بعد والے رکن کی ابتدا سبب سے ہونا چاہیے مگر کالم اول کے نمبر ۴ - ۸ - ۱۲ - اور کالم دوم کے نمبر ۲ - ۸ - ۱۲ کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں اس قاعدہ کی پابندی نہیں کی گئی۔ مفعولن اور مفاعیلن کے بعد وتد مفروق فاع موجود ہے۔ مندرجۂ بالا اوزان کے علاوہ چند وزن اور بھی پیدا ہوتے ہیں جن کے عدم صحت کی دلیل بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ غیر مروج ہیں۔ اسکے متعلق مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اُردو والوں نے کالم اول کے ۹ لغایت ۱۲ - اور کالم ۲ کے ایک لغایتہ ۸ وزنوں میں رباعی نہیں لکھی مگر یہ وزن اپنی جگہ پر صحیح ہیں۔ اگر کوئی شخص ان میں سے کسی وزن پر رباعی یا کوئی مصرع رباعی لکھے تو ناموزوں نہ ہوگا مگر مندرجۂ ذیل اوزان کو سب غلط کہیں گے۔ حالانکہ از روے قاعدہ صحیح ہیں۔ ملاحظہ ہوں :-

اوزان احزب الصدر والابتدا	اوزان احزم الصدر والابتدا
(۱) مفعول مفاعیل مفاعلن فعل	(۱) مفعولن فاعلن مفاعلن فعل
(۲) مفعول مفاعیل مفاعلن فعول	(۲) مفعولن فاعلن مفاعلن فعول
(۳) مفعول مفاعلن مفاعلن فعل	(۳) مفعولن مفعول مفاعلن فعل
(۴) مفعول مفاعلن مفاعلن فعول	(۴) مفعولن مفعول مفاعلن فعول
(۵) مفعول مفاعیلن فاعلن فعل	(۵) مفعولن مفعولن فاعلن فعل
(۶) مفعول مفاعیلن فاعلن فعول	(۶) مفعولن مفعولن فاعلن فعول

ان کے علاوہ ایک بھونڈا بنگلی اور بھی برتی جاتی ہے کہ چار چار وزن ایک ایک رباعی میں جمع کیے جاتے ہیں۔ غرض جتنی بھونڈا بنگلیاں ہو سکتی تھیں وہ سب برتی گئیں۔ کچھ اوزان جو حقیقت میں داخل تھے خارج کیے گئے۔ کچھ بے قاعدہ بڑھا لیے گئے اور جملہ اوزان کا ذہن میں محفوظ رکھنا بھی مشکل۔ یہ سب کچھ کیوں ہوا۔ اس لیے کہ اہل عروض نے تفصیل میں دعوکا کھایا اور ہماری قدامت پسندی نے نکتہ چینی کو عیب سمجھا۔ جو کچھ اسلاف سے ملا، بلاکم وکاست اُس کے حال پر رہنے دیا۔ حالانکہ ضرورت اس امر کی تھی کہ اجمال کی

تفصیل، تطویل کا اختصار کرتے موقع بموقع اپنی ایجادیں شامل کرتے فضولیات کو، چھوڑتے۔ جن لوگوں نے اس طرف توجہ کی اُنھوں نے اسلاف کی ہر بات کو بُرا بتایا اور جدید شاہراہ اختیار کی۔ دونوں فرقوں کے درمیان ایک ناقابل عبور خلیج حائل ہو گئی ہے اگر انصاف سے کام لیکر خذ ما صفا ودع ما کدر پر عمل کریں تو دونوں فرقے پھر ایک ہو سکتے ہیں۔

رباعی کی بیقاعدگیاں تو اوپر تبلائی جا چکی ہیں اب قواعد سنیئے۔ رباعی کے دو وزن ہیں اور دونوں بحر ہزج مثمن سے اختراع کیے ہیں۔ ایک اخرب ملفوف مجبوب مفعول مفاعیل مفاعیل فعل دوسرا اخرب مقبوض ملفوف مجبوب مفعول مفاعلن مفاعیل فعل اس میں صرف تسکین اوسط کے زحاف سے کام لے کر نامانوس ارکان کو حسب ضابطۂ عروضیاں مانوس ارکان سے بدلا ہے۔ تسکین اوسط ایک معمولی زحاف کا نام ہے اور جیسا کہ اسکے نام سے ظاہر ہے تین متواتر حرکتوں کی درمیانی حرکت کے حذف کو کہتے ہیں۔ یعنی جب کسی رکن میں یا ایک رکن کے آخر اور دوسرے رکن کی ابتدا میں تین حرکتیں جمع ہو جائیں تو درمیانی حرکت کو حذف کر سکتے ہیں۔ اہل عروض کا یہ قاعدہ بھی ہے کہ جب کسی رکن میں زحاف کرنے سے کوئی نامانوس کلمہ آئے تو اُسکو مانوس کلمہ سے بدل لیا جائے۔ ان اوزان میں جو تبدیلیاں واقع ہیں اُن کی تشریح درج ذیل ہے:-

(۱) اصلی وزن مفعول مفاعیل مفاعیلُ فعَلَ ہے کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔

(۲) اصلی وزن کے رکن ثالث ورابع کے درمیان تسکین اوسط سے کام لیا تو مفعول مفاعیل مفاعیلُ فْعَلْ ہوا اسکو مفعول مفاعیل مفاعیلن فع سے بدلا۔

(۳) وزن نمبر ۲ کے رکن ثانی وثالث کے درمیان یہی زحاف ہوا تو مفعول مفاعیلم فاعیلن فع پیدا ہوا اُسکو مفعول مفاعیلن مفعولن فع سے تبدیل کیا۔

(۴) وزن نمبر ۳ کے رکن اول ودوم میں تسکین اوسط سے مفعولم فاعیلن مفعولن فع پیدا ہوا اسکو مفعولن مفعولن مفعولن فع سے بدلا۔

(۵) وزن نمبر ۲ کے رکن اول ودوم میں یہ زحاف کیا گیا تو مفعولم فاعیل مفاعیلن فع رہا اسکو مفعولن مفعول مفاعیلن فع سے تبدیل کیا۔

(۶) وزن نمبر ایک کے رکن ثانی وثالث میں سکون وسط کی بدولت مفعول مفاعیلم فاعیل فعل پیدا ہوا اسکو مفعول مفاعیلن مفعول فعل سے بدلا۔

(۷) وزن نمبر ۶ کے رکن اول و دوم میں پھر بھی زحاف عمل میں لایا گیا تو مفعولم فاعیلن مفعول فعل پیدا ہوا اسکو مفعولن مفعولن مفعول فعل سے بدلا۔

(۸) وزن نمبرایک کے رکن اول دوم میں بھی تسکین اوسط کی گئی تو مفعولم فاعیل مفاعیل فعل رہا۔ اسکو مفعولن مفعول مفاعیل فعل سے تبدیل کیا۔

(۹) دوسرا اصلی وزن مفعول مفاعلن مفاعیل فعل اپنی اصلی حالت پر ہے۔

(۱۰) وزن نمبر ۹ کے رکن ثالث ورابع کے درمیان سکون اوسط سے مفعول مفاعلن مفاعیلتُ عَلن پیدا ہوتا ہے اسکو مفعول مفاعلن مفاعیلن فع سے بدلا۔

(۱۱) وزن نمبر۱۰ کے رکن اول دوم میں بھی زحاف کیا گیا تو مفعولم فاعلن مفاعیلن فع ہوا اسکو مفعولن فاعلن مفاعیلن فع سے تبدیل کیا۔

(۱۲) وزن نمبر۹ کے رکن اول دوم میں تسکین اوسط کی وجہ سے مفعولم فاعلن مفاعیل فعل رہتا ہے اسکو مفعولن فاعلن مفاعیل فعل سے بدلا۔

اہل عروض نے اس امر کی اجازت بھی دی ہے کہ آخر مصرع میں حرفِ موقوف بڑھایا جا سکتا ہے اور اسکی وجہ سے نہ بحر بدلتی ہے نہ مصرع ناموزوں ہوتا ہے۔ لہٰذا ان کل اوزان کے آخر میں ایک ایک حرف موقوف بڑھایا جائے تو بارہ[۱۲] وزن اور پیدا ہوں گے اور یہ سب مل کر مروجہ چوبیس وزن ہو جائیں گے اور جو بارہ وزن میں نے پیش کیے تھے وہ بھی پیدا نہیں ہوتے۔ مفعولن اور مفاعیلن کے بعد وتد مفروق فاع بھی استعمال ہو سکتا ہے اور غیر مربوط چوبیس وزنوں کا یاد کرنا بہت مشکل امر تھا اب بہت آسانی کے ساتھ یاد ہو سکتے ہیں اور حافظہ پر بھی بار نہ پڑے گا اور اس امر کی وجہ بھی معلوم ہوگئی کہ رباعی میں چار وزن کیوں جمع ہو سکتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ایک ہی وزن کی اتنی شاخیں ہیں اس وجہ سے جمع کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور رباعی ایک ہی وزن میں ہوتی ہے نہ کہ مختلف وزنوں میں۔

فارسی زبان میں مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ نے چھ رباعیاں اس التزام سے کہی ہیں کہ چوبیس وزن ان میں استعمال کیے ہیں یعنی ہر وزن میں ایک مصرع ہے۔ اسی التزام سے میں نے اردو میں تین رباعیاں کہی ہیں اور بارہ وزنوں میں بارہ مصرعے لکھے ہیں اور اردو کے مروجہ وزن بھی یہی ہیں۔ اسکے علاوہ کسی وزن میں کوئی مصرع اردو رباعی کا نظر سے نہیں گذرا

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مضمون کو ان رباعیوں پر ختم کروں ؎

کیا ممکن ہے محال امکاں ہو جائے　　حسن اور مری نظر سے پنہاں ہو جائے
میں جسکا خیال دل میں کر لوں ہمدم　　وہ شکل تصور میں نمایاں ہو جائے

دیگر

قسمت کا گلہ کاتب تقدیر سے ہے　　کم بختی سب اسی کی تحریر سے ہے
یہ سب سہی لیکن سبب اسکا بھی کچھ　　تقدیر کو میری ضد جو تدبیر سے ہے

دیگر

مسرور ہے جو آج وہ کل ہوگا ملول　　ہے دنیا کا یہی ہمیشہ سے اصول
کلفت میں یاد حق ہر اک کرتا ہے　　غافل نہ خدا کو عیش و عشرت میں بھول

احقر و افقر بندہ غضنفر کان اللہ لہٗ امروہوی

غزل حبیب رامپوری

کیا ہے کیا عدو نے گر کچھ کمال پیدا　　اک دن عروج ہی سے ہوگا زوال پیدا
مجھ کو سنا رہے ہو کیوں داستان دشمن　　یہ باتیں وہ ہیں جن سے ہو اشتعال پیدا
دل کیا ہے جان تک ہیں ہم نذر کرنیوالے　　کب تک نہ ہوگا انکے دل میں خیال پیدا
جو بات تم میں دیکھی وہ ایک میں نہ دیکھی　　تم سا نہ ہوگا کوئی یوسف جمال پیدا
غیروں کی کر رہے ہو تعریف میرے منہ پر　　اس طرز گفتگو سے ہوگا ملال پیدا
مغرور حسن پر ہیں سب سے وہ کہہ رہے ہیں　　اللہ نے کیا ہے مجھ میں کمال پیدا
بے وجہ پھر کسی پر کاہے کو کوئی مرتا　　ہوتا نہ گر جہاں میں حسن و جمال پیدا
خاطر سے میں تمہاری چاہوں گا گر عدو کو　　پھر تو تمہارے دل میں ہوگا خیال پیدا
دل دیکے ان بتوں کو پچھتا رہا ہوں کیا کیا　　خود ہو رہا ہے مجھکو اک انفعال پیدا
پیری کا وقت آیا انجام پر نظر ہے　　یوں ہو رہی ہے دل کو فکر مآل پیدا
تم کو برا بتاؤ کس دن کہا ہے میں نے　　بیکار ہو رہا ہے رنج و ملال پیدا
مقصود اس سے یہ ہے نکتہ نواز ہے وہ　　رخسار پر کیا ہے انکے جو خال پیدا

ناحق حبیب اپنی کیوں عمر کھو رہا ہے
عزت جو چاہتا ہے کر کچھ کمال پیدا

عہد واجد علی شاہ کا ایک باکمال صناع

ہندوستان میں عجب عجب صاحب کمال لوگ گذرے ہیں، اور ہندوستان کے ہر دربار نے اُن کی بہت قدر کی، اور آج بھی معلوم نہیں کس کس فن کے اُستاد اور کاملین زندگی کے دن [illegible] رہے ہیں، لیکن افسوس اگلے زمانہ کے ایسے قدردان آجکل نہیں دکھائی دیتے جو اُن مصیبت زدوں کی کفالت کریں اور اُنکی سرپرستی کرکے زمانہ کے آگے پیش کریں۔ الغرض زمانہ کبھی کاملین سے خالی نہیں رہتا اور نہ شاید آیندہ رہے گا۔

اس وقت میں ایک باورچی کا ذکر کرتا ہوں۔ جب لکھنو کا آخری تاجدار واجد علی شاہ، مٹیا برج میں اپنی زندگی کے دن پورے کر رہا تھا تو اُس وقت دکن حیدرآباد سے ایک باورچی روزگار ترک کرکے کلکتہ آیا اور اس یوسف بے کارواں کے دیدار کا مشتاق ہوا۔ چنانچہ عرضی گزرانی اور شرفِ حضوری سے باریاب ہوا۔ جب بادشاہ سلامت کو اسکے کمال سے حاضرین نے مطلع کیا تو حکم شاہی سے مٹیا برج میں قیام کی جگہ ملی، اور ایک ماہ کے بعد اس باورچی نے سلطان عالم کی حضوری میں عرضی پیش کی کہ غلام حضور میں کوئی نہ کوئی تحفہ پیش کرنا چاہتا ہے، لہذا اشیاے ضروری کی اجازت کا خواہاں ہے۔ بادشاہ نے اس سے پوچھا کہ بھئی کیا شے کھلاؤ گے؟ اُس نے ادب سے عرض کیا کہ آج سہ پہر کو آقائے ولی نعمت فلاں باغ میں جلوہ افروز ہوں، یہ غلام بھی پابوسیِ شاہ کو حاضر رہے گا اور اُس وقت جہاں پناہ اپنے دستِ مبارک سے فلاں درخت سے نارنگیاں توڑ کر نوش فرمائیں۔ چنانچہ حضرت ظل سبحانی نے محظوظ ہوکر اُسکی التماس کو قبول فرمایا، اور داروغہ کو حکم دیا کہ اسکی ضروریات کو مہیا کردے۔ غرض باورچی نے پہلے داروغہ صاحب سے کہا کہ براہ نوازش فلاں چمن کے گرد قناتیں لگوا دیجیے اور کوئی شخص وہاں نہ آئے۔ داروغہ صاحب نے قناتیں کھنچوا دیں اور حکم دیدیا کہ خبردار کوئی شخص وہاں نہ جائے۔ اب یہ باورچی اُس درخت کی نارنگیاں بنانے میں مصروف ہوا اور کئی گھنٹے کے بعد فارغ ہوکر باہر آیا۔ اور داروغہ صاحب سے کہا کہ قناتیں کُھلوا دیجیے۔ داروغہ صاحب نے قناتیں ہٹوا دیں۔ اور باورچی سے کہا کہ "ارماں سنو تو۔ وہ کونسا درخت ہے جس کی نارنگیاں بنائی ہیں؟ ذرا ہمکو تو بتاؤ"

اُس باورچی نے کہا کہ "آپ خود ہی کیوں نہیں ڈھونڈھ لیتے، اگر اب نارنگیاں نہ توڑیے گا۔" یہ کہکر باورچی چلا گیا اور داروغہ صاحب نے کئی گھنٹے تک چمن کی سیر کی اور درختوں کی نارنگیوں کو ہلایا، سونگھا، چھوا، لیکن پہچان نہ سکا کہ کون سی نارنگیاں بنائی گئی ہیں - وقت مقررہ پر سلطان عالم جلوہ افروز ہوے اور باورچی کو طلب کیا اور پوچھا کہ فلاں درخت سے ہم نارنگیاں توڑیں؟ اُس نے دست بستہ عرض کیا کہ بسم اللہ کریں حضور عالی چنانچہ بادشاہ نے ایک نارنگی توڑی تو فوراً رس بہنے لگا اور ذرا سے دبنے میں بادشاہ کا پورا ہاتھ رس سے بھر گیا - اب اُسے سونگھا تو نہایت بھینی بھینی نارنگی کی خوشبو آرہی تھی- بادشاہ نہایت خوش ہوے اور باورچی کی زبان مبارک سے بہت تعریف کی- اس عرصہ میں شاہی رکابدار نے اُس نارنگی کو نفاست سے چھیل کر بادشاہ کے سامنے رکابی پیش کی- حضور عالی نے پھانک اُٹھا کر نوش کی تو لب بندھنے لگے اور ذائقہ بالکل تازی نارنگی کا سا تھا اور اوپر کے چھلکے کو دبایا تو رس پھوٹ نکلا - غرضکہ درخت سے کئی نارنگیاں توڑیں اور حاضرین کو مرحمت فرمائیں، لیکن ہر نارنگی مثل پہلی کے پائی گئی - سلطان عالم نے باورچی کی بہت تعریف کی اور پانچ سو روپیہ اور ایک بیش قیمت رومال انعام میں دیا- اور فرمایا کہ تم کو پچاس روپیہ ماہوار ملے گا - اُس نے آداب بجالا کر انعام لیا اور دست بستہ عرض کیا کہ غلام نوکری کرنے سے مجبور ہے -

اس صاحب کمال باورچی نے اُن نارنگیوں میں ایسی نفاست اور عمدگی سے شیرہ اُتارا تھا کہ کوئی نہ پہچان سکا کہ کونسی بنی ہوئی نارنگیاں ہیں اور کون سی بغیر بنی- اور نہ ان نارنگیوں پر کسی قسم کا نشان، چپچپاہٹ، نہ کوئی بوجھ تھا، بلکہ چیونٹیاں اور مکھیاں تک اُنپر نہ بیٹھتی تھیں - ہر حال عجب باکمال شخص تھا -

اسرار حسین خاں طباطبائی

"بچہ"

لختِ دل، لختِ جگر، آنکھ کا تارا تو ہے　　ماہ رُو، نورِ نظر، راج دُلارا تو ہے
راحتِ جانِ حزیں، جان سے پیارا تو ہے　　صاف ظاہر ہے کہ محبوبِ دلارا تو ہے

باپ کے واسطے دلکش ہیں ادائیں تیری
ماں تو ماں، غیر بھی لیتے ہیں بلائیں تیری
گھر کی زینت ہے، تو ہی رونقِ کاشانہ ہے　　گوشہ گوشہ ترے جلوے سے جلوخانہ ہے
ماں ہے شیدائی تری، باپ بھی دیوانہ ہے　　تو ہے وہ شمع کہ گھر بھر ترا پروانہ ہے
روح پرور جو ہے معصوم تبسّم تیرا
باعثِ وجد ہے اندازِ تکلّم تیرا
ماں تری جانتی ہے چاند کا ٹکڑا تجکو　　رشکِ گل، مہرِ لقا، آئنہ سیما تجکو
منّتیں مان کے اللہ سے پایا تجکو　　ساری دُنیا سے سمجھتی ہے وہ اچھا تجکو
کیوں کہے کوئی کہ گورا نہیں کالا تو ہے
وہ تو کہتی ہے یہی، گھر کا اُجالا تو ہے
اُس کی آنکھوں میں پھرا کرتی ہے صورت تیری　　کعبۂ دل میں بھی موجود ہے مورت تیری
پوری کرتی ہے بصد شوق ضرورت تیری　　سُبح گھڑی، پوچھتی پھرتی ہے مہورت تیری
لطف دے جاتی ہیں جو تیری ادھوری باتیں
وہ مزہ دیتی نہیں اور کی پوری باتیں
دل سے کرتی ہے دعا تو کبھی بیمار نہ ہو　　کوئی آسیب نہ ہو، دُکھ نہ ہو، آزار نہ ہو
گو کسی چیز کا تو مُنہ سے طلبگار نہ ہو　　تیری چیتوں کو سمجھتی ہے کہ بیزار نہ ہو
دیکھتی رہتی ہے ہر وقت وہ صورت تیری
بے کہے تیرے سمجھتی ہے ضرورت تیری
تیری خدمت کے سوا اور اُسے کام نہیں　　صبح کی فکر نہیں اُسکو غمِ شام نہیں
تو نہ آرام سے ہو تو اُسے آرام نہیں　　اور یہ لطف۔ شکایت کا کہیں نام نہیں
لب پہ ہے ذکر ترا، دل میں ہے داغِ الفت
تا قیامت نہیں بجھنے کا چراغِ الفت

باسط۔ بسوانی

پچھلے مہینے کے رسالے

معارف ابھی حال ہی میں اہل ہنود نے مختلف مقامات پر مرہٹہ سردار سیواجی کی سہ صدی سالگرہ منائی ہے۔ اس موقع پر اُن کے جرائد و صحائف نے اس سردار کی تعریف و صیف میں بے اندازہ غلو سے کام لیا۔ اُن کی موجودہ ذہنیت نے اس سردار کو پرماتما کا اوتار یا دیوتا تک تصور کرنے میں باک نہ کیا، اور اُن اخباروں نے جو "قوم پرست" ہونے کے مدعی ہیں، دیوتا تو خیر نہیں کہا لیکن سیواجی کو قومی معمار تو ضرور تصور کیا ہے۔ اسی "بطل اعظم" کے متعلق دو قلمی تاریخیں ہندوستان کے ایک مشہور انشا پرداز کو دستیاب ہوئی ہیں، جو مصلحت وقت کی بنا پر "خافی خاں" کے نام سے منصۂ شہود پر رونما ہوئی ہیں۔ یہ دونوں تاریخیں کسی مسلمان کی تحریر کردہ یا کسی "سازشی جدوجہد" کا نتیجہ نہیں ہیں، بلکہ اپنے عہد کے مشہور وقائع نگار و انشا پرداز منشی لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی اور لالہ گردھاری لال کی لکھی ہوئی ہیں۔ ان تاریخوں کے اقتباسات "معارف" کے تازہ نمبر میں شائع ہوئے ہیں۔ ان تاریخوں کے نام بساط الغنائم اور تاریخ ظفرہ ہیں۔ دونوں نام تاریخی ہیں۔ یہ دونوں کتابیں عہد مغلیہ کے دورِ انحطاط کے بعد تصنیف کی گئی ہیں۔ اس لیے یہ خیال بھی نہیں ہو سکتا کہ یہ مغلوں کی خوشامد میں لکھی گئی ہیں۔ "شفیق کا قلم متین ہے" اور گردھاری لال ملک کی تباہی کو دیکھ کر اس درجہ برافروختہ ہے کہ اُسکی تحریر سے بھی غصہ و غضب عیاں ہوتا ہے۔ ان دونوں تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں جبکہ یہ تاریخیں لکھی گئی تھیں، اہل ہنود سیواجی کو "بطل" تصور نہیں کرتے تھے۔

اب کتاب کی اصل عبارت میں واقعات ملاحظہ فرمائیے:-

"سیواجی ... ازانجا (از راہے گڈھ) کوچیدہ در جالناپور کہ بست کروہی اورنگ آباد جانب مشرق واقع شدہ رسیدہ دست تاراج کشاد و چوں تکیۂ جان اللہ شاہ کہ از کاملان زمانہ بود آبرو بخشِ آبادی است مردم آبادی آں مکان را مامن و پناہ دانستہ دراں خزیدند سیواجی قساوتِ قلب را کار فرمودہ و پاس ادب نہ نمودہ ہمہ را غارت کرد بلکہ اشجار ہم بریدہ نسبت بہ شاہ مذکور بے ادبی ہا روا داشت و ایں حرکت موجب آغاز ادبار او گشت۔ رستم خان منصب دار بادشاہی را کہ با جمعیت جزوی متعین جالناپور بودہ ہماں بشارتِ غیب شد کہ بر کمیت فوج خود نظر نہ کردہ با سیواجی مقابل شود کہ بلاشک فتح ازان است۔ چنانچہ صباح

این روبا رنمست خان خود را بیاکانہ بلشکر سیواجی زد و باوصف قلت جمعیت غالب آمد مردم بیار از سیواجی باسد وجی سردار عمدہ اش بقتل رسید ند ہزیمت بلشکرش افتاد و سیواجی را پا ازجا رفت و یارائے قیام در خود نیافتہ تا رائے گڈھ باز پس ندید - بالاجی راؤجی کہ بر اورنگ آباد تاختہ بود و نیز از انجا گریختہ بسیواجی ملحق شدہ (ص ۵۵-۵۶)

(ترجمہ) سیواجی نے اس جگہ (رائے گڈھ) سے کوچ کرکے جالنا پور کہ اورنگ سے ۲۰ کوس بہ شرق کی جانب واقع ہے دھاوا مار کر غارت گری شروع کی چونکہ جان اللہ شاہ جو کہ کاملین زمانہ سے تھے، ان کا تکیہ اس آبادی کے لیے عزت بخش تھا، وہاں کے لوگ اسکو جائے پناہ سمجھ کر اس میں چلے گئے - سیواجی نے سنگدلی سے کام لیکر اور اس کا پاس ادب نہ کرکے سب کو لوٹ لیا، بلکہ درختوں کو بھی کاٹ ڈالا اور شاہ صاحب مذکور کے متعلق بے ادبیاں کیں اور یہ حرکت اسکے ادبار کا سبب بن گئی - رنمست خاں شاہی منصبدار بادشاہی کو کہ تھوڑی سی جمعیت کے ساتھ جالنا پور پر متعین تھا، اُسی رات کو غیبی بشارت ہوئی کہ اپنی فوج کی تعداد سے قطع نظر کرکے سیواجی کے ساتھ مقابلہ کرے یقیناً اُسکی فتح ہوگی - چنانچہ اس خواب کی بنا پر رنمست خاں بیباکی کے ساتھ سیواجی کے لشکر پر ٹوٹ پڑا، اور باوجود فوج کی کمی کے غالب آیا، سیواجی کے بہت سے آدمی اسکے بہترین سردار سدوجی کے ساتھ قتل ہوئے اسکی فوج نے شکست کھائی - سیواجی کے پاؤں اُکھڑ گئے اور ٹھہرنے کی طاقت سلب ہوگئی اور ایسا بھاگا کہ رائے گڈھ تک پیچھے مڑ کر نہ دیکھا - بالاجی راؤجی بھی جس نے اورنگ آباد پر دھاوا کیا تھا اس جگہ سے بھاگ کر سیواجی کے ساتھ مل گیا -

اب دیکھیے کہ انھیں پنڈتوں کے متعلق جو آجکل سیواجی کو پرماتما کا اوتار مانتے ہیں، خود سیواجی کا خیال اور طرزِ عمل کیا تھا،

"........ سیواجی ..... یکقلم براہمہ را از کار و خدمت موقوف داشتہ گفت کہ این این گروہ بدطینت گدا پیشہ نظر بر بزرگی ذات واجب الخدمت اند البتہ از ینہا توقع خیر سگالی و آقا پرستی ہیچ نیست۔"

(ترجمہ) سیواجی نے ..... یکقلم تمام برہمنوں کو ملازمت سے موقوف کر دیا، کہ یہ بدطینت گدا پیشہ گروہ اپنی ذات کی بزرگی سے واجب الخدمت ضرور ہے لیکن اس سے خیر خواہی اور آقا پرستی کی کوئی توقع نہیں -

سیواجی کے اخلاقیات کی ایک دفعہ ملاحظہ ہو - سنبھاجی نے بھوپال گڈھ پر حملہ کیا اور اسکو جبراً و قہراً مفتوح کرکے تقریباً ۷۰۰ قیدی جنکے ہاتھ پاؤں ٹوٹے ہوئے تھے، قتل کر ڈالے - دیکھیے ایک سفید لڑکے کی اس لیاقت و کارگزاری پر باپ کس قدر خوش ہوتا ہے

"...... سیواجی خبر رشادت فرزند دریافتہ مشتاق ملاقات شد، و در رائے گڈھ آمدہ از دیدار فرزند ارجمند ذخیرہ خورسندی اندوخت و وقت ملاقات یک پرتلہ مرصع با شمشیر و سپر بخشید"

(ترجمہ) سیواجی نے لڑکے کی اس لیاقت کی خبر پائی تو ملاقات کا اشتیاق ہوا اور رائے گڈھ

میں آکر لائق لڑکے کے دیدار سے مسرت اندوز ہوا، اور ملاقات کے وقت ایک مرصع پرتلہ تلوار اور ڈھال کے ساتھ عطا کیا۔

سیواجی کے موت کے واقعہ کو بساط الغنائم کا مصنف اس طرح لکھتا ہے:—

"..... یکے از عمازان ذہن نشین سوارا بائی زوجۂ سیواجی کہ مادر راجہ رام است ساخت کہ سیواجی سنبھاجی پسر خود را کہ از زوجۂ دیگر است میخواہد کہ ولیعہد سازد، چنانچہ اورا باین ارادہ از بنالا طلبیدہ است و اغلب کہ عنقریب در رسد و مختار ریاست شود۔ زن مذکور از ین کلمات سراسیمہ شدہ زہر در طعام سیواجی انداخت تا آنکہ او قالب خالی گذاشت ...."

(ترجمہ) ایک چغلخور نے سیواجی کی بی بی سورا بائی (جو راجہ رام کی ماں تھی) کے یہ بات ذہن نشین کی کہ سیواجی اپنے لڑکے سنبھاجی کو جو دوسری بی بی سے ہے، ولیعہد بنانا چاہتا ہے، چنانچہ اس ارادہ سے اسکو بنالا طلب کیا ہے اور غالباً وہ عنقریب پہونچکر مختار ریاست ہوگا۔ یہ عورت ان کلمات سے پریشان ہوئی اور سیواجی کے کھانے میں زہر ڈالدیا جسکو کھاکر وہ مرگیا۔

یہ ہم چلے لکھ چکے ہیں کہ تشفیق کا قلم متانت سے نہیں گرتا ہو لیکن گردھاری لال مصنف تاریخ ظفرہ قلم کا تیز ہے، اُس نے سیواجی اور سنبھاجی کے متعلق جو الفاظ لکھے تھے اُس سے کم از کم یہ تو معلوم ہی ہوجائے گا کہ وہ لوگ سیواجی کو کوئی "قومی معمار" یا ہیرو تصور نہیں کرتے تھے۔ تاریخ ظفرہ جسکے اقتباسات ہم پیش کرنے والے ہیں سیواجی کی وفات کے ۵۹ برس بعد، یعنے ۱۷۶۶ء میں لکھی گئی ہے، جبکہ کمپنی کا ابتدائی دور تھا اور ہیسٹنگز، میکفرسن کی حکومت تھی اور پلاسی کی لڑائی کو ختم ہوئے ابھی تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا۔ ملاحظہ فرمائیے گردھاری لال کا قلم کس درجہ شوخ ہے:—

"..... سیوائے ناخلف بہ نیابت پدر بدسلفت دراں دو پرگنہ (سوبہ و پونہ) می ماند۔ سیوا مردود کہ در بیباکی و جلادت و مکر و حیلہ بے نظیر بود و قابو یافتہ در ولایت کوکن غارتہا برانگیخت ..... آں شقی ..... آں غدار ..... نابکار ..... مزدراجہ تلبیس آں ابلیس فن .....

"سیوائے مقہور، و در سنہ ۱۰۹۱ھ سیوائے لعین ہم واصل جہنم شد"

(ترجمہ) سیوائے ناخلف اپنے بدسلف باپ کا قائم مقام ہوکر ان دونوں پرگنوں (سوبہ و پونہ) میں رہتا ہے۔ سیوا مردود نے کہ بیباکی، بہادری اور مکر و حیلہ میں بے نظیر تھا، قابو پاکر کوکن کے صوبہ میں غارتگریاں کیں ....

.... اور سنہ ۱۰۹۱ھ میں سیوائے لعین بھی جہنم پہونچ گیا۔

سیواجی نے جو عرضی شہنشاہ عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے دربار میں بھیجی تھی، اُسکے لب ولہجہ پر خشمگیں ہوکر حسب ذیل عبارت لکھتا ہے:۔

"بر زبان الہام ترجمان گذشت کہ .... آں نا عاقبت اندیش (سیواجی) نخوت و تکبر را سرمایۂ حیات خود ساختہ عنقریب تلافی خودنمائی و بیجائی خواہد رسید
(عالمگیری) زبان الہام ترجمان سے یہ نکلا کہ ...... اس نا عاقبت اندیش نے نخوت اور تکبر کو اپنی زندگی کا سرمایہ بنالیا ہے اس لیے اُسکو عنقریب اسکی خودنمائی اور بیجائی کا بدلہ ملے گا۔

اس کے بعد ہی یہ حق پرست مورخ فرمانِ شاہی کا اثر ظاہر کرنے کے لیے لکھتا ہے:۔
"چنانچہ آں سگ بے دُم و خر بے سُم بداصل جہنم شد" (ترجمہ) چنانچہ وہ بے دُم کا کُتا اور بے سُم کا گدہا داصل جہنم ہوا۔

فی زماننا ہمارے ہندو بھائیوں کو مسلمانوں کی ساری داستان میں لے دے کے یہ یاد رہ گیا ہے کہ
عالمگیر ہندوکش تھا، ظالم تھا، ستمگر تھا

اُسی عالی مرتبت قدسی صفت عرش آشیانی بادشاہ کے متعلق ایک ہندو مورخ اُسکی زندگی میں نہیں
آہ اُسوقت جبکہ سطوتِ تیموری و شوکت بابری دَم توڑ رہی تھی، اور دبدبۂ اکبری اور سلطنۂ شاہجہانی تاریخوں کے خزاں رسیدہ اوراق میں محض باقی رہ گیا تھا۔ اس بادشاہ کی موت پر حسب ذیل تبصرہ کرتا ہے۔ یہ جاننا چاہیے کہ یہ وہی بادشاہ ہے جس کی فرد جرم امتداد زمانہ سے بہت طولانی ہوگئی ہے۔ اس نے متھرا و کاشی کے مندر بھی توڑ ڈالے ہیں پالکیوں اور گھوڑوں پر ہندوؤں کو چلنے کی ممانعت بھی کی ہے ہندوؤں کے استبداد اور مظالم کو موقوف کیا ہے، عمالِ ریاست میں اسلامی عنصر نمایاں ہے، ہندو ریاستیں بھی تباہ و برباد کی ہیں، سیواجی کو ذلیل بھی کیا ہے، اُسی ظالم، ستمگر، ہندوکش بادشاہ کے متعلق شوخ نگار گردھاری لال کا قلم صفحۂ قرطاس پر اس طرح رقص کرتا ہوا نظر آتا ہے کہ

"آں شاہ والا گہر در شیوۂ جہانداری بادشاہِ عادل و در پابندی شریعت و ریاضت ولی کامل"
ترجمہ۔ وہ شاہ والا گہر فرمانروائی میں بادشاہ عادل تھا اور پابند شریعت اور ریاضت میں ولی کامل۔

نگار مولانا عبدالسبحان صاحب ناظر نے ایک دلچسپ و تاریخی مقالہ بعنوان اکبر آئین اکبری میں نگار

کے ستمبر نمبر میں سپردِ قلم کیا ہے، مذہبی نقطۂ نظر سے اس میں بحث کی گئی ہے اور ۱۵۷۵ء سے ۱۵۹۵ء تک جو تغیرات اکبر میں اُس کے لامذہب حاشیہ نشینوں کی وجہ سے ہوئے وہ سب بدایونی کی زبانی پر لکھے گئے ہیں۔ جن سے پتہ چلتا ہے کہ اکبر برائے نام مسلمان رہ گیا تھا، ورنہ حقیقتاً حاشیہ نشینوں کے ملحدانہ خیالات سے اُسکے قلب میں ایک خفیف علامت بھی اسلام کی باقی نہیں رہ گئی تھی۔ حج بند کر دیا گیا تھا۔ اگر نام سُن لیتا تو قتل کا حکم دے دیتا۔ حد ہو گئی کہ کلمۂ لا الہ الا اللہ اکبر خلیفۃ اللہ رائج کرنے کا ارادہ کر لیا گیا تھا لیکن فتنہ و فساد کے خیال سے یہ کلمہ محض قلعہ معلّی کی چہار دیواری تک محدود رہ گیا چنانچہ ایک جگہ فاضل مضمون نگار صاحب رقمطراز ہیں کہ

...... ۹۹۵ء میں .. حج کرنے کی اجازت طلب کرنا قتل کا مستوجب ہوتا تھا..... تناسخ کے اصول نے خاص طور پر اسکے دل میں مضبوط جڑ پکڑ لی .... فاضل پادریوں نے انجیل مقدس پیش کی بادشاہ نے .... عیسائی مذہب کی حقانیت کو باور کر لیا ... اور شہزادہ مراد کو (جس کی عمر اُس وقت ۸ سال کی تھی) ... انجیل پڑھنے کا حکم دیا۔ ان پادریوں نے سید المرسلین صلعم کی شان مبارک میں دجال (نعوذ باللہ من ذالک) کے اوصاف منسوب کیے ...... راجہ بیربل برہمن نے بادشاہ کے دل پر یہ بات نقش کر دی کہ آفتاب ساری کائنات کا مخزن اور اصل ہے۔ بادشاہ نے ہندوؤں سے تسخیر آفتاب کی دعا سیکھی اور صبح و شام بطور مذہبی وظیفہ کے اس کا ورد کیا کرتا۔ .... گائے ذبح کرنے کی ممانعت کر دی تھی ... سنہ کے پچیسویں سال اُس نے عام طور پر لوگوں کے روبرو آفتاب کو سجدہ کیا۔ شام کے وقت کل درباری چراغ روشن ہوتے وقت تعظیماً کھڑے ہو جاتے .... رفتہ رفتہ یہ خیالات پختہ ہو گئے ..... ۱۵۷۹ء میں بادشاہ کو سلطنت دنیوی کے ساتھ ہی خلافت دینی کے اختیارات حاصل کرنے کی فکر لاحق ہوئی۔ کیونکہ دوسرے کی اتباع اُسکو ناگوار تھی اس لیے جامع مسجد میں خطبہ پڑھنے کی کوشش کی اور فیضی کے ان اشعار پر خطبہ ختم کیا

خداوندے کہ ما را خسروی داد　　دلِ دانا و بازوے قوی داد
بعدل و داد ما را رہنموں کرد　　بجز عدل از خیالِ ما بروں کرد
بود وصفش ز حدِ فہم برتر　　تعالیٰ شانہٗ اللہ اکبر

...... اگر مذہبی مسائل میں اختلاف آرا ہوتا، تو بادشاہ کا فیصلہ آخری اور قطعی حکم سمجھا جاتا۔ .... ۱۵۷۹ء میں منجملہ اور باتوں کے شہنشاہ نے صاف طور پر جن و ملائک اور عالم غیب کی جملہ دیگر چیزوں سے انکار کر دیا۔ بزرگوں کی کرامات اور پیغمبروں کے معجزات سے بھی منکر ہو گیا اہل مذہب کی گواہی، قرآن کے ثبوت، مرنے کے بعد روح کی بقا اور عاقبت کی جزا و سزا ان سب سے جہاں تک کہ وہ عقل کے خلاف تھے، انکار کر دیا ...... سچے مسلمان لمبی داڑھیاں رکھتے تھے، اکبر نے اراکین دربار کو حکم دیا کہ وہ داڑھیاں صاف کرا کے حاضر ہوا کریں سنہ واقعہ ۱۵۹۲ء کا ہے ..... بادشاہ کو یہ خیال پیدا ہو گیا تھا (۱۵۸۲ء

کہ ہزار برس کا زمانہ ہو چکا ہے اس لیے اب جدید شریعت کا ظہور ہونا چاہیے ....
.... یہ حکم ہوا کہ بادشاہ کے حضور میں سجدہ کیا کریں۔ زمیں بوس ہونا اس کا نام رکھا گیا
آگرہ میں شراب کی دوکانات کھلنے کی اجازت دی گئی۔ سوّر اور کتے اب پاک سمجھے جانے لگے۔
.... ایک شکاری کتے کا خوشنما مقبرہ تعمیر کیا گیا ـــــ غسل .... جو ردا اجا ضروری تھے
باطل ٹھہرائے گئے ـــــ چچا یا ماموں کی بیٹیوں سے شادی ناجائز ٹھہری ......
نماز و حج کی ممانعت کی گئی۔ سنہ ہجری موقوف کرکے ایک نیا فارسیوں کا شمسی سال
جاری کیا گیا ..... اسلام کے کل عقائد میں اشتباہ اور تمسخر ہونے لگا۔ نہ دار خطرہ میں
تھے اور نہ دین محفوظ۔

مسلمانوں میں ایک شخص ملا شیبر تھا اُس نے ایک قطعہ لکھا ہے، جو بہت دلچسپ و مضحکہ انگیز ہے ہم یہاں اُسے نقل کرتے اور اس اقتباس کو ختم کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس بادشاہ کو ہندو اچھا نہ کہیں گے تو کیا عالمگیر کو؟

تا بزاید ہر زماں کشور بر انداز آفتے — فتنہ در کوے حوادث کدخدا خواہد شدن
باعقابِ قرض‌خواہِ تیغ در ارباب شرک — بارِ سر از ذمۂ گردن ادا خواہد شدن
فیلسوف کذب را خواہد گریباں پارہ شد — خرقہ پوشِ زہد را تقوی ردا خواہد شدن
شورش فراست اگر در خاطری از جاہلی — از خلائق مہرِ پیغمبر جدا خواہد شدن
خندہ می آید مرا زیں بیت بس کز طرفگی — نقل بزمِ منعم نزدر گدا خواہد شدن
بادشاہ امسال دعویٔ نبوت کردہ است — گر خدا خواہد پس از سالے خدا خواہد شدن

اُردو انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن) کے سہ ماہی نقیب اُردو کے تازہ نمبر میں مولانا عبدالحق صاحب اڈیٹر رسالہ نے ایک مقالہ "قدیم اُردو" کے نام سے شایع کیا ہے۔ یہ اصل میں بیجاپور کے اولیاء اللہ کے ایک شاعر خاندان کا دوسرا نمبر ہے۔ اس قسط میں حضرت شاہ برہان الدین جانم کے حالات اور کلام پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ حضرت شاہ برہان الدین جانم حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق کے فرزند و خلیفہ تھے۔ علوم ظاہری اور باطنی کا اکتساب اپنے والد ماجد سے کیا۔ اپنے دور کے بہت بڑے عابد زاہد مرتاض اور صوفی منش تھے۔ عوام کو اُن سے بہت فیض پہونچتا تھا۔ بہت سے رسالے سلوک اور تصوف میں بھی تحریر فرمائے ہندی زبان میں لکھتے تھے جسکو ہم لوگ آجکل ابتدائی اُردو کہتے ہیں۔ تلقین بھی فرماتے تھے جو اُنکے رسائل سے بھی ظاہر ہے۔ صاحب روضۃ الاولیاء بیجاپور نے انکی تاریخ وفات پانزدہم جمادی الآخر لے

لکھی ہے۔ سنہ غائب ہے۔ تذکرۂ اولیاے دکن کے مصنف نے آپ کو ۵۰۹ھ تک حیات لکھا ہے۔ بہرحال جو کچھ بھی ہو' اپنے والد ماجد ہی کے مقبرہ میں مدفون بھی ہوے۔ ان کا عرس آج بھی ۱۶ جمادی الاخریٰ کو ہوتا ہے۔ انکا بہت سا منظوم کلام فاضل مدیر، رسالہ اُردو کو مل گیا ہے جس پر اُنھوں نے فاضلانہ تبصرہ فرمایا ہے۔ ایک جگہ پر تبصرہ کرتے ہوے "تصوف" پر بحث کی ہے، وہ اس قابل ہے کہ ہم ناظرینِ الناظر کے سامنے پیش کریں :۔

"تصوف ہمارے ادبیات، معاشرت اور زندگی کے ہر شعبہ میں رچا ہوا ہے' (شاید ہماری سیاسیات بھی اس سے خالی نہیں ہے) لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک لاش ہے جس میں روح کا نام نہیں اور جسے ہم صدیوں سے پیٹتے چلے آتے ہیں یا ایک شاندار درخت ہے جو اندر سے کھوکھلا ہوگیا ہے، کہنے کو درخت ہے، مگر صرف دیدِ حسن کے قابل رہ گیا ہے، یا ایک خوبصورت اور زاہد عمارت کا کھنڈر ہے جسکی تعریف کر دینا ہی ہمارے ذوقِ سلیم کی دلیل ہے۔ یا ایک قبر ہے جو اپنے پُرعظمت گنبد کی وجہ سے بچ رہی ہے۔ بہت سوں نے اسکا پیشہ بنا لیا ہے۔ پیشہ کی بدولت بہت سی مقدس چیزیں کھیل تماشہ بن گئی ہیں۔ یہ بھی محفل کے گرمانے کے لیے ایک لطیفہ ہوگیا ہے۔ تصوف اب اسکا نام ہے کہ چند اصطلاحیں یاد کرلیں یا چند آسن یا ذکر رٹ لیے، اور نہیں تو کم سے کم لباس ہی میں جدت پیدا کرلی۔ حسن و عشق کے چرچے میں جب کچھ مزا نہ رہا تو تصوف نے ہماری غزلوں میں چاشنی پیدا کر دی۔ کسی شعر میں تصوف کی اصطلاح کا آجانا ہمیں وجد میں لانے کے لیے کافی ہے۔ مایوسی اور ناکامی، غفلت اور کاہلی کا سہارا اب یہی رہ گیا ہے۔ اور کیا ستم ظریفی ہے کہ ریا کا دشمن خود ریا کے لباس میں جلوہ گر ہے۔ اور اب تو اس کی "نے" اس قدر بڑھتی جاتی ہے کہ شاید چند روز میں ہمیں اپنی یونیورسٹیوں میں اسکے لیے کوئی ڈگری قائم کرنی پڑے۔۔ غرض تصوف ایک قسم کی روحانی منطق ہے جو لفظی داؤں پیچ اور مبہم بیانات کا مجموعہ ہوگیا ہے ۔۔۔۔۔۔"

(۲) اسی پرچہ میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کی ایک مختصر نظم بھی شایع ہوئی ہے۔ جسکا عنوان صبح بنارس (جوگی کی صدا) ہے۔ یہ اس قابل ہے کہ نذرِ ناظرین کی جائے :۔

(۱)

یہ ستھری ستھری آنکھیں
یہ لمبی لمبی پلکیں ۔۔۔۔۔۔
یہ تیکھی تیکھی چتون
یہ سندر سندر روشن ۔۔۔۔ مایا ہے سب ملیے ہے

(۲)

یہ گورے گورے گال
یہ کالے کالے بال
یہ پیاری پیاری گردن
یہ اُبھرا اُبھرا جوبن ۔۔ مایا ہے سب آیا

کُل جھوٹا ہے سنسار ۔
اک سچا ہے سرجن ہار

ہمایوں

ڈاکٹر اعظم صاحب کریوی سابق مدیر "اکبر" (الہ آباد) نے ایک دلچسپ تاریخی و جغرافی مضمون بعنوان کوئٹہ، ہمایوں کی تازہ اشاعت میں سپردِ قلم کیا ہے۔ کوئٹہ برٹش بلوچستان کا ہیڈکوارٹر ہے۔ ۱۸۷۶ء سے قبل یہ ایک غیر معروف مقام تھا۔ ۱۹۲۶ء میں یہاں ریزیڈنسی بنوائی گئی، اُسوقت سے یہ برابر ترقی کررہا ہے۔ اسکا ماخذ زیادہ تر گزیٹیر ہے۔ حیرتناک امر یہ ہے کہ اب تک کوئی جغرافیہ کوئٹہ کا نہیں لکھا گیا۔ آبادی زیادہ تر مسلمانوں کی ہے۔ انکے رسم و رواج عجیب غریب ہیں۔ طلاق وشادی کے مراسم حد درجہ مضحکہ انگیز ہیں۔ انکا لباس وغیرہ بھی نرالا ہے۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں فاضل وقائع نگار ایک جگہ ارقام فرماتے ہیں:۔

"۔۔۔۔ یہ دُنبہ کو جلد سمیت کھاجاتے ہیں، ذبح کرنے کے بعد اسکی جلد کو جھلس دیتے ہیں پھر اُسے بھون لیتے ہیں۔ وہ چمچوں سے نہیں کھاتے اور نہ خوان پر برتن رکھتے ہیں بلکہ زمین پر رکھکر ہاتھوں سے کھاجاتے ہیں۔ ان کا لباس بھی عجیب وغریب مناسبت کا ہوتا ہے۔ دیہاتی لبادے کی طرح ایک لباس پہنتے ہیں جس کی آستینیں ہاتھی کی سونڈ کی طرح لمبی ہوتی ہیں۔ اسے یہ لوگ (پٹھان) اپنی زبان میں کوسی کہتے ہیں۔ اسی قسم کا ایک دوسرا لباس ہوتا ہے اور آستینیں بہت چھوٹی چھوٹی ہوتی ہیں، اسے صدری کہتے ہیں۔ امراء کشمیری شال کے جُبّے اور سمور وسنجاب کی پوستین پہنتے ہیں۔ اکثر قبائل سر نہیں منڈاتے بلکہ لمبی لمبی زلفیں رکھتے ہیں۔ ان کی عورتیں بہت لمبے ڈھیلے کپڑے پہنتی ہیں۔ کرتے کے سامنے ہاتھی کی سونڈ کی طرح لٹکتی ہوئی لمبی جیب ہوتی ہے۔ دیہاتی عورتیں باہر بے تکلف گھومتی پھرتی ہیں، لیکن شہر میں پردہ کا خاص لحاظ رکھتی ہیں۔
۔۔۔۔۔ جو پہاڑوں میں رہتی ہیں، اکثر گھوڑوں کی دُموں کے بال کاٹ کر اپنے بالوں کے ساتھ ملاکر گوندھتی ہیں۔ قبیلۂ غلزئی کی عورتیں اپنی پیشانی کے بالوں میں چھلّے ڈال کر گھونگھر والے بناتی ہیں اور پیشانی پر جھالر کی طرح لٹکا دیتی ہیں۔ اکثر عورتیں موٹے موٹے چاندی، پیتل اور سونے کے چھلّے پہنتی ہیں ۔۔۔۔۔ شادی کا عجیب طریقہ ہے ۔۔۔۔ پہلے ایک عورت کو بھیجکر لڑکی دیکھ لی جاتی ہے ۔۔۔۔ جب لڑکی پسند کرلی جاتی ہے تو لڑکا اپنے والدین اور کچھ اعزا و احبا کے ہمراہ لڑکی کے باپ کے پاس جاتا ہے اور "ولور" (نذر جو لڑکے کو دینا پڑتا ہے) اور تحائف کا جو باپ اپنی لڑکی کو دیتا ہے فیصلہ کیا جاتا ہے ۔۔۔۔ سمدھیوں کی رضامندی پر ولور کی تعداد مقرر کی جاتی ہے، تب لڑکی کی ماں ۔۔۔۔۔ دولہا کے باپ کو ایک سوئی جسکے سوراخ میں ایک ریشمی تاگا پڑا ہوتا ہے نذر کرتی ہے، اسوقت بندوقیں چھڑائی جاتی ہیں، دُنبے ذبح کیے جاتے ہیں اور دعوت ہوتی ہے۔۔۔

اسکو کوکرا " کہتے ہیں .... ایک ماہ کے بعد دلّور کی کچھ رقم ادا کی جاتی ہے، اور تب کچھ لوگ
لڑکے کے اعزہ و احباب میں سے لڑکی کے باپ کے گھر پر جاتے ہیں، جہاں لڑکی کا باپ
اُنکو ایک ریشمی رومال نذر کرتا ہے جس کا رنگ عموماً سبز ہوتا ہے اور جسکے گوشوں پر کوئی
ریشمی پھول یا طلائی کام ہوتا ہے۔ اس رسم کو کوزدا کہتے ہیں .... اس موقع پر رقص و
سرود کا جلسہ کیا جاتا ہے ..... کوزدا کے بعد دولھا کو اجازت ہے کہ وہ اپنی ساس
کی رضامندی سے اپنی دولھن سے (تو) مل سکتا ہے لیکن وہ ایسا علانیہ نہیں کر سکتا۔
اس خفیہ ملاقات کو "گنگا گردی" کہتے ہیں ..... اگر لڑکی اپنے باپ کے گھر میں حاملہ ہو
جاتی ہے تو شادی کی تاریخ جلد مقرر کر دی جاتی ہے اور لڑکے کو جرمانہ (جس کی تعداد
پچاس سے لیکر دوسو روپیہ یا اس سے زیادہ حسب حیثیت ہوتی ہے) دینا پڑتا ہے۔
.... طلاق کا عجیب طریقہ ہے اگر مرد کو یقین ہو جائے کہ عورت بدمزاج ہے یا اُس نے
کوئی چوری کی ہے تو وہ تین کنکریاں یا تین مٹی کے ڈھیلے عورت کے پیچھے پھینک دیتا ہے
جس سے وہ سمجھ لیتی ہے کہ اُسکو طلاق دیدی گئی۔ زانی عورتوں کو نہایت سخت سزا دیتے
ہیں ..... نوجوانوں کو جب کسی حسینہ سے عشق ہو جاتا ہے تو وہ اُسکی محبت میں ایسے
از خود رفتہ ہو جاتے ہیں کہ عشق و محبت کے اظہار کے لیے اپنے بزرگوں اور ناصحوں کو
بھی قتل کرنے میں ذرا لحاظ نہیں کرتے۔

نیرنگ خیال

مولانا محمد علم الدین سالک بی اے پروفیسر السنۂ مشرقیہ دیو سماج کالج لاہور نے نیرنگ خیال کے ستمبر نمبر میں ایک نہایت دلچسپ مضمون "مغل باغات" کے عنوان سے شایع کیا ہے۔ اس میں یہ دکھلانے کی کوشش کی ہے کہ تیموریوں کے نقطۂ نگاہ سے ایک باغ میں حسب ذیل خصوصیات کا ہونا لازمی ہے۔ اور یہی وہ خصوصیات تھیں جنھوں نے ان مغل باغات کو "فردوس نگاہ" و "جنتِ نظر" بنا دیا تھا۔

"..... (۱) فصیل بندی۔ یہ مغلوں کی اختراع فائقہ ہے ..... اُنھوں نے (قدیم) چاردیواری کو مستحکم فصیل سے بدل دیا ..... اُسکے چاروں کونوں پر ہشت پہلو یا مثمن برج بنا کر اسکے حسن کو اور بھی چار چاند لگا دیتے تھے۔ ان برجوں کے اوپر چڑھنے کے لیے سیڑھیاں اور بیٹھنے کے لیے جگہیں بنا دی جاتی تھی۔ دیوار کے ایک سرے سے لیکر اخیر تک مضبوط کنگرے لگائے جاتے تھے جنسے فصیل کی ظاہری زیبائش بڑھ جاتی تھی۔ (۲) .... مغل اپنے باغ عموماً مستطیل یا مربع رکھا کرتے تھے .... خوبصورتی میں اضافہ کرنے کی خاطر .... چند چھوٹے مربع حصوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ یہ حصے "خیابان" کہلاتے تھے۔ .... (۳) مغل اپنے باغوں کو درجوں میں تقسیم کیا کرتے تھے .... ایک دوسرے سے کئی کئی فٹ اونچے واقع ہوتے تھے ... کہ ایک شخص پہلے درجہ میں کھڑا ہو کر تمام

درجوں کی سیر کر سکتا تھا اور لطف یہ کہ بادی النظر میں ایسے تمام درجے یکساں و ہموار نظر آتے تھے (۴) .... ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ باغ کے عین وسط میں شاہی خاندان کی نشست و برخاست کے لیے ایک نہایت خوبصورت بارہ دری بنائی جاتی تھی - یہ عام طور پر سنگ مرمر یا سنگ موسیٰ کی ہوتی تھی - اسکی عمارت باغ کی وسعت کے مطابق تعمیر کرائی جاتی تھی ...... بارہ دری کے چاروں طرف حوض .... اور فوارے لگائے جاتے تھے - عین مقابل میں ایک آبشار بنائی جاتی تھی - یہ بارہ دری مربع شکل کی ہوتی تھی - (۵) .... باغوں کو شاداب رکھنے کے لیے نہریں کھدواتے تھے .... اسکی تعمیر میں اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا تھا کہ ان کا پانی باغ کے ہر تختہ میں چکر لگا کر ایک خاص مقام کی طرف نکل جائے .... ایسی نہروں کی تعمیر میں بے دریغ روپیہ صرف کیا جاتا تھا ...... (۶) باغات بعلاوہ درختوں سے بھی مرتب کیے جاتے تھے .... اس میں ترتیب و تنظیم میں نہایت سختی سے کام لیا جاتا تھا - عام طور پر ایک باغ میں ایک ہی قسم کے درخت لگائے جاتے تھے ......"

مرقع

جناب مولانا وحید الدین صاحب سلیم پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن نے ایک دلچسپ تحقیقاتی مضمون "زندریزے" کے عنوان سے مرقع کے تمبر نمبر میں شایع کیا ہے - ہوا سمندر اور زمین میں ہزارہا باریک اور زندہ اجسام و تحتاً موجود ہیں، جن کے متعلق ہم کو کچھ علم نہیں ہے - بعض کے متعلق کچھ علم اب ہوگیا ہے - انھیں کو علمی اصطلاح میں زندریزے کہتے ہیں - انگریزی میں ایک نیا علم مرتب کیا گیا ہے جسکو مائیکرو بیالوجی کہتے ہیں، اس میں ان جراثیم کی تحقیقات کی جاتی ہے - ایک جگہ پر مولانا محترم تحریر فرماتے ہیں کہ

".... بعض زندریزے نقطہ کی طرح گول ہوتے ہیں، انکو نقطیے کہتے ہیں بعض لکیر سے ہوتے ہیں، یہ لکیریے کہلاتے ہیں، بعض علامات سکون یعنی جزم کی شکل کے ہوتے ہیں انکو جزمیے کہتے ہیں - بعض دریا کی طرح لہراتے نظر آتے ہیں، یہ لہرائی کہلاتے ہیں اور بعض پیچدار شکل کے ہوتے ہیں انکا نام پیچدار رکھا گیا ہے - جب وہ دو مل کر رہتے ہیں تو دوگانے کہلاتے ہیں اور جب کئی مل کر جمع ہو جاتے ہیں تو انھیں گچھیا کہتے ہیں - کبھی کبھی انکی قطار زنجیر کی شکل میں دکھائی دیتی ہے اس صورت میں وہ زنجیریے کہلاتے ہیں - یہ مجھو کہ گویا زندریزوں کی بستیاں ہیں جن میں وہ ایک خاص طریقۂ انتظام کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں - پچیس ہزار نقطے ایک ساتھ جمع ہوں اور ایک قطار میں رکھے جائیں تو ایک انچ سے زیادہ انکی لمبائی نہ ہوگی - بیس ارب زندریزوں کا وزن ایک دانۂ خشخاش سے زیادہ نہیں ہوگا - طاعون کا زندریزہ اسقدر ننھا اور باریک ہوتا ہے کہ اگر وہ سوئی کی نوک کے ایک کنارے پر ہو تو اس نوک کے دوسرے کنارے

تک پہونچنے میں اسے وہی وقت پیش آئے گی جو ایک انسان کو صحرائے افریقہ کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پہونچنے میں پیش آتی ہے .... زندریزے مفر بھی ہیں اور مفید بھی۔ ہوا اور پانی کے ذریعہ ہم ہزاروں زندریزوں کو نگلتے رہتے ہیں اور ان سے ہماری صحت پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ مگر بیماری کے زندریزے انسانوں اور حیوانوں کے اندر پہونچ کر انکی جسمانی ساخت کو تباہ کر دیتے ہیں .... آٹے میں خمیر اٹھنا اور نشاستہ کو شکر کی شکل میں تبدیل کرنا انھیں زندریزوں کا کرشمہ ہے۔ انکی پیدایش اور بالیدگی کا طریقہ بھی عجیب ہے۔ ایک زندریزہ بیچ میں سے کٹ جاتا ہے اور اسکے دو زندریزے بنجاتے ہیں۔ قد میں یہ دونوں برابر ہو جاتے ہیں۔ پھر اسی طرح دو کے چار اور چار کے آٹھ ہو جاتے ہیں۔ ایک گھنٹے میں انکی تعداد ۲ لاکھ تک پہونچ جاتی ہے۔ اس حساب سے ہیضہ کا ایک جرثوم جب ترقی کرتا ہے تو ایک دن رات میں اسکی نسل کی تعداد چار ارب اسی کرور تک پہونچ جاتی ہے۔"

کیف

کیف کی جلد اول نمبر ۳ میں "معرفت دنیا و آخرت" کے عنوان سے شایع ہوا ہے۔ ایک حصہ اس قابل ہے کہ پیش کیا جائے۔ معلوم نہیں اسکے مصنف کون صاحب ہیں۔ پہلے تو دھوکا ہوا تھا کہ شاید امام غزالی علیہ الرحمہ کی کسی تصنیف کا ترجمہ ہے؟

"...... انسان کو دنیا میں دو چیزوں کی حاجت ہوتی ہے، ایک تو وہ جو دل (روح) کی اسباب ہلاکت سے نگہداشت کرے اور اس کی غذا حاصل کرے، دوسرے وہ جسم کو مہلکات سے محفوظ رکھے اسکو غذا بہم پہونچائے۔ دل کی غذا خدا کی معرفت و محبت ہے کہ ہر چیز کی غذا اپنی طبع کی مقتضی ہوتی ہے اور انسان کی ہلاکت دل کا سبب یہ ہوتا ہے کہ ماسوا اللہ کی دوستی میں مستغرق ہو جائے۔ تہذ دل کی غرض محض دل ہونا چاہیے کہ تن فانی اور جسم باقی۔ جسم کی مثال اس شتر کی سی ہے جو حاجی کو حج کے لیے لیجاتا ہے .... حاجی کو بضرورت چارہ اور محل کی فراہمی کے لیے شتر سے شرط وفا باندھنا چاہیے تاکہ جب کعبہ پہونچ جائے اسکے رنج سے رہائی پائے .... تمام عمر صرف جسم سے پیمان وفا باندھنے، غذا مہیا کرنے اور اسکو اسباب ہلاکت سے باز رکھنے میں بسر ہوگی تو وہ خود اپنی ذات کی سعادت سے محروم رہیگا۔"

مشیر قادری

رسید کتب

۱۔ سفرنامۂ اندلس با تصویر مرتبۂ میر و پیر قاضی ولی محمد صاحب سکرٹری روبکاری ریاست بھوپال

۲۔ تذکرۂ مشاہیر کاکوری " مولانا حافظ محمد علی حیدر علوی ے/

۳۔ سیر المہاجرین " مولوی حاجی معین الدین ندوی ۱۲/

۴۔ برہان (تفسیر سورۂ نور) از خواجہ محمد عبد الحی فاروقی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی ۱۲/

اُردو رسائل کے خاص مضامین

(ستمبر ۱۹۲۷ء)

معارف - اعظم گڈھ

مدینۃ الزہراء

مرہٹہ ہیرو

عرب قدیم پر مستشرقین کی ایک نئی کتاب

ہمایوں - لاہور

نمکدۂ حالی

ٹامس گرے کے کلام پر ایک تنقیدی نظر

کوئٹہ

اُردو (سہ ماہی) اورنگ آباد دکن

ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی

قدیم اُردو

نیرنگ خیال - لاہور

کیا مغلیہ غیر ملکی حکومت تھی؟

مغل باغات

نگار - لکھنؤ

سحرالبیان

اکبر آئین اکبری میں

مخزن - لاہور

دولت ترکیہ کی مختصر تاریخ

ادب لطیف

جامعہ - دہلی

فلسفۂ خودی

ہندوستان کا قدیم تمدن

نیرنگ - رامپور

بہترین غزل گو

شرح خاقانی پر دوسری نظر

مرقع - لکھنؤ

زندہ ریزے

افادات میر

کیف - اجمیر

معرفت دنیا و آخرت

پلاٹ کس طرح سوجھا؟

بیداریِ ہند

مہاتما گاندھی کے اخبار ینگ انڈیا سے ہندوستان کا انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ بخوبی واقف ہے اردو اصحاب بھی گذشتہ آٹھ سال میں اخبارات میں بار بار اس کا نام سُنتے اور اُسکے مضامین کے تراجم تراقتباسات پڑھ پڑھ کے اس سے واقف ہوگئے ہیں۔ ینگ انڈیا کے مضامین کے دو مجموعے سنہ میں شایع ہوے تھے، اب میرٹھ کے لالہ مقصدی لال ہندی نے اُنکو اُردو کا لباس پہنایا ہے، اور بیداری ہند کے نام سے شایع کیا ہے، جس کی پہلی جلد پیش نظر ہے۔ مہاتما جی جس طرح اپنی معاشرت، اپنے ضابطۂ اخلاق، اپنے مطمحِ نظر اور اپنے اصول کار کے لحاظ سے ہندوستان کے تمام رہنماؤں سے بالکل جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں اُسی طرح اُنکی تحریروں اور تقریروں کا بھی ایک مخصوص انداز ہے۔ مہاتما جی کی انگریزی تحریروں کی بڑی خوبی یہ ہے کہ سلیس و پاکیزہ انگریزی کے چھوٹے چھوٹے جملوں، سادی اور مختصر عبارت میں وہ اہم سے اہم معاملات پر رائے زنی کرتے اور عمیق سے عمیق خیالات کا اظہار فرماتے ہیں۔ ادبی حیثیت سے انکی تحریریں اپنی آپ نظیر ہیں۔ ہندوستان کے مشہور ترین انشا پردازوں کا تو ذکر ہی کیا خود انگلستان کے اہلِ قلم بھی اس قسم کی تحریروں کے لکھنے پر قادر نہیں۔ اس لیے اُنکے مضامین کا کامیابی کے ساتھ ترجمہ کرنا قریب قریب محال تھا۔ لالہ مقصدی لال صاحب لایقِ ستایش ہیں کہ اُنھوں نے اس دشوار کام میں ہاتھ ڈالا اور اپنی محنت و عرقریزی سے اُردوداں اصحاب کو مہاتما جی کے خیالات سے براہِ راست آگاہ ہونے کا موقع بہم پہونچایا۔

ایک زمانہ تھا کہ سارا ملک مہاتما جی کے قدموں پر عقیدت و ارادت کی نذریں پیش کرتا، اُنکے نام کی جے، ہر مجمع اور ہر جلسہ میں پکاری جاتی، اور اُنکے حکم کی تعمیل میں چھوٹے بڑے سبھی کوشاں ہوتے، مگر موجودہ دورِ رجعت میں عام طور پر ہندو مسلمان کوئی بھی اُنکی تابعیت کے لیے تیار نہیں۔ جوش کی حالت میں جس طرح افراد کے لیے مشکل ہے کہ وہ صحیح توازن عقلی قائم رکھ سکیں، اُسی طرح قومیں بھی کسی خاص جذبہ کے ماتحت جہد و عمل میں مصروف ہوں تو طریق کار کی نوعیت یا راہِ عمل کی حقیقت سے واقف ہونے کی اُنھیں زیادہ فکر نہیں ہوتی۔ مگر آج وہ جوش و خروش مفقود ہے اور اُسکے بجاے ایک قسم کا جمود و سکون اس ملک کے باشندوں پر محیط ہے۔ ایسے وقت میں مہاتما جی کی تحریروں کا ہندوستان کی مشترکہ قومی و ملکی زبان

شایع ہونا ایک فال نیک ہے۔ جو اصحاب مہاتما جی کی تحریک میں شریک رہے یا کم سے کم اُسکو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھتے رہے اُنکو ان تحریروں کی روشنی میں اپنے موجودہ خیالات اور طریقِ عمل کے جانچنے کا بہت اچھا موقع ہے کہ شاید اس کتاب کے مطالعہ سے پھر اُن میں وہی روحِ عمل کارفرما ہو جائے جو ترکِ موالات کے عہد شباب میں سارے ملک پر محیط تھی۔ اور جن لوگوں نے اُس دور میں مہاتما جی کی رایوں سے اتفاق نہیں کیا یا جنھیں بالکل اسکا موقع ہی نہیں ملا کہ انکی رایوں پر پوری اطلاع کے بعد سنجیدگی کے ساتھ غور کر سکیں، اُنکے لیے قومی بیکاری کے موجودہ لمحوں سے فائدہ اُٹھا کر ایک اپنے ایسے ہموطن کے افکار و خیالات سے واقفیت بہم پہونچانا غالباً بے محل اور غیر مفید نہ ہو جسے ہندوستان کے کثیر التعداد افراد اور یورپ و امریکہ کے بعض عقلا دنیا کا بزرگ ترین انسان تصور کرتے ہیں۔

خیال تھا کہ بیداری ہند پر بہت تفصیل سے تبصرہ کیا جائیگا، مگر وقت نے مساعدت نہ کی اور وعدہ کی میعاد ختم ہو رہی ہے اسلیے سرسری تعارف پر قناعت کی جاتی ہے۔ پھر بھی ناظرین کی آگاہی کے لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کی ترتیب کا مختصر خاکہ پیش کر دیا جائے۔ کتاب کے دو جزو ہیں۔ فہرست مضامین کے بعد ۵۸ صفحے کا ایک مقدمہ ہے جسکے ۱۹ صفحوں پر مترجم نے مہاتما جی کے مختصر حالاتِ زندگی لکھے ہیں۔ اور بقیہ اوراق میں مہاتما جی کے متعلق امریکہ کے مشہور پادری ریورنڈ جے ایچ ہومز، فرانس کے مشہور عالم مصنف رومین رولانڈ اور بعض دیگر انگریزوں، امریکنوں اور ہندوستانیوں کے پُر عظمت خیالات درج کیے گئے ہیں۔ صفحہ ۵۹ سے ینگ انڈیا کے مضامین کا ترجمہ شروع ہوتا ہے جو ص ۴۰۰ پر ختم ہوا ہے۔ یہ مضامین چار حصوں پر منقسم ہیں۔ حصۂ اول (۵۹ تا ۹۸) میں ۱۹۱۹ء کی ستیاگرہ پر، حصۂ دوم (۱۰۱ تا ۱۳۸) میں مظالم پنجاب پر، حصۂ سوم (۱۳۹ تا ۱۹۰) مسئلۂ خلافت پر اور حصۂ چہارم (۱۹۴ تا ۴۰۰) میں عہد ترک موالات کے متعلق مضامین ہیں۔ آخری حصہ میں نصف کتاب پر حاوی ہے، پہلے ترک موالات کے ابتدائی عہد سے متعلق تحریریں ہیں اور اسکے بعد انسداد شراب نوشی، کونسلوں، عدالتوں اور سرکاری مدارس کے مقاطعہ، سودیشی، کھدر اور چرخہ کی اہمیت و ضرورت، قومی اتحاد اور اچھوت ادھار کے ضروری مباحث پر مضامین درج کیے گئے ہیں۔ اور اس طرح گویا ستیاگرہ اور ترک موالات یا عدم تعاون کے مصنف کی زبان سے اُسکی سہ سالہ جد و جہد کی پوری تاریخ سامنے آ جاتی ہے جس کا مطالعہ مستقبل کے شاہراہ عمل متعین کرنے میں موافق و مخالف دونوں کے لیے اُمید ہے کہ فائدہ مند ہوگا۔ ملنے کا پتہ دارالاشاعت بیداری ہند میرٹھ

...علی سرور مرحوم
- ...نہ عجائب
- ...اے سرور ۶ر

...ر مینائی مرحوم
- ...اللغات نامکمل
- ...خانہ عشق
- ...الغیب
- ...خاتم النبیین ۸ر
- ...ے سخن
- ...تیب امیر مینائی

...ال مرحوم
- ...یہ زبان اردو
- ...و نہالے دلکش
- ...نگارین
- ...التذکیر و تانیث ۸ر
- ...ادۂ تاریخ
- ...عد المنتخب ۴ر

...زا محمد عباس ... مرحوم
- ...انہ نادر جہان
- ...ری سہیلی ۱۲ر
- ...ز سحر ۸ر
- ...بون ۱۲ر

...شی فضل حسین ثابت
- ...یات دبیر
- ...رالحسین

پنڈت رتن ناتھ سرشار
- فسانہ آزاد ۴ جلد
- سیر کہسار
- خدائی فوجدار
- جام سرشار
- الف لیلی کا طرز ناول
- کامنی
- بچھڑی دلہن ۶ر

منشی سجاد حسین مرحوم
- احمق الذین ۸ر
- حاجی بغلول ۸ر
- پیاری دنیا ۸ر
- کایا پلٹ ۸ر
- میٹھی چھری ۶ر
- طرحدار لونڈی
- طلسمی فانوس

منشی جوالا پرشاد برق
- مرزا لنی ۱۲ر
- مار آستین ۱۲ر
- بنگالی دلہن ۱۲ر
- معشوقہ فرنگ ۱۲ر
- پرتاب ۸ر
- ردہنی ۱۲ر

پریم چند
- پریم بتیسی
- پریم پچیسی
- بازار حسن

مولانا عبدالحلیم شرر
- جنید بغدادی
- خواجہ معین الدین چشتی
- تذکرہ مشاہیر عالم
- مخدرات
- قیس و لبنیٰ
- مقدس نازنین
- ایام عرب ۶ر
- فتح اندلس
- ماہ ملک
- حسن کا ڈاکو ۸ر
- دربار حرام پور ۸ر
- الفانسو ۸ر
- مفتوح فاتح ۸ر
- فلپانا ۶ر
- زوال بغداد
- لعبت چین
- نیکی کا پھل
- جویائے حق
- بابک خرمی
- طاہرہ
- شوقین ملکہ
- یوسف و نجمہ
- گذشتہ لکھنؤ
- شاعرانہ و عاشقانہ مضامین
- آغاز و ختم سال
- سیر رجال
- تاریخی و جغرافی مضامین
- مینا بازار

حکیم محمد علیخان مرحوم
- رام پیاری کامل
- عبرت کامل
- حسن سرور کامل
- اختر و حسینہ
- دیبل دیوی
- جعفر و عباسہ

شوق قدوائی مرحوم
- ترانہ شوق
- قاسم و زہرہ
- نیرنگ جمال ۴ر
- گنجینہ ۱۲ر
- میگفرت اور لوسی ۱۰ر

خواجہ عبدالرؤف عشرت
- زبان دانی ۶ر
- اصلاح زبان اردو ۶ر
- قواعد میر ۶ر
- اصول اردو ۶ر
- جان اردو ۶ر
- شاعری کی پہلی کتاب
- " دوسری کتاب
- " تیسری کتاب
- لغات اردو

منشی محمد احسن وحشی
- محبوس گذشت
- جام زہر

مولانا حکیم عبدالحی مرحوم
- یاد ایام
- تذکرہ گل رعنا

حکیم احمد حسین الہ آبادی
- تاریخ ابن خلدون جلد اول
- " " دوم
- " " سوم
- " " چہارم
- " " پنجم
- " " ششم
- " " ہفتم
- " " ہشتم
- " " نہم
- " " دہم
- " " یازدہم
- سلطان صلاح الدین
- نور الدین محمود

مولوی محمد حلیم انصاری
- الاسلام و النصرانیہ ۱۲ر
- فتح اندلس
- ابو مسلم خراسانی
- تاریخ عرب

مولوی حبیب الرحمن خان شروانی
- سیرۃ الصدیق
- علمائے سلف
- تذکرۃ الشعراء میر حسن

حافظ اسلم جیراجپوری
- سیرۃ الرسول
- خلافت راشدہ
- خلافت بنو امیہ
- خلافت بنو عباس
- عباسیہ بغداد
- علوم عرب

قاضی محمد سلیمان منصورپوری
- رحمۃ للعالمین
- سفرنامہ حجاز

مولوی خلیل الرحمن
- اخبار الاندلس جلد
- تاریخ مولدین
- مختصر تاریخ اسلامی
- عذرا ۱۲ر

مولوی محمد انشاء اللہ
- سیرۃ الرسول
- تاریخ آل عثمان
- حالات عراق عرب و ایران
- حالات قسطنطنیہ
- تاریخ طرابلس و مغرب الاقصیٰ

منشی سعید احمد مارہروی
- آثار اکبری
- حیات خسرو
- امرائے ہنود

...تیرتھ بدھا - مہاتما بدھ کی مختصر سوانحعمری اور ان کی مذہبی تعلیم نہایت دلکش انداز میں لکھی گئی ہے۔ قیمت صرف ... ۳ر

مولوی عزیز مرزا مرحوم
- خیالات عزیز ٤ار
- وکرم اروسی عہ

خواجہ عباد اللہ اختر
- صدیق اکبر ۱۲ر
- حضرت زید ۶ر
- مشاہیر اسلام ۱۱ر
- بغداد ٤ار
- دمشق ے ر
- دیوان حافظ مع شرح

مفتی انوار الحق ایم اے
- تاریخ ابو البشر عہ
- تذکرۃ الحبیب عہ
- حقایق اسلام ٤ار

میر ولی اللہ بی اے
- بندگی ٤ار
- کاس الکرام ے ر
- لسان الغیب جلد اول ے
- 〃 〃 دوم ٤ار
- 〃 〃 سوم
- 〃 〃 چہارم

سید مسعود بی اے
- نصاب اردو عہ
- جاپان کا تعلیمی نظم ے
- انتخاب زرین ٤ار

مولانا حسرت موہانی
- شرح دیوان غالب
- کمل دیوان حسرت

سید سجاد حیدر بی اے
- خیالستان عہ
- ثالث بالخیر ۸ر
- زہرا ۱۴ر
- جلال الدین خوارزم شاہ ۱۲ر

مسٹر ظفر عمر بی اے
- چوروں کا کلب ۹ر
- نیلی چھتری
- بہرام کی گرفتاری
- مستقبل اسلام

پروفیسر فیروز الدین مراد
- تحفہ سائنس ے ر
- بادل کے نیچے عہ
- خوننابہ عشق عہ

حکیم احمد شجاع بی اے
- باپ کا گناہ ٤ار
- حسن کی قیمت ٤

منشی عبد المجید سالک بی اے
- راہ و رسم منزلہا ۸ر
- چھیاد دلچسپ افسانے عہ
- چترا (ٹیگور) ۱۲ر

منشی احمد علی بی اے
- تاریخ تمدن
- شباب لکھنؤ

مولوی عبد الماجد بی اے
- فلسفہ جذبات
- مکالمات برکلے
- پیام امن
- تصوف اسلام عہ
- فلسفیانہ مضامین
- زود پشیمان ۸ر

منشی محمد لطیف بی اے
- اکبر
- اورنگ زیب
- رنجیت سنگھ
- لارڈ کلایو

پروفیسر نواب علی ایم اے
- معارج الدین
- تذکرۃ المصطفی
- صحف سماوی ے ر
- شمع سخن ۱۰ر

پروفیسر الیاس برنی ایم اے
- جذبات فطرت چار حصے للعہ
- معارف ملت ، للعہ
- مناظر قدرت ، للعہ
- علم المعیشت

مولوی سید سلیمان ندوی
- ارض القرآن للعہ
- سیرۃ عائشہ رض
- حیات امام مالک عہ
- خلافت عثمانیہ و اسلام
- خلافت اور ہندوستان

مولوی عبد السلام ندوی
- اسوہ صحابہ ۲ جلد
- سیرۃ عمر بن عبد العزیز
- انقلاب الامم ٤ار
- تاریخ الحرمین الشریفین
- حکمائے اسلام
- فطرت نسوانی
- شعر الہند ۲ جلد

مولوی عبد الباری ندوی
- مبادی علم انسانی
- برکلے کا فلسفہ

مولوی سعید انصاری
- سیر الصحابہ جلد اول
- سیر انصار ۲ جلد
- سیر الصحابیات

مولوی عبد الرزاق ندوی
- اسوہ حسنہ
- کتاب الوسیلہ
- ترکی اور یورپ ۶ر

خواجہ حسن نظامی
- قرآن آسان قاعدہ
- میلاد نامہ عہ
- محرم نامہ عہ
- فاطمی دعوت اسلام ے
- ذکر غوث پاک ۱۲ر
- کرشن جیون
- شامی جہاد
- سیپارہ دل ٤ار
- کم ٹو موت
- چٹکیاں اور گدگدیاں ۱۲ر
- اتالیق خطوط نویسی
- روزنامچہ ٤ار
- بیوی کی تعلیم
- بیوی کی تربیت عہ
- اولاد کی شادی عہ
- جگ بیتی کہانیاں ۱۰ر
- آپ بیتی
- بچوں کی کہانیاں ۱۲ر
- سیر دہلی ۱۲ر
- سفرنامہ ممالک اسلامیہ
- غدر دہلی کے افسانے عہ
- یزید نامہ
- طمانچہ بر رخسار یزید عہ
- اردو دعائیں ۸ر
- تسکین احساس ۸ر
- روزنامچہ ہند ۱۲ر
- اسلام کا انجام ۶ر
- تسخیر مہر و قہر ۱۰ر

مولوی عبد الراشد الخیری
- الزہرا ۱۲ر
- صبح زندگی
- شام زندگی عہ
- شب زندگی ٤
- نوحہ زندگی ۱۲ر
- در شہوار ۱۰ر
- منازل السائرہ ٤ار
- سراب مغرب ۸ر
- بنت الوقت ۸ر
- قطرات اشک
- جوہر قدامت
- عروس کربلا
- یاسمین شام
- تیغ کمال
- ماہ عجم
- محبوبہ خداوند
- سوودہ ۸ر

نیاز فتح پوری
- گیتانجلی ٤ار
- گہوارہ تمدن ٤ار
- نگارستان ٤
- صحابیات
- تاریخ الدولتین

یاس عظیم آبادی
- چراغ سخن
- نشتر یاس ۸ر

تاریخ اندود ۔ یعنی مرہٹوں کے استقلال مسلمانوں کی شجاعت اور انگریزوں کی حکمت کا آئینہ از "خافی خان"، قیمت ۱۲ر

ملنے کا پتہ ۔ الناظر بک ایجنسی ۔ لکھنؤ

رجسٹرڈ نمبر سلے ۴۷۸

ہوالمستعان

الناظر

ایڈیٹر ــــ ظفر الملک ــــ علوی

الناظر پریس لکھنؤ میں باہتمام اسحاق علی علوی چھپا

قیمت سالانہ للعہ ر

قیمت فی پرچہ ۸ر

محصول معاف
[price] کی روانگی پر آدھا
اور
[price] کی روانگی پر پورا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اُردو کی بہترین کتابیں

ہدیتہً لیجیے
[price] کی روانگی پر الناظر ایک سال
اور
[price] کی روانگی پر [price] کی کتابیں

مرزا غالب مرحوم
- اُردوے معلی عہ
- عود ہندی ۸ر و ۱۰ر
- دیوان غالب بیبی ے
- اکمل دیوان غالب صہ

سرسید مرحوم
- خطبات احمدیہ ے
- اکمل مجموعہ لکچر للعہ
- اسباب بغاوت ہند ۸ر
- سیرت فریدیہ ۱۰ر
- خطوط سرسید ۶ر

نواب محسن الملک مرحوم
- مضامین تہذیب الاخلاق للعہ
- اکمل مجموعہ لکچر للعہ
- تقلید و عمل بالحدیث ۱۲ر
- کتاب المحبۃ و الشوق ۱۲ر
- مکاتیب عہ
- مسلمانوں کی تہذیب ۶ر

خلیفہ محمد حسین مرحوم
- [illegible] للعہ
- سفرنامہ برشیرو جلد للعہ

مولانا آزاد مرحوم
- آب حیات ے
- دربار اکبری صہ
- سخندان فارس ے
- نگارستان فارس عہ
- نیرنگ خیال عہ
- سیر ایران عہ
- ڈرامہ اکبر عہ
- مجموعہ مکتوبات آزاد عہ
- مجموعہ نظم آزاد ۸ر
- نصیحت کا کرنپھول ۸ر
- جانورستان ۱۰ر
- بیاض آزاد صہ
- تذکرۂ علماء ۵ر
- لغت آزاد عہ
- دیوان ذوق مرتبہ آزاد ۶ر

پروفیسر شہباز مرحوم
- زندگانی بے نظیر عہ
- خیالات شہباز صہ

مولوی سید ممتاز علی
- تذکرۃ الانبیا عہ
- شیخ حسن ۱۲ر

مولانا نذیر احمد مرحوم
- حمائل شریف مترجم عہ
- الحقوق والفرائض ے
- بنات النعش ۹ر
- مراۃ العروس ۱۰ر
- توبۃ النصوح ۱۲ر
- موعظۂ حسنہ عہ
- رویائے صادقہ عہ
- ایامیٰ عہ
- فسانۂ مبتلا عہ
- ابن الوقت عہ
- مصائب غدر ۱۲ر
- مجموعہ نظم بے نظیر عہ
- اکمل مجموعہ لکچر ۲ جلد عہ
- منتخب الحکایات ۶ر
- چند پند ۶ر
- مبادی الحکمہ عہ

مولانا شرر مرحوم
- حیات امیس ۶ر
- ایشیائی شاعری عہ
- نورجہان بیگم ۸ر
- میوہ سلطان صہ
- حیدر علی سلطان عہ

مولانا حالی مرحوم
- یادگار غالب ے
- حیات سعدی عہ
- مقدمہ شعر و شاعری عہ
- حیات جاوید للعہ
- دیوان حالی عہ
- مسدس حالی عہ و ۸ر
- مجموعہ نظم حالی عہ
- بیوہ کی مناجات ۲ر
- شکوۂ ہند ۲ر

مولوی بشیر الدین احمد
- واقعات دار الحکومت دہلی عہ
- تاریخ بیجاپور عہ
- حرز طفلان عہ
- نشاط عمر عہ
- عصائے پیری عہ
- لخت جگر ے
- حسن معاشرت عہ
- اصلاح معیشت عہ
- اقبال دلہن عہ
- شمع ہدایت عہ
- انشائے بشیر عہ
- دیوان بشیر عہ

مولانا شبلی مرحوم
- سیرۃ النبی جلد اول عہ
- جلد دوم عہ
- سوم عہ
- الفاروق صہ و ۱ر
- سیرۃ النعمان عہ
- الغزالی عہ
- المامون عہ
- سوانح مولانا روم ۶ر
- سفرنامہ مصر و روم و شام ۶ر
- علم الکلام ۶ر
- الکلام ۶ر
- رسائل شبلی عہ
- مقالات شبلی عہ
- شعر العجم جلد اول ے
- دوم عہ
- سوم عہ
- چہارم ے
- پنجم ۶ر
- موازنۂ انیس و دبیر ے
- مضامین عالمگیر ۸ر
- آغاز اسلام ۸ر
- مجموعہ کلام شبلی اردو ۱ر
- کلیات شبلی فارسی ۶ر

مولانا ذکاء اللہ مرحوم
- تاریخ ہندوستان ۱۰ جلد
- تاریخ عہد سلطنت انگلشیہ
- کرزن نامہ ۶ر
- آئین قیصری عہ
- صحیفۂ فطرت ۶ر
- تعلیم الانتظام عہ
- محاربات عظیم ۸ر
- جغرافیہ ریاضیہ ۱۲ر
- جغرافیہ طبعی ۸ر
- اہل عرب کا جبر و مقابلہ ۱۰ر
- رسالہ علم مناسب ۶ر
- معاون الحساب ۱۲ر
- مساحت ماڈرنر ۱۲ر

سید محمود مرحوم
- کتاب الطلاق عہ
- کتاب الشفعہ عہ
- لکچر ۱۲ر
- شرح قانون شہادت عہ

مولوی رشید احمد انصاری
- المدنیۃ والاسلام عہ
- تحریر المراۃ عہ

ملنے کا پتہ الناظر بک ایجنسی۔ لکھنؤ

بسم اللہ

النا

فہرست مضامین بابت ماہ نومبر سنہ ۱۹۲۷ء

نمبر ۵ — جلد ۳۴

ظ

نئی کتابیں

کلیات ولی

ریختے کے باوا آدم ولی دکنی کا کلیات پہلی بار انجمن ترقی اردو کے حسن اہتمام سے ٹائپ میں شائع ہوا ہے۔ مولانا سید علی احسن مارہروی نے اسے ترتیب دیا اور ۱۰۴ صفحے کا دیباچہ اور ۲۲ صفحے کی فرہنگ الفاظ قدیمہ اضافہ کی ہے۔ کلیات میں ۴۲۲ غزلیں، ۲ مستزاد، ۲ مخمسات، ۲ ترجیع بند، ۶ قصائد، ۲ مثنویات، ۷ قطعات، ۲۶ رباعیات، ۴۰ فردیات کے علاوہ دو طویل ضمیمے ہیں جن میں سے ایک میں وہ غزلیات و اشعار درج کیے گئے جو سب نسخوں میں نہیں ملے اور دوسرے میں نسخوں کے اختلافات کی تفصیل ہے۔ کلیات کا مجموعی حجم ۶۰۰ صفحے ہے قیمت للعہ

سفرنامہ اندلس

(مرتبہ قاضی ولی محمد صاحب سکرٹری سٹیٹ کونسل بھوپال)

جس میں اندلس کی تقریباً ایک سو مشہور اسلامی بستیوں قرطبہ، اشبیلیہ، غرناطہ، مالقہ، طلیطلہ، بلنسیہ، برشلونہ، قادس، جزیرہ کے چشم دید حالات و روایات اور فتوحات طارق و موسیٰ، منصور و یوسف وغیرہ کے واقعات مع آثار صنادید اسلامی درج ہیں۔ اور کتاب کو دلچسپ و مفید بنانے کے لیے متعدد نقشے اور قصور و محلات، مساجد و قلعہ جات وغیرہ کے ۹۵ عکسی تصویریں اضافہ کی گئی ہیں۔ کتاب کی طباعت نہایت دیدہ زیب ہے۔ قیمت سے ؍

اصلاح سخن

جس کا تفصیلی ریویو فروری و مارچ کے مشترکہ نمبر میں شائع ہو چکا ہے، ہمارے یہاں موجود ہے۔ شائقین طلب کر لیں۔ قیمت ۳ ؍

پس پردہ

نسائی زبان کے مشہور انشا پرداز آغا حید دہلوی کے مضامین کا دلچسپ مجموعہ

قیمت عہ ؍

ملنے کا پتہ:- **الناظر بک ایجنسی۔ لکھنؤ**

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر (۴) جلد ۳۳ — نومبر سنہ ۱۹۲۷ء

قانون

اُردو بولنے والی اقوام میں قانون کا لفظ جس قدر عام ہے، غالباً کوئی دوسرا لفظ اُسکی برابر ہمہ گیری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ شہری اور نیز دیہاتی حلقوں میں ہر متنفس اس سے روشناس اور واقف ہے۔ عام اصطلاح میں مجالسِ مقننہ کے صادر کیے ہوئے احکام یا حکومت کے بنائے قواعد وضوابط کا نام قانون ہے۔ مگر بہت کم اصحاب ایسے ہونگے جو اس لفظ کے اصلی ماخذ اور اُسکے معنی کے کثیر انقلابات سے واقفیتِ کُلّی رکھتے ہوں۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ زبانِ اردو نے یہ لفظ زبانِ عربی سے مستعار لیا۔ کب اور کس نے اس کو اُردو ادب میں شامل کیا؟ اس کا جواب ایک گونہ دشوار ہے۔ سیاسیاتِ مُلکی میں اس لفظ کی شہرت سب سے زیادہ اسوقت ہوئی جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے مملکتِ ہند کے نظم ونسق کی خاطر مختلف احکام وضوابط کو عام فہم بنانے کے لیے اُردو کا لباس پہنایا۔ اُردو کے ابتدائی تراجم میں یہ لفظ سب سے اول اٹھارویں صدی کے اوائل میں مستعمل ہوا اس سے قبل ہندوستان کی علمی دنیا قانون سے آشنا نہ تھی۔ مختلف علوم و فنونِ لطیفہ کے سلسلہ میں اس کا نام بارہا آچکا تھا، مگر آئینِ مُلکی اس نام سے بالکل خالی تھا۔

قبلِ اسلام کی عربی زبان بھی اس سے متعارف نہ تھی۔ عہدِ عباسیہ میں، جب یونانی

شامی اور لاطینی کتابوں کا ترجمہ کیا گیا۔ لفظ قانون بھی اصل کے ساتھ ساتھ تراجم کا جزو بن گیا لفظ قانون کا اصلی ماخذ "کینن" ہے، جو بجائے خود یونانی زبان کے لفظ Kavwv سے وضع کیا گیا ہے جسکے لغوی معنی سیدھا ڈنڈا یا سیدھی چھڑی کے ہیں۔ استعارتاً اس لفظ کو ہر اس چیز کے لیے استعمال کیا جاتا تھا جو دوسری چیز کو سیدھا کرنے میں مدد ......

سب سے اوّل کلیسائی لٹریچر نے لفظ "قانون" کا غیر یونانی پبلک سے تعارف کرایا۔ اسوقت اُسکے اصطلاحی و لغوی معنی کی ایک بحث چھڑی۔ کتاب مقدس کے تراجم میں لفظ "قانون" کا یونانی پیش رَو کہیں بمعنی "ضلع" اور کہیں بمعنی "پیمانہ" استعمال ہوا ہے۔ ابتدائے عہدِ مسیحیت میں اسکے مفہوم کے متعلق سخت اختلاف رہا۔ ناظرین کرام کی آگاہی کے لیے تین مختلف رائیں پیش کی جاتی ہیں:۔

(۱) [illegible] کے ابتدائی معنی فہرست کتب کے تھے۔ اسکے بعد اس کا اطلاق ان تحریرات و رسائل پر ہونے لگا جو ابتدائی مسیحی مجالس میں پڑھی جاتی تھیں۔ سب سے اول "فہرست" کے معنوں میں یہ لفظ "اریجین" Origen کی کتاب .... "تذکرۂ یوشع نبی" میں استعمال ہوتا ہے۔

(۲) اسکندریہ کے نحویوں نے اس کا مفہوم جداگانہ سمجھا، وہ اسکو نفیس انتخابات یا ازہار ادب کے مترادف سمجھتے رہے۔ یونانی ادب کے ان انتخابات کو جو بہترین سمجھے جاتے تھے، Canonical writings یا "قانونی تحریرات" سے تعبیر کیا جاتا تھا۔

(۳) تیسرا فریق اسکو منضبط کرنے والا اصول یا قاعدہ سمجھتا رہا۔ رومانی امپراطور قسطنطین اعظم کے زمانہ تک یہ لفظ کلیسائی مصطلحات میں ایسے معنی کا مرادف رہا۔ ان معانی میں بھی بعد کو تغیرات ہوتے رہے۔ اور رفتہ رفتہ اس لفظ کے سب ذیل معنی ہو گئے

(۱) قاعدۂ اساسی یا اصول،

(۲) مجموعہ یا فہرست کتب جس میں قواعد درج ہوں

ارتقاء لسانی پر نظر رکھنے والے اصحاب سے پوشیدہ نہیں کہ ابتداً یہ لفظ "قاعدۂ اساسی" کے معنی میں مستعمل ہوا ہوگا۔ مگر جب اس کا استعمال زیادہ عام ہوا اور خاص قسم کی تحریرات کے واسطے مخصوص ہو گیا تو رفتہ رفتہ دوسرے معنی نے معنی اول کی جگہ لے لی، اور معنی اول بالکل فراموش ہو گئے۔ اگر ہم اپنے یہاں کی فقہی اصطلاحوں پر غور کریں، تو ہم کو اس حقیقت کا اعتراف کرنا

پڑیگا کہ لغوی حیثیت فقہی حیثیت سے مرعوب ہو جاتی ہے اور کچھ عرصہ کے بعد اصلی معنی بالکل نسیاً منسیاً ہو جاتے ہیں۔ نکاح، طلاق، شفعہ اور اسی قبیل کے بہت سے الفاظ اس کی شہادت دیتے ہیں۔

"فہرست کتب جن میں اُن الہامی و مقدس احکام کا تذکرہ ہو جو خدا نے بنی نوع انسان کی رہنمائی کے لیے اُتارے ہیں"۔ اسی وجہ سے "کینن" عہد نامۂ جدید و عہد نامۂ عتیق کے ابتدائی تراجم میں مستعمل ہونے لگا۔ اس سوال کے پیدا ہو جانے سے ہمیں "کتب سماوی" یا "کتاب مقدس" کی تدوین و تالیف کی دلچسپ بحث کے متعلق اسرائیلی، مسیحی اور کلیسیائی تاریخ کی ورق گردانی کرنی پڑیگی۔ کیونکہ اسکے بغیر "کینن" کا صحیح مفہوم سمجھنا دشوار ہے۔ آج جن کتابوں پر مسیحیت کو ناز ہے اُنکے متعلق اسلام کا حکمِ ناطق یہ ہے کہ وہ محرف اور تبدیل شدہ ہیں۔ تاریخی تلاش و تفحص کے عادی اشخاص کو مطلقاً یہ سُن کر تعجب نہ ہوگا کہ عرب کی جاہل اور غیر متمدن آبادی میں پیدا ہونے والی برگزیدہ ہستی نے جو "فیصلۂ ربانی" انبیاء سلف کی کتب کے متعلق سُنایا تھا وہ آج مسیحیت کی اَن تھک اور مسلسل کوششوں کے باوجود ویسا ہی صحیح ہے جیسا ۱۳۰۰ برس قبل تھا۔ مسیحیت باوجود ربع مسکوں کے بیشتر حصہ پر حکمراں ہونے اور علمی خزائن کے بیشمار دفاتر پر قابض بن جانے کے "کتاب مقدس" کو ناقابل تردید دلائل سے اصلی ثابت نہ کر سکی۔ اکثر علمبرداران تحقیق کو اس مجموعہ کے اصلی ہونے کے متعلق نہ مٹنے والے شبہات ہیں۔ مستند تاریخی شہادتیں اس بات کی موجود ہے کہ ابتدائے عہد مسیحیت میں صرف موسوی شریعت یا عہد نامۂ عتیق کو اِلہامی کتاب "صحیفۂ سماوی" یا "قانون" کا مقدس مرتبہ حاصل تھا۔ خود نصرانی عہد نامۂ جدید کو عہد نامہ عتیق کا ہم پلہ نہ سمجھتے تھے۔ ہم عہد نامۂ جدید کی تدوین کے متعلق آگے چل کر کچھ روشنی ڈال سکیں گے اس وقت صرف اتنا لکھنا کافی ہے کہ دوسری صدی عیسوی (۱۸۰ء) میں انطاکیہ کے مسیحی عالم Theopolius تھیو پولیوس نے عہد نامۂ جدید کو عہد نامۂ قدیم کا ہم مرتبہ قرار دلوایا۔

عہد نامۂ عتیق | عہد نامہ عتیق یا توَرات کی تدوین حضرت موسیٰ و حضرت ہارون کے زمانہ میں نہیں ہوئی۔ اجلائے یہود کے بعد ازرا کاتب یا عزیر علیہ السلام نے قیادتِ یہود کی باگ سب سے اول اپنے ہاتھ میں لی۔ اُس وقت اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ موسوی شریعت کو مدون کیا جائے۔ ازرا Ezra نے بعض صحفِ عہد نامۂ عتیق کو مدون کیا۔ تاریخی حیثیت سے موسوی شریعت کے سب سے پہلے مدون، آئین یہود کے سب سے پہلے مشر

کتب خمسہ یا **Pentateuch** کے مؤلف اول حضرت عزیر ہیں۔ اس وجہ سے سب سے پہلی کتاب جو "کینن" یا "قانون" یا کتاب ربانی کہلائے جانے کی مستحق ہوئی وہ یہی مجموعۂ عزیر ہے۔ یہ فتویٰ سب سے اول قرون وسطیٰ میں صادر ہوا۔ لیکن تاریخ وعقلیات کی کسوٹی پر یہ ہنوز زیر کم عیار ہے۔ اور اسوقت بھی اکثر حکمائے یورپ عقلی و تاریخی بنیاد پر اسے فرضی کہتے ہیں۔ بہرحال ہمیں اسوقت عہدنامجات کے تناقض سے کچھ سروکار نہیں۔

حضرت عزیر کے بعد یہ ضرورت محسوس ہونے لگی۔ یہ مجموعہ نامکمل ہے، کیونکہ ابھی بہت سی قومی تصانیف ایسی باقی ہیں جو "کتب سماوی" کا مرتبہ رکھتی ہیں۔ ۴ صدی قبل مسیح میں جو غالباً حضرت مسیح کی پیدائش کی صدی ہے، نحمیاہ **Nehemiah** اسرائیل کے دوسرے مدبر نے ایک کتبخانہ کا سنگ بنیاد رکھتے وقت "افعال الملوک" "افعال الانبیاء" "زبور داؤد" اور "رسائل الملوک والانبیا" کے جمع کرنے کا حکم دیا۔ یہ مدبر اسرائیلی "قانون" یا شریعت کا مدون ثانی ہے۔ یہود میں اس مجموعہ کی وقعت بہت تھی، مگر مجموعۂ عزیر کے مقابلہ میں اس کا نمبر دوسرا تھا۔ اب بھی یہ مجموعے نامکمل سمجھے جاتے تھے، رفتہ رفتہ سو یا ڈیڑھ سو برس کے عرصہ میں تیسری تدوین عمل میں آئی۔ کچھ اور کتابیں مثل "کتاب الامثال" "کتاب الایوب" اور "غزل الغزلات" اس مجموعہ میں اور اضافہ کی گئیں۔ اس طرح پر تقریباً چھ صدی کی لمبی مدت میں عہدنامۂ عتیق پورا ہوا۔ اور اس مکمل مجموعہ کو آخرکار "کینن" یا الہامی قانون کا درجہ ملا۔ لیکن اسپر بھی اختلافات کا دروازہ بند نہ ہوا۔ فلسطینی یا اصل عبرانی مجموعہ، اسکندریہ کے مجموعے یا یونانی ترجمہ سے مختلف تھا۔ اسکی خاص وجہ تھی۔ اسکندریہ کے یونانی سمجھتے تھے کہ "عقل الٰہی" کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ انکے نزدیک ہر وہ کتاب جو انسانی ہدایت کے لیے مفید ہے، خواہ اُس کا الہامی ہونا کتنا ہی مشتبہ ہو، کتاب ربانی سمجھی جاتی۔ برعکس اسکے فلسطینی یہود جو بیشتر بنو اسرائیل تھے اس بات کے قائل تھے، کہ انبیاء کے ساتھ ساتھ الہام کا سلسلہ بھی ٹوٹ گیا۔ لہذا بغیر کافی چھان بین کے کوئی دوسری کتاب الہامی مجموعہ میں شامل نہیں کی جاسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ عبرانی مجموعہ میں بہت کم کتابیں شامل ہوئیں۔ لیکن یونانی کتب سبعہ یا **Septuagint** میں الہامی والحاقی کتابوں کو سند صحیح کی تحقیقات کے بغیر قانونی تحریرات کا مقدس مرتبہ حاصل ہوگیا اور اُن میں سے ہر ایک یکساں واجب الاحترام قرار پائی۔ مگر فلسطینی یا عبرانی مجموعہ کا ماننے والا طبقہ اُن تمام کتابوں کو جو ابتدائی مجموعہ میں درج نہ تھیں ممنوع القرأت قرار دیتا رہا۔ آج بھی دنیائے مسیحیت میں جو

قریبیبرانی مجموعہ کو حاصل ہے اُس کا دسواں حصہ بھی یونانی مجموعہ کو حاصل نہ ہوسکا - دونوں عہدناموں کے جمع کرنے میں سب سے زیادہ پریشانی ایک خاص وجہ سے ہوئی - پہلی اوردوسری صدی عیسوی میں عام رواج ہوگیا تھا کہ اکثر لکھنے والے اپنی تصانیف کو مقدس یا متبرک بنانے کے لیے زعماء یا انبیاء سلف کی طرف منسوب کردیتے تھے - اس مذموم طریقہ نے اسرائیلی ادب میں ایک ایسا ذخیرہ جمع کردیا تھا جو الہامی کتابوں کی ہمسری کا دعوی کرتا تھا - کلام پاک بھی اس قابل نفرت طریقۂ عمل کو اپنے مخصوص اسلوب اور مؤثر انداز میں یوں بیان فرماتا ہے

فویل للذین یکتبون الکتٰب بایدیھم ثم یقولون ھذا من عند اللہ لیشتروا بہ ثمنًا قلیلا - فویل لھم مما کتبت ایدیھم وویل لھم مما یکسبون
(سورۂ بقرہ رکوع ۵)

خرابی ہے اُنکو جو لکھتے ہیں کتاب اپنے ہاتھ سے پھر کہدیتے ہیں یہ خدا کی طرف سے ہے تاکہ لیویں اُسکے ذریعہ سے تھوڑے سے دام - سو خرابی ہے اُنکو اپنے ہاتھوں کے لکھے سے اور خرابی ہے اُنکو اپنی ایسی کمائی سے -

یہی وجہ تھی کہ الہامی تعلیم اور الہامی کتابوں کے تلاش کرنے والے ہر چمکیلی چیز کو سونا سمجھنے لگے تھے اور اصل جوہر مختلف نقلی سنگریزوں میں گم تھا - یہود کے مسلمہ مجموعہ میں بھی سب سے بلند مرتبہ احکام عشر یا شریعت کا تھا - جزو ثانی یا "الانبیاء" وغیرہ کو ثانوی درجہ حاصل تھا - جزو ثالث جزوِ ثانی سے بھی کم مرتبہ تھا - المختصر مجموعہ یہود میں سب حصوں کی یکساں عزت نہ تھی - چونکہ مجالس مذہبی میں ہر سلہ جزا کو "کینن" یا قانون کا مقدس مرتبہ حاصل ہوگیا تھا، لہذا اسکو نظرانداز کرنا ممکن نہ تھا - اس طرح یہ قانون الہامی تقدیس "تقریباً ہم معنی تھے -

عہدنامۂ جدید

اوپر بیان کیا جاچکا ہے کہ اوائل مسیحین کے نزدیک عہدنامۂ عتیق ہی کتاب ربانی تھا - عہدنامہ جدید کے حصے اُسوقت تمام مسیحی دنیا میں مختلف صحف و رسائل کی صورت پھیلے ہوئے تھے - آباء مسیحیت نے پہلی صدی عیسوی میں عہدنامہ جدید کی کتابوں کا کبھی بحیثیت الہامی کتب کے تذکرہ نہیں کیا - مسیحیت کے دورِ اول میں دو قسم کے عیسائی تھے

(۱) یہودی الاصل (۲) غیر یہود -

یہودی الاصل عیسائی سمجھتے تھے کہ عہدنامہ عتیق اور مقولات مسیح ایک ہی ہیں - اُنکے دلوں میں قانون موسوی کی جو وقعت تھی وہ عہدنامۂ جدید کے صحف کو قانون کا مرتبہ دینے سے مانع تھی - وہ "متی" "انکشافات یوحنا" اور "تبلیغات پطرس" کو محض قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے، الہامی نہ سمجھتے تھے - رسائل پولوس اُنکی نظروں میں وقیع نہ تھے - لیکن غیر یہود

کا زاویۂ نظر یک گونہ مختلف تھا۔ اُنکے دلوں میں متی، لوقا، یوحنا، پطرس و پولوس ہم مرتبہ تھے اور اُنکی تقدیس یوماً فیوماً بڑھ رہی تھی اور غیر ارادی طور پر اُنکو سرعت کے ساتھ الہامی مرتبہ حاصل ہوتا جا رہا تھا۔

اول اول علماء مسیحیت نے محض بطریق سند اپنی رایوں کی تائید کے لیے عہدنامۂ جدید کی کتابوں کا تذکرہ کرنا شروع کیا۔ اُن کا منشا محض اپنی دلیل کو قوی کرنا تھا۔ انکی کوئی الہامی وقعت نہ تھی اور نہ عام طور پر کلیسیائی کتبخانوں سے وہ باہر نکلی تھیں۔ سب سے پہلے برنا باس **Barnabas** نے ۱۰۰ء میں اپنی تصنیفات میں صحیفۂ متی کا حوالہ دیا۔ اسکے بعد علماء مسیحیین میں ان حوالوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ کسی نے متی سے مدد لی، کسی نے "لوقا" سے، کسی نے "مرقس" سے اور ہر شخص نے اپنی رائے کو زیادہ مقبول بنانے کے لیے اپنی اپنی سند کے بیت گانا شروع کیے۔ یہ کوششیں اور تذکرے رنگ لائے بغیر نہ رہے۔ دوسری صدی عیسوی میں عہدنامۂ جدید کی مختلف کتابوں نے بھی الہامی مرتبہ حاصل کرنا شروع کر دیا۔ بالآخر ۱۸۰ء میں انطاکیہ کے مشہور مسیحی عالم **Theopolius** تھیو پولیس نے عہدنامہ جدید کے مقدس و الہامی ہونے کا بیانگ دہل لاذقیہ **Laodicia** میں اعلان کر دیا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب **Chatholic Church** یا کلیسا رعامہ کا خیال پیدا ہوا اور اسکے ساتھ ساتھ قانون عام یا **Chatholic Canon** کا بھی خیال ترقی کرنے لگا۔ اسی خیال نے مختلف مدارج طے کرکے مسیح کے تقریباً ۱۰۰ برس بعد عہدنامہ جدید کے مجموعے کو مقدس، ربانی اور الہامی قرار دلوایا۔ پہلے اس مجموعۂ جدید کو محض تقدیس و تبریک حاصل ہوئی۔ بعد ازاں عہدنامۂ عتیق کے برابر اس کا شمار ہونے لگا۔ بالآخر اسکو موجودہ الہامی مرتبت حاصل ہو گئی۔

ابتدائً عہدنامۂ جدید میں صرف ۴ کتابیں الہامی سمجھی جاتی تھیں۔ حواریوں کے افعال و رسائل حصۂ حوارین میں شامل تھے۔ اس حصہ کے رسائل حسب ذیل تھے

پولوس	۱۳
پطرس	۱
یوحنا	۱

جو حصہ میں انکشافات یوحنا تھے۔ رفتہ رفتہ ان میں اور کتابیں اور خط شامل ہوئے۔ اب

یہ مجموعہ اچھا خاصا معجون مرکب بن گیا origen اریجن کی شہادت سے ثابت ہے کہ تیسری صدی عیسوی میں عہدنامہ جدید کے مجموعہ میں تین قسم کی کتابیں شامل تھیں

(۱) مصدقہ

(۲) غیر مصدقہ

(۳) مذبذب یا بین بین

"قانون" اسیبوس The Canon Eusebius (۳۴۰ء) تین قسم کی کتابوں پر مشتمل تھا

(۱)	جو عام طور پر تواتر سے ثابت ہوں	متواتر
(۲)	جن کی صحت مابہ النزاع ہے	نزاعی
(۳)	جو رد کر دینا تھے	موضوع

ان متنازعہ مجموعوں نے دنیائے عیسائیت کے سامنے Canonical قانونی یا الحاقی Apocrypha ہونے کا ایسا نزاع پیدا کیا جو اس وقت تک بہ آسانی طے نہ ہو سکا - ان امور کے طے کرنے کے لیے ۳۶۳ء میں سب سے پہلی مجلس کلیسا لاذقیہ Loadicia میں منعقد ہوئی - اس کی مجلس نے کچھ کتابیں "قانونی" یا الہامی قرار دی گئیں بقیہ کو الحاقی ہونے کی وجہ سے ممنوع القرأت قرار دیا گیا - اس طرح پر چوتھی صدی عیسوی میں ہر دو معاہدجات یکجا کیے گئے . اور اس مجموعہ کا نام قانون "کتاب مقدس" یا Holy Bible قرار پایا - اسکے بعد ۳۹۳ء میں شہر ہپو Hippo میں افریقی اسقفوں کی ایک اور مجلس منعقد ہوئی - اور اسکے بعد ۳۹۷ء میں بمقام قرطاجنہ Carthage تیسری مجلس منعقد ہوئی - ہر جگہ اور ہر مجلس میں "قانون" یا مجموعہ کتب ربانی میں کچھ نہ کچھ تبدیلی ہوتی رہی - یوں ہی رفتہ رفتہ مشرقی کلیسا کا مجموعہ قانون مغربی کلیسا یا Roman Church سے مختلف تھا ان دونوں کلیساؤں کی کشمکش پر الناظر کی ایک اشاعت ماسبق میں روٹیوں کی نزاع "کے سلسلہ میں ایک "شمع بے نور" نے بصیرت افروز روشنی ڈالی ہے - ان دونوں کلیساؤں کے اصول تدوین میں بھی بہت کچھ اختلاف تھا - یونانی یا شرقی کلیسا نے جس کا سنگ بنیاد مجلس لاذقیہ کے وقت عملاً رکھ دیا گیا تھا ہر اس نسخہ کو "قانونی" یا الہامی سمجھنے سے انکار کر دیا جو سند صحیح کے معیار پر پورا نہ اترتا ہو - مگر لاطینی کلیسیا یا رومانی چرچ نے عرف عام اور روایات مسلسل کو بھی سند صحیح کا مرتبہ دیا -

لاطینی کلیسا دراصل رومانی شاہنشاہ قسطنطین کی زندیقانہ کوشش کا نتیجہ تھا۔ اس نے باطل پرستی اور مسیحیت کے امتزاج سے ایک جدید ملغوبہ طیار کیا جو بالآخر ایک نیا مذہب بن گیا۔ قسطنطین اعظم جسکو آج مسیحی دنیا مسیحیت کا بانی و مبلغ اور محسن سمجھتی ہے، ہندوستان کے اکبر اعظم کی طرح محض حکومتی اغراض اور سیاسی مصلحتوں کا غلام تھا۔ دربار کے امرا و اعیان دولت ہنوز بت پرستی کے دلدادہ تھے اور اپنے باپ دادا کے مذہب کو چھوڑنا کفر سمجھتے تھے۔ لیکن اس کے شہنشاہ کی ماں ہیلینا جسکو مسیحی دنیا St Helena کے نام سے یاد کرتی ہے مسیحیت کی حلقہ بگوش تھی۔ بہت سی شاہی محل کی عورتیں اسکی ہمنوا تھیں ان کا اثر دن بدن بڑھ رہا تھا۔ رومانی دربار کے بت پرست امراء کا جما ہوا اثر، کلیسا کی عظمت کا بڑھتا ہوا اقتدار، ہیلینا ولیہ کا روز افزوں رسوخ، یہ سب متضاد قوتیں تھیں۔ انکے درمیان توازن قائم رکھنا بچوں کا کھیل نہ تھا۔ سلطنت کی داخلی قوتوں کو ٹکرا جانے سے محفوظ رکھنے کے لیے قسطنطین کی دوربین نگاہ نے ایسے مذہب کا انتخاب کیا جو عیسائیت اور بت پرستی سے مل کر بنا ہو۔ قسطنطین کے طیار کیے ہوئے اس مرکب کا ٹھیکہ دار رومانی کلیسا بن گیا۔

قسطنطین اضداد کا مجموعہ تھا۔ اس نے مندر بھی تعمیر کرائے اور گرجا بھی۔ اس نے باپ، بیٹا، روح القدس کے دوام و قدم کو طے کرنے کے لیے موتمر نقیہ بھی طلب کی۔ اور خوش قسمتی کی دیوی یا ہندوستانی اصطلاح میں لکشمی کے مجسمہ کے سامنے سجدہ بھی کیا۔ اس نے بپتسمہ بھی لیا اور خدائی کا بھی دعوے کیا۔ قسطنطین اس مخلوط مذہب کو ملکی سیاست کے لیے بہترین نسخہ سمجھتا تھا۔ اصلی عیسائیت کی یہ مسخ شدہ شکل تھی۔ بت پرست و نصرانی دونوں اپنی اپنی جگہ پر اس سے خوش تھے۔ اس مخلوط اور ماؤف مذہب کی اشاعت میں سب سے زیادہ ہیلینا ولیہ نے حصہ لیا۔ یہ اسی کا اثر تھا کہ بت پرستوں کے مندروں اور عبادت گاہوں کی کی طرح اولیاء و انبیاء کے بھی مقابر طیار کرائے گئے۔ اور انکو وہی مرتبہ ملا جو بت پرستوں کے مندروں کا تھا۔ گویا دنیا کے الہامی مذہبوں میں سب سے پہلی قبابہ یا قبوں کی پرستش کی بانی یہی ہیلینا ولیہ ہے۔ جسکو آج یورپ بے طرح سراہ رہا ہے۔ اس ماؤف مذہب کا قانون جسکو ہم لاطینی قانون سے تعبیر کریں گے سب سے زیادہ الہیات سے معمور تھا۔ نشاۃ ثانیہ یا قرون وسطے تک نصرانی دنیا "الحاقی" اور "قانونی" کا کوئی فیصلہ نہ کرسکی۔ ۴۲۶ء میں مجلس ٹرنٹ Trent نے تو اغسطس ولی Saint Augustine کے

قانون کو جو سر تا سر الحاقی کتابوں سے بھرا ہوا تھا آنکھ بند کر کے منظور کر لیا اور اس طرح تمام اصلی و الحاقی کتابوں کو "قانونی" مرتبہ حاصل ہو گیا۔ ۱۸۲۵ء میں بائبل سوسائٹی کا ایک اجلاس ملک اسکاٹ لینڈ میں منعقد ہوا۔ اس نے بہ قوت تمام الحاقی کتابوں کی اشاعت کو منع کیا۔

پانچویں صدی کی کلیسیائی تاریخ کی ورق گردانی ظاہر کر رہی ہے کہ شرقی و غربی کلیساؤں میں روز بروز اختلاف بڑھ رہا تھا۔ چند بار اتحاد کی کوششیں بھی کی گئیں مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا، اور اختلاف روز بروز شرارت چوگنا ہوتا گیا۔ "یہاں تک کہ تکفیر و تفسیق کا دروازہ کھل گیا۔ اور ایک کا پیرو دوسرے کو نجات ابدی سے محروم تصور کرنے لگا۔" خوب خوب قلمی و لفظی جہاد ہوئے۔ اگر ان مقدس کاغذی لڑائیوں کا کوئی نقشہ آپ دیکھنا چاہتے ہوں تو ذرا تنگ خیال مسلمان عالموں کے آستانہ پر جبہ سائی کیجیے اور پھر کفر ساز فیکٹریوں سے نکلے ہوئے کفر و شرک کے بموں کو ملاحظہ فرمائیے۔ افسوس کہ علماء اسلام کے سواد اعظم نے حرفاً حرفاً نصرانیت کی تقلید کی اور توحید کے پاک و صاف چشمہ کو خود تراشیدہ عقائد سے مکدر کر دیا۔

غرض اس تمام کشمکش میں قانون یا "کینن" کا دائرہ کلیسیائی تخیل کے موافق تنگ یا وسیع ہوتا رہا۔ جب مذہبی امور کی تدوین نے ایک گونہ مستقل صورت اختیار کی، تو لفظ "کینن" کا مفہوم بھی بدلنے لگا۔ اب ربانی قانون سے قطع نظر کر کے اس کا اطلاق ان قواعد پر ہونے لگا جو کلیسیا نے اپنے داخلی و خارجی نظام کے لیے وضع کیے۔ اس وقت "کینن" کے حریف "غیر ربانی" قواعد و احکام نہ تھے بلکہ اب اس کا استعمال آئین ملکی یا Jus civilis کے مقابلہ میں ہونے لگا۔ اس مفہوم میں رفتہ رفتہ مختلف ترمیمیں اور اضافے ہوتے رہے۔ اس سلسلہ میں اولاً اس کا اطلاق صرف مجلس کلیسیا کے احکام تک محدود رہا۔ اس کے بعد پاپا اور آباء کے احکام کو بھی وہی مرتبہ ملا۔ اب قانون کلیسیا یا آئین قانونی یا کینن لا Jus Canonicum ملکی اور ربانی قانون سے علیحدہ بالکل جداگانہ چیز ہو گیا۔ اس کے بعد "کینن لا" میں ایک نئی کوپل پھوٹی۔ اس کے دو جداگانہ حصے ہو گئے

(۱) وہ مجموعۂ قوانین جس کو کلیسیا نے اپنے متبعین کی ہدایت کے لیے وضع کیا اب یہ اصلی کینن لا یا Corpus Jus Canonicai ہو گیا۔

(۲) دوسرا وہ مجموعۂ قواعد جس کو کلیسیا نے اپنے مختلف شعبوں کے نظام داخلی کے لیے وضع کیا اس کا جداگانہ نام Jus ecclesiasticum یا آئین کلیسیا بن گیا۔

ول الذکر وہ قانون ہے جو ایک عرصہ تک مسیحی دنیا میں ملکی قانون کو نیچا دکھاتا رہا۔ بسا
اوقات پاپائی وآبائی احکام کے سامنے بڑے بڑے جباروں اور قہرمانوں کی گردنیں جھک
جاتی تھیں۔ پاپائے اعظم کے تقدس تاب دربار سے صادر کیے ہوئے احکام شاہنشاہانِ وقت
کو نیچا دکھا دیتے تھے۔ جب کلیسا کا زور گھٹ گیا، مذہب کا اثر نہ رہا۔ قومیت و وطنیت کا غلغلہ
بلند ہوا۔ یہ قانون بھی اپنی اہمیت کو کھو بیٹھا۔ ردی کے پرچہ سے زیادہ اسکی وقعت نہ رہی۔
کلیسا کی جگہ حکومت نے لی۔ پوپ کی مسند پر مسولینی بیٹھا۔ اب یہ قانون کس مپرسی کی حالت میں
یورپ میں دم توڑ رہا ہے۔ گرجاتے جاتے "کینن لا" ایک نیا شگوفہ چھوڑ گیا۔ دول متمدنہ نے
تعلقات باہمی میں انضباط قائم کرنے کے لیے ایک نئے قانون کا سنگ بنیاد رکھا۔ یہ بین الاقوامی
قانون ہے۔ اس قانون کا بنیادی پتھر بھی قانونِ کلیسا ہے۔ اُس زمانہ میں جبکہ روما کی
ہیبتناک سلطنت نے عیسائی مذہب اختیار نہ کیا تھا۔ صرف لاطینی اقوام اور اہل روما کو حقوقِ
شہریت حاصل تھے ورنہ اُنکے قانون کے بموجب غیر اقوام کے کوئی حقوق نہ تھے۔ لیکن کلیسا کے
دائرۂ اثر میں رومی و غیر رومی ہر قسم کی قومیں تھیں۔ غیر رومی اقوام کے تحفظ اور اُنکے حقوق
کی کما حقہٗ حفاظت کے لیے کلیسا کو ایسے قوانین کے وضع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی جو صلح و
جنگ میں کام آسکیں۔ مسیحی اقوام کے حقوق کی نگہداری، اُنکی تالیفِ قلوب، اور اُن پر اپنی
گرفت مضبوط کرنے کے لیے یہ قواعد بنائے گئے تھے۔ رفتہ رفتہ کلیسائی احکام کا ایک جزوِ کثیر
جمع ہوگیا۔ جو ممالک غیر یا دیگر اقوام کے معاملات خارجی سے تعلق رکھتا تھا۔ اس جزو کو مسیحی
دول یورپ نے معمولی کاٹ چھانٹ کے بعد بین الاقوامی قانون میں شامل کرلیا۔ آج دُنیا
سے اُس کی رائے عامہ کے علی الرغم اس قانون کی عظمت منوائی جارہی ہے۔ گویا دوسرے معنی
میں کلیسائی احکام کے سامنے دنیا کی قوموں سے بجبر سجدہ کرایا جاتا ہے۔ لیگ آف نیشنس یا انجمنِ
اقوام کے قیام کے بعد اس قانون کا اثر روز بروز بڑھ رہا ہے۔ اسی بین الاقوامی قانون کی ایک
شاخ حکمبرداری ہے۔ یہ نیا پھندا ہے جو کمزور اقوام کے گلے میں ڈالا جارہا ہے۔ گویا دولِ یورپ
کے اصول استعماریت کا یہ دوسرا نام ہے اور آج سرزمین شام اسی مقدس قانون کی بدولت
محبانِ وطن کے خون سے لالہ زار بن رہی ہے۔ بین الاقوامی قانون یقیناً دورانِ جنگ میں
ایک رحمت ہے۔ لیکن جنگ عظیم میں جرمنی کی خلاف ورزیاں بتا رہی ہیں کہ زبردست طاقتیں
جب چاہتی ہیں تارِ عنکبوت کی طرح توڑ ڈالتی ہیں۔

اسلامی عہد

سرزمین مشرق میں مسلمانوں کی احیاءِ علوم کی جدوجہد نے قانون کا تعارف اقوام شرقیہ سے کرایا۔ مگر یہاں کبھی اسکو مذہبی تقدیس وتبرک نصیب نہ ہوئی۔ فقہاء اسلام نے کبھی فقہی وشرعی مسائل میں دوسری قوموں کے مذہبی احکام سے مدد نہیں لی۔ اور نہ دوسری شریعتوں کی طرح اُنکی شریعت غیر مکمل اور غیر مدوّن تھی۔ عیسائیت کی مذہبی کتابوں میں لفظ "کینن" کے جو معنی تھے وہ مسلمانوں میں کبھی مقبول نہ ہوئے۔ علوم و فنون کی کتابوں کے ترجمہ کے سلسلہ میں عرب مترجمین نے لفظ "قانون" کو یونانی کتابوں سے مستعار لیا۔ آخر دوسری یا تیسری صدی ہجری میں لفظ قانون "اصول اساسی" یا "فہرست تصانیف حامل اصول اساسی" کے معنی میں مستعمل ہوا۔ عہد عباسیہ میں اور نیز بعد کے زمانہ میں مسلمانوں نے اس لفظ کا استعمال محض علوم و فنون کے سلسلہ میں کیا ہے۔ اسکی چند بدیہی مثالیں ہیں۔ شیخ الرئیس بوعلی سینا کی وہ معرکۃ الارا تصنیف جسنے اسکے مصنف کو "جالینوس عرب" کا خطاب دلوا کے چھوڑا اور جو آج بھی اطباء یونانی کا صحیفۂ ربانی ہے "القانون فی الطب" کے نام سے مشہور ہے۔ اگرچہ شیخ نے کسی جگہ اپنے مجموعہ میں لفظ قانون کی کوئی تعریف نہیں کی مگر کتاب کے مضمون اور نیز دیگر اصطلاحوں کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لفظ محض اصول یا قاعدۂ اساسی کے معنی میں مستعمل ہوا۔ مسلم ریاضی دانوں نے بھی بعض بعض ترجموں کے سلسلہ میں قانون کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ہندی کتاب ریاضی "سدھانت" کا ترجمہ مشہور مسلم ریاضی داں محمد ابن ابراہیم الفزاری نے کیا تھا۔ یہ کتاب عربی میں ایک عرصہ تک "سندِ ہند" کے نام سے موسوم رہی۔ البیرونی جگہ جگہ اس کتاب کو "قانون الفزاری" کے نام سے یاد کرتا ہے۔ افسوس کہ اس مشہور ریاضی داں کی تصنیفیں حوادث زمانہ کے ہاتھوں تلف ہوگئیں اور اب دنیا میں اُنکا نام جاننے والے بھی بہت کم ہیں۔

غزنوی دربار کے ارسطاطالیس ثانی "ابوریحان محمد ابن احمد البیرونی" کی مشہور تصنیف "القانون المسعودی فی الہیئۃ والنجوم" کے نام سے شہرۂ آفاق ہے۔ یہ کتاب علم ہیئت میں ایک معرکۃ الارا تصنیف ہے اور اُسوقت کے مسلمانوں کی علمی ترقی کی ایک زندہ مثال ہے۔ افسوس ہے کہ یہ لاجواب نسخہ محض یورپ اور ہندوستان کے قلمی کتبخانوں کی زینت ہے اور اسوقت تک شائقین علم کے ہاتھوں میں طبع ہوکر نہیں آیا۔

سلطنت "تاتار کا بانیِ اول یا آشوبِ تاتار کا سرخیل" "چنگیز خاں" تھا۔ چنگیز خاں پیدائشی

جنرل اور فطری، برتھا - تاریخ "جہاں کُشا" عہد تاتار کی ایک مستند تاریخ ہے - علامہ علاء الدین عطا ملک الجوینی اسکے مصنف ہیں - علامہ علاء الدین اور اُنکے بھائی شمس الدین تاتاری عہد میں بہت زیادہ دخیل اور صاحب اثر تھے - انھیں دو بزرگوں کی کوششوں سے چنگیز خاں کا پوتا مشرف با سلام ہوا - علامۂ موصوف اپنی کتاب میں چنگیزی تذکرہ کے سلسلہ میں فرماتے ہیں

"بروفق و اقتضاء رائے خود (چنگیز خاں) ہر کارے را قانونے و ہر معاملۂ را دستورے نہاد" (صـ۱ جلد ۱)

یہاں بھی لفظ قانون عام قاعدہ کے معنی میں مستعمل ہوا ہے - ورنہ چنگیز خاں نے سلطنت کے انتظام کے لیے جو قواعد بنائے اُنھیں طوماروں (Scrolls) پر لکھوایا اور اس مجموعہ کا نام "یاسانامہ بزرگ چنگیزی" رکھا -

"یاساہا و احکام برطوامیر ثبت کردند و آں را یاسانامۂ بزرگ چنگیزی خوانند و در خزانۂ معتبران بادشاہ باشد - ہر وقتے کہ خانے بر تخت نشیند یا لشکرے بزرگ برنشانند و یا پادشاہزادگان جمعیت سازند و در مصالح ملک و تدبیر آں شروع پیوندند آں طومارہا حاضر کنند و بناء کار برآں نہند" (صـ۱۷-۱۸ جلد اول)

گویا تاتاری مغلوں میں "قانون" کے معنی میں لفظ "یاسا" استعمال ہوتا تھا -

ان چند مثالوں سے پتہ چلتا ہے کہ اُس وقت تک قانون کا استعمال محض عام قاعدہ کے معنی میں ہوتا تھا ورنہ ملکی حکمرانوں کے احکام سے اُسے کچھ سروکار نہ تھا - وجہ ظاہر ہے - مُسلم ممالک میں موجودہ قانون کی جگہ شریعت حکمراں تھی - فقہاء اسکے مدون تھے - گویا شرعی قواعد کو قانون کا مرتبہ حاصل تھا ورنہ آئین ملکی لفظ "قانون" سے خالی تھا - عہد اکبری کی مشہور تصنیف "آئین اکبری" میں احکام ملکی کے سلسلہ میں لفظ "قانون" کا مطلقاً پتہ نہیں چلتا -

مختلف علوم و فنون کو چھوڑ کر آئینِ ملکی کے گروہ میں قانون کے داخلہ کے وقت کا پتہ چلانا یک گونہ دشوار ہے - مگر اتنا معلوم ہوتا ہے کہ مختلف ممالک کے نظم و نسق کے ساتھ مسلمان فاتحوں نے مفتوح اقوام کے رواج یا عرف عام کا بھی خیال رکھا - اکثر جگہ شرعی احکام کی موجودگی میں عرف عام سے کام لینا پڑا -

اب یہ عرف عام بھی رفتہ رفتہ قانونِ رواجی یا Customary law کی صورت اختیار کرنے لگا - آج تک اصل پر "رسم و رواج" کے اُس حصہ کو جس نے مختلف

قواعد و ضوابط کی صورت اختیار کرلی ہے "قانون" کے نام سے پکارتے ہیں۔ غالباً اصل اسلام میں قانون رسم و رواج کے نام سے سیاسیاتِ ملکی میں دخیل ہوا اور رفتہ رفتہ کل انتظامی احکام و ضوابط پر "قوانین ملکی" کے نام سے حاوی ہوگیا۔

قانون کا سیاسیات ملکی میں باقاعدہ داخلہ عثمانی عہد حکومت میں ہوا۔ پندرہویں صدی کے آخر میں سلطان محمد فاتح قسطنطنیہ رحمۃ اللہ علیہ نے محمد پاشا قرامانی وزیر اعظم کی تحریک پر ایک آئین مرتب کیا اور اُس کا نام "قانون نامہ" رکھا۔ یہ قانون تین مختلف ابواب پر مشتمل تھا

باب اول — زعمائے سلطنت اور اُنکے فرائض

باب دویم — رسوم و رواج کا تذکرہ

باب سویم — مختلف جرائم کی تشریح، اُنکی سزا کا تعین اور مختلف مخصوص شعبوں کے لیے مالگذاری کی تعداد کا تقرر۔

یہ قانون وزیر اعظم موصوف کے زورِ قلم کا نتیجہ تھا۔ پاشا موصوف حضرت مولانا جلال الدین رومی رومی کی نسل سے تھے۔ مئی ۱۴۷۷ء میں وزیر اعظم ہوئے اور ۱۴۸۱ء میں ظالم ینگ چریوں کے ہاتھ سے نہایت بیدردی سے شہید ہوئے۔ اسکے بعد سلاطین آل عثمان نے مختلف قانون ناموں کے ذریعہ سے اس قانون میں ترمیم و تنسیخ کی۔ اس سلسلہ میں سلطان سلیمان کے قانون نامے خاص طور پر مشہور ہیں، جنھوں نے اُسے سلیمانی قانونی لقب دلوایا۔

سلطنت عثمانیہ کی تاریخ میں "قانونِ اساسی" کو بھی نمایاں مرتبہ حاصل ہے۔ یہ قانون غازی مدحت پاشا کی وزارت عظمیٰ کے عہد میں سلطانی خط تشریف کے ذریعہ سے ۲۴۔ دسمبر ۱۸۷۶ء کو نافذ ہوا۔ یہ پہلا دستوری نظام تھا جو سلطنت عثمانیہ کو عطا ہوا۔ اس حیثیت سے اسکو عثمانی رعایا کی آزادی کا وثیقۂ حریت یا magna charta کہا جا سکتا ہے۔

اوپر لکھا جا چکا ہے کہ زبانِ اُردو میں یہ لفظ سب سے پہلے احکام و قواعد ملکی کے ترجموں کے سلسلہ میں استعمال کیا گیا۔ فی زماننا لفظ قانون آئین ملکی کے علاوہ فنون کے ہر شعبہ میں مروج ہے۔ ہندوستانی اربابِ علم تو "قانونِ شریعت" کے استعمال سے بھی حذر نہیں کرتے۔ الفاظ بھی مختلف قوموں کی طرح چلتے پھرتے رہتے ہیں اور جس جگہ جاتے ہیں مقامی خصوصیات اختیار کرکے وطن جدید کی زینت بنجاتے ہیں۔ لیکن اصلیت کا کچھ نہ کچھ رنگ غالب رہتا ہے۔

ناظرین کرام لفظ "کینن" کو کانون شامی سے مشتق نہ سمجھیں۔ کانون ایک شامی

قانون

کانون اول و کانون آخر۔ حدیث شریف میں بھی
مہینے کا نام ہے۔ اس نام کے دو مہینے ہیں۔
یہ لفظ کانون ایک جگہ آیا ہے۔
قانون ایک باجہ کا بھی نام ہے۔ یہ ایک چپٹے مستطیل صندوق کی طرح ہوتا ہے۔ اس پر
باقاعدہ تار لگے ہوتے ہیں۔ گھٹنوں پر رکھ کر مضراب سے بجایا جاتا ہے۔

محمد یحییٰ۔ ایم اے۔ ایل ایل بی وکیل بدایوں

مری تاب کیا ہے جو یہ کہوں کہ میں تیرا عاشق زار ہوں
تجھے پا رہے ہیں جو اے صنم دل و جاں سے اُن پہ نثار ہوں

جو نظر میں اپنی کھٹکتا ہے مرے دوستو میں وہ خار ہوں
مری زندگی کا ثمر یہ ہے کہ میں آپ اپنے پہ بار ہوں

وہی تیر ناز لگاؤ تم کہ نہ دل بچے نہ جگر بچے
وہ ہے چاہتا میں شکار ہوں یہ ہے چاہتا میں شکار ہوں

ہوا جل کے خاک میں اس لیے کبھی اُس نے پاؤں نہ رکھ دیا
نہیں پوچھا جسکو ہوا نے بھی میں وہ بدنصیب غبار ہوں

کہیں زخم ہیں کہیں داغ ہیں یہ عنایتوں کے نشاں ہیں سب
یہ شگوفے جس نے کھلائے ہیں اُسی باغباں کی بہار ہوں

مرے سوز کا یہ طریق ہے کہ میں آپ اپنے کو پھونک دوں
جو لگی تھی آگ ازل کے دن میں اُسی کا ایک شرار ہوں

مجھے کیوں کہا کہ یہاں سے جا مری جان آنکھ ذرا ملا
مری کچھ خطا تو بھلا بتا ترے صدقے جاؤں نثار ہوں

وہ بڑا سفر جو ہے پُر خطر تو خیالِ حُسن ہو راہبر
میں اُٹھوں جو حشر میں قبر سے تو کسی حسیں پہ دو چار ہوں

جو میں اُمتی ہوں کریم کا تو ہوں آہ بندہ رحیم کا
مجھے خوف روزِ جزا نہیں میں گنہگار ہزار ہوں

ممتاز علی آہ

نعمت خان عالی

وقائع نعمت خان عالی فارسی کی ایک مشہور کتاب ہے، جسکے اجزاء اکثر مدارس کے نصاب میں داخل کیے جاتے ہیں مگر دقتِ مضامین کی وجہ سے شاید ایسے بہت ہی کم اصحاب ہوں گے جو اُس سے پوری طرح لطف اندوز ہوسکیں۔ اس مشکل کو رفع کرنے اور نعمت خان عالی کے کمالِ انشاپردازی کو نمایاں صورت میں پیش کرنے کے لیے ہمارے کرم جناب مرزا محمد عسکری صاحب نے وقائع کو اُردو میں منتقل کیا ہے۔ اور طرزِ تحریر وہی اختیار کیا ہے جو انگریزی کے مشہور ادیب چارلس لیمپ نے شکسپیر کے ڈراموں کو کہانی کی صورت میں پیش کرتے وقت ملحوظ رکھا۔ مرزا صاحب کے کمالاتِ ادبی کو دیکھتے ہوئے غالباً یہ توقع بیجا نہ ہوگی کہ اُنھیں بھی چارلس لیمپ کی طرح اپنے اس ادبی کارنامہ کی بدولت شہرتِ عام حاصل ہوگی۔

وقائع کے اُردو ایڈیشن کے شروع میں اضافہ کرنے کے لیے مرزا صاحب نے نعمت خان عالی کے حالات اور اُس کی تصانیف و کلام پر جو تبصرہ لکھا ہے اُسے چھپنے سے پہلے ازراہِ کرم الناظر میں اشاعت کے لیے مرحمت فرمایا ہے، جسکے مطالعہ سے اہلِ ملک کو کسی قدر اندازہ ہوسکیگا کہ اصل کتاب کس عرقریزی اور کاوش سے لکھی گئی ہے۔

وقائع میں شہنشاہ عالمگیر اورنگ زیب کے متعلق جو روش مصنف نے اختیار کیا اُسے مسلمان پسندیدہ نہیں سمجھ سکتے، مگر مصنف کے ادبی کمالات کا اعتراف نہ کرنا اور اُس کی انشاپردازی کے محاسن کو نظرانداز کرنا انصاف کے خلاف اور مسلمانوں کی علم دوستی و ادب نوازی کی دیرینہ روایات کے منافی ہوگا

ایڈیٹر

عالی اصل میں میرزا محمد نام تھا، مگر اپنے خطاب کے ساتھ ایسے مشہور ہوئے کہ لوگ اصل نام کو بھول گئے، اور صرف خطاب یعنی نعمت خان عالی یاد رہ گیا۔ عام تو عام بعض بعض دفعہ طبقہ خواص نے بھی دھوکا کھایا۔ مثلاً بعض تذکرہ نویسوں نے اسی خطاب کو نام سمجھ لیا۔

عالی شیراز کے رہنے والے تھے اور ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ انکے والد کا نام فتح الدین تھا، جو اپنے زمانہ کے مشہور و معروف طبیب تھے۔ ہندوستان کی بھی سیاحت

کی تھی، اور پھر شیراز واپس چلے گئے تھے۔ انھیں حکیم فتح الدین کے بھتیجے یعنی عالی کے چچازاد بھائی حکیم محسن خاں نے بھی ہندوستان آکر شاہ عالم کی مصاحبت اختیار کی اور بڑا عروج پایا۔ اسی طرح محسن خاں کے بیٹے حکیم صادق خاں نے عالمگیر ثانی کے آخر عہدِ حکومت میں اقتدار و اعتبار حاصل کر کے حکیم الملوک خطاب پایا، اور اپنے معاصرین کی نظروں میں اتنا مرتبہ حاصل کیا کہ محسودِ زمانہ ہوئے۔

عالی کی تعلیم و تربیت

مرزا محمد ہندوستان میں پیدا ہوئے اور یہیں نشو و نما پاکر کمسنی ہی کے زمانے میں اپنے والد حکیم فتح الدین کی [illegible] وقت انکے ساتھ ساتھ اپنے آبائی وطن مالوف شیراز چلے گئے اور وہیں شیراز میں علوم و فنون کی تحصیل اور تکمیل کی۔ فارسی اُن کی اصلی زبان تھی اس لیے اُس کا ذکر تحصیلِ حاصل سمجھنا چاہیے۔ مگر اُنھوں نے زبان عربی میں مختلف علوم و فنون صرف و نحو، منطق، فلسفہ، ہیئت، فقہ، حدیث، پڑھی اور ایک عالمانہ قابلیت پیدا کرلی۔ اس کے بعد طب کی طرف توجہ کی، اور جلد اپنے اس آبائی پیشے میں بھی کمال حاصل کرلیا۔ علوم ضروری سے فراغت حاصل کرنے کے بعد شاعری شروع کی اور حکیم تخلص اختیار کیا۔ ابتدائی کلام میں یہی تخلص رکھا مگر جب ملا شفیعائے یزدی ملقب بہ دانشمند خاں سے [illegible] واقف ہوئے تو معلوم کسی کے سُجھانے سے یا خود یہ خیال آیا کہ علیم اور حکیم بالکل ایک ہی طرح سے لکھا جاتا ہے لہٰذا اس تخلص کو چھوڑ دیا، اور اپنے اُستاد کے مشورے سے عالی تخلص اختیار کیا۔ جیسی بابت اپنے دیوان کے دیباچہ میں لکھا ہے

"در بدایت حال بمناسبت شغلِ طبابت کہ سمت موروثی بود حکیم تخلص می نمودم۔ آخر تصحیف حکیم اختیار تخلص علیم را مانع شد۔ بفرمودۂ استاد دانشمند خاں عالی تخلص کردم"

چونکہ اُس زمانے میں تیموری فرماں روائی کا آوازہ تمام عالم میں پہونچ چکا تھا، اس لیے عالی نے دوبارہ ہندوستان کا رُخ کیا، اور یہاں آکر کسی نہ کسی وسیلے سے دربارِ عالمگیری میں پہونچ کر تقرب حاصل کیا۔ اور رفتہ رفتہ زمرۂ ملازمینِ شاہی میں داخل ہو گئے۔ ۱۰۹۸ھ میں جب جنگ حیدرآباد میں اورنگ زیب کو فتح ہوئی تو عالی نے مندرجہ ذیل تاریخ فتح کہکر حضورِ شاہی میں گزرانی، جو نہایت پسند آئی، اور صلے میں خلعتِ شاہی سے سرفراز کیے گئے۔

تاریخ یہ ہے :-

از نصرت بادشاہ غازی　　گردید دل جہانیاں شاد
آمد بہ قلم حساب تاریخ　　شد فتح بہ جنگ حیدرآباد

تاریخ نعمت خاں عالی بابت فتح حیدرآباد

بو الحسن داشت جا بجائے زحل　　بدرش کرد از مکان تقدیر
چوں برون رفت او بجاش نشست　　شاہ اورنگ زیب عالمگیر

اسی زمانے میں زمرۂ مصاحبین خاص میں شامل ہوئے، اور ۱۱۰۲ھ میں بکاول یعنی داروغہ باورچی خانہ کی خدمت پر مامور ہوئے، اور نعمت خاں دربار شاہی سے خطاب حاصل کیا۔ "شکر نعمت واجب" اسکی تاریخ ہے۔

مذہب، عادات و خصائل

عالی مذہباً امامیہ تھے، اور تحصیل و تکمیل علوم مذہبی کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مذہب کے ایک مقتدر عالم تھے۔ مگر فطرتاً نہایت آزاد مزاج، شگفتہ طبع، ہشاش بشاش، ظریف الطبع واقع ہوئے تھے، اس لیے مولویت کا ان پر کچھ زیادہ اثر نہیں پڑا تھا۔ جسکی انکے کلام کے ایک ایک لفظ سے شہادت ملتی ہے۔ پھر بھی صورت معاملات کچھ ایسی واقع ہوئی تھی کہ انکو متعصب بننا پڑا۔ وجہ یہ تھی کہ فرماں روائے عہد یعنی اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ ایک مولویانہ وضع رکھنے والے سُنّی المذہب تھے اور اپنے مذہب کی پاسداری میں انکو پورا غلو تھا۔ اُدھر عالی ایک فطرتی منہ زور، لاابالی، وہ اس تعصب کو بُرا جانتے تھے۔ اور تو کچھ کر نہ سکتے تھے، بادشاہ کی اکثر باتوں کا مضحکہ اڑاتے اور اتنا اُڑاتے کہ خود بھی تعصب مذہبی سے لبریز معلوم ہونے لگتے تھے۔ کچھ تو یہ، کچھ بات کی پیچ نے انھیں بھی اچھا خاصا متعصب بنا دیا تھا۔ اسی مذہبی غلو اور تعصب کی وجہ سے وہ بادشاہ سے کچھ صاف نہ تھے۔

اس باہمی ناروا داری اور ناراضی کی اطلاع عالمگیر ایسے بادشاہ کو نہ ہونے کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ مگر چونکہ اورنگ زیب عالمگیر اس خشک مزاجی اور انتہائی تعصب کے باوجود بھی قابلیت کے قدر دان اور جوہر شناسی میں فرد تھے اس لیے انھوں نے اگرچہ عالی کی متعدد شکایات بھی سنیں، مگر کبھی انکے جوہر ذاتی کو نظر انداز کر کے انصاف کا خون اپنی گردن پر نہیں لیا، اور اسی لیے کسی قسم کا تعرض نہیں کیا۔ چنانچہ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ نکتہ چینیوں نے عالمگیر سے عالی کی شوخ مزاجی اور تعصب مذہبی کے ساتھ صحابہ کرام پر لعن و طعن، سب و شتم وغیرہ

ڈالا ہے۔ یہ شکایات سن کر بادشاہ نے عالی کو بلایا اور باتوں باتوں میں اعتقادات کے متعلق دریافت کیا، تو نعمت خان عالی نے جواب میں یہ رباعی پڑھی:

اصحاب نبی کہ چار یار اند　　چوں چار کتاب و رستگار اند
ہر چار بہا شیلے و ریبے　　زاں چار یکے نداشت عیبے

بادشاہ کو یہ سن کر دلی اطمینان ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، مگر بظاہر اس رباعی سے کچھ نہ کچھ مطمئن ہو گئے۔ مگر نکتہ چینیوں اور خوردہ بینوں کی نگاہ تو ایک ایک نقطے اور ایک ایک حرف پر رہتی ہے، چنانچہ جب عالی چلے گئے تو کہا گیا کہ ذرا حضور غور تو فرمائیں، یہ تو کھلا تبرا ہے۔ ذرا چوتھے مصرعے کو حضور اچھی طرح دیکھیں۔ چوتھا مصرعہ تو کھلا ہوا ذومعنی مصرعہ ہے۔ سمجھتے ہی بادشاہ کو بھی شبہ ہو گیا۔ پھر بلایا، اور پھر مذہب و مشرب کی بابت تشریح و تصریح چاہی۔ عالی نے یہ شعر پڑھا:

بارہا گفتم بتو اے شہریار　　چار یار و چار یار و چار یار

یہ سن کر بادشاہ کو بہر صورت اطمینان ہو گیا۔ بعض کاٹنے والوں نے کہا بھی کہ حضور اس شعر میں آپ نے صحابہ کبار کی مدح سمجھی ہے مگر در اصل عالی نے دوازدہ امام کی منقبت کی ہے۔ بادشاہ نے یہ سن لیا، اور سمجھ بھی لیا، مگر پھر کچھ نہ کہا۔ ٹالنے کو تو ٹال گئے، مگر دل سے نہ وہ صاف رہے، اور نہ یہ صاف رہے۔ عالی تو عمر بھر ستم ظریفیوں کے ساتھ بادشاہ پر چوٹیں کرتا رہا۔ مذہبی معاملہ ہو یا غیر مذہبی اسے ہر طرح سے بادشاہ پر تبرا کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ مرزا یار علی بیگ مقربانِ شاہی میں سے ایک نہایت ممتاز اور موقر مصاحب تھا۔ گردن میں کسی عارضے کی وجہ سے تھوڑا سا زخم تھا۔ اسی طرح بادشاہ کے زانو میں ایک بلند جگہ سے گر جانے کی وجہ سے ہمیشہ درد رہا کرتا تھا۔ اور اسی سے ٹانگ میں ایک اعوجاجی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ اسی لیے ہمیشہ دوا دوش ہوتی رہتی تھی اور ہمیشہ نئے نسخے تیار ہوتے تھے۔ تضمید و تدہین کا سلسلہ غیر متناہی ہو گیا تھا۔ نئی دوائیں روز روز بنتی تھیں۔ اسی واقعے کو عالی نے یوں نظم کیا ہے:

روغنے چوں پئے زانوے شاہ　　امتحاں از لوازمِ داروست
برگردنش بہ پیش یار علی　　آنکہ یکساں بود بہ دشمن و دوست
گر کند ایں علاجِ گردنِ او　　بیشک از بہر پائے ما نیکوست
یعنے از رمز نکتہ گفتیم　　کہ نہاں چوں اشارۂ ابروست
فتنہ ہائے کہ ما بپا کردیم　　وبذر ایں پا ہمہ بگردنِ اوست

اسی طرح ایک مرتبہ بادشاہ کی تعریف میں یہ قطعہ کہکر نذر گزرانا:

اے عمر صورت و عثمان سیرت — کہ ابوبکر محمد اید تو باد
روز محشر کہ بجز دور مانی — پسر بوسفیان یار تو باد

بادشاہ کوئی جاہل تو تھے نہیں، چوتھے مصرعے کا مطلب سمجھ گئے۔ مگر پھر بھی یہ کہکر خاموش ہوگئے:

"اگرچہ ایں کونہ قرمساق بد ذات خود ہجو کردہ است، لیکن سعادت است۔ بنویسند در بیاض خاص"

عالی چونکہ بالطبع ظرافت پسند اور شوخ مزاج واقع ہوئے تھے اس لیے دوسرے معاملات میں بھی انکی یہ ہنسی رو کے نہ رکتی تھی، اور دنیاوی افکار بھی انکی اس عادت خاص پر غلبہ نہ حاصل کرسکتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ضرورت اور افلاس کے ہاتھوں سے پریشان ہوکر اپنا جنیئہ مرصع زیب النساء بیگم صبیۂ بادشاہ وقت کے پاس فروخت کے لیے بھیجا۔ مگر کچھ ایسے اتفاقات ہوئے کہ ایک عرصہ گزر گیا اور اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا تو بیگم کی خدمت میں یہ رباعی لکھ بھیجی۔

اے بندگیت سعادت اختر من — در خدمت تو عیاں شدہ جوہر من
گر جنیئہ خریدنی ست پس کو زر من — ور نیست خریدنی بزن بر سر من

زیب النساء نے رباعی پڑھ کر جنیئہ واپس کردیا، اور پانچ ہزار روپیہ انعام دیا۔

عالی کی شاعری

دور عالمگیری کے شعرا کی تعداد اگرچہ عہد اکبری و جہانگیری کے برابر نہیں ہے پھر بھی شاہجہاں کے زمانے کے برابر ضرور ہے۔ چنانچہ عنایت خاں آشنا، ناظم ہروی، مرزا محمد رفیع قزوینی، [illegible]، مرزا عبدالقادر بیدل، ملا شفیعائے یزدی، مرزا محمد علی اکبرآبادی، ملا محمد سعید اشرف، عاقل، ملا طغرائے مشہدی، مرزا معزالدین فطرت، علی سرہندی، راسخ، ناصر، بازل، طاہر، ارادت خاں واضح وغیرہ وغیرہ عہد عالمگیری کے نامور شعرا میں سے گزرے ہیں۔ ان سب کے مقابلے پر جب عالی کے کلام کو دیکھا جاتا ہے یا اُن سے موازنہ کیا جاتا ہے تو وہ کسی صورت سے اُن لوگوں سے کم نہیں ٹھہرتا بلکہ اُس میں ایک خاص رنگ تغزل کا نظر آتا ہے۔

کلام عالی کی خصوصیات

عالی کے کلام میں چند ایسی خصوصیتیں ہیں جو انکے معاصر شعرا کے کلام میں نہیں ہیں۔ جنھیں ہم ذرا تفصیل کے ساتھ لکھنا چاہتے ہیں:-

پہلی خصوصیت — عالی کے کلام کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ فارسی کے اہل زبان ہونے اور

ایران کے رسوم ورواج کو جاننے اور انکے بیان کرنے پر قادر ہونے کے باوجودیکہ وہ ہندوستان میں رہ کر ہندوستان کے مذاق اور یہاں کے رسوم ورواج کو نظرانداز نہیں کرتے، اور انکے اکثر اشعار میں یہاں کے عادات وحالات اس خوبی سے نظم ہوتے ہیں کہ بیاختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اُن کی نگاہیں اس گہرے راز کو دریافت کر چکی تھیں، کہ جس ملک میں شاعری کی جائے اُسکو اُسی سرزمین کے دلکش حالات سے وابستہ رکھا جائے تاکہ وہ زیادہ دلکش اور دلچسپ ہو۔ اور اُس کے اثرات دلوں پر اچھی طرح سے مترتب ہو سکیں۔ برعکس دوسرے شعرا کے کہ وہ ہندوستان میں رہ کر ایران وتوران کی باتیں نظم کیا کرتے تھے۔

دوسری خصوصیت زبان فارسی کی شاعری رنگینیِ بیان، نادر استعاروں، بدیع تشبیہوں میں اُلجھ کر ایسی محدود ہو گئی تھی کہ اس میں اصلیت نہ رہی تھی۔ چنانچہ متاخرین کے دواوین اس کے شاہد ہیں۔ فطرت، شوکت، بیدل وغیرہ سب اسی رنگ کے دلدادہ ہیں۔ مگر عالی نے ان سب باتوں پر ایک غائر نظر ڈالی اور ان عیوب سے اپنے دامنِ کمال کو ملوّث نہ ہونے دیا۔ چنانچہ اُنکے دیوان میں استعاروں اور تشبیہوں کی وہ بھرمار نہیں ہے جو اُنکے پیشرووں یا اُنکے معاصرین کے یہاں ہے۔ وہ غلو اور اغراق کی آندھیوں سے وہ طوفان بے تمیزی برپا نہیں کرتے جو اُنکے معاصرین نے کیا۔ اُنکو ہمیشہ اس بات کا خیال رہتا ہے کہ زوائد کا شعر پر اتنا اثر ہرگز نہ پڑنا چاہیے کہ فروع باقی رہ جائیں اور اصل غائب ہو جائے۔ وہ نہیں چاہتے کہ مطالب ضروری اس قدر تاریکی میں چلے جائیں کہ پھر تیز سے تیز نگاہیں بھی اُنکو ڈھونڈھ نہ سکیں۔ یہ نہیں ہے کہ اُنھوں نے تشبیہوں اور استعاروں یا صنایع بدایع کو واجب الترک قرار دیا ہے اور کبھی استعمال ہی نہیں کیا۔ مگر اس طرح سے استعمال کیا ہے کہ اہمال پیدا ہونے کے بجائے حُسنِ کلام بڑھ گیا ہے۔

تیسری خصوصیت اساتذہ نے شعر کی خوبی اور تاثیر کو دو باتوں پر منحصر رکھا ہے کہ یا تو شعر میں انبساطی پہلو ہو یا انقباضی۔ اگر یہ دونوں باتیں شعر میں نہیں ہیں تو وہ شعر حدودِ شعریت سے دُور ہے بلکہ ہذیان ہے۔ اُسکو شعر کہنا ایک قسم کی زیادتی ہے۔ چنانچہ شعرائے متاخرین فارس میں بابا فغانی سے لیکر عرفی وفیضی وظہوری وغیرہ بلکہ اُن کے مابعد کے شعراء بھی برابر انقباضی رنگ کو مدنظر رکھتے چلے آتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو رنگ اس قدر عام

ہو جاتا ہے، وہ ایک پیش پا اُفتادہ مضمون سے زیادہ وقیع نہیں رہتا۔ اُس میں ایک قسم کا ابتذال اور عمومیت پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر اُس کے مقبول بنانے اور اُس میں تازگی پیدا کرنے کے لیے تصنعات لایعنی کی ضرورت پڑتی ہے۔ چنانچہ شعراء مابعد میں ایسا ہی ہوا ہے۔ پھر ایسے ایسے مصنوعی خیالات پر صرف شعر کو درد انگیز بنانے کی غرض سے مصنوعی الفاظ اور تراش و ترکیبات وغیرہ سے آورد کا رنگ و روغن چڑھایا گیا ہے۔ مگر اس تصنع نے شعر میں اثر کی بجائے اور بے اثری پیدا کر دی ہے۔ عالی نے اس بات کا بلکہ اس نقص کا بھی اندازہ کیا۔ اور اسی لیے اس پامال اور مخصوص جادہ کو چھوڑ کر ایک طرز خاص ایجاد کیا۔ جس میں انبساط و انقباض کو ملا دیا۔ سلامت روی اور اعتدال کو ہر جگہ ملحوظ رکھا، اور اسی رنگ خاص پر اپنی شاعری کے قصر رفیع کی بنیاد رکھدی۔ مگر چونکہ وہ فطرتاً ظریف الطبع تھے اس لیے پھر بھی انبساطی رنگ انکے کلام پر غالب رہا۔ بلکہ اُن کی شاعری کا جزو اعظم بن گیا۔ اسی لیے دور مذکورہ میں عالی کے کلام میں یہ بات ایک خصوصیت کی حد میں داخل ہو گئی۔

چوتھی خصوصیت

مضمون آفرینی اور تخیّل اگرچہ ہر شاعر کے لیے ضروری ہے بلکہ بالفاظِ دیگر شعر کا جزوِ اعظم ہی ہے، مگر عالی نے خصوصیت کے ساتھ اس کا بہت خیال رکھا ہے، بلکہ التزام کیا ہے۔ اور اکثر جگہ جدتِ تخیّل میں وہ اپنے معاصرین سے بڑھ گئے ہیں۔ اور زیادہ تر قابلِ تعریف یہ امر ہے کہ کہیں اپنی قوتِ متخیلہ کو متمیزہ کی حدود حکومت سے ایک قدم باہر نہیں جانے دیا۔

پانچویں خصوصیت

یہ بھی ایک خاص بات ہے کہ وہ مختلف علوم و فنون کے ماہر اور اُستاد کامل تھے مگر غزلیات اور رباعیات میں خصوصاً اُنھوں نے صفائی زبان کا ہر جگہ خیال رکھا ہے اور اس بادۂ شیرازی میں کسی قسم کا ذرا بھی میل نہ ہونے دیا۔ اسی لیے تمام کلام موجِ سلسبیل معلوم ہوتا ہے۔ صفائی، شیرینی، روانی، کہیں تسلسل سب اُس میں موجود ہیں۔ اُن کے دیوان میں اصناف کلام، مثلاً غزلیات، رباعیات، قطعات، تاریخیں، ہجویں موجود ہیں۔ ایک مثنوی موسوم بہ سخن عالی بھی اس میں شامل ہے۔

اصناف کلام پر رائے

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا اُنکے کلام میں انبساطی رنگ زیادہ ہے یہی وجہ ہے کہ دوسرے مشاہیر کے مقابلہ پر عالی کے یہاں درد و اثر کی کمی ہے۔ مگر ظرافت کی چاشنی اور انبساطی رنگ نے اس کمی کو پورا کر دیا ہے۔ اسوا اسکے تنوع معانی اور معاملہ بندی کے اسلوب نے اور بھی چار چاند لگا دیے ہیں۔ اسی سے غزلیات

میں ایک خاص رنگ پیدا ہو گیا ہے۔

رباعیات | اگرچہ اُن کے یہاں رباعیوں کی ایک اچھی خاصی تعداد ہے مگر ان میں کوئی ایسی خصوصیت نہیں کہ عمر خیام کی رباعیوں کی طرح وہ عالی کے نام پر طغرائے امتیاز ثابت ہوں۔

قطعات | بعض قطعات ہجو اور مذمت کی تیز اور چٹپٹی ہوئی تلواریں ہیں جنھیں بیدردی کے ساتھ اپنے مخاطب کے گلے پر پھیر دیا ہے۔ بعض واقعات پر مبنی ہیں بعض معمولی ہیں۔

تاریخیں | انکی کہی ہوئی تاریخیں ایک خاص درجۂ امتیاز رکھتی ہیں۔ مادۂ تاریخ اس قدر صاف ہوتا ہے کہ اسکی نظیر دوسروں کے یہاں ذرا مشکل سے ملتی ہے۔ اسی لحاظ سے وہ نہایت قابلِ تعریف ہیں

ہجویں | تمام اصناف سخن میں عالی کے یہاں ہجوگوئی کا زیادہ شہرہ ہے۔ اور اسکے ساتھ ہی ساتھ ہجووں کا پایہ اس قدر بلند ہے کہ وہ عیب کے بجائے ہنر معلوم ہوتی ہیں۔ اُنکی ہجووں کا جواب اُنکے معاصرین بلکہ متقدمین کے یہاں بھی جواب نہیں۔ مولانا غلام علی آزاد تذکرۂ خزانۂ عامرہ میں لکھتے ہیں "ہجوش شمشیر خونریز است بلکہ صور قیامت" لیکن اگرچہ فارسی شعراء میں سیکڑوں شاعر ہجوگو گذرے ہیں، مگر نعمت خان عالی نے جو طرز خاص اختیار کیا وہی اُسکے موجد تھے اور وہی اسکے خاتم ہوئے۔ دوسروں کو اس رنگ کی ہوا بھی نہیں لگی۔ اگر انکی ہجووں کو متانت کی نگاہ سے دیکھیے تو بھی ان کا مرتبہ عالی ہے۔ اور اگر ہزل کی نوعیت سے اُن پر نگاہ ڈالیے، تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا مسخرہ بھانڈ بھی انکا مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ عالی ہجووں میں صرف بیہودہ گوئی اور ہرزہ سرائی ہی سے کام نہیں لیتے بلکہ اُس میں انتہائی معانی آفرینی کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر لطف یہ ہے کہ کسی ہجو سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ہجو کرنے والا غصے میں ناک بھوں چڑھائے ترش رو بنا بیٹھا ہے، بلکہ برعکس اس کے صاف صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ کہنے والا جو کچھ کہہ رہا ہے نہایت خندہ پیشانی سے کہہ رہا ہے۔ یا ہنس ہنس کر دوسرے کے خرمنِ صبر و قرار پر بجلیاں گرا رہا ہے۔ ظرافت کا ایک بے پایاں اور ذخار دریا موجیں مارتا چلا آتا ہے، جس پر اُسکی روانی میں اُسکی چھینٹیں پڑجاتی ہیں وہ شرابور ہوکر رہ جاتا ہے۔ علی الرغم دوسرے لوگوں کے کہ جب کچھ کہتے ہیں حرف بعد کو مُنہ سے نکالتے ہیں پہلے سننے والے کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ جسکے منہ سے یہ لفظ نکل رہے ہیں اُس سے موروثی دشمنی اور پُرانی مخاصمت ہے۔ عالی کے وہ تمام قصائد ہجویہ جو اُنکے دیوان کے علاوہ وقائع میں درج ہیں اپنے خاص انداز میں یکتا

اور بے نظیر ہیں۔ اسکے علاوہ ایک قطعہ جو کامگار خاں پسر جعفر خاں وزیر کی کتخدائی کے موقع پر کہا ہے اور وہ دیوان میں موجود ہے، ایسا ہے جس نے بڑے بڑے ہجو یہ قصیدوں کو مات کر دیا ہے بلکہ شعرا کی ہجو کے دفتر اُسکے سامنے دریا بُرد نظر آتے ہیں۔ ہجو گوئی، ظرافت، ہزل، کو نظر انداز کرکے جب اس قطعہ کی بلاغت پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ جاہلیت کا کوئی عرب شاعر جوش میں کچھ کہہ رہا ہے۔ ایک ایک لفظ میں معنی کا ایک خزانہ مخفی ہے۔ بہت سے علوم و فنون کے مصطلحات اس طرح اُس میں سمو دیے ہیں جیسے زہر کے پیالے میں آبحیات ملا دیا جائے۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ ہر ہجو کرنے والا اتنا جوش میں آجاتا ہے کہ مشارالیہ کے ساتھ اُسکے تمام خاندان کو لے ڈالتا ہے۔ موجودہ واقعات میں تمام گذشتہ غیر ضروری واقعات اور ذاتیات کو بھی شامل کر لیتا ہے۔ مگر خان عالی کا یہ طریقہ نہیں ہے۔ وہ اپنی ہجو کو اکثر دائرۂ تہذیب میں صرف اپنے مخاطب تک محدود رکھتے ہیں، اور جو شکایت اُنھیں ہے اُسکے سوا ایک لفظ بھی نہیں کہنا چاہتے۔ اگر اُنکی یہ تہذیب بھی میٹھی چھری بنکر فانہ برانداز عالم ثابت ہوتی ہے، مگر وہ اُسی محدود فضا میں وہ کچھ کہہ جاتے ہیں جسکے لیے دوسروں کے واسطے گالی اور کوسنوں، طعن و تشنیع کے وسیع میدان بھی کافی نہیں ہوتے۔ اُنکی یہ ناشی متانت ایسی ہوتی ہے کہ شوخیوں کے دفتر کے دفتر اُس پر قربان ہیں۔

مثنوی جو "سخن عالی" کے نام سے موسوم ہے، اگرچہ تعنفی وغیرہ اُس زمانے کے دوسرے مشاہیر کی مثنویوں کی ٹکّر کی نہیں، پھر بھی خیالات عالی جواہر آبدار کی طرح اُس میں چمک رہے ہیں۔ فصاحت، بلاغت، روانی کے دریا بہا دیے گئے ہیں۔ جنسے تشنگان ذوق کے دل اور روحیں سیراب و شاداب ہوتے ہیں۔ اسی لیے اُسکا پایہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔

تصانیف ظاہر ہے کہ عالی ایسے وارفتہ مزاج کو تصنیف و تالیف کے ساتھ کیا شغف ہو سکتا تھا، اُنکی ظرافت اور عدم توجہ کرنے کی کب اجازت دیتی تھی۔ تاہم وہ ایک مصنف کی حیثیت سے ایک شہرت رکھتے ہیں۔ تصانیف ذیل اُنکی مشہور ہیں:-

دیوان جسکا مفصل ذکر اوپر گذر چکا۔

وقائع نعمت خان عالی اس میں محاربہ گولکنڈہ کے ۱۰۹۷ھ کے حالات مذاق کے پیرایہ میں ایسے دلکش مقفی طرز عبارت کے ساتھ لکھے ہیں کہ اُس وقت کے مشہور منشآت اور

اور اپنا ناز تصانیف میں بھی اس کا جواب نہیں ہے۔ اسکی عبارت میں رنگینی، شگفتگی، فصاحت، بلاغت، تمام چیزیں اس طرح جمع کردی ہیں جیسے مختلف رنگ کے پھولوں سے کوئی خوشنما گلدستہ بنایا جاتا ہے۔ اپنے طبعی اور خلقی رنگ کے تقاضے کی بنا پر درمیان درمیان میں اسوقت کے مشہور مشہور افسروں اور خود شاہ عالم پناہ پر بہت سی چوٹیں کی ہیں۔ محاربہ و محاصرہ میں جو جو ناکامیاں ہوئیں اُن کا عجیب و غریب طریقے سے مضحکہ اُڑایا ہے۔ اور دراصل یہی اس کتاب کا باعث تصنیف ہے۔ غالباً یہ تصنیف بادشاہ سے خفیہ لکھی گئی ہے۔ اور اورنگزیب کے انتقال کے بعد اسکے وجود سے لوگوں کو خبردار کیا ہے۔ ورنہ شاید عالمگیر کو اسکا لکھا جانا گوارا نہ ہوتا۔

جہاں تک خیال کیا جاتا ہے اور جس قدر نظر دوڑائی جاتی ہے اُسی قدر صاف صاف معلوم ہوتا جاتا ہے کہ نعمت خان عالی کی تصانیف میں شاہکار یا ماسٹر پیس اُسکا وقایع ہے۔ یوں تو انکی ہر ایک تصنیف کو ایک خاص رتبہ اور درجہ حاصل ہے۔ مگر وقایع میں جس قدر محنت اور نظر غائر سے کام لیا گیا ہے وہ کسی میں نہیں۔ اسکی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ الفاظِ عبارت میں اس قدر ربط ہے کہ ہر ایک فقرہ صنعت تناسب اور مراعات النظیر کی ایک روشن مثال ہے۔ مگر یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ظہیرا ے تفرشی کی مایۂ ناز تصنیف تسنیم شاداب، ظہوری کی سہ نثر، ارادت خاں واضح کی مینا بازار، شیخ عنایت اللہ کی بہار دانش بھی اس صنعت سے مالا مال ہیں۔ اول سے آخر تک مذکورہ کتب میں بھی رعایات لفظی کی گرم بازاری ہے۔ مگر حقیقت میں جو چیز وقایع کو ان سب سے جدا کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ان سب میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ عبارت محض صنعت کے لیے لکھی گئی ہے اور وقایع کو دیکھنے سے معاملہ برعکس نظر آتا ہے کہ صنعت عبارت کے لئے لائی گئی ہے۔ یعنی کتنی ہی زبردست رعایت ہو پھر بھی ہر لفظ اپنی جگہ پر اس خوبی اور اس عمدگی کے ساتھ صرف کیا گیا ہے کہ پڑھنے والا ہرگز حشو کا الزام نہیں لگا سکتا۔ اس قسم کی مثالیں پیش کرنا ایک قسم کی تحصیل حاصل ہے۔ کیونکہ تمام کتاب من اولہ الے آخرہ اسی رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ پھر بھی چند فقرے ناقدانہ نظر مثال کے لیے چن ہی لیتی ہے۔ ہر واقعہ کے ابتدائی دو چار فقرے لکھے جاتے ہیں۔ چنانچہ سب سے پہلے واقعے یا شروع کتاب کے یہ فقرے :-

"دمیکہ مدرس کشاف صبح - در صفۂ صدق و صفا - چوں قاضی بیضاوی تفسیر والشمس وضحٰہا

بخط شعاعی آفتاب بر صفحۂ روزگار نگاشتند۔ وعابد شب زندہ دار ماہ با سیارے پُر نور دنیا
سجادہ سپہر گستردہ ادائے نافلۂ شب بختم سورۂ نور کردہ سر بسجدۂ غروب گذاشت"

مدارس، کشاف، صفہ، صدق، صفا، قاضی بیضا، تفسیر، والشمس وضحٰہا، خط شعاعی صفحہ۔ سب الفاظ مناسبت کے لیے لائے گئے۔ لیکن ہر لفظ عبارت کے زور کو بڑھا رہا ہے اور معنی کا بہانہ فراہم کر رہا ہے۔ صبح کی رعایت کو دیکھ کر کشاف، صدق صفا، بیضا، والشمس وضحٰہا وغیرہ پر غور کیجیے پھر انھیں الفاظ کو اس خیال سے دیکھیے کہ مصنف کو اس میں ایک قاصد کے آنے اور واقعات فتح وظفر کے بیان کرنے کا خیال ہے، تو فوراً یہ خیال بدل کر رائے قائم کرنی پڑتی ہے کہ یہ سب براعۃ الاستہلال کی صنعت ہے۔ دیگر شعرا کے یہاں بہت سی جگہ ظہور صبح کے "لازمہ" کے لیے الفاظ لائے گئے ہیں۔ مگر وہ اکثر "لازمہ" ہی معلوم ہوتے ہیں۔ برعکس اسکے یہاں ہر لفظ، ہر نظر کے لیے نئے نئے معنی پیدا کرتا ہے۔ دوسرے وقائع کا ابتدائی فقرہ بھی اسی مضمون سے ملتا جلتا ہے۔ مگر مصنف کے خیال کی پرکاری نے اسکو بالکل بدل دیا ہے

ہنگامے کہ مخبر صادق صبح بقولے والصبح اذا تنفس عالمیاں را از قدرت کاملہ صنعت آفریدگار
تعالیٰ شانہٗ خبر داد، وجمازۂ سریع السیر گردوں بود اسے اللہ نور السموات والارض در
اظہار احوال جہانیاں بتقریر واضح لب کشاد

رعایات اور مناسبات وہی ہیں لیکن بالکل نئی ہیں۔

تیسرے وقائع کا فقرۂ اول ملاحظہ کیجیے

"روزے کہ مذہب قدرت سرلوح طلوع خورشید را بر دیباچۂ بیاض صبح منقوش ساخت و
حاشیۂ اوراق فلک را بخطوط شعاعی جدول کشیدہ نقاط کواکب را بہ خط بطلان از نظر
انداخت"

مضمون وہی ہے۔ مگر الفاظ "لازمہ" نے وہ مینا کاری کی ہے کہ پہلے وقائع سے کوئی نسبت نہیں ہے۔

اسی طرح ایک اور شروع کا فقرہ

در حینیکہ سلطان فلک تخت بلند بخت انجم سپاہ خورشید سریر سمت الراس را بموجب
"وہو الذی جعل الشمس ضیاءً" بفروغ عالمتابی منور ساخت و سایۂ جہاں پروری وظل عدل
گستری بحکم "الم تر الیٰ ربک کیف مد الظل ولو شاء لجعلہ ساکنا"

مضمون وہی، رعایات اسی قبیل کی مگر بالکل علیحدہ ہیں۔

تمام وقائع کو دیکھ لیجیے، مگر ایک جگہ بھی ایسی نہ ملیگی جو رعایات سے خالی ہو اور رعایات میں ہر لفظ اپنی جگہ برق لامع کا کام نہ کر رہا ہو۔

دوسری خصوصیت اسکی عبارت میں یہ ہے کہ ہر لفظ مصنف کے رنگ طبیعت کا ایک آئینہ ہے جس سے خندہ ہائے ظرافت کی بلند آوازیں آرہی ہیں۔ ظاہرا عبارت کو دیکھیے تو پہلی نظر میں نہایت دقیق نظر آئیگی، دوسری نظر غائر میں مناسبات و رعایات کا ایک بحر ذخار نظر آئیگا۔ تیسری نظر میں معلوم ہوگا کہ صرف رعایات کا دریا موجزن نہیں بلکہ معنی کا ایک طلسم ہے جس سے مذاق سلیم کے موافق ہزاروں گوہر شاہوار نکل رہے ہیں۔ چوتھی نظر میں معلوم ہوگا کہ ظرافت کا ایک ایوان عالیشان تیار ہے۔ ظرافت کی قسموں میں سے بھی ہر قسم کی ظرافتیں اس میں مل سکیں گی۔ ہلکی ہلکی لبوں کو جنبش بھی ہوگی، تبسم و خنداں کا بھی ہوگا، خندہ، قہقہہ۔ غرضکہ تمام اقسام ظرافت اس میں موجود ہیں۔ اس لیے کہ مصنف نے تمسخر، پھبتیاں، پھکڑ، ہجو، ہجو ملیح، سبھی چیزیں اس میں صرف کردی ہیں۔ کہیں تشبیہوں کے ذریعہ سے عبارت کو کشت زعفران بنا دیا ہے اور کہیں صنایع بدایع سے دیوار قہقہہ کردیا ہے۔ کہیں ایک کنڈو کو لکھتے ہیں "درازتر از عمر خضر والیاس" کہیں ندوبان کو "محکم تر از دلائے محکم اساس" کہیں فیروز جنگ پر "بہادر بے بہادر" کا فقرہ، کہیں صلابت خاں میر آتش پر دیو آتشبازی کی پھبتی۔ کہیں عالمگیر کے طبیبوں کے حکم کو اجل بتایا ہے۔ کہیں اودھ کے آدمیوں کے جسم کو مرض قرار دیا ہے۔

تیسری خصوصیت یہ کہ قرآن شریف کی آیات یا عربی فقروں کو فارسی کی عبارت کے ساتھ نہایت خوبی اور عمدگی سے ملایا ہے۔ اسکی مثالیں اصل کتاب ہی سے دیکھنا چاہیے۔ از اوّل تا آخر یہی رنگ وقایع میں موجود ہے۔

گو مندرجہ بالا آخری دو خصوصیات یعنی ظرافت کے الفاظ لانا اور عبارت کو شگفتہ بنانا، یا آیات قرآنی کو فارسی عبارت میں ملا دینا صرف وقائع کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ ان کی کتاب مضحکات کا بھی یہی رنگ ہے۔ لہذا یہ دو خصوصیات وقائع کو اگر ادھر جنگنامہ سے جسکی عبارت محض مقفیٰ اور دردناک ہے، جدا کرتی ہیں تو ادھر مضحکات سے ملا دیتی ہیں۔ مگر مخصوص چیز جس کا جواب شاید کہیں جگہ نہ ملے وہ وہ قصائد اور نظمیں شہر آشوب وغیرہ ہیں جو انھوں نے اس کتاب میں لکھی ہیں، ان کا نہ جنگ نامے میں جواب ہے نہ مضحکات میں۔

بلکہ اُن کے دیوان تک میں اُن کا جواب نہیں مل سکتا۔ مانا کہ ایک قصیدہ جو انھوں نے کامگار خاں پسر جعفر خاں وزیر کی شادی کی تقریب میں کہا ہے اس میں بھی کچھ ایسی ہی باتیں آگئی ہیں۔ مگر وہ حد اعتدال سے خارج ہو کر فحش اور پھکڑ بن گئی ہیں۔ برعکس اُنکے یہاں جس نظم کو دیکھیے ایک خاص انداز رکھتی ہے۔ بعض نہیں بلکہ ہر نظم کو کہا جا سکتا ہے کہ یہ رنگ نعمت خان عالی پر ختم ہو گیا ظرافت اور اُس میں متانت یہ ایک ایسی دشوار بات ہے جسکو بڑے بڑے عالی دماغ بھی نہیں نباہ سکتے۔ مگر مصنف موصوف نے نہ صرف متانت ہی کی پابندی کی ہے۔ بلکہ بعض نظموں کو اصلیت پر مبنی کر دیا ہے اور سیاست کی زد سے اس قدر بچایا ہے کہ ہر وقت وہ آسانی کے ساتھ جواب دے سکتے ہیں کہ یہ ایک منظومہ لغت ہے۔ اسی لیے وہ بعض بعض نظموں کو دلی دشت بیاضی کی طرح شروع کرتے اور اس میں نصاب الصبیان کا رنگ پیدا کر دیتے ہیں۔ مگر در اصل وہ سب کھُلی ہوئی چوٹیں بلکہ تیز تلواریں ہیں جن کے زخم کبھی بھر نہیں سکتے۔ فردوسی نے محمود کی ہجو لکھی۔ مگر وہی کھلی کھلی گالیاں، طعن و تشنیع کی طرف جا نکلے۔ اور کہنا پڑا کہ

اگر چہ بود زادہ شہر یار ۔۔۔ پرستار زادہ نیاید بکار
مرا سیم و زر تا بہ زانو بُدے ۔۔۔ اگر مادرِ شاہ بانو بُدے

مگر علی الرغم اُن کے نعمت خاں عالی اپنی ظریفانہ متانت کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں اور لشکر شاہی کی بے سروسامانی کا خاکہ اُڑاتے ہیں، اور ہر تمثیل میں پھبتی کا انداز پیدا کر دیتے ہیں

فاعلاتن فاعلاتن فاعلات ۔۔۔ شعر در بحر رمل باشد بہ از آبِ حیات
چیست عنقا روپیہ، کبریتِ احمر اشرفی ۔۔۔ کیمیا، نوکر شدن یک ہفتہ پیش بوالحسن
فقر و فاقہ عیلۂ و عسرت۔ صبوری انتظار۔ ۔۔۔ آنچہ باشد نوکرانِ بادشہ را در وطن
خیمہ۔ آں چیزے کہ منع بارش و تابش نکرد ۔۔۔ فرش داں سطح زمیں۔ ملبوس چہ جلدِ بدن

اسی میں بعض صنایع سے کام لیتے ہیں

ممتنع معدوم و ایں ہر دو بطرزِ لف و نشر ۔۔۔ دانہ و کاہ و دواب و نفقۂ فرزند و زن
الثقیل و الغلیظ۔ آبے کہ در ایں لشکر ہست ۔۔۔ الاجل۔ حکم طبیباں۔ المرض احوالِ تن
نفخ صور و صیحہ۔ آواز نقیب و چوکی است ۔۔۔ طُعم و ماکول۔ آنچہ آں ہرگز نیاید در دہن
لم یفتح چہ۔ فتح قلعہ۔ لم یکن۔ یعنی یورش ۔۔۔ سہو سیبہ لہو زینہ۔ لغو توپ انداختن

یہ قصیدہ پورا اسی رنگ میں ہے۔ اور اسکی ظرافت کی کامیابی کا اس سے زیادہ ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کے مشہور ہزال جعفر زٹلی نے اپنے پورے لغت کی بنا اسی انداز پر رکھی ہے۔ کہیں اسی تمسخر او ہزل میں اپنے تبحر اور ہمہ دانی سے بھی کام لیتے ہیں اور دیکھنے والے کو حیرت میں ڈالتے ہیں کہ ایسا زبردست عالم ایسی باتیں بھی کہہ سکتا ہے۔ چنانچہ اس قصیدہ میں

دریں ملک خراب امروز بی رونقست ما مانے — چو گنج افتادہ اند اہل ہنر در کنج ویرانے

کہتے ہیں:-

ز فکر مفلسی رمال از بس ریش خود کندہ — [illegible] لحیہ اش را شکل لحیانے

یکے گفت اے سبب ساز کریم از غربت [illegible] — [illegible] خوش از خواب شب گنج پنہانے

یکے بگفت اے رحمان بحق موسیٰ عمران — [illegible] از آسمان [illegible] بادرنج بریانے

یکے گفت اے خداوند کریم از حرمت موسیٰ — [illegible] امروز ہمچون [illegible] خوانے

بادی النظر میں یہ سب تلمیحات ہیں، مگر در اصل مصنف کے تبحر علمی پر دلالت کرتی ہیں۔ اس قصیدہ میں یہ کمال کیا ہے کہ جس قدر کسی فن یا علم کی مصطلحات ہیں ان سب کو ظرافت کی روح [illegible] بنا دیا ہے۔ مثلاً

بسر مدے رسیدہ خلق را افراط [illegible] — کہ حتی [illegible] زمان حرت سخندانے

طبیب از علم طب [illegible] — [illegible] و [illegible]

منجم را نشد غیر از فلاکت ز فلک [illegible] — [illegible]

محاسب سال را بنوشت ماہ روزہ در دفتر — [illegible] نشد شوال و شعبانے

غرض تمام پیشے، تمام پیشوں کی اصطلاحات ظرافت کا پیرایہ [illegible] انجام دے رہی ہیں۔ ایک جگہ دلی دشت بیاضی کی نصاب الصبیان پر مصرعے لگا دیئے ہیں

بحر مضارع است در آن گوہر سخن — مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن

معراج سلم آمدہ زینہ دہق کمند — زین [illegible] کارنیلہ با نصرام

حرب و قتال جنگ ہزیمت شکست دان — آمد [illegible] ہر کدام

سیف و [illegible] و صارم و عضب حسام و تیغ — [illegible] نیام

غرضکہ جس نظم کو دیکھیے وہ اپنے [illegible] فرد ہے۔ علیٰ ہذا نثر [illegible] موجود ہیں جو نثر کے لیے ضروری ہیں۔ نثر میں تمام اقسام نثر اور تمام صنائع [illegible] موجود ہیں۔ اور وہ

اس طرح سے چمک رہی ہیں جس طرح انگشتری میں چمکدار نگینہ۔ ایک جگہ ایک خطبہ میں لکھتے ہیں

"ایہا الناس اعلموا ان اللہ انزل علیکم بلاء حسنا فاشکروا۔ بجعل الخلافۃ من ہذا السلطان العادل عن الحق المشفق من طریق العدل والاحسان، وہو امام من الائمۃ فقاتلوا کما قال اللہ عزوجل بامرہ وان عوتم علیہم یبقی لکم صدور فوالذنب تقطعا۔"

اسی طرح اس خطبہ کو فارسی اور عربی میں پورا کر دیا گیا ہے۔ اس خطبے کو دیکھ کر جہاں اُنکے تبحرِ علمی کا پتہ چلتا ہے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی حال میں اپنے اصلی رنگ کے انحراف نہیں کرتے۔ اس حالت میں بھی تمسخر اور ظرافت اور ہجو کا نشتر پوشیدہ ہے۔ چنانچہ پہلا ہی فقرہ "اعلموا ان اللہ انزل علیکم بلاء حسنا" کے جہاں یہ معنی ہیں کہ خدا نے تم پر ایک بلائے حسنہ نازل کی ہے۔ اور اس سے اس حدیث کے معنی پر روشنی پڑتی ہے کہ خدا اپنے نیک بندوں کو اس طرح آزماتا ہے کہ انکو بلاؤں اور مصیبتوں میں پھنسا دیتا ہے، وہیں یہ معنی بھی سمجھ میں آتے ہیں اور اس حدیث کا مفہوم نظر میں پھر جاتا ہے کہ خدا کے قہار جب کسی قوم کے طغیان وسرکشی کو حد سے زیادہ گزرتے دیکھتا ہے تو اس پر بلائیں مسلط کر دیتا ہے اور ظالم حاکم کو اس پر متعین کر دیتا ہے۔ یہی مضمون "لجعل الخلافۃ من ہذا السلطان" تک ختم ہو جاتا ہے۔ "سلطان العادل عن الحق" کو دیکھیے، اسکے یہ معنی بھی ہیں کہ بادشاہ عدل کرنے والا حق سے ہے، اور یہ معنی بھی ہیں کہ یہ بادشاہ ایسا ہے جو حق سے عدول کرتا ہے اور پھر گیا ہے۔ "المشفق من طریق العدل والاحسان" کے پہلے معنی یہ ہیں کہ عدل و احسان کے طریق سے وہ اپنی رعایا پر مہربان ہے، اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ وہ عدل و احسان کے راستے میں جاتے ہوئے ڈرتا ہے۔ ان آخری معنوں پر نظر ڈالتے ہوئے اس عبارت کو دیکھیے کہ وہو امام من الائمۃ کما قال اللہ عزوجل الخ تو صاف معنی نکل آئیں گے کہ یہ بادشاہ طاغی و باغی گردن زدنی ہے۔ غرض کہ یہ تمام خطبہ اسی ریشخند سے بھرا ہوا ہے۔ نہ صرف یہی بلکہ جیسا کہ کہا جا چکا ہے اس کتاب کے لفظ لفظ سے عبارت کی گرانمائیگی اور مصنف کی قدرتِ کلام کا پتہ چلتا ہے۔ وہ اصلاح کے ساتھ ہر طرح کی اصطلاحات کو صرف کر کے اُس سے اپنی ظرافت کا کام لے لیتے ہیں۔ مندرجہ ذیل عبارت کو دیکھیے۔ مکار لوگوں کی شان میں لکھتے ہیں

"بعد از آں جہرہ ان الکلام من موضعہ سر رشتۂ توجیہ وتاویل در دست بلکہ سرکیسہ بضبط در آمد ...اشتند و بر خرد ضلال ترازشیر مادر دانستہ بمعنی وساوس شیطانی و ہوا جس نفسانی

عملِ جرّ بی مضمر بنحوے صرف خواہی کرد کہ الف و نون زائدہ غیر منصرف نشود و قیاس اقترانی بدلالت تضمنی ترتیب خواہی داد کہ جزوے دیگر ہم جزئی اضافی گردد و از اینجا کہ مبلغ علم استعداد ظاہر است صغریٰ و کبریٰ ازیں مقولہ خواہد بود کہ ہمیشہ حلوائے اعلائے مفرح را از دکانِ پدر در مدرسہ بودمی خریدم و از اُستاد حلوائی کہ مرد شیریں زبان است خطاب اخوند می شنیدم"

اس عبارت کا سلسلہ دور تک ہے اور اس میں صرفی، نحوی، منطقی اور ریاضی کی اصطلاحات صرف کی ہیں۔ البتہ تمام کتاب میں اس سلسلہ کو قائم کر کے وقائع کو باوجود تمسخر اور ہزالی کے ایک شاہکارِ ادب بنا دیا ہے۔

اسکے علاوہ جب جنگنامے پر نظر ڈالی جاتی ہے تو ایک نئی دُنیا سامنے آجاتی ہے۔ اسکی عبارت مقفّٰی ہونے کے علاوہ اس میں جو شگفتگی پیدا کی ہے وہ بیسوں مقفّٰی مسجّع کتابوں میں بھی نہیں پائی جاتی۔ حمد کی عبارت ہی اس قدر دلچسپ ہے کہ ایک پختہ کار کی نظم کا لطف ملتا ہے۔ اور حزن و یاس کے ساتھ فرحت و انبساط۔ واقعات وغیرہ کا دل پہ اثر پڑتا چلا جاتا ہے۔ دیکھیے۔ کسی جگہ نہ دماغ کو فکر کی ضرورت نہ تاویل کی حاجت۔ ایک سیدھی سڑک ہے آنکھیں بند کیے چلے جائیے۔

"زیب دیباچہ سخن نیایش بے نیازے است کہ در بارگاہ کبریائیش زباں چون و چرا لال است۔ و در جناب عظمت و الائیش مقولۂ کم و کیف از امر محال۔ افعالش ہمہ مقرونِ بہ حکمت اما کسے بر سرِ آں آگاہ نیست۔ و امرش در کل مشحون بہ صنعت لیکن متنفسے را بر کماہی آں راہ نے۔ دو گل از یک شاخ سر بر آورد۔ یکے را بر دستارِ دولت رساند و دیگرے را بخارِ حوادث ریش گرداند، دو گوہر از یک بحر بیرون آورد یکے را رونق تاج سلطنت سازد و دیگرے را بہ کحل الجواہرِ عدم اندازد۔ دو لعل از یک کان سر بیروں کشد یکے را زینت اکلیل تاجداری نماید و دیگرے را در زیرِ سماقِ فنا فرساید۔ دو شمع از یک نور منور کند۔ یکے را فروغ بخش شبستان اقبال فرماید و دیگرے را بہ صرصرِ نیستی خاموش نماید اگر رقم اقبال است زخم زدہ کلکِ صنع اوست، و اگر خط ادبار است نگاشتۂ قلم حکم او"

کچھ دور تک یہ سلسلہ قائم رکھ کر اسی عبارت سے واقعات کو شروع کر دیا ہے، اور بہت دور جا کر اس فقرے کی مبتدا کی خبر نکالی ہے، وہاں دونوں شاہزادوں محمد معظم شاہ اور محمد اعظم شاہ کے اوپر کچھ متاسفانہ فقرے لکھے ہیں جو تیر و نشتر سے کم نہیں ہیں۔ کہتے ہیں کہ

سمندِ قلم را در فضائے احوال آں دو تیر سپہر سلطنت کہ یکے بہ نیروے توفیقات بلند فروغ بخش ایوان شہریاری گردیدہ و دیگرے را بے مددی طالع رشتۂ حیات بُریدہ بہ بُرجِ خاکی آرمیدہ و دستِ قدرت یکے را علم سلطنت برافراختہ و بر قضا دیگرے را لوائے حیات سرنگوں ساختہ یکے را کوکب مقصود بمصاعدا اعلا طلوع گردیدہ و دیگرے را خورشید اقبال رو بہ زوال آوردہ۔ یکے را نیل چشم در حفظ و حراست ایزدی محروس، و دیگرے اقبال اعوان و انصار از فتح و ظفر مایوس۔ یکے را اولاد کرام بسایۂ عنایت صمدی در امان و دیگرے را دو قرۃ العین بچشم زخم فلک در زیان۔ یکے را کوس فتح و نصرت در چار سوے عالم بلند آوازہ، و دیگرے را نوحۂ سوگواری در شبستان دُسیدم تازہ"

جہاں تک اس قسم کی عبارت ہے اُسکو ادب کا بہتر سے بہتر نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ اسی طرح صفوفِ جنگ کے مناظر کو اس حُسن سے بیان کیا ہے کہ نظامی کا سکندر نامہ، اور فردوسی کا شاہنامہ ہی اُسکا جواب ہو سکتا ہے۔ ورنہ اگر نظم و نثر کے فرق پر ایک نگاہ ڈالی جائے تو معلوم کیا لوہا پڑے۔ لکھتے ہیں:-

"کمانہا بہ شکل قوس قزح در دست دلاوران نمودار۔ و سیل خوں از ہر سو دراں عرصۂ پُر آشوب پدیدار۔ نے نے میدان رزم در نظر نظارگیان خوشتر از گلزار بود۔ و فضائے معرکہ بہ دیدۂ تماشائیاں بہتر از گلشن بہاری نمود۔ صحن حرب گاہ از خون کشتگاں رشک ارغوان زار۔ و نیزہ ہا بدست جواناں چوں سرو و شمشاد نمودار۔ ہزاراں فوارۂ خونیں از بدن مبارزاں در جوش، و چاؤشان بسان عندلیبان ہزار زباں در خروش۔ جوہائے خونیں از ہر طرف مانند انہار در جریان۔ و مرغانِ خدنگ در عرصۂ ہوا از ہر سو در طیران۔ عرق بر روے اہل تردد چوں قطرۂ شبنم بر عارض گُل ریختہ، و صدائے چقاچاق تیر در سیدان لحن چکاوک برانگیختہ"

یہ منظر بھی نہایت حُسن سے دکھایا ہے۔ جانبین کے خطوط میں ایک سے حلم و بردباری، دوسرے سے غصہ اور نافرمان برداری بھی قابل دید ہیں۔ محمد معظم شاہ اعظم شاہ کو جنگ پر آمادہ دیکھ کر لکھتے ہیں۔

"اے نو گل باغ سلطنت و جہانداری، و اے نخبۂ گوہر بحرِ خلافت و شہریاری۔ گوہر وجود ما و شما از یک بحر سر بر آوردہ و تازہ گل خلقت طرفین از یک شاخ نشو و نما کردہ۔ اگرچہ برادری اما بہتر از فرزندانت می شمارم۔ و ہر چند ہمسری لیکن بہ کالۂ جگرت می پندارم۔ ستودہ آئینِ

فرمودہ می آید [illegible] کہ قسمت پدر بزرگوار اینچنین بود و بانتظام مہام دکن کہ ملکیت وسیع و چند یں
بادشاہ [illegible] بجا خلافت نمودہ اند پرداختہ تجربہ ارباب غرض سرچشمۂ یگانگی جانناک
[illegible] سوائے صوبۂ دکن و دو صوبۂ دیگر مثل گجرات و اجمیر مطلوب باشد سنانتہ
نیست [illegible] صورت کشائش فائدہ مترتب نمی شود

محمد اعظم نے خط پڑھ کر جواب دیا

"الٰہی [illegible] مراتب روزگار چہ مصلحت بخاطر اقدس راہ دادہ وایں چہ قسمت است کہ بظلم
انصاف گزارش نمودہ - سلطنت راکہ پرتو لیست از ظلال افضال ربانی بوراثہ چہ نسبت و
خلافت [illegible] است از جناب عزت باشرکت چہ مناسبت - این توفیقی خلق است
بہ فرق [illegible] است می تابد وایں دولت وابستۂ حکم اوست - ہرکرا در عالم
قدم نوزیدہ [illegible] - اگر تقدیر سرشتۂ ایں مرخطہ بہ قسمت بازیچۂ ہیچ پسر بہ حضور پدر
بتخت نشستہ - چنانچہ حرص بہ درویشاں مذموم است بادشاہ قانع ہم ملعون و ملوم -
[illegible] از طریق سویت مسلک نی بود مضائقہ نداشت - چار دہ صوبہ خود گرفتن و
چار صوبہ دکن بمن سپردن بہ میزان انصاف درنمی آید و ایں عقدۂ مالانحل بناخن جگر
نمی کشاید [illegible] ملک کسے درکنار گیرد تنگ ! کہ بوسہ برلب شمشیر آبدار زند"

غرضکہ تمام عبارت [illegible] بمشکل تشبیہیں ہیں نہ استعارے نہ صنائع نہ بدائع - مگر پھر بھی ایک
کارنامہ ہے۔

حسن وعشق

یہ کتاب اُس زمانے کی خیالی نثر نویسی کا اعلیٰ اور بہترین نمونہ ہے جس میں فرضی طریقے پر حسن اور عشق کی شادی کرائی ہے - اسی ضمن میں اُن تمام رسوم ورواج کی تشریح کی ہے جو شادی بیاہ کے موقعے پر شرفا اور امرا کے یہاں برتے جاتے تھے - عبارت نہایت شاداب اور رنگین ہے - نادر نادر استعارے اور تشبیہوں نے پوری کتاب کو باغ وبہار بنادیا ہے -

مضحکات

اس میں اپنی خاص طرز عبارت میں لطائف وظرائف جمع کیے ہیں اور اپنی شوخی سے لطیفوں پر گویا سونے پہ سہاگے کا عالم دکھایا ہے - ایک بوستان بے خزاں ہے جسکے لفظ لفظ سے خندۂ گل کی آوازیں آرہی ہیں - ظرافت کی ایک مجلس آراستہ ہے اور نعمت خان عالی میر مجلس بنے بیٹھے ہیں -

اسی رنگ کے چند رقعات بھی ہیں جو منشآت عالی کے نام سے موسوم ہیں۔ یہ بھی عجیب و غریب ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جسکی طرف ہنسکر خطاب کیا ہے، ہنستے ہنستے خود بھی لوٹتے ہیں اور اسکو بھی دیوانہ بنا دیا ہے۔

جنگنامہ | اورنگ زیب کے انتقال کے بعد جو اعظم شاہ اور محمد معظم شاہ میں محاربہ اور مجادلہ ہوا ہے اُسکی ایک مختصر دلچسپ تاریخ ہے۔ خوبی عبارت نے اُسکو ایک خوشنما تصویر یا ایک مصفی اور مجلی آئینہ بنا دیا ہے۔ عبارت مقفّی مسجع اور اس قدر سلیس اور دلچسپ ہے کہ تعریف محال ہے۔ اس تصنیف میں سب سے بڑا کمال یہ دکھایا ہے کہ اپنے رنگ سے علٰحدہ رہے ہیں اور کہیں ظرافت کی ہَوا بھی نہیں لگنے دی جو انکی قادرالکلامی کی بیّن دلیل ہے۔ کتاب کے فقرے فقرے میں درد واثر اور جوش کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے۔ دیباچے ہی سے ایسی پرواز ڈالی ہے کہ تمام واقعاتِ آیندہ آئینہ ہو جاتے ہیں۔ زیادہ تعجب یہ ہے کہ نعمت خاں جیسا کہ لکھا جاچکا ایک استبدادی اور متعصب مزاج رکھنے والا آدمی تھا۔ شہزادہ محمد معظم اُسکا ہم مذہب یعنی شیعہ اور محمد اعظم شاہ مقتول سنّی المذہب تھا۔ مگر پوری کتاب کو دیکھ جائیے ایک لفظ بھی ایسا نہ ملے گا جو مرحوم کی شان کے منافی ہو یا جس میں مضحکہ انگیزی، توہین، یا مذمت کا شائبہ بھی ہو۔ بلکہ دونوں بادشاہزادوں کو بالکل ایک ہی مرتبے میں پیش کیا ہے۔ اور کسی ایک کے لیے بھی کوئی فقرہ کم وبیش نہیں ہے

خوان نعمت | یہ بھی عالی کی تصنیف ہے۔ اسمیں مختلف شاہی کھانوں کے پکانے کی ترکیبیں ہیں۔

عالمگیر کے آخر زمانے میں نعمت خاں عالی کا اعزاز اور پایۂ اعتبار اتنا بڑھ گیا تھا کہ پیشگاہ سلطنت سے مقرب خاں خطاب ملا۔ اور جواہر خانے کی داروغگی کی خدمت انکے تفویض ہوئی۔ عالمگیر کے انتقال کے بعد محمد معظم کی ملازمت میں رہے۔ جس وقت شاہ عالم دکن سے محمد اعظم شاہ کے مقابلے کے لیے چلے تو نعمت خان عالی بھی شہزادے کے ہمرکاب تھے۔ جس وقت گوالیار میں آئے تو انکو قلعہ میں داروغۂ جواہر خانہ کی حیثیت سے جواہر خانے کی محافظت کے لیے یہیں چھوڑ دیا گیا۔ جب حرب و ضرب کا ہنگامہ فرو ہو گیا اور محمد اعظم شاہ مغلوب ہو کر مقتول ہوے تو دوبارہ محمد معظم شاہ سے ملے۔ اس مرتبہ ملازمان خاص میں منسلک ہوکر دانشمند خاں خطاب پایا اور وقائع نویسی کی خدمت پر مقرر ہوے۔ پیشگاہ سلطانی سے شاہنامہ لکھنے کا حکم دیا گیا۔ خدا معلوم اس حکم کی کس قدر تعمیل کی گئی تھی کس قدر نہیں کہ ۱۱۲۱ھ

(مطابق ۱۷۱۰ء) میں حیدرآباد جاکر انتقال ہوا۔ اور دائرۂ میر مومن واقع حیدرآباد میں مدفون ہوئے۔

نعمت خانِ عالی کی تمام تصانیف علیحدہ علیحدہ چھپ گئی ہیں۔ مگر منشآت نایاب ہے اور مضحکات بھی اب کمیاب ہے۔ ان کا کلیاتِ قلمی خوشخط کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد دکن میں محفوظ ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

کار باطرفہ حیفی پیشۂ افتادہ مرا
کہ نہ یادم کند وستے نرود از یاد مرا

کشد چو سوے چمن بے قدت ملال مرا
گزد چو مار سیہ سایۂ نہال مرا

نخواہد کرد ترکِ بت پرستیہا دلِ زارم
کہ چوں سنگِ سلیمانیست مادرزاد زنارم

می کند بازایں دلِ شوریدہ آزارِ خودش
من چرا منعش کنم او داند و کارِ خودش

رشتۂ دل در تنم باہمچو رشتۂ تسبیح
صد گرہ بکار رُفتاد تا بیار پیوستم

نقش پائے او بہرگامے کند جاں درتنم
خاک راہ دوست گلشن ہمچو دامن من است

گفتی اگر قرار بگیری رسی بہ کام
بارے ازیں قرار بہ بینیم چہ می شود

سیر باغے کہ بود بے تو کم از ماتم نیست
میکند سایۂ ہر نخل سیہ پوش مرا

بزمِ وصل او کاش اینقدر ہم می شدم محرم
کہ چوں آئینہ حرفے از پسِ دیوار می گفتم

کوکب سوختہ می کرد گر اندک دودے
ہمچو آتش بدل سنگ تو جا می کردم

چو یار محرمِ بزمِ شراب کرد مرا
بنگ و لیک رقیباں کباب کرد مرا

ز ہمیشِ رقت بیاد آنچہ بود در گرہم
چو گل شگفتگیِ دل خراب کرد مرا

ارباب نظر رخصتِ گفتار ندارند
مانع نہ ہمیں وجہ بود سرمہ صدا را

ذرہ ام امید وارِ پرتوے از آفتاب
لے سحاب بے مروت میشوی حائل چرا

می کند فرزند آخر دعوے مالِ پدر
میوہ از خورشید گیرد رنگ از گل بادہ را

ہر کہ کیسا بہ بجانانہ رساند خود را
ایں محال است کہ تا خانہ رساند خود را

در نشاط آید وصالِ دوستاں مشتاق را
حلقۂ صحبت نمی باشد کم از جامِ شراب

مصیبتے ست ملاقاتِ مردمِ عالم
ببیں کہ دست ز دستہا بسر سلام شدہ است

کاہلی در کارِ خود مجنوں چرا کرد ایں قدر
مردنِ عاشق بہ آہے یا نگاہے بیش نیست

سود مسیح و خضر ز اورا ک عہدِ تست
ورنہ کدام نفع بہ عمر دراز بود

بے تعلق شو کہ تا دے ہیچ می ریزد نبات — قالبے امروز می سازد کہ فردا بشکند
بیمروت یکنفس نگذاشت دل را پیش من — این قدر ہم لایقِ بے اعتباری نیستم
بے تو ہر گاہ تماشائے گلستاں کردم — ہمچو گل دامنِ خود پُر ز گلستاں کردم
ساغرے بے صحبتِ آں نازنیں نتواں زدن — در فراقش جام مے جز بر زمیں نتواں زدن

کلامِ اثر

خبر کچھ اور دیتا ہے اثرؔ ہشیار ہو جانا — مژہ کا گلفروشِ دیدۂ خونبار ہو جانا
نظر ملتے ہی پلکوں کا جگر کے پار ہو جانا — گھم کے پھرتے پھرتے دل پہ سو سو وار ہو جانا
ارے تو یہ کسی کا طالبِ دیدار ہو جانا — اور اُس پر قہر محوِ شوخیِ گفتار ہو جانا
اُنھیں در پیشِ تالیفِ ادائے بے نیازی ہے — غضب تھا عشق کا لذتِ کشِ آزار ہو جانا
شعاعِ مہر سے ذرّے اگر چمکے تو کیا چمکے — مرے داغوں سے سیکھیں مطلعِ انوار ہو جانا
متاعِ شوق سے ترتیب دے لو داغ ہجراں کے — پھر اُسکے بعد بندلے دیدہ بیدار ہو جانا
بس اتنی سی خطا پر کیوں سوئے ساحل نظر اُٹھی — وہ موجوں کا اُمنڈ کر بیچ میں دیوار ہو جانا
خدا معلوم کس سے نیم باز آنکھوں نے سیکھا ہے — کبھی بیدار کر دینا کبھی بیمار ہو جانا
بلاؤں پر بلائیں ہیں شکستوں پر شکستیں ہیں — مبارک ہو جنوں کو عشق کا غمخوار ہو جانا
نیازِ عشق کامل ہے تو شوقِ جبہ سائی کیوں — یہاں سجدے میں جھکنا ہے ذلیل و خوار ہو جانا
کسی کا مسکرا کر دیکھ لینا غرفۂ شب سے — وہ دشت و کوہ و گلشن کا تجلی زار ہو جانا

نویدِ وصلِ دلبر سے نہیں کچھ کم طرب افزا
سحر کا لیکے انگڑائی اثرؔ بیدار ہو جانا

سنہ ۱۲۶۱ ہجری میں دہلی کا ایک مشاعرہ

(از جناب مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب بی اے۔ دہلوی)

۱۔ تمہید

نام نیک رفتگاں ضائع مکن
تا بماند نام نیکت برقرار

بقول غالب مرحوم "انسان" ایک محشر خیال" ہے، لیکن خیال میں حشر بپا ہونے کے لیے کسی بیرونی تحریک کا ہونا لازمی ہے۔ دماغ خیال کا گنجینہ ہے۔ لیکن اس گنجینے کے کھلنے کے واسطے کسی ظاہری اسباب کی کنجی کی ضرورت ہے۔ مجھے بچپن سے شعرائے اردو کے حالات پڑھنے اور سننے کا شوق رہا ہے۔ مگر کبھی کوئی ایسی تحریک نہیں ہوئی جو انکے حالات کو ایک جگہ جمع کرنے کا خیال پیدا کرتی اور یہ خیالات الفاظ کی شکل میں ظاہر ہوکر ایک خوشنا چلتی پھرتی تصویر بن جاتے۔

جب کوئی بات ہونے والی ہوتی ہے تو اسباب خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ اتفاق دیکھیے کہ پرانے قدیم کاغذات میں مجھ کو حکیم مومن خاں مومن دہلوی کی ایک قلمی تصویر ملی، تصویر کا ملنا تھا کہ یہ خیال پیدا ہوا کہ تو بھی محمد حسین آزاد مرحوم کے "نیرنگ خیال" کی محفل شعرا کی طرح ایک مشاعرہ قائم کر، مگر ان لوگوں کے کلام پر تنقید کرنے کے بجائے صرف انکی چلتی پھرتی تصویریں دکھا۔ خیال میں رفتہ رفتہ پختگی پیدا ہوئی، اور اس پختگیٔ خیال نے ایک مشاعرے کا خاکہ پیش نظر کردیا۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مختلف زمانوں کے شاعروں کو کس طرح ایک جگہ جمع کروں۔ اس عقدے کو امیر اللہ تسلیم مرحوم کے اس شعر نے حل کردیا

جوانی سے زیادہ وقت پیری جوش ہوتا ہے
بھڑکتا ہے چراغ صبح جب خاموش ہوتا ہے

اس شعر کا یاد آنا تھا کہ شعرائے دہلی کا آخری دور آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ اور دل میں یہ بات جم گئی کہ بجائے تمام شعرائے اردو کے، دہلی کے آخری دور کا نقشہ کھینچ دیا جائے۔ قاعدے کی بات ہے، کہ مرنے سے پہلے بیمار سنبھالا لیتا ہے۔ اردو شاعری کے حق میں بہادر شاہ ثانی کا زمانہ بھی دہلی کا سنبھالا تھا۔ بادشاہت برائے نام تھی، اور جو تنخواہ بادشاہ سلامت کو ملتی تھی اس میں قلعہ کا

خرچ بھی مشکل سے چلتا تھا: برخلاف اسکے دکن اور اودھ میں دولت کی گنگا بہ رہی تھی۔ پھر بھی دریائے جمنا کی چمکیلی ریت" دہلی والوں کے لیے نظر فریب رہی، اور اس "اُجڑے دیار میں شعراء ہی نہیں، ہر فن کے کاملوں کا ایک ایسا مجمع ہوگیا جس کی نظیر ہندوستان تو ہندوستان دوسرے کسی مُلک میں بھی ملنی دشوار ہے۔

زمانہ ایک رنگ پر نہیں رہتا۔ ۱۸۵۷ء سے قبل ہی ان کاملینِ فن میں سے بہت سے تو مُلکِ عدم کو سدھارے، جو بچے کھچے رہ گئے تھے اُنکو غدر کے طوفان نے تتر بتر کر دیا۔ جسکو جہاں کچھ سہارا ملا، وہیں کا ہو رہا۔ دہلی برباد ہو کر حیدرآباد اور رامپور آباد ہوئے۔ اکثر شرفا گھروں سے نکلے کہ پھر اُنکو دہلی کی صورت دیکھنی نصیب نہ ہوئی، جو رہ گئے ہیں وہ چلنے چلانے کو تیار بیٹھے ہیں۔ بہت سے اُٹھ گئے، بہت سے اُٹھتے جاتے ہیں، اور ایک زمانہ وہ آنے والا ہے، کہ کوئی یہ بتانے والا بھی نہ رہے گا کہ مومن مرحوم کا مکان کہاں تھا۔ جس طرح سوائے میرے اب شاید کسی کو یہ بھی معلوم نہیں کہ اُنکی قبر کہاں ہے۔

ان حالات کو دیکھ دیکھ کر مجھے خیال آیا (اس خیال کی محرک مومن مرحوم کی تصویر بھی ہوئی) کہ "اُردو" کے لیے ان سے ایک ایسا تو چراغ روشن کرلوں جسکی روشنی میں آنے والی نسلیں زبانِ اُردو کے ان محسنوں کی شکلیں (خواہ وہ دُھندلی ہی کیوں نہ سہی) دیکھ سکیں، اور اُنکا کلام پڑھتے وقت کم سے کم انکی صورتوں کا ایک موہوم سا نقشہ پڑھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔ جو لوگ علمی مذاق رکھتے ہیں وہ جانتے اور سمجھتے ہیں کہ کسی کا کلام پڑھتے وقت اگر اسکی شکل و صورت، حرکات و سکنات، آواز کی کیفیت، نشست و برخاست کے طریقے، طبیعت کا رنگ، اور سب سے زیادہ یہ کہ اُسکے لباس اور وضع قطع کا خیال دل میں رہے تو اُسکا کلام ایک خاص اثر پیدا کر دیتا ہے اور پڑھنے کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ ورنہ مصنف کے حالات سے واقف ہوئے بغیر اُس کی کسی کتاب کا پڑھ لینا، گراموفون کے ریکارڈ سننے سے زیادہ موثر نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ آجکل مہذب ممالک کے کسی مصنف کی کوئی کتاب شائع نہیں ہوتی جسکے شروع میں اُسکے حالات درج نہ کیے جائیں اور وہ واقعات نہ دکھائے جائیں جن کی موجودگی میں وہ تصنیف ضبط تحریر میں آئی۔

یہی خیالات تھے جنھوں نے مجھے ان چند اوراق کے لکھنے پر آمادہ کیا۔ اس البم میں آپ ایسی بہت سی تصویریں دیکھیں گے جو ان کاملینِ فن نے اپنے ہاتھ سے خود کھینچی ہیں؛ بہت سے ایسے مرقعے پائیں گے جو دوسرے مصوروں کے ہاتھ کے بنے ہوئے ہیں؛ بعض ایسے [illegible]

[illegible] گئے ہیں، ٹوٹا پھوٹا قلمی نقشہ دیکھ کر الفاظ میں اتارے گئے ہیں؛ اکثر و بیشتر ایسی صورتیں ہونگی جو خود میں نے بڑے بوڑھوں سے پوچھ کر بنائی ہیں۔ لیکن ہر صورت میں شہادت تائیدی کے مقابلے میں شہادت تردیدی کو زیادہ وقعت دی ہے۔ یعنی اگر کسی واقعے کے متعلق ایک بھی مخالف بات معلوم ہوئی تو اس واقعے کو قطعاً ترک کر دیا۔

اگر یہ سارے جتنے ایک جگہ ہی جمع ہو جاتے تو یقیناً یہ مضمون نوح کے چہروں کا رجسٹر بن کر بے لطف ہو جاتا۔ لیکن ادھر تو آزاد مرحوم کے [illegible] خیال نے دل میں مشاعرے کا خیال ڈالا، ادھر کریم الدین مغفور کی کتاب طبقات الشعرائے ہند کے طبقۂ چہارم نے رجب ۱۲۶۱ھ کے ایک مشاعرے کا پتہ دیا۔ بس کیا تھا، دونوں کو ملا کر ایک مضمون پیدا کر لیا۔ رہی رنگ آمیزی، اس کی تکمیل میں خود کر دیتا ہوں، البتہ اپنے سر اس کی ذمہ داری نہیں لیتا۔

بحیثیت مورخ ۱۲۶۱ ہجری کے واقعات میں خود اس طرح لکھ سکتا تھا، گویا یہ سب میرے چشم دید ہیں۔ اور

ہمچو سبزہ بارہا روئیدہ ام
ہفصد و ہفتاد قالب دیدہ ام

پر نظر رکھتے ہوئے اس زمانے کا بھی "مرزا الم نشرح" بن سکتا تھا، مگر میرے دل نے گوارا نہیں کیا کہ کریم الدین مرحوم کی کامیابی کا سہرا اپنے سر پر باندھوں، اور ایسے شخص کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینکدوں جس نے اس مشاعرے میں بہت بڑا حصہ لیا تھا؛ جس کے مکان پر یہ مشاعرہ ہوا تھا اور جو اس مشاعرے کی روح رواں تھا۔ یہ ضرور ہے کہ انکی یہ مجلس محدود تھی اور میں نے اسکو اتنی وسعت دی ہے کہ اس زمانے کے تقریباً سب بڑے بڑے شعرا کو اس میں لا بٹھایا ہے۔

اب اس میں مجھے کامیابی ہوئی ہے یا نہیں، اس کا اندازہ قارئین کرام فرما سکتے ہیں۔ اگر ہوئی ہے تو زہے نصیب، میری محنت ٹھکانے لگی، اگر نہیں ہوئی تو کم سے کم یہی کچھ کر میری داد دی جائے کہ "مرزا صاحب نے بات تو اچھی پیدا کی تھی مگر نباہ نہ سکے جو ان سے نہیں ہوا وہ اب ہم کر دکھاتے ہیں۔" ممکن ہے کہ اس طرح کوئی قلم کا دھنی "زندہ خفتگان خاک" کا ایک ایسا مرقع تیار کر دے جو بزم ادب اردو میں سجانے کے قابل ہو۔

لیجیے "میں" اب "مولوی کریم الدین صاحب" کی جون میں حاضر خدمت ہوتا ہوں، لیکن یہ ضرور عرض کیے دیتا ہوں کہ جب میں اپنی تمام محنت "کریم الدین صاحب" کے نذر کر رہا ہوں تو

جو کچھ برا بھلا آپ کو اس مضمون کے متعلق کہنا ہو وہ مجھے نہ کہیے، مولوی صاحب کو کہیے اور خوب دل کھول کر کہیے۔ میں بھی خوش اور میرا خدا بھی خوش۔ والسلام

۲۔ تمہید

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

میرا نام کریم الدین ہے۔ میں پانی پت کا رہنے والا ہوں۔ یہ قصبہ دلی سے چالیس کوس پر بجانب شمال مغرب واقع ہے، اور اپنی لڑائیوں کی وجہ سے تاریخ میں مشہور ہے۔ ہم اچھے کھاتے پیتے لوگ تھے۔ مولویوں کا خاندان تھا۔ لیکن زمانے کی گردش نے ایسا پیسا کہ کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گئے۔ جائداد ضبط ہو گئی۔ میرے دادا صاحب قبلہ ایک مسجد میں جا بیٹھے اور اللہ اللہ کر کے گزارہ کی۔ جب ضبط شدہ جائدادوں کے متعلق دریافت شروع ہوئی تو توکل نے ان کا دامن پکڑ لیا۔ اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پیٹ کے لیے روٹیوں کا سہارا لکھو بیٹھے۔ میرے والد سراج الدین مرحوم بمصداق عصمت بی بی از بے چادری متوکل بنے رہے اور مسجد میں ایسے بیٹھے کہ مر کر اٹھے۔ میں ۱۲۳۵ ہجری میں [illegible] کے دن پیدا ہوا۔ میری تعلیم انہیں دونوں بزرگوں کے ہاتھوں ہوئی۔ لیکن بچپن کی طبیعت اور خاندانی تقاضوں نے آخر پانی پت چھڑوایا۔ اس زمانے میں دلی میں علم کا بڑا چرچا تھا۔ ہر فن کے کاملوں سے دلی بھری پڑی تھی۔ ہر سمت علم کے چشمے جاری تھے۔ [illegible] میں پانی پت چھوڑ دلی آ گیا۔ کاپی نویسی سے گزارا کرتا، محنت مزدوری کے بعد بھی ذوق علم ہر حلقۂ درس میں کھینچتا۔ اسی زمانے میں دلی کالج کی تنظیم جدید ہوئی تھی، طالب علموں کی تلاش تھی۔ میں بیس سال کی عمر میں وہاں شامل ہو گیا۔ سولہ روپیہ وظیفہ بھی مقرر ہوا۔ اور اس طرح میرے علم کی پیاس بجھنے لگی۔ لیکن یہ وہ زمانہ نہیں تھا کہ علم کو علم کے لیے حاصل کیا جاتا۔ اب اس کے ساتھ گزارہ کی ایک بڑی شق لگ گئی تھی۔ اس لیے چند دوستوں کے ساتھ مل کر ایک مطبع کھولا۔ قاضی کے حوض پر مبارک النساء بیگم کی حویلی کرایہ پر لی۔ عربی کی مشہور مشہور کتابوں کے ترجمے چھاپے۔ لیکن مطبع جیسا چلنا چاہیے تھا نہ چلا۔ یہ اردو شاعری کے شباب کا زمانہ تھا۔ بادشاہ سے لے کر فقیر تک سب اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ خیال آیا کہ ایک مشاعرہ قائم کر کے شعرا کے حالات اور ان کا کلام طبع کر دوں، ممکن ہے کہ اس طرح مطبع چل جائے۔ مجھے شاعری سے نہ کبھی لگاؤ تھا اور نہ اب ہے۔ بلکہ شعر کہنا عیب جانتا ہوں کیونکہ اہل علم کا یہ پیشہ نہیں ہے۔ وہ لوگ جو ہمیشہ سے تارک البال ہیں [illegible]

چاہتے ہیں اور حسرت نکالنے کے لیے شاعری کرتے ہیں۔
میں خود عالم ہوں، میرے باپ دادا عالم تھے، بھلا میں تو اس قسم کے فضولیات کی طرف
توجہ بھی نہیں کر سکتا ہوں، ضرورت سب خیالات پر حاوی ہو گئی اور مجھے قیام مشاعرہ پر مجبور کیا۔
لیکن بڑی مصیبت یہ تھی کہ ایک تو اس شہر میں غریب اور خاص کر پردیسی غریب کو منہ نہیں لگاتے۔
دوسرے مشاعرہ کرنے کے لیے بڑے سامان کی ضرورت تھی، تو مولویوں سے وہ بھلا اس معاملے میں میرا کیا ساتھ دے سکتے تھے
سوچتے سوچتے نواب زین العابدین خاں عارف پر نظر پڑی، ان سے دو چار دفعہ ملنا ہوا تھا۔ بڑے
خوش اخلاق آدمی ہیں۔ لال کنوئیں کے پاس ایک حویلی ہے اسکو مدرسہ بھی کہتے ہیں، وہاں رہتے
ہیں کوئی تیس سال کی عمر ہے، گوری رنگت، اونچا قد اور نہایت جامہ زیب آدمی ہیں، البتہ داڑھی
ابھی نہیں نکلی ہے، تھوڑی سی پر کچھ گنتی کے بال ہیں۔ غالب کے بھانجے بھی ہیں اور شاگرد بھی،
کچھ عرصے تک شاہ نصیر سے بھی اصلاح لی ہے ہر حال انکی محبت، انکی شرافت اور سب سے
زیادہ انکی اس شہرت نے مجھے انکی خدمت میں حاضر ہونے اور اس بارے میں انکی امداد حاصل کرنے
پر مجبور کیا۔ ایک روز صبح ہی صبح گھر سے نکل انکے مکان پر پہونچا۔ معلوم ہوا کہ وہ حکیم احسن اللہ خاں
صاحب وزیر اعظم کے مکان پر تشریف لیگئے ہیں۔ حکیم صاحب کا مکان سرکی والاں ہی میں تھا ڈیوڑھی
میں دروازے پر دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ نواب زین العابدین خاں اندر ہیں۔ چوبدار کے ذریعے
سے اطلاع کرائی۔ انھوں نے اندر بلا لیا۔ بڑا عالیشان مکان ہے، صحن میں نہر ہے، سامنے بڑا
چبوترہ ہے۔ اور چبوترے پر بڑے بڑے دالان در دالان، مکان خوب آراستہ پیراستہ ہے؛
ہر چیز سے امارت ٹپکتی ہے۔ سامنے گاؤ تکیے سے لگے نواب صاحب بیٹھے تھے۔ میں نے تو انکو پہچانا
بھی نہیں، سوکھ کر کانٹا ہو گئے تھے اور چہرے پر جھریاں پڑ گئی تھیں۔ میں نے سلام کر کے کیفیت پوچھی،
کہنے لگے "مولوی صاحب کیا کہوں کچھ دل بیٹھا جاتا ہے، بظاہر کچھ مرض بھی معلوم نہیں ہوتا، علاج
کر رہا ہوں، مگر بے نتیجہ۔ بھئی اب ہمارے چل چلاؤ کا زمانہ ہے، کچھ دنوں دنیا کی ہوا کھا رہے
ہیں" مگر یہ تو کہیے آج آپ کدھر نکل آئے" میں نے واقعات کا اظہار کر کے ضرورت بیان کی۔
تھوڑی دیر تک سوچتے رہے۔ پھر ایک آہ بھر کر کہا "میاں کریم الدین تم کو بات تو اچھی سوجھی
ہے۔ مگر بھئی اسکا نباہنا مشکل ہے۔ تمھیں خبر نہیں، دہلی کے پہلے مشاعروں نے کیا کچھ فرق دلوں میں
ڈال دیے ہیں۔ دل تو میرا بھی چاہتا ہے کہ مرتے مرتے ایک ایسا مشاعرہ دیکھ لوں جس میں یہاں
کے سب کاملین فن جمع ہو جائیں۔ مگر مجھے یہ بیل منڈھے چڑھتی معلوم نہیں ہوتی۔ اچھا تم بھی

کوشش کرو، میں بھی کرتا ہوں، ممکن ہے کہ کوئی صورت نکل آئے۔ ہاں ٹھہرو، حکیم صاحب کو آنے دو، ایک تجویز ذہن میں آئی ہے، اگر چل گئی تو میری بھی آخری کوشش پوری ہو جائے گی اور تمھارا بھی کام نکل جائے گا۔" ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ حکیم صاحب آ گئے۔ گورے چٹے آدمی ہیں سفید بھری ہوئی ڈاڑھی، گول چہرہ اُس میں کچھ کچھ چیچک کے داغ۔ آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ سر سے پاؤں تک سفید لباس پہنے ہوئے تھے! فن طب میں کامل اور تاریخ کے عالم ہیں۔ میں آداب بجا لایا۔ میری طرف مسکرا کر دیکھا۔ اور نواب صاحب سے کہا "آپ کی تعریف کیجیے" انھوں نے کہا "یہ میرے قدیم ملنے والوں میں سے ہیں۔ خود شاعر نہیں مگر شعر فہم ہیں۔ آج کل خیال پیدا ہوا ہے کہ شعرائے دہلی کا ایک تذکرہ لکھیں اور اس میں اُنکے حُلیے اور اُن کے کلام کے نمونے دکھائیں۔ مجھ سے مشورہ کرنے آئے تھے۔ آپ جانتے ہیں مجھے ان چیزوں سے عشق ہے۔ اب لیے آخری وقت میں چاہتا ہوں کہ پرانے زمانے کا ایک مشاعرہ اور دیکھ لوں اگر آپ مدد فرمائیں تو یہ مشکل آسان ہو سکتی ہے"۔ حکیم صاحب کہنے لگے "میاں عارف خدا کے لیے تم ایسی مایوسی کی باتیں نہ کیا کرو، ابھی جوان ہو، انشاء اللہ طبیعت مرض پر غالب آ جائے گی۔ اور تمھیں مرض ہی کیا ہے، وہم ہی وہم ہے، مگر ہاں یہ بتاؤ تم مجھ سے کس قسم کی مدد چاہتے ہو" نواب صاحب نے کہا "حکیم جی بس اور کچھ نہیں اتنا کر دو کہ میاں کریم الدین کو بارگاہ جہاں پناہی تک پہونچا دو، میں خود جاتا مگر ہمت نہیں ہوتی، میں انکو بہت کچھ سمجھا دوں گا۔ اگر حضرت ظل اللہ اپنا کلام بھیجنے پر راضی ہو گئے تو مشاعرے کا جم جانا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اور اگر بدقسمتی سے انکار ہو گیا تو پھر مشاعرے کا خیال ہی فضول ہے۔ اب رہا مشاعرے کا انتظام وہ میں خود کر لوں گا، کیونکہ یہ بچارے ان چیزوں کو کیا سمجھیں" حکیم صاحب پہلے تو کچھ سوچتے رہے، پھر کہا عارف! تمھارے لیے میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں، اس لیے اور بھی کروں گا کہ اس سے تمھاری طبیعت بہل جائے گی اور کچھ دنوں اس مشغلے میں لگ کر ممکن ہے کہ تمھارے دل سے مرض کا وہم جاتا رہے۔ بادشاہ سلامت سے تو میں کہتا نہیں، ہاں آپ کے دوست کو صاحب عالم مرزا فتح الملک* بہادر سے ملا دے

---

* ان کا نام مرزا فخرالدین، خطاب مرزا فتح الملک شاہ بہادر، عرف مرزا فخرو اور تخلص رمز تھا۔ بہادر شاہ ثانی کے منجھلے بیٹے تھے۔ مرزا محمد دارا بخت عرف مرزا شبو ولیعہد سلطنت کے انتقال کے بعد ۱۸۴۹ء میں ولیعہد ہوئے مگر غدر سے پہلے ہی ۱۰ جولائی ۱۸۵۶ء میں ۴۰ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ ان کے انتقال کے بعد مرزا جواں بخت کی ولیعہدی کے جھگڑے ہوئے۔

دیتا ہوں۔ انکو آجکل مشاعرہ کی لَو لگی ہوئی ہے، حضور سے بھی کئی مرتبہ عرض کر چکے ہیں مگر وہ ٹال گئے اگر ان صاحب نے ذرا بھی زور دیا تو مجھے یقین ہے کہ صاحب عالم کہہ سن کر ضرور اجازت حاصل کریں گے۔ اچھا تو مولوی صاحب کل آپ ایک بجے قلعہ معلی میں آ جائیے، میں چوبدار سے کہے جاتا ہوں، وہ اندر پہونچا دے گا، آگے آپ جانیں اور آپ کی قسمت" یہ کہہ کر حکیم صاحب نے خدا بخش کو آواز دی وہ آیا تو اس سے کہا کہ "کل یہ صاحب حویلی میں ایک بجے آئیں گے، انکو میری بیٹھک میں پہونچا دینا" یہ کہہ کر وہ نواب صاحب کی طرف متوجہ ہوگئے اور میں آداب کر کے واپس چلا آیا۔

دوسرے روز ایک بجے کے قریب میں مولویانہ ٹھاٹھ سے جبہ پہن، شملہ باندھ، قلعہ معلی پہونچا لاہوری دروازے کے باہر خدا بخش کھڑے ہوے تھے وہ مجھ کو حکیم صاحب کی بیٹھک میں لیگئے۔ یہ بیٹھک جسکو پہلے زمانہ میں "نشست" کہا جاتا تھا دیوان عام سے ملی ہوئی تھی، حکیم صاحب بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے، مجھے دیکھ کر بولے "اجی مولوی صاحب! میں نے آپ کا کام کر دیا ہے، صاحب عالم مرزا فتح الملک بہادر سے صبح ہی کو ملنا ہو گیا، وہ اس تجویز سے بڑے خوش ہوے۔ فرماتے تھے، جہاں پناہ سے میں اجازت لیے لیتا ہوں، مگر مشاعرہ کا انتظام ایسا ہونا چاہیے کہ ہم لوگ بھی آ سکیں۔ خیر بیٹھیے، شاید ابھی آپ کی یاد ہو۔ میں ایک طرف بیٹھ گیا۔ بیٹھا ہی تھا کہ چوبدار نے آکر کہا، "وہ کریم الدین کون صاحب ہیں انکو حضور والا یاد فرماتے ہیں" یہ سننا تھا کہ میرے پسینے چھوٹ گئے میں سمجھا تھا کہ حکیم صاحب ہی کے پاس جا کر معاملہ طے ہو جائے گا، یہ کیا خبر تھی کہ بارگاہ جہاں پناہی میں یاد ہوگی، اور یاد بھی ایسے وقت کہ میرا سانس بھی پوری طرح پیٹ میں نہیں سمایا ہوگا "حکم حاکم مرگ مفاجات" اٹھا اور چوبدار کے پیچھے پیچھے روانہ ہوا۔ تمام راستے آیۃ الکرسی پڑھتا رہا، آنکھ اٹھا کر یہ بھی نہ دیکھا کہ یہ بندۂ خدا کدھر لیے جا رہا ہے۔ اندر سے قلعہ دیکھنے کا بہت شوق تھا، اب جو موقعہ ملا تو کن انکھیوں سے بھی دیکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ چلتے چلتے آندہ آگئی، آخر خدا خدا کر کے چوبدار نے دیوان خاص کی سیڑھیوں پر لیجا کر کھڑا کر دیا اور آپ اندر اطلاع دینے چلا گیا۔ حضرت جہاں پناہ اسوقت حمام میں رونق افروز تھے۔ جن صاحبوں نے دہلی کا قلعہ نہیں دیکھا ہے وہ

---

* قلعہ دہلی کو لال حویلی یا مبارک حویلی بھی کہا جاتا تھا۔ حافظ عبد الرحمن خاں احسان کا شعر ہے:

مری تنخواہ لوٹی ان لٹیروں نے حویلی میں
بہادر شاہ غازی کی دہائی ہے دہائی ہے

شاید نہ سمجھ سکیں کہ گرمیوں میں حمام میں بیٹھنے کے کیا معنی۔ اصل یہ ہے کہ یہ حمام کیا ہے ایک عالیشان عمارت ہے، اسکے دو درجے ہیں، ایک گرم اور دوسرا سرد۔ عمارت کا جو حصہ موتی مسجد کی جانب ہے وہ گرم ہے، اور جو جمنا کے رخ پر ہے وہ سرد ہے۔ ریتی کے رُخ خس کے پردے ڈال کر خسخانہ بنایا بنالیا جاتا ہے۔ اندر نہر بہتی ہے۔ بیچ میں کئی بڑے بڑے حوض ہیں۔ ان میں فوارے چلتے ہیں۔ حمام کیا ہے ایک بہشت کا ٹکڑا ہے۔ چوبدار جو گیا تو آنے کا نام نہیں لیتا۔ دھوپ میں کھڑے کھڑے فشار ہوگیا۔ پسینے میں تربتر، گردن نیچی کیے کھڑا ہوں اور ناک سے پسینے کی بوندیں ٹپک رہی ہیں۔ ارادہ ہوا کہ واپس چلا جاؤں، مگر اول تو طلبی کے بعد بھاگ جانا ہی نازیبا، دوسرے راستہ کس کو معلوم۔ خدا خدا کرکے یہ مشکل آسان ہوئی اور چوبدار نے آکر کہا کہ "چلیے" اس ایک لفظ نے خود بخود پاؤں میں لغزش اور دل میں کپکپی پیدا کردی۔ خیر کسی نہ کسی طرح اُلٹے سیدھے پاؤں ڈالتا حمام مبارک میں داخل ہوگیا۔ چوبدار نے آواز دی "ادب سے، نگاہ روبرو، حضرت جہاں پناہ سلامت، آداب بجالاؤ" میں نواب زین العابدین خاں صاحب سے یہ سبق پورا اور اچھی طرح پڑھ کر آیا تھا، دوہرا ہوکر سات تسلیمات بجالایا اور نذر گزرانی۔ نذر دیتے وقت ذرا آنکھ اونچی ہوئی تو وہاں کا رنگ دیکھا۔ حضرت پیرو مرشد ایک چاندی کی پلنگڑی پر لیٹے تھے، پائنتی مرزا فخرو بیٹھے پاؤں دبا رہے تھے۔ دہلی میں وہ کون ہے جس نے حضرت ظل اللہ کو نہیں دیکھا۔ میانہ قد، بہت نحیف جسم، کسی قدر لمبا چہرا، بڑی بڑی روشن آنکھیں، آنکھوں کے نیچے کی ہڈیاں بہت اُبھری ہوئی، لمبی گردن، چوکا ذرا اونچا، پتلی ستواں ناک، بڑا دہانہ، گہری سانولی رنگت، سر منڈا ہوا، چھدری داڑھی، گلوں پر بہت کم، ٹھوڑی پر ذرا زیادہ، لبیں کتری ہوئی، ۷۰ برس سے اونچی عمر تھی۔ بال سفید بھق ہوگئے تھے، لیکن پھر بھی داڑھی میں اِکّا دُکّا سیاہ بال تھا۔ چہرے پر جھریاں تھیں، لیکن باوجود اس پیرانہ سالی اور نقاہت کے آواز میں وہی کراراپن تھا۔ سبز کمخواب کا ایک برکا پیجامہ اور سفید ڈھاکے کی ململ کا کرتا زیب بدن تھا۔ سامنے ایک چوکی پر جامہ وار کی خفتان اور کارچوبی چوگوشیہ ٹوپی رکھی ہوئی تھی۔ اب رہے مرزا فخرو تو وہ عین مین باپ کی تصویر تھے، یہ جوان، اُن کا رنگ بڑھاپے کی وجہ سے ذرا کلونس لے آیا تھا، ان کا کھلا گیہواں رنگ تھا، اُنکی داڑھی سفید تھی، اِنکی سیاہ۔ ورنہ یہی معلوم ہوتا تھا کہ ایک بادشاہ لیٹے ہیں اور ایک بیٹھے ہیں۔ دونوں نے مجھ پر ایک گہری نظر ڈالی اور بادشاہ سلامت نے فرمایا: "ہاں[۱]! تمہارا ہی نام کریم الدین ہے؟ تم کہیں باہر کے معلوم ہوتے ہو۔"

۱؎ اسکا حاشیہ صفحہ آئندہ میں ملاحظہ ہو۔

میں نے کہا کہ "خانہ زاد پانی پت کا رہنے والا ہے۔ بچپن ہی سے حضرت ظل اللہ کے سایۂ عاطفت میں آ رہا ہے۔" فرمایا "اماں! ابھی تمہارا ہی تذکرہ مرزا فخرو کر رہے تھے۔ میرا خود جی چاہتا ہے کہ پہلے کی طرح دیوان عام میں مشاعرہ کروں، مگر کیا کروں۔ زمانے کی ہوا ایسی بگڑ گئی ہے کہ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ یہ صحیح ہے کہ "بود ہم پیشہ با ہم پیشہ دشمن" لیکن خدا محفوظ رکھے ایسی دشمنی بھی کس کام کی کہ دو گھڑی مل جل کر نہ بیٹھنے دے۔ دیوان عام میں مشاعرہ ہوتا تھا، وہ کچھ دنوں ٹھیک چلا۔ پھر میں نے دیکھا کہ بے لطفی بڑھ رہی ہے۔ اس لیے بند کر دیا۔ منشی فیض پارسا نے اجمیری دروازے کے باہر غازی الدین خاں کے مدرسے میں مشاعرہ شروع کیا، وہ تیلیوں کی طرح بکھر گیا۔ وہ تو کہو غنیمت ہوا کہ ردیف میں "تیلیاں" ہی تھیں، کہیں خدانخواستہ اگر ردیف "کڑیاں" ہوتیں تو خدا معلوم کتنوں کے سر پھوٹ جاتے۔ تم مشاعرہ تو کر رہے ہو مگر ان ہاتھیوں کی ٹکر کیسے سنبھالو گے۔ استاد ذوق تو بیچارے بے زبان آدمی ہیں، مگر خدا بچائے حافظ ویران سے، وہ ضرور لڑ مریں گے۔ اور تم جانتے ہو "اندھے کی داد نہ فریاد اندھا مار بیٹھے گا" کسی نے اگر مشاعرہ میں اُستاد پر ذرا بھی چوٹ کر دی تو ان نابینا صاحب کا سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔ میاں تم سے یہ کام سنبھلتا نظر نہیں آتا۔"
میں نے عرض کی کہ "قبلۂ عالم! میری کیا ہمت ہے جو میں اتنے بڑے کام میں ہاتھ ڈال سکوں، مشاعرہ کا سارا انتظام نواب زین العابدین عارف نے اپنے ذمے لیا ہے۔" فرمایا "تو پھر مجھے اطمینان ہے۔ یہ لڑکا بڑا ہوشیار اور ذہین ہے۔ مرزا نوشہ اور مومن خاں کو وہ سنبھال لے گا۔"

+ شاہان دہلی ہمیشہ مرد و عورت دونوں کو "اماں" سے خطاب کیا کرتے تھے۔ چنانچہ اس طرز کلام کی جھلک اب تک حیدر آباد میں پائی جاتی ہے۔ مجھے بڑا تعجب ہے کہ ایک مورخ نے اس طریقۂ مخاطبت کی بنا پر قلعۂ معلیٰ کی تہذیب و اخلاق پر حملہ کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ "بادشاہ کے اخلاق کی پستی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو بھی "اماں" کہتا تھا"۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ صاحب انگریزی نہیں جانتے تھے۔ ورنہ ان کو یہ پڑھ کر تعجب ہوتا کہ جس قوم کو وہ تہذیب کا پتلا اور اخلاق کا نمونہ ظاہر کرتے ہیں اُن کے ہاں بھی خاوند اپنی بیوی کو "اماں" ہی کہتا ہے اور بیوی اپنے خاوند کو کبھی "ابا" اور کبھی "دادا" پکارتی ہے۔

(میرے خیال میں یہ "ارے میاں" کا اختصار ہے۔ چنانچہ اب بھی بے تکلف بول چال میں میاں کو ماں ہی کہہ جاتے ہیں۔ (ایڈیٹر)

رہے اُستاد ذوق اُن سے میں کہہ دوں گا۔ خدا نے چاہا تو اس طرح مشاعرہ چل جائے گا۔ مگر میں یہ کہے دیتا ہوں کہ مشاعرہ سے پہلے ان لوگوں سے مل لو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وقت پر انکار کر بیٹھیں۔ میں اور مرزا شبّو تو آ نہیں سکتے ہیں۔ ہاں مرزا فخرو کو اپنی جگہ بھیجدوں گا۔ اور انشاء اللہ اپنی غزل بھی بھیجوں گا۔ ہاں یہ تو بتاؤ کہ تم نے "طرح" کیا رکھی ہے؟ "طرح" ہی تو بڑے جھگڑے کی چیز ہے، یہ ذرا سوچ سمجھکر دینا" یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ باز وسے آواز آئی "ملے ہے" یہ آنا تھا کہ گویا بے طرح سُلا گئی ہے" یہ سُنتے ہی بادشاہ سلامت نے یہ فرمایا "لو بھائی! یہ خود بخود فال گوش مل گئی۔ تم اس مشاعرہ میں کوئی "طرح" ہی نہ دو۔ جس شخص کا جس بحر، جس ردیف قافیہ میں غزل پڑھنے کو دل چاہے پڑھے۔ نہ لینا ایک نہ دینا دو" میں نے عرض کی "تاریخ؟" فرمایا "ہاں جب مقرر کردو۔ دن بھی اچھا ہے۔ چاندنی رات بھی ہوگی، آج ۵ تاریخ ہے، ۹ دن باقی ہیں؛ اتنے دنوں میں بہت کچھ انتظام ہو سکتا ہے۔ ۲۰۔ جولائی پڑ گئی، موسم بھی ٹھنڈا ہو جائے گا۔ اچھا اب خدا حافظ"۔ میں نے عمر و دولت و اقبال کو دعا دی اور خوش خوش اُلٹے قدموں واپس ہوا۔ مرزا فخرو بیچ میں کچھ نہیں بولے۔ مگر میں سمجھتا تھا کہ یہ سب کیا دھرا اُنھیں کا ہے، ورنہ کہاں میں اور کہاں یہ خلوتِ شاہی۔ سچ ہے "بگڑی بنجاتی ہے جب فضل خدا ہوتا ہے"۔ یہاں میں اتنا ضرور کہوں گا کہ میرے لیے حضوری اتنا مشکل کام نہ تھی جتنا یہ اُلٹے پاؤں واپس ہونا۔ زمین پاؤں کو نہیں لگی تھی، اس لیے دو چار قدم ہی چلا ہوں گا کہ دیوار سے ٹکر کھائی، اس ٹکر سے سنبھلا نہیں تھا کہ نہر میں پاؤں جا پڑا۔ خیر ہزار دقت باہر نکل ہی آیا۔ ادھر میں نکلا اُدھر چوبدار ساتھ ہوا۔ اُسکو انعام دے دلا کر ٹالا۔ حکیم صاحب کے پاس آیا، وہ میرے انتظار ہی میں بیٹھے تھے؛ اُن سے تمام واقعہ بیان کیا، فرمانے لگے "مولوی صاحب بات یہ ہے کہ مرزا فخرو بہت دنوں سے مشاعرہ کیلیے بیچین ہو رہے تھے، اُنھی کی یہ کارگذاری ہے، ورنہ بھلا یہ معاملہ اس طرح تھوڑی طے ہو جاتا۔ مگر چلو تمھارا کام بن گیا۔ میاں عارف سے بھی جا کر کہدو۔ وہ میرے ہاں بیٹھے انتظار کر رہے ہوں گے۔

حکیم صاحب کے مکان پر پہونچا تو دیکھا کہ واقعی نواب صاحب میرے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ اُن سے حالات بیان کیے۔ کہنے لگے کہ "چلو یہ مشکل تو آسان ہوئی، اب تم یہ کرو کہ کل کم سے کم استاد ذوق، مرزا نوشہ اور حکیم مومن خاں کے مکان کا گشت لگا ڈالو؛ مگر دیکھنا ذرا پھونک پھونک کر قدم رکھنا۔ یہ تینوں بڑے دماغ دار آدمی ہیں۔ اگر ذرا بھی تم سے بات چیت میں لغزش ہوئی تو یاد رکھو کہ بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ جب دیکھو کہ ان میں سے کوئی ہاتھوں سے نکلا جاتا ہے تو میرا نام لے دینا،

...ہے کہ میرزا صاحب شاید راضی ہو جائیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ مبارک النساء بیگم کی حویلی جس میں تمھارا مطبع ہے، دو روز میں خالی کر کے میرے حوالے کر دو، مجھے وہاں نشست کا انتظام کرنا ہوگا"۔ میں نے کہا "اور میں کہاں جاؤں" فرمانے لگے "میرے مکان میں آٹھ نو روز کے لیے آجاؤ، تم کو تکلیف تو ہوئی مگر کیا کیا جائے۔ جب قلعہ کے لوگوں کو بلا رہے ہیں تو اُنھی کے رُتبے کے موافق مکان کو بھی درست کرنا ہوگا۔ دیکھیے خرچ کیا پڑتا ہے" میں نے کہا "مشاعرہ میں خرچ ہی ایسا کونسا ہوتا ہے؟ زیادہ سے زیادہ سو سوا سو روپے اُٹھ جائیں گے" یہ سُن کر نواب صاحب مسکرائے اور کہا "میاں کریم الدین۔ تم کیا جانو کہ ایسے مشاعروں میں کیا خرچ ہو جاتا ہے۔ ہزار دو ہزار میں بھی اگر پو[را] پورا ہوگیا تو سمجھو کہ سستے چھوٹے" یہ سُن کر تو میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ میں نے کہا "نواب صاحب اگر یہ صورت ہے تو میرا ایسے مشاعرے کو دور ہی سے سلام ہے؛ مطبع تو مطبع اگر اپنے آپ کو بھی بیچ ڈالوں، تو اتنی رقم نہ اُٹھے" فرمانے لگے "بھئی تم اس خرچ کے جھگڑے میں نہ پڑو، خدا یہ مشکل بھی آسان کر دیگا۔ جب میں نے اس کام میں ہاتھ ڈالا ہے تو میں جانوں اور میرا کام جانے تم بیٹھے تماشہ دیکھو۔ مگر ہاں مکان کل تک خالی کر دینا۔ نو ہی دن تو رہ گئے ہیں، رات کم اور سوانگ بہت ہے۔ اب جاؤ خدا حافظ۔ تم تھک بھی گئے ہو، ذرا آرام لے لو، اور کل صبح ہی سے ادھر مکان خالی کرنے کی فکر کرو، اُدھر اِن تینوں اُستادوں کے مکانوں کا چکر لگا آؤ۔ مکان خالی ہو جائے تو مجھے فوراً اطلاع دینا اور خود میرے ہاں چلے آنا۔ اس میں شرم کی کونسی بات ہے آخر میری ہی وجہ سے تو تم اپنا مکان چھوڑ رہے ہو"۔ وہاں سے نکل کر میں اپنے گھر آیا، مطبع کو بند کرتے کرتے اور سامان کو سمیٹتے سمیٹتے شام ہو گئی۔ صبح اُٹھ کر اپنے پہننے اوڑھنے کا سامان تو نواب زین العابدین خاں کے مکان پر روانہ کیا اور خود کابلی دروازہ کی طرف چلا کہ چلے اُستاد ذوق ہی سے بسم اللہ کروں۔

کابلی دروازے کے پاس ہی ان کا مکان ہے۔ مکان بہت چھوٹا ہے، چھوٹی سی ڈیوڑھی ہے۔ اس میں ایک طرف جائے ضرور ہے۔ اندر صحن اتنا چھوٹا ہے کہ دو پلنگ بچھنے کے بعد راستہ چلنے کے لیے مشکل سے جگہ رہتی ہے۔ سامنے چھوٹا سا دالان ہے اور اُسکے اوپر ایک کمرہ۔ صحن میں سے زنانہ مکان میں راستہ جاتا ہے۔ جب میں پہنچا تو اُستاد صحن میں ایک کھرّی چارپائی پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ دوسری چارپائی پر اُنکے چہیتے شاگرد حافظ غلام رسول ویران بیٹھے تھے یہ اندھے ہیں، اور انھیں سے ہوشیار رہنے کے لیے حضرت جہاں پناہ نے ارشاد فرمایا تھا "اُستاد

ذوق قد و قامت میں متوسط اندام ہیں، رنگ اچھا سانولا ہے۔ چہرے پر چیچک کے بہت داغ ہیں آنکھیں بڑی بڑی اور روشن اور نگاہیں تیز تھیں۔ چہرے کا نقشہ کھڑا کھڑا ہے۔ اسوقت سفید تنگ پیجامہ، سفید کُرتا اور سفید ہی انگرکھا پہنے ہوے تھے۔ سر پر گول چندوے کی ململ کی ٹوپی تھی۔ میرے پاؤں کی آہٹ سنتے ہی حافظ ویران نے چونک کر کہا "کون ہے" میں نے کہا "کریم الدین۔ اُستاد ذوق کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں"۔ اُستاد نے اپنا نام سُن کر کہا "آیئے آیئے اندر تشریف لائیے"۔ میں نے آداب کیا، اُنھوں نے فرمایا "بیٹھو بھئی بیٹھو"۔ میں حافظ ویران کے پاس چارپائی پر بیٹھ گیا۔ کہا "فرمائیے کیسے تشریف لانا ہوا؟" میں نے عرض کی کہ "میرا ارادہ قاضی کے حوض پر ایک مشاعرہ شروع کرنے کا ہے۔ ۱۴ رجب تاریخ مقرر ہوئی ہے۔ اگر حضور بھی ازراہ ذرہ نوازی قدم رنجہ فرمائیں تو بعید از کرم نہ ہوگا"۔ میرا اتنا کہنا تھا کہ حافظ ویران تو چراغ پا ہو گئے۔ کہنے لگے "جائیے جائیے، کہاں کا مشاعرہ نکالا ہے۔ اُستاد کو فرصت نہیں ہے۔ اُن مرزا لے پالک کے پاس کیوں نہیں جاتے جو خواہ مخواہ انکو آکر دق کرتے ہو"۔ اُستاد نے کہا "بھئی حافظ ویران! تمھاری زبان نہیں رُکتی۔ میٹھے بٹھائے تم دنیا بھر سے لڑائی مول لیتے ہو"۔ حافظ ویران کہنے لگے "اُستاد، جب وہ آپ کو بُرا بھلا کہیں تو ہم کیوں چُپ بیٹھنے لگے۔ وہ ایک کہیں گے تو ہم سو سُنائیں گے۔ اور تو اور میاں آشفتہ کو دن لگے ہیں، کل کی بات ہے آپ کو نا روا کہہ رہے تھے۔ مگر میں نے ایسی خبر لی کہ تمام عمر یاد کریں گے، اُن کی سات پشت کو تو م ڈالا"۔ اُستاد ہنس کر فرمانے لگے "نا بھئی نا، تم میری وجہ سے کیوں بلا میں پڑتے ہو۔ مجھے جس کا جو جی چاہے سو کہے میں نے اُن سب کا جواب ایک رباعی میں دیدیا ہے

تو بھلا ہے تو بُرا ہو نہیں سکتا اے ذوق	ہے بُرا وہ ہی کہ جو تجھکو بُرا جانتا ہے
اور جو خود تو ہی بُرا ہے تو وہ سچ کہتا ہے	کیوں بُرا کہنے سے اُسکے تو بُرا مانتا ہے

* اُن دنوں دہلی میں لوگوں نے یہ اُڑا رکھا کہ مرزا نوشہ (غالب) مرزا عبد اللہ بیگ کے بیٹے نہیں ہیں بلکہ اُنھوں نے ان کو پال لیا ہے۔ اور یہ دراصل کسی کشمیری کی اولاد ہیں۔ حافظ ویران نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ خدا محفوظ رکھے دہلی والوں سے جو باپ سے آیا اُس کے حسب و نسب میں اُنھوں نے کیڑے ڈالے۔

الغا و ذوق کو شہر بھر نانی کہتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ آزاد مرحوم نے اُن کے ہاتھ میں اُسترے کی بجائے تلوار دے کر اُنکو سپاہی زادہ بنا دیا ہے۔

میں نے عرض کی کہ "میں کل بارگاہِ سلطانی میں حاضر ہوا تھا - حضرت ظل اللہ نے ارشاد فرمایا تھا کہ اس مشاعرے میں ہم مرزا فتح الملک بہادر کو اپنی طرف سے بھیجیں گے اور اپنی غزل بھی بھیج کر مشاعرے کی عزت بڑھائیں گے - اور یہ بھی ارشاد ہوا تھا کہ اُستاد ذوق سے بھی کہہ دیں گے - وہ بھی مشاعرے میں ضرور آئیں گے" - یہ سُن کر حافظ ویران تو ٹھنڈے پڑ گئے - اُستاد نے فرمایا "ہاں بھئی مجھے یاد آ گیا - کل شام کو حضرت پیر و مرشد نے مجھ سے بھی فرمایا تھا، اور یہ بھی ارشاد ہوا تھا کہ تو بھی ضرور جائیو - میاں میں انشاء اللہ تعالیٰ ضرور آؤں گا - مگر یہ تو بتاؤ "طرح" کیا رکھی ہے؟" میں نے واقعہ عرض کیا اور کہا کہ "حضرت ظل سبحانی نے "طرح" کا جھگڑا ہی نکال دیا - جو شخص جس بحر اور جس ردیف قافیے میں چاہے آ کر غزل پڑھے" اُستاد تو "بہت خوب، بہت خوب" کہتے رہے، مگر حافظ ویران کی تیوری کے بل نہیں گئے، برابر بڑبڑاتے ہی رہے کہ "اللہ خیر کرے، دیکھیے اس مشاعرے کا کیا حشر ہوتا ہے - حضرت پیر و مرشد بھی بیٹھے بیٹھے شگوفے چھوڑا کرتے ہیں" - وہ اپنی کہے گئے میں تو اُٹھ سلام کر چلا آیا -

دوسرا حملہ اسد اللہ خاں غالب پر تھا - چاندنی چوک سے ہوتا ہوا بلی ماروں میں آیا - حکیم محمود خاں صاحب کے مکان کے سامنے سے قاسم جان کی گلی کٹی ہے - بائیں طرف پہلا ہی مکان اُن کا تھا - یہ مکان مسجد کے پیچھے ہے، اس کے دو دروازے ہیں، ایک مردانہ دوسرا زنانہ - محلسرا کا ایک راستہ مردانے مکان سے بھی ہے - باہر کے دروازے کی دہلیز ذرا دھنسی ہوئی سی ہے - دروازے کے اوپر ایک کمرہ ہے اور کمرے کے دونوں پہلوؤں میں دو کوٹھریاں - گرمی میں مرزا صاحب دوپہر کے وقت اسی ایک کوٹھری میں رہا کرتے ہیں - دروازے سے گزر کر مختصر سا صحن ہے اور سامنے ہی دالان در دالان - جب میں پہنچا تو اندر کے دالان میں گاؤ تکیہ سے لگے بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے -

مرزا نوشہ کی عمر کوئی ۵۰ سال کی ہوگی جسیم اور تنو مند آدمی ہیں، قد اونچا اور ہاڑ بہت چوڑا چکلا - موٹا موٹا نقشہ اور سرخ و سفید رنگ ہے - لیکن اس میں کچھ کچھ زردی جھلکتی ہے - ایسے رنگ کو محاورہ میں چمپئی کہا جاتا ہے - آگے کے دو دو دانت ٹوٹ گئے ہیں، ڈاڑھی بھری ہوئی ہے، مگر گھنی نہیں ہے - سر منڈا ہوا - اس پر لمبی سیاہ پوستین کی ٹوپی ہے جو کلاہِ پاپاخ سے ملتی جلتی ہے ایک بر کا سفید پاجامہ، سفید ململ کا انگرکھا - اُس پہ ہلکی زرد زمین کی مدوار کا چُغہ[†] - میری آہٹ

---

* معلوم نہیں کہ یہ کس زبان کا لفظ ہے، مگر دہلی میں عام طور پر "تنگ" وغیرہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

† دہلی کے عجائب خانہ میں مرزا غالب کی ایک تصویر ہے اُس سے یہ لباس لیا گیا ہے۔

پا کر لکھتے لکھتے آنکھ اونچی کی، میں نے آداب کیا، سلام کا جواب دیا اور آنکھوں سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں ایک طرف بیٹھ گیا۔ ابھی بیٹھا ہی تھا کہ نواب ضیاء الدین احمد خاں آ گئے۔ یہ امین الدین خاں صاحب نواب لوہارو کے بھائی ہیں۔ ریختے میں رخشاں اور فارسی میں نیّر تخلص کرتے ہیں۔ کوئی ۴۰ سال کی عمر ہے۔ انشا پردازی، جغرافیہ، تاریخ، علم انساب، اسمائے رجال، تحقیق لغات اور واقفیت عامہ میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ مرزا نوشہ کے خلیفہ ہیں۔ چھوٹا قد، بہت گورا رنگ، نازک نازک نقشہ، غلافی آنکھیں، چگی ڈاڑھی، چھریرا بدن۔ غرض نہایت خوبصورت آدمی ہیں۔ ایک برکا سفید پیجامہ اور سفید ہی انگرکھا زیب بدن تھا۔ قالب چڑھی ہوئی چوگوشیہ ٹوپی سر پر تھی۔ ایک بڑا رومال سموسہ بنا کندھے پر ڈالے ہوئے تھے۔ میں نے اٹھ کر سلام کیا۔ انھوں نے بڑھ کر مصافحہ کیا اور خاموش ایک طرف دوزانو نہایت ادب سے بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر میں مرزا غالب بھی لکھنے سے فارغ ہوئے۔ پہلے نواب صاحب کی طرف مڑے اور کہنے لگے "میاں نیّر! تم کس وقت یہاں آ بیٹھے۔ بھئی اس مرزا تفتہ نے میرا ناک میں دم کر دیا ہے۔ ظالم کی طبیعت کی روانی کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ ہر خط میں آٹھ دس غزلیں اصلاح کے لیے بھیجدیتے ہیں۔ اصلاح دیتے دیتے تھک جاتا ہوں"۔ میری طرف دیکھ کر کہا "آپ شاید مولوی کریم الدین صاحب ہیں"۔ میں نے کہا "جی ہاں" فرمانے لگے "حضرت آپ کے تشریف لانے کی مجھے پہلے ہی سے اطلاع مل گئی تھی۔ کل ہی میاں عارف آ کر مجھ سے مشاعرے میں چلنے کا وعدہ لے گئے ہیں۔ کہو میاں نیّر! تم بھی چلو گے"۔ نواب صاحب نے کہا "جہاں آپ وہاں میں۔ آپ تشریف لے جائیں گے تو انشاء اللہ میں بھی ضرور ہمراہ ہوں گا"۔ مرزا صاحب نے پوچھا "مگر بھئی اب تک علائی نہیں آئے، مجھکو ان کا کل سے انتظار ہے۔ اسے لو وہ آ ہی گئے۔ بھئی بڑی عمر ہے، ابھی میں تم کو پوچھ رہا تھا"۔

نواب علاء الدین خاں علائی، نواب لوہارو کے ولیعہد ہیں۔ کوئی ۲۳، ۲۴ سال کی عمر ہے۔ متوسط قد، گندمی رنگ، موٹا موٹا نقشہ، گول چہرہ، شربتی آنکھیں، اور گھنی چڑھی ہوئی ڈاڑھی ہے۔ لباس میں غلطے کا تنگ مہری کا پیجامہ، سفید جامدانی کا انگرکھا، اس پر سفید کھلی ہوئی سیاہ مخمل کی نیمہ آستین اور سر پر سیاہ ہی مخمل کی چوگوشیہ ٹوپی تھی؛ وہ بھی آداب کر کے ایک طرف بیٹھ گئے اور کہا "واقعی آج دیر ہو گئی، مجھے خود خیال تھا کہ آپ انتظار کر رہے ہونگے"۔ میری طرف دیکھ کر کہا "آپ کی تعریف" مرزا نوشہ نے تمام قصہ بیان کیا اور کہا "علائی تم کو بھی چلنا ہو گا، ابھی تو شاید تم کہیں جا رہے ہو"۔ انھوں نے کہا "بہت خوب، آپ تشریف لیجائیں گے تو میں بھی حاضر ہوں"۔

جب یہ مرحلہ بھی طے ہو گیا تو میں نے اجازت چاہی۔ وہاں سے رخصت ہو کر زین العابدین خاں کے مکان میں آیا۔ اُنھوں نے مردانے کا ایک حصہ میرے لیے خالی کر دیا تھا۔ جو اسباب صبح میں نے بھیجا تھا اُس کو جما جمایا پایا۔ کپڑے اُتارے۔ اندر سے کھانا آیا۔ کھانا کھا کر تھوڑی دیر سو رہا۔ چار بجے کے قریب اُٹھ کر حکیم مومن خاں کے ہاں جانے کی تیاری کی

حکیم صاحب کا مکان چیلوں کے کوچہ میں ہے۔ راستے میں مولوی امام بخش صاحب صہبائی مل گئے۔ یہ کالج میں میرے اُستاد رہے ہیں۔ کھلا ہوا گندم گوں رنگ ہے، مگر کہیں کہیں چیچک کے داغ ہیں، سر پر پٹے ہیں، بڑے دُبلے پتلے آدمی ہیں، کوئی ۴۰ سال کی عمر ہوگی۔ ایک بر کا سفید پیجامہ، سفید انگرکھا، کشمیری کام کا جُبہ پہنتے اور سر پر چھوٹا سفید عمامہ باندھتے ہیں یہ بھی چیلوں کے کوچے ہی میں رہتے ہیں۔ مجھ سے پوچھنے لگے "کہاں جاتے ہو" میں نے کہا "حکیم مومن خاں کے کے پاس" پوچھا "کیا کام ہے"۔ میں نے حال بیان کیا۔ کہنے لگے "چلو میں بھی وہیں جا رہا ہوں"۔ حکیم آغا خاں کے چھتے کے سامنے خاں صاحب کا مکان تھا بڑا دروازہ ہے، اندر بہت وسیع صحن اور اُس کے چاروں طرف عمارت ہے، دو طرف دو صحنچیاں ہیں، اور سامنے بڑے بڑے دالان در دالان۔ پہلے دالان کے اوپر کمرہ ہے۔ سامنے کے دالان کی چھت کو کمرے کا صحن کر دیا ہے، لیکن مُنڈیر بہت چھوٹی رکھی ہے*۔ دالانوں میں چاندنی کا فرش ہے۔ اندر کے دالان کے بیچوں بیچ قالین بچھا ہوا، قالین پر گاؤ تکیہ سے لگے حکیم صاحب بیٹھے ہیں۔ سامنے حکیم سکھانند متخلص بہ رقم اور مرزا رحیم الدین حیاؔ مؤدب دو زانو بیٹھے ہیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی دربار ہو رہا ہے کہ کسی کو آنکھ اُٹھا کر دیکھنے اور بلا ضرورت بولنے کا یارا نہیں۔ حکیم مومن خاں کی عمر تقریباً چالیس سال کی تھی کشیدہ قامت، سرخ و سفید رنگ تھا، جسم پر سبزی جھلکتی تھی۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں، لمبی لمبی پلکیں، کھنچی ہوئی بھویں، لمبی سُتواں ناک، پتلے پتلے ہونٹ، اُن پر پان کا لاکھا جما ہوا، مسی آلودہ دانت، ہلکی ہلکی مونچھیں، خشخاشی ڈاڑھی، بھرے بھرے ڈنڈ، پتلی کمر، چوڑا سینہ اور لمبی اُنگلیاں۔ سر پر گھونگھر والے لمبے لمبے بال کاکلوں کی شکل میں، کچھ تو پشت پر اور کچھ کندھوں پر پڑے ہوئے،

---

* میں نے خود یہ مکان ۲۰۔۲۲ برس ہوئے دیکھا تھا۔ ٹوٹ کر کھنڈر ہو گیا تھا۔ تین طرف کی عمارت ڈھے گئی تھی سامنے کا حصہ قائم تھا۔ معلوم نہیں کہ اوپر کی مُنڈیر کیوں اتنی نیچی رکھی گئی تھی۔ اسی منڈیر سے ٹھوکر کھا کر حکیم مومن خاں نیچے گرے۔ ہاتھ اور بازو ٹوٹ گیا اور اسی کی وجہ سے ان کا انتقال ہوا۔ خود ہی مرنے کی تاریخ کہی تھی کہ "دست و بازو بشکست"۔

کان کے قریب تھوڑے سے بالوں کو موڑ کر زلفیں بنا لیا تھا۔ بدن پر شربتی ململ کا نیچی چولی کا انگرکھا تھا لیکن اسکے نیچے کُرتا نہ تھا، اور جسم کا کچھ حصہ انگرکھے کے پردے میں سے دکھائی دیتا تھا۔ گلے میں سیاہ رنگ کا فیتہ، اُس میں چھوٹا سا سنہری تعویذ۔ کاکریزی رنگ کے دوپٹے کو بل دے کے کمر میں لپیٹ لیا تھا۔ اور اسکے دونوں کونے سامنے پڑے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں پتلا سا خار پشت! پاؤں میں سرخ گلبدنی کا پیجامہ، مُہریوں پر سے تنگ اوپر جا کر کسی قدر ڈھیلا۔ کبھی کبھی ایک برکا پیجامہ بھی پہنتے تھے۔ مگر کسی قسم کا بھی ہو ہمیشہ ریشمی اور قیمتی ہوتا تھا۔ جوڑا سرخ نیفہ۔ انگرکھے کی آستینیں آگے سے کٹی ہوئیں، کبھی لٹکتی رہتی تھیں اور کبھی لپیٹ کر چڑھا لیتے تھے۔ سر پر گلشن کی بڑی دو پلڑی ٹوپی، اُسکے کناروں پر باریک لیس۔ ٹوپی اتنی بڑی تھی کہ سر پر اچھی طرح منڈھ کر آگئی تھی۔ اندر سے مانگ اور ماتھے کا کچھ حصہ اور بال صاف جھلکتے تھے۔ غرض یہ کہ نہایت خوش پوشاک اور جامہ زیب آدمی تھے۔ جب ہم دونوں پہونچے تو صاحب عالم مرزا رحیم الدین حیا سے کہہ رہے تھے، کہ "صاحب عالم! تمھارے شطرنج کے نقشوں نے میرا ناک میں دم کر دیا ہے۔ ایک ہو، دو ہوں۔ آخر یہ روز روز کی فرمائشیں کوئی کہاں تک پوری کرے"۔ صاحب عالم نے کہا "استاد کیا کروں، رزیڈنٹ بہادر کے پاس ولایت سے حل کے لئے شطرنج کے نقشے آیا کرتے ہیں، کچھ تو میں خود حل کر کے اُنکے پاس بھیجدیتا ہوں، جو سمجھ میں نہیں آتے وہ آپکے پاس لے آتا ہوں"۔ حکیم صاحب نے نظر اُٹھا کر ہماری طرف دیکھا۔ ہمارا اسلام لے کر کہا "بیٹھیے بیٹھیے" ہم بیٹھ گئے۔ اور وہ پھر صاحب عالم کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے "میاں حیا! جو نقشہ تم لائے ہو وہ تو میرے خیال میں کچھ پیچیدہ نہیں ہے، تم کہتے ہو کہ سرخ مُہروں کو مات ہوگی، میں کہتا ہوں نہیں، سبز کو ہوگی۔ تم بساط بچھاؤ، میں ابھی سمجھائے دیتا ہوں۔ اچھا چلے ذرا مولوی صہبائی سے بات کر لوں۔ اور میاں سکھانند تم بیٹھے انتظار کرتے رہو، میں حکم لگا چکا ہوں کہ جب تک پورب کی طرف سے اس چھپکلی کا جوڑا نہ آجائے یہ سامنے کی دیوار سے نہ جائے گی۔ اس کا جوڑا آئے پہ آئے۔ سکھانند حکیم تھے، "رقم" تخلص کرتے تھے، دھرم میں پورے رہتے تھے کوئی ۴۰ سال کی عمر تھی۔ ریختے میں شاہ نصیر کے اور رمل میں خاں صاحب کے شاگرد تھے۔ بڑے خوش پوشاک، خوش وضع، خوش اخلاق ظریف الطبع، حلیم، خوبصورت اور شکیل آدمی تھے۔ اُستاد کا ایسا ادب کرتے تھے جیسے کوئی بیٹا باپ کا کرتا ہے۔ حکیم صاحب کی باتیں سُن کر "بہت خوب" بہت مناسب" کہتے رہے۔ اُن سے گفتگو کر کے حکیم صاحب ہماری طرف متوجہ

ہوئے اور کہنے لگے "ارے بھئی صہبائی! تم تو کئی دن سے نہیں آئے۔ کہو خیریت تو ہے۔ اور آپ کے ساتھ یہ کون صاحب ہیں"۔ مولوی صہبائی نے کہا "یہ پہلے کالج میں میرے شاگرد تھے، اب مطبع کھول لیا ہے، وہاں مشاعرہ کرنا چاہتے ہیں، آپ کو تکلیف دینے آئے ہیں"۔ حکیم صاحب نے ہنس کر کہا "بس صاحب مجھے تو معاف ہی کیجیے۔ اب دہلی کے مشاعرے شریفوں کے جانے کے قابل نہیں رہے۔ ایک صاحب ہیں وہ اپنی امت کو لیکر چڑھ آتے ہیں، شعر سمجھنے کی تو کسی کو تمیز نہیں، مفت میں واہ واہ! سبحان اللہ! کا غل مچا کر طبیعت کو منغض کر دیتے ہیں۔ یہ نہیں سمجھتے کہ

صائب دو چیز می شکند قدر شعر را　　　　تحسین ناشناس و سکوت سخن شناس

دوسرے صاحب ہیں وہ ہُد ہُد کو ساتھ لیے پھرتے ہیں، وہ خواہ مخواہ اُستادوں پر حملہ کرتے ہیں خود تو میدان میں نہیں آتے، اپنے نااہل پٹھوں کو مقابلے میں لاتے ہیں۔ اُس روز جو اُس جانور نے یہ شعر پڑھ کر

مرکزِ محورِ گردوں بہ لبِ آب نہیں　　　　ناخنِ قوسِ قزح، شبہہ مضراب نہیں

کہا کہ یہ غالب کے رنگ میں لکھا ہے، تو میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھ کو کس قدر ناگوار گزرا۔ غالب کے رنگ میں شعر کہنا تو کجا، وہ یا اُنکے اُستاد پہلے مرزا نوشہ کے شعروں کو سمجھ تو لیں۔ اب رہے میر صاحب۲ تو اُن کی بات دوسری ہے۔ وہ بھی واہیات بکتے ہیں گو کسی پر حملہ تو نہیں کرتے، بلکہ اُنکی وجہ سے مشاعرے میں چہل پہل ہو جاتی ہے۔ بھئی میں نے تو اسی وجہ سے مشاعروں میں جانا ہی ترک کر دیا ہے"۔ میں نے عرض کی کہ اس مشاعرے میں استاد ذوق اور مرزا نوشہ نے آنے کا وعدہ کر لیا ہے، حضرت ظلِ سبحانی کی غزل بھی آئے گی"۔ فرمایا "ہر شخص مختار ہے چاہے غزل بھیجے، میں تو نہ آؤں گا، نہ غزل بھیجوں گا" یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک بنارس کا سوداگر کپڑوں کے دو گٹھے لے کر آیا۔ شہر میں جب کوئی کپڑوں کا سوداگر آتا تو حکیم صاحب کے پاس اُس کا آنا لازمی تھا۔ ریشمی کپڑوں سے انکو عشق تھا۔ کوئی کپڑا پسند آتا تو پھر قیمت کی پروا نہیں کرتے تھے، جو مانگتا دیتے۔ اس سوداگر نے آکر ایک گٹھری مزدور کے سر سے اتاری، اُس میں سے پٹ سے ایک چھپکلی نیچے گری اور دوڑ کر سامنے کی دیوار پر چڑھ گئی۔ جو چھپکلی پہلے سے دیوار پر جمی بیٹھی تھی وہ لپک کر

+ یہ اُستاد ذوق کی طرف اشارہ تھا

۲ ان کا مفصل حال آگے آئے گا۔ یہ بھی عجیب رقم تھے۔

اس سے آملی، اور دونوں مل کر ایک طرف چلے گئے۔ ہم لوگ بیٹھے یہ تماشہ دیکھتے رہے جب دونوں چھپکلیاں چلی گئیں تو حکیم صاحب نے کہا "کہو میاں رقم! تم نے دیکھا؟" انھوں نے کہا "جی ہاں، ایک خانہ کا حساب لگانے میں مجھ سے غلطی ہوئی۔ میں نے جو اپنی رائے پر اصرار کیا تھا اُسکی معافی چاہتا ہوں"۔ کہنے لگے "بھئی، انسان ہی سے غلطی ہوتی ہے۔ ہاں تو بھئی صہبائی مشاعرے کے متعلق ہمارا تو صاف جواب ہے"۔ میں نے جب دیکھا کہ خاں صاحب ہاتھوں سے نکلے ہی جاتے ہیں تو مجھے نواب زین العابدین کا آخری نسخہ یاد آیا۔ میں نے کہا "مجھے تو اس مشاعرے سے بڑے نام تعلق ہے، سب کیا دھرا نواب زین العابدین خاں عارف کا ہے۔ وہ بہت بیمار ہو گئے ہیں، اور اُنکو اب زندگی کی اُمید نہیں رہی۔ اُنکی آخری خواہش ہے کہ مرتے مرتے ایک ایسا مشاعرہ دیکھ لوں جس میں دہلی کے تمام کاملین فن جمع ہوں۔ وہ خود حاضر ہوتے مگر حکیم احسن اللہ خاں صاحب نے اُنکو کہیں جانے آنے سے منع کر دیا ہے"۔ یہ آخری فقرہ میں نے اپنی طرف سے بڑھا دیا۔ خاں صاحب بڑے غور سے میری بات سنتے رہے۔ میں خاموش ہوا تو مولوی امام بخش صاحب کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے "ہوں ہے کیا خوش فکر اور ذہین شخص ہے۔ یہ عمر اور یہ مایوسی۔ سچ ہے ہمیشہ رہے نام اللہ کا"۔ میری طرف دیکھ کر کہا "اچھا بھئی، تم جاؤ؛ میری طرف سے عارف سے کہدینا کہ میاں میں ضرور آؤں گا"۔ جب میں نے دیکھا کہ یہ جادو چل گیا تو دوڑ کر پاؤں پکڑ لئے اور کہا "نواب صاحب نے یہ بھی فرمایا تھا کہ مولوی صہبائی صاحب، مفتی صدر الدین صاحب اور نواب مصطفٰی خاں صاحب شیفتہ کو بھی اپنے ہمراہ لائیے گا تو عنایت ہو گی"۔ حکیم صاحب کہنے لگے "میاں صہبائی سے تو میں ابھی کہے دیتا ہوں، اب رہے آزردہ اور شیفتہ تو واپس جاتے جاتے اُن سے بھی کہتے جاؤ۔ یہ کہدینا کہ میں نے تمکو بھیجا ہے۔ ہاں تاریخ کیا مقرر کی ہے؛ مشاعرہ کہاں ہوگا؛ اور "طرح" کیا ہے؟" میں نے تاریخ بتا کر مکان کا پتہ دیا۔ "طرح" کے متعلق حضرت جہاں پناہ کے حضور میں جو گفتگو ہوئی تھی وہ بیان کی۔ کہنے لگے "ہمارے بادشاہ سلامت بھی عجیب چیز ہیں، جو سوجھتی ہے نئی سوجھتی ہے۔ شاید ایسا مشاعرہ کہیں بھی نہ ہوا ہوگا جس میں "طرح" نہ دی گئی ہو۔ خیر یہ تو اچھا ہوا، جھگڑے کا جھونپڑا ہی نہیں رہا۔ مگر بھئی بات یہ ہے کہ جب تک مقابلے کی صورت نہ ہو نہ شعر کہنے میں جی لگتا ہے اور نہ پڑھنے میں

---

† یہ واقعہ ہے۔ اس کے دیکھنے والے ایک صاحب کا ابھی کوئی بیس برس ہوئے انتقال ہوا ہے۔ میں نے یہ واقعہ خود اُن کی زبانی سنا تھا۔

لطف آتا ہے"۔ یہ کہہ کر وہ کپڑے دیکھنے میں مشغول ہو گئے اور میں سلام کر کے رخصت ہوا۔

چتلی قبر کے قریب حویلی عزیز آبادی کے سامنے مفتی صدر الدین صاحب کا مکان تھا۔ اسکے نزدیک ٹیا محل میں نواب مصطفیٰ خاں صاحب شیفتہ رہتے ہیں۔ مفتی صاحب کے ہاں جا کر معلوم ہوا کہ شیفتہ بھی مفتی صاحب ہی کے پاس بیٹھے ہیں۔ میں نے کہا چلو اس سے بہتر موقعہ ملنا مشکل ہے، دونوں سے ایک ہی جگہ ملنا ہو گیا۔ یہ سوچ کر اندر گیا۔ مکان کوٹھی کے نمونے کا ہے انگریزی اور ہندوستانی دونوں وضعوں کو ملا کر بنایا گیا ہے۔ صحن بہت بڑا نہیں ہے۔ اس میں مختصر سی نہر ہے۔ سامنے دالان در دالان اور پہلو میں انگریزی وضع کے کمرے ہیں۔ باہر کے دالان میں کواڑ لگا کر اسکو بھی کمرے کی شکل کا کر دیا ہے۔ دالانوں کے سامنے اونچا چبوترہ ہے، چبوترے کے اوپر تخت بچھے ہوئے تھے، اس پر چاندنی کا فرش اور دو طرف گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ تختوں پر مفتی صاحب اور نواب صاحب بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ مفتی صاحب کی عمر کوئی ۵۶، ۵۷ سال کی تھی۔ گداز جسم، سانولا رنگ، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، ذرا اندر کو دھنسی ہوئیں، بھری ہوئی ڈاڑھی، بہت سیدھی سادی وضع کے آدمی ہیں۔ ظاہری نمائش سے کوئی سروکار نہیں۔ لباس سفید، ایک برکا پیجامہ، سفید کرتا اور سفید ہی صافہ تھا۔* [illegible] میں حکیم مومن خاں کے عہد دہلی میں نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ ہی کا نمبر تھا۔ ان کا [illegible] تھا لیکن ناک نقشہ غضب کا پایا تھا۔ اس پر نیچی سیاہ گول ڈاڑھی بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ جسم کسی قدر بھاری اور قد متوسط تھا۔ لباس میں بھی زیادہ تکلف نہیں کرتے تھے۔ ٹخنے تک ٹہری کا سفید پیجامہ سفید کرتا، نیچی چولی کا سفید انگرکھا اور قبہ نما پنجگوشیہ ٹوپی پہنتے تھے تقریباً ۳۸، ۴۰ سال کی عمر ہے۔

میں آداب کر کے تخت کے ایک کونے پر دوزانو بیٹھ گیا۔ مفتی صاحب نے آنے کا سبب پوچھا۔

---

* پرانے زمانے میں شرفا گھر پر بھی پورا لباس پہنے رہتے تھے۔ زنانے میں جانے کے خاص خاص وقت تھے ورنہ سارا وقت مردانے ہی میں گزرتا تھا۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی ملنے جلنے والا پاس بیٹھا رہتا۔ عالم ہوئے تو درس کا حلقہ ہوتا، شاعر ہوئے تو شعر کا چرچا رہتا۔ غرض کوئی وقت بیکار نہ گزرتا۔ خاص خاص دوستوں سے مذاق کی گفتگو ہوتی ورنہ عام طور پر اپنے کو بہت لیے دیے رہتے۔ جہاں جاؤ یہی معلوم ہوتا کہ دربار لگا ہوا ہے۔ ہر شخص دوزانو مودب بیٹھا ہے۔ بے ضرورت نہ بات کی جاتی ہے نہ جواب دیا جاتا ہے۔ کوئی ہنسی کی بات ہوئی تو ذرا مسکرا دیے، کھلکھلا کر ہنسنا معیوب اور بڑھ بڑھ کر بولنا یا اونچی آواز میں بات کرنا خلاف ادب سمجھا جاتا تھا۔

میں نے حکیم مومن خاں کا پیام پہونچا دیا۔ مفتی صاحب نے آنے کا سبب پوچھا" ہیں! خاں صاحب نے تو مشاعرے میں نہ جانے کا عہد کر لیا ہے۔ بھئی شیفتہ! یہ کیا معاملہ ہے؟ یا تو خود نہیں جاتے تھے یا دوسروں کو بھی گھسیٹ رہے ہیں"۔ میں نے نواب زین العابدین خاں عارف کا واقعہ بیان کیا، کہنے لگے "ہاں، یوں کہو، یہ بات ہے۔ ورنہ مجھے تو یہ سُن کر حیرت ہوئی تھی کہ حکیم صاحب اور مشاعرے میں جائیں۔ اچھا بھئی عارف سے کہہ دینا کہ میں اور شیفتہ دونوں آئیں گے"۔ یہاں سے چھٹی ہوئی تو میں یہ سمجھا کہ گویا گنگا نہا لیا۔ خوشی خوشی آکر نواب زین العابدین خاں سے واقعہ بیان کیا۔ وہ بھی مطمئن ہو گئے۔ میں نے حکیم مومن خاں کا حسب حال بیان کیا تو اُنکے آنسو نکل آئے۔ کہنے لگے "میاں کریم الدین! تم کو یہ بھی معلوم ہے کہ میری حکیم صاحب سے صفائی نہیں ہے" میں نے کہا "نواب صاحب! آپ کیا فرماتے ہیں، اُن پر تو آپ کی بیماری سُننے کا ایسا اثر ہوا کہ بیان نہیں کر سکتا۔ شاید اُن کا سگا بھائی بھی بیمار ہوتا تو اتنا ہی اثر ہوتا۔ مفتی صاحب سے معلوم ہوا کہ اُنھوں نے مشاعروں میں نہ جانے کا عہد کر لیا تھا۔ صرف آپ کی وجہ سے اُنھوں نے یہ عہد توڑا ہے"۔ نواب صاحب نے کہا "بھئی، تم کو ان لوگوں کی محبتوں کا کیا حال معلوم؟ یہ لوگ وہ ہیں کہ اپنے دشمن کو بھی مصیبت میں نہیں دیکھ سکتے۔ خیر اسکو جانے دو؛ اب یہ بتاؤ کہ تمھارا مکان خالی ہو گیا یا نہیں"۔ میں نے کہا "جی ہاں بالکل خالی ہے۔ حکم ہو تو میں بھی خدمت میں حاضر رہ کر مدد کروں"۔ فرمایا "نہیں بھئی، نہیں۔ جہاں دو آدمیوں نے مل کر کسی کام میں ہاتھ ڈالا اور وہ خراب ہوا۔ تم اس انتظام کو بس مجھ پر چھوڑ دو، میں جانوں اور میرا کام جانے۔ بلکہ تم تو اُدھر آنا بھی نہیں۔ تم نے آکر اگر مین میخ نکالی تو مجھ پر دوہری محنت پڑ جائے گی"۔

(باقی) (منقول از رسالۂ اردو)

رسید کتب

اسلامی کہانیاں	مرتبۂ شیخ بدر الاسلام فضلی بی اے بی ٹی	۹ر
پھولوں کی ڈالی	" شیخ محمد اسمٰعیل ایڈیٹر رسالۂ کائنات	۴ر
مرآۃ الشعر	مصنفۂ پروفیسر عبد الرحمٰن ایم اے دہلی	سے ر
الایمان	نوشتۂ مولوی حاجی مقتدیٰ خاں شروانی	۱۲ر
لمعۃ النبی	مصنفۂ حکیم محمد حسین خاں صاحب رئیس باپور	عہ ر
شیریں خسرو	(امیر خسرو دہلوی) بہ تنقید و تصحیح مولوی حاجی علی احمد خاں اسیر بدایونی	سے ر

نظم خیالات

سعی و تدبیرِ چارہ گر اکثر — وجہ افزونیِ مرض نکلی
یہی دیکھا ہے بیشتر ہم نے — "نظرِ مہر" خود غرض نکلی

یاد کس کا مسکرانا آ گیا — کیوں جگر کے زخم خنداں ہو گئے
دیکھنا بجلی گری ہے کس طرف — داغِ حسرت پھر نمایاں ہو گئے

سود دے دے کے وضع نبھتی ہے — قرض لے لے کے کام چلتا ہے
بیع ہوتا ہے اب وثیقہ بھی — کیا نوابی کا نام چلتا ہے

پے آزارِ دل، شگوفے بھی — نت نئے روز روز کھلتے ہیں
ہونے لگتے ہیں مندمل جب زخم — ٹھیس لگ لگ کے پھر وہ چھلتے ہیں
اب عزیزوں سے دل نہیں ملتا — ہم فقط مصلحت سے ملتے ہیں

دعوتِ عام کو محدود نہ کر — چشمۂ فیض کو مسدود نہ کر
کارِ تبلیغ کو محدود بنا — امرِ مقبول کو مردود نہ کر

درجِ تاریخِ زمانہ ہو گیا — واقعاتِ زیست کا یہ اقتباس
"دل رہا خود بینیوں میں عمر بھر — ہو سکا پھر بھی نہ ظالم خود شناس"

جستجو امن و سکوں کی مجلسِ اقوام میں! — جلوۂ حق کی تلاش ان مغربی اصنام میں!
سادہ لوحی چھوڑئیے اور دعوتِ قرآں تو سن — ہے سکونِ قلب و امنِ عام اس پیغام میں

ابو عمر

نظرے خوش گزرے

حال ہی میں مسٹر رام بابو سکسینہ ایم اے ایل ایل بی ڈپٹی کلکٹر صوبجات متحدہ و رکن ہندوستانی اکیڈمی نے ادب اردو کی ایک تاریخ انگریزی زبان میں شایع کی ہے۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ بھی امید ہے کہ آیندہ سال شایع ہو جائے۔ اور اسی وقت انشاء اللہ اس پر مفصل تبصرہ کیا جائے گا۔ سردست ہم اس کتاب کا ناظرین سے تعارف کرانا چاہتے ہیں تاکہ جن اصحاب کو انگریزی کتاب دیکھنے کا شوق ہو وہ اس سے لطف اندوز ہو سکیں۔ کتاب کا مجموعی حجم چار سو صفحے کے قریب ہے۔ قیمت [illegible] شایع کنندہ رام نرائن لال تاجر کتب الہ آباد ہیں۔ شروع میں ایک ورق کا مختصر دیباچہ مصنف نے اور ایک ورق کا تعارف ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو نے لکھا ہے۔ چودہ باب ہیں جن میں ابتداءً زبان کی ابتداء، اردو ادب کا عام خاکہ اور اردو شاعری کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ دکن کی شاعری اور شعرائے دہلی و لکھنؤ کے مختلف ادوار کا تفصیلی بیان ہے۔ اور اسی سلسلہ میں ایک باب مرثیہ اور مرثیہ گو قائم کر کے اس صنفِ شاعری سے بحث کی ہے۔ پھر اردو شاعری کے جدید دور یعنی عہد حالی و آزاد کا تذکرہ ہے۔ اس کے بعد نثر اردو کی ابتدائی تاریخ، عہد غالب و سرسید کی اردو اور افسانہ نویسی کی ذیل میں عہد سرشار و شرر پر تبصرہ ہے۔ پھر ایک باب ڈراما کی بحث کے لیے وقف کیا گیا ہے اور آخری باب میں اردو ادب کی عام ترقیات کا ذکر کیا ہے جس کے ضمن میں عہد حاضر کی تحریکات اور اہل قلم پر اجمالی تبصرہ ہے۔

کتاب میں کوئی بات اگرچہ نئی نہیں ہے مگر جہاں تک کتاب کی ادبی حیثیت اور ترتیب کا تعلق ہے مصنف کی کوششیں امید ہے کہ پسندیدگی سے دیکھی جائیں گی۔ اردو زبان و ادب کے متعلق جو کثیر ذخیرہ مختلف کتابوں میں پھیلا ہوا ہے اسے ایک مسلسل و مرتب صورت میں پیش کرنا نہایت باموقعہ کہا جا سکتا ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہندوستان کے کثیر التعداد انگریزی تعلیم یافتہ جو اردو زبان کو بالکل حقیر اور ناقابلِ التفات سمجھتے تھے اس کتاب کے ملاحظہ سے شاید ان کی رائے میں مناسب تبدیلی ہو جائے، اور وہ اپنی ملکی زبان پر اب سے زیادہ توجہ کرنے لگیں۔

غلطیوں اور فروگذاشتوں سے انسان کا کوئی کام پاک نہیں ہوتا، اس بنا پر اس کتاب میں بھی بہت سے نقائص نکلیں گے۔ مگر اس وقت محاسن و معائب کسی پر تفصیلی بحث کا موقعہ نہیں ہے۔

اس لیے اس پہلو کو نظر انداز کرنا مناسب ہوگا۔ البتہ لائق مصنف کی توجہ دو باتوں کی طرف مبذول کرانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

(۱) ایک مقام پر مصنف نے اُردوے معلّٰی کا ترجمہ exalted army کیا ہے جس سے خیال ہوتا ہے کہ اُنھوں نے اُردو کو لشکر کا اور لشکر کو فوج کا مرادف سمجھا ہے۔ حالانکہ "اُردو" کے معنی ہیں "فوج کا بازار" جسے اب عموماً صدر بازار یا چھاؤنی بازار کہا جاتا ہے۔

(۲) مصنف نے جن کتابوں سے یہ ساری معلومات اخذ کی ہیں اُنکے حوالہ دینے میں بہت کوتاہ قلمی سے کام لیا ہے، حالانکہ اکثر مقامات پر پوری عبارتیں لے لی گئی ہیں۔ کم سے کم ایک فہرست ہی اپنے ماخذوں کی درج کردیتے تو ایک حد تک یہ شکایت رفع ہو جاتی۔

"۱۲۶۱ھ" کا ایک مشاعرہ' انجمن ترقی اُردو کے سہ ماہی رسالہ "اُردو" کے اکتوبر نمبر میں شایع ہوا ہے۔ اور ہمیں اس قدر پسند آیا کہ الناظر کی روایاتِ عامہ کے خلاف ہم نے اس مضمون کو تمام و کمال نقل کرکے ناظرین الناظر کو بھی اس سے لطف اندوز ہونے کا موقعہ فراہم کرنا ضروری سمجھا۔ مضمون بہت طولانی تھا، اس لیے الناظر کی ترتیب بھی بدل دینا پڑی۔ اس نمبر میں دو جزو آگئے ہیں۔ انشاءاللہ آیندہ نمبر میں بقیہ دو جزو بھی شایع کردیے جائیں گے۔ اصلی لطف تو سارے مضمون کو یک وقت مطالعہ کرنے ہی سے آئے گا، مگر ان اوراق سے بھی لائق مضمون نگار کے اندازِ تحریر کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ جو صاحب زیادہ بیتاب ہوں وہ دفتر انجمن ترقی اُردو سے، رسالۂ اُردو منگا کر اپنا ذوق پورا کرلیں۔ قیمت فی پرچہ غالباً عار ہے۔
راقم مضمون مرزا فرحت اللہ صاحب کی خدمت میں ہمیں بھی عرصے سے نیاز حاصل ہے اور یہ بھی معلوم تھا کہ انھیں ادبِ اُردو سے دلچسپی ہے لیکن "اُردو" کے اوراق پر پہلی بار اُن کی قلمکاری کے نمونے دکھائی دیے ہیں۔ اس سے قبل ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے متعلق صاحب موصوف کا جو مضمون شایع ہوا وہ بھی بہت خوب تھا، اور اس مضمون نے تو اُنکے حسنِ تحریر کو اور نکھار دیا ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

امید ہے کہ انجمن ترقی اُردو کی طرف سے یہ مضمون جلد کتابی صورت میں شایع ہوکر عام شائقین ادب کے ہاتھوں میں پہونچ جائے گا۔

حکام کے پاس گذریگی فوراً منظور ہو جائیگی۔ اس واسطے یہ تجویز قرار پا چکی ہے کہ بعد آپکے
جو دوسرا قاضی القضاۃ مقرر ہوگا اوس کو یہ اختیار نہین ملے گا۔ صرف آپ کی خاطر سے
یہ اختیار اب تک آپ کو سپرد ہے۔ جب آپ اپنی خوشی سے یہ درخواست دین گے تو فوراً
منظور ہو جائیگی۔ اس درخواست کو آپ پھیر لیجائیے۔ یا کہیے تو مین پھاڑ ڈالون آپ نے ہرگز قبول
نہ کیا اور فرمایا مین ہرگز یہ اختیار اپنے ذمہ نہین رکھون گا۔ بعد اوس کے مسٹر ہارنگٹن ممدوح نے
ہمارے ایک چچا مولوی حکیم الدین خان بہادر مغفور جو آپ کے ساتھ تھے اون کو طلب
کرکے اون سے فرمایا کہ آپ اپنے والد کو سمجھائیے کہ اتنا بڑا اپنا اختیار ہاتھ سے نہ دیوین۔
جب یہ درخواست گورنر کے پاس باجلاس کونسل پیش ہوگی فوراً منظور ہو جائیگی اور اوس کے
بموجب نیا قانون چھپ جائیگا۔ مین نے اب تلک پیش نہین کی۔ آپ اپنے والد سے
پوچھکے اور بہت سمجھاکے میرے پاس سے پھیر لیجائیے۔ ہرچند چچا صاحب نے اور اور خیر طلبون
نے بہت عرض کیا مگر آپ نے قبول نہ کیا اور اپنی دیانت اور امانت منحصر اسی مین سمجھی کہ
وہ اختیار اپنے ذمے باقی نہ رہے۔ اس واسطے کہ قطع نظر اوس امر مکروہ سے جو واقع ہوا تھا
قضات کا مقرر کرنا باوصف نہ ہونے اختیارات شرعی کے اون کے ہاتھ مین اس کو بھی خلاف
دیانت جانتے تھے۔ غرض وہ درخواست آپ کی کونسل مین گورنر جنرل کے پیش ہوئی
اور بموجب آپ کی تجویز کے قانون جاری ہوا کہ قضات کو صاحبان جج اضلاع کے مقرر
کرکے صدر عدالت مین رپوٹ کیا کرین وہان سے قاضی القضات کے پاس اجرائے سند کے
واسطے سپرد ہوا کرے۔ ایک اور حکایت جناب جد امجد کے کمال اخلاق
اور ترحم کی قابل لکھنے کے ہے۔ جب ممالک مغربیہ دلی اور آگرہ
وغیرہ کمپنی کے اختیار مین مرہٹی سے آئے اونیسوین صدی کے شروع
مین تو بموجب آپ کی درخواست کے صدر عدالت دیوانی سے جناب
عم اکرم مغفور مولوی حکیم الدین خان بہادر کا منصب افتا اور صدر امینی

[illegible]

ضلع اور شہر میرٹھ پر تقرر ہوا اور جناب حضرت والد ماجد مغفور کا تقرر افتا اور صدر امینی
ضلع اور بلدۂ اکبراباد مین ہوا اور اتفاقات سے میرٹھ کے جج نے اوس عہدے پر تقرر کا
رپوٹ ایک شخص کا قصبۂ زیدپور کے سادات مین سے کیا تھا جن کا نام مولوی محمد قلی تھا
وہ رپوٹ نامنظور رہوا - اگرچہ مولوی محمد قلی کو کچھ تعارف جناب حضرت جدامجد سے
نہ تھا مگر جب میرٹھ کے جج نے انکو اطلاع نامنظوری رپورٹ سے کی تو اونھون نے اوس عہدہ کے حصول سے
مایوس ہوکر ایک عرضی حضرت جدامجد کی حضور مین اس مضمون کی روانہ کی کہ مین ایک طالب علم سادات
کے زمرے سے آپ کے جوار کا رہنے والا ہون ہزار تگ و دو اور تلاش سے میرے واسطے
صاحب جج نے رپوٹ میرٹھ کے افتا کا کیا تھا سو وہ صاحبزادے والا شان کے تقرر کے
سبب سے نامنظور رہوا اب مجھکو پھر ایسے عہدے کا ملنا محال ہے اور حضور کے صاحبزادے
کو اوس سے بہتر عہدہ ہاتھ آنے کا کچھ عجب نہین ہے اس واسطے مین امیدوار ہون کہ میری
بیا دست پر رحم کہا کے وہ عہدہ مجھے عنایت فرمائیے - اور جہان تک لجاج اور خوشامد ممکن
تھی کوئی دقیقہ اوٹھا نہین رکھی جب وہ عرضی حضرت جد امجد کے پاس پہونچی آپ کو مولوی محمد قلی کے حال پر
بہت رحم آیا بخصوص جب سیادت کا نام سنا اور باوصف اسکے کہ مذہب اونکا امامیہ تھا آپ کو نہایت غیرت
ہوئی وہی وقت جناب عم نامدار مولوی حکیم الدین خان بہادر کو جو وہین آپکے ہمراہ کلکتہ مین تھے اور بغرض عہدہ جو تقرر
ابتدائی کے سامان مین تھے آپ نے طلب فرمایا اور اگرچہ اپنے فرزند دلبند تھے مگر اون سے بھی
بنظر رعایت دلداری اور اخلاق کے یہ تقریر فرمائی کہ ہم تم سے ایک چیز مانگتے ہین مگر شرط یہ ہے
کہ کسی طرح کی کبیدگی تمھارے دل مین نہ آوے خوشی خاطر سے وہ چیز ہم کو دو اونھون نے
عرض کیا جان و مال حضور کا ہے کبیدگی کا کیا ذکر ہے - آپ نے فرمایا تم ابھی جا کے میرٹھ
کے افتا سے استعفا داخل کرو جناب ممدوح نے استعفا دیا اور مولوی محمد قلی کو اطلاع کی گئی
کہ تم پھر صاحب جج سے اپنے واسطے رپوٹ کرواؤ چنانچہ اون کی رپوٹ آئی اور منظور
ہوئی - مدت تک اوس عہدے پر رہے - اور ۱۲۳۱ھ کے بندوبست مین وہین کے صدر الصدور

مقرر ہوئے اور ظاہرا وہین قضا کی اور تا دم مرگ ہم لوگون سے ملاقات مین اپنے تئین ممنون احسان ظاہر کرتے رہے۔ اس جنس کا رحم اور مروت ایک شخص اجنبی سے اور پاسداری سیادت کی۔ اوس کے ساتھ گفتگوے دلداری اور اخلاق کی اپنے بیٹے سے جو جناب حضرت جد امجد نے برتی۔ غالب ہے کہ اوس کی نظیر بہت کم لوگون نے سنی ہوگی۔ الغرض قریب پچیس برس کے آپ نے کام قاضی القضاتی کا انجام فرمایا۔ اوس کے بعد بسبب کبر سنی کے مستعفی ہوے کہ عمر بقیہ خانہ نشینی مین بسر کرین۔ صدر عدالت کے حکام نے گورنر جنرل کو باجلاس کونسل تحریر طول طویل آپ کے محامد اور اوصاف مین لکھی اور درخواست کی کہ کل مشاہرہ آپ کا جو چھ سو پچاس روپیہ تھے پنشن مقرر ہو گورنر جنرل نے جواب مین لکھا چونکہ ہم کو نصف تنخواہ سے زیادہ پنشن مقرر کرنے کا اختیار نہین ہے۔ اس واسطے ہم ولایت مین کورٹ آف ڈائرکٹرز کے پاس رپوٹ کرتے ہین اور وہان سے جواب آنے تک نصف مشاہرہ مقرر کیا گیا تاکہ قاضی صاحب کو تکلیف نہو۔ اس سبب سے کہ اوس عرصہ مین ولایت سے مراسلات کی آمد و رفت مین برس دن سے کم عرصہ نہین ہوتا تھا۔ غرض گورنر جنرل نے زیادہ اوس سے جو حکام صدر نے اون کے پاس لکھا تھا۔ آپ کے محامد اور اوصاف ولایت مین لکھے اور اگرچہ ولایت سے منظوری کل مشاہرہ کے پنشن مقرر کرنے کی آگئی لیکن آپ کو آدھا درماہہ بھی بہت کم لینے کا اتفاق ہوا کہ استعفا دینے سے تیسرے یا چوتھے مہینے آپ نے قضا کی۔ کلکتہ سے وطن کے عزم پر روانہ ہوئے۔ وطن مین ابھی پہونچنے نہین پائے تھے کہ بنارس مین آپ کا انتقال ہوا[1]۔ چونکہ آپ نے لاش کے نقل کرنے سے ممانعت کی وصیت کی تھی اس واسطے وہین بنارس مین مدفون ہوئے اور جب ولایت سے منظوری کل مشاہرہ بحال رہنے کی آگئی تب گورنر جنرل نے ایک خط تعزیت کا جناب جدۂ ماجدہ مغفورہ کے نام پر لکھا خلاصہ مضمون اوس

(حاشیہ: جناب جد امجد کے عہدۂ قاضی القضاتی سے استعفا دینے کے بعد کل درماہہ پنشن مقرر ہوا مگر آپ کو اس کے لینے کی نوبت نہ آئی)

(حاشیہ: گورنر جنرل کے خط تعزیت کا خلاصہ جو جناب جدۂ ماجدہ کو لکھا ... ترجمہ)

[1] ۳ ربیع الثانی ۱۲۱۲ھ۔

خط کا یہ ہے ۔ زبدۃ الاماثل والاقران اہل خانہ قاضی القضاۃ مولوی نجم الدین علی خان بہادر
مرحوم سلمہا اللہ تعالے ۔ بعد از سلام سلامتی انجام مکشوف باد ۔ سانحہ انتقال آپ کے
شوہر کا سرکار دولت مدار کمپنی انگریز کو کم آپ سے معلوم نہین ہوا کہ اوس نے ایسے اپنے
متوسل لایق اور فاضل بے بدل کو گم کیا ۔ چونکہ کارخانہ قضا و قدر مین بجز صبر اور تسلیم
کے کچھ چارہ نہین ہے یقین ہے کہ آپ راہ شکیبائی اختیار کرینگی ۔ اور اگرچہ آپ کے
چار و بیٹے سرکار کے معزز عہدون پر نوکر ہین کچھ آپ کو اپنی بسر بر داوقات مین احتمال
تکلیف کا نہین ہے ۔ مگر سرکار نے صرف براہ قدردانی اور ناموری آپ کے شوہر کے
ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار آپ کے تا حین حیات مقرر کیا زیادہ حد برطراز د ۔ چنانچہ جناب ممدوحہ
مغفورہ قریب بیس برس کے زندہ رہین اور نہایت جود اور فیض سے پرورش اور پرداخت
اعقاب کی اور بھائی بندون کی کرتی رہین اور اس امر مین جوار اور دیار مین بہت ناموری
حاصل کی ۔ بالجملہ پاس اور لحاظ اور تعظیم اور تکریم جناب جد امجد مغفور کی سارے حکام کو
اور گورنر جنرل کو ایسی منظور رہتی تھی کہ اب اس زمانے مین اگر بعضے وقایع اوس عہد کے
نقل کیے جاوین تو نہایت اچنبا معلوم ہو ۔ مثلاً جب آپ پہلے تقرر کے وقت کلکتہ مین
تشریف لیگئے تھے تو گورنر جنرل غالباً سر جان شور تھے یا اون سے پہلے کوئی دوسرا تھا استقبال کر کے
پالکی پر سے خود اوتارنے گئے معانقہ کیا اور ہمیشہ عیدین مین معانقہ کرتے تھے ۔ اور بہت
جزئیات ایسے ہین کہ اون کا ذکر اب فضول معلوم ہوتا ہے ۔ حضرت کو شعر اور شاعری کا
بہت مذاق تھا معمیات اور الغاز اور تاریخ ایسی عمدہ تالیف کرتے تھے کہ دیکھنے سے
تعلق ہے ۔ تبرکاً کچھ کلام عربی اور فارسی آپ کا یہان نقل کیا جاتا ہے چنانچہ شروع ایک
مناجات سے ہم کرتے ہین حضرت پیران پیر دستگیر محبوب سبحانی محی الدین گیلانی رحمۃ اللہ کی طرف ایک
مناجات جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے منسوب ہے اوسکا آپنے مخمس کیا ہے وہ یہ ہے جس مین مخمس کے دستور
کے موافق اول تین مصرعہ آپ کے ہین اور دو مصرع اخیر کے حضرت پیر دستگیر کے ہین ۔ مناجات

کلام منظوم حضرت جد امجد کا

ذهب النفس بی عن السدد اعجزتنی ولیس ملتحد
میرے نفس نے مجکو سیدھی راہ سے ڈگا دیا مجکو عاجز کر دیا اور کوئی پناہ کی جگہ نہین ہے

سوءها ساقنی الی الاود یا حبیب الالہ خذ بیدی
اوسکی شرارت نے مجکو ٹیڑھی راہ دکھائی اے دوست خدا کے میرا ہاتھ پکڑ

ما لعجزی سواک مستند
میری عاجزی کے لیے سوائے تیرے کوئی تکیہ نہین ہے

یا رسولی مقامک ارفع انا داع ببابک فاسمع
اے میرے رسول تیرا مقام بہت بلند ہے مین طالب ہون تیرے دروازہ پر پس سن لو

قیلک فی شفاعتی انجع کن رحیما لذلتی واشفع
تیری دعا میری شفاعت کے واسطے موثر ہے رحم کر میری خواری پر اور شفاعت کر

یا شفیع الوری الی الصمد
اے شفاعت کرنے والے خلق کے خدا کے پاس

یوم للمرء شانه یغنی یوم من حیلتی یفر اخی
جس روز ہر شخص اپنے حال مین مبتلا ہوگا جس روز میرا بھائی میری صورت سے بھاگیگا

یوم عنی البنون لا تجزی اعتصامی سوا جنابک لی
جس روز میری اولاد میرے کام نہ آئیگی اعتماد میرا سوا تیری جناب کے اپنے واسطے

لیس یا سیدی من الاحد
نہین ہے میرے سردار کسی پر

انا فی الابتلاء بالداءین انتجی یا شفاء من هاتین
مین دو بیماریون مین گرفتار ہون کہ درمناجات درخواست کنم اے شافی ازین دونون سے

علة الفقر والذنوب فاین غیر غروالک لیس فی الدارین
بیماری احتیاج کی اور گناہون کی پس نہین سوا تیری پشتی کے دونون جہان مین

بعلیل ذلیل معتمد
واسطے بیمار حقیر کے کوئی محل اعتماد کا

من یکن یا هادی الکونین فارتجائی لان بقلب لین
جو شخص ہو وے اے ہادی دو جہانون کے پس امید گاہ میرا ہو آئینہ دل متواضع کے ساتھ

صلوات علیک فازدین صلواتی علیک فی الملوین
درود تیرے اوپر جو اون دونون مقصد کو پہونچے میرا درود ہے تیرے اوپر دونون جہان مین

کان متجاوزا عن العدد
کہ شمار سے باہر ہے

وعلی سیدة النساء قدرا بنت طه کفی به فخرا
اور اوپر عورتون کی سیدہ کے مرتبہ مین بیٹی رسول اللہ کی یہ کافی ہے اون کے فخر کو

ثم سبطیه طهرا طهرا وعلی اهل بیته طرا
پھر اون کے دو بیٹے حسن اور حسین پر اور اون کے سارے اہل بیت پر

وعلی آله الی الابد
اور اون کی اولاد پر علی الدوام

وعلی[عـه] خیر صحبه الاورع وعلی ذی الحیاء والاشجع

[عـه] اس بند کا ترجمہ اصل مین نہین ہے ۔۱۲

وعلى الاعدل الذى ابرع　　وعلى الصحب كلهم اجمع

هم نجوم الهدى الى الرشد

هم سماء الهدى لقد زانوا　　بذلوا جهدهم وما آنوا
اونهون نے رہنمائی کے آسمان کو زینت دی　　کوششین کین اور تھکے نہین
امما عن ضلالة صانوا　　وعلى التابعين هم كانوا
امتون کو گمراہی سے بچایا　　اوراون کے تابعین پر جو تھے

لخيام السداد كالوتد
راستی کے خیمون کی میخین

یا کرام العلى انا فقر　　منكموا استعين كى اظفر
اے بزرگوار لوگ مین بڑا محتاج ہون　　تم سب سے مدد مانگتا ہون تاکہ اپنے مطلب کو پہونچون
سائل فى جنابه الاطهر　　استغيثوا العاجز مضطر
اوس کے حضور پاک مین بھیک مانگتا ہون　　فریاد رسی کرو عاجز مضطر کی

شمروا ذيلكم الى المدد
آستین چڑھاؤ مدد کے لیے

اوسکے بعد ایک اور عربی غزل عاشقانہ ہم لکھتے ہین جو نہایت فصیح اور بلیغ ارشاد کی ہے

صاد بالخال خلتى خلدى　　ركت فى كيدها فياكمدى
شکار کیا معشوق نے اپنے خال سے میرے دل کو　　دکھ دیا مجکو اوس کے مکر نے پس افسوس ہے
احرقتنى بنار وجنتها　　كلمتنى بهدبها الاود
جلایا مجکو اپنے رخسارے کی آگ سے　　بات کی مجھ سے اپنی ٹیڑھی پلکون سے
جاوز الصبر غاية ياليت　　جورها ينتهى الى الامد
صبر منتہا کو پہونچ گیا پس اے کاش　　ظلم اوس کا آخر ہو جاے ایک حد تک
نقضت عهد يوم اذ وضعت　　كفها بالوشام فوق يدى
توڑا اوس عہد کسی دن کا جب باندھا　　اوسکے ہاتھ رنگین نے میرے ہاتھ پر
واعدتنى زوارتى زورا　　ليلة ما رقدت فى الرصد
وعدہ کیا مجھ سے میری ملاقات کا جھوٹا　　ایک رات مین سویا نہین انتظار مین
فاذا اخلفته ثم شكوت　　انشدت فى الجواب بالغرد
پھر جب اوس نے وعدہ خلافی کی تب مین نے گلہ کیا　　جواب دیا اوس نے ایک مزے کی آواز سے
قول سلمى ومن يضاهيها　　فى المواعيد غير معتمد
معشوقون کا قول　　وعدہ مین اعتبار کے قابل نہین

شیخ احمد عرب یمنی شروانی نے ایک کتاب عربی لکھی ہے جو تذکرہ علما اور شعرا کا ہے اوسکا نام حدیقۃ الافراح رکھا ہے اوسمین ایک غزل عربی جناب جد امجد مغفور کی اونھون نے نقل کی ہے وہ غزل آپ کی بیاض شکر یا کشن مین مندرج نہین ہے اگرچہ اوسمین بہت سا کلام آپ کا عربی اور فارسی منقول ہے ہم اوسکو بعینہ معہ شیخ احمد کی تحریر کے یہان نقل کرتے ہین جو حدیقۃ الافراح مین اونھون نے لکھا ہے ۔ وهو هذا

قاضی القضاۃ الامجد محمد نجم الدین خان نجم الھدایۃ الثاقب
مظھر المکارم والمناقب غطمطم العلوم العقلیۃ والنقلیۃ وسفینۃ النجات
من اھتدی بانجم فضایلہ الجلیۃ تثارہ شذور العسجد ونظامہ من
وقف علیہ لم یلج بغیر الصلوۃ والسلام علی محمد فمن لطایفہ قولہ

لسلمی جمال کشمس الضحی   لھا جبھۃ قبل ھلال بدی
لھا قامۃ مثل سرو تمیل   یداھا کاغصانہ بالصبا
وکانت لھا حلۃ مع صفا   عن القلب ما زال تجلو الصدا
لقد فارقتنی بلا باعث   وداع الی نقض ذاک الھوی
وما لاحظت خدمتی کالعبید   ولم توف اصلا عھود الحمی
ولی دونھا ھیئۃ الاضطراب   کحوت عن الماء جاز الثری
جری من عیونی سیول الدما   الی اللہ اشکو جری ما جری
فیا ثاقب اصبر ولا تجزعن   لان النسا قبل فیھا الوفی

اور کلام فارسی آپ کا بہت کثرت سے ہے دو غزلیں اس میں سے ہم یہاں نقل کرتے ہیں

نمونہ کلام فارسی حضرت جد امجد

بر پشت فرس بر شدہ در خانۂ زین باش   با سیر و تماشاے جہان نازنشین باش
جہدے بکن این جا کہ پس از مرگ بر افلاک   روح تو رسد گو کہ جسد زیر زمین باش
بر مائدۂ اہل دول دست میندا ز   از مکسب خود قانع یک نان جوین باش
کو ملحد بیباک کجا زاہد یا برس   بگزین رہ عشاق نہ آن باش نہ این باش
با دل کہ زمن دوری صد مرحلہ می جست   گفتم کہ زمن دور ز دلدار قرین باش
از جان کنی خویش بکن کار عزیزان   در شہرت نام دگران ہمچو نگین باش

ثاقب بفغان ست ز مصراع نظیری
بر غمزدۂ خندہ زدم گفت حزین باش

تخلص

آنکہ زو داز برمن ہمچو نفس آمد و رفت — شعلۂ بود کہ گرم از پئے خس آمد و رفت

خو کن اے دل با سیری کہ ز وحشت برہی — ہمچو آن مرغ کہ دار د بہ قفس آمد و رفت

لذت از نعمت الوان کریمانہ نیافت — گندہ خوارے کہ برین خوان چو مگس آمد و رفت

چیزہاے من آزادہ محقر پنداشت — دزد در خانۂ من ہمچو عسس آمد و رفت

قصد شہرت ہمیش باشد و نے استغنا — شیخ را نیست اگر بر در کس آمد و رفت

بہرہ از صحبت ثاقب نہ بر د غیر ذکی — اغبیا راست بہ پیشش ز ہوس آمد و رفت

اس قدر تبرکا کلام حضرت جد امجد کا راقم نے ذکر کیا اشعار عربی و فارسی اور معمے اور لغز اور تاریخین عجیب صنایع کی تعمیے اور تخرجے کے ساتھ بیاض رشک ریاض مین مذکور ہین جسکو خواہش ہو اوس مین دیکھے

کوائف و سوانح جناب والد ماجد مغفور مولف

اب کچھ کوائف اور سوانح مختصر جناب والد ماجد مغفور کے مین لکھتا ہون اگر مفصل لکھون تو ایک دفتر چاہیے۔ پس باوصف اس کے کہ بسبب اشغال دنیوی اور عوارض جسمانی کے نوبت تدریس کی اور مطالعۂ کتب کی جیسی علما کو چاہیے نہین آئی۔ شروع سن شباب مین پہلے عارضہ ذات الجنب کا لاحق ہوا بعد اوس کے لقوہ ہو گیا یا پہلے لقوہ ہوا پیچھے ذات الجنب ہوا اوس کے نتایج اور صدمات سے دماغ مین بہت ضعف آ گیا بعد اوس کے سن کہولت اور پیری مین عارضہ دوار کا شروع ہوا اوس کا دورہ دو تین برس تک ہوا کیا اور ظاہرا اوسی کے سبب سے دوی اور طنین کا دایم اور قایم تا دم مرگ رہا پھر سرکاری کامون سے ضیق فرصت اس کے ساتھ بھی ہم لوگون کو اور بعض طلبہ کو کبھی کبھی نوبت پڑھانے کی آئی ذہن و ذکا اور قوت استعداد کامل اور سرعت انتقال ذہن اور خوش بیانی اور حسن تقریر تو آپ کے اوپر ختم تھی کتب مطولات اور جو کتب درس مین نہین ہین اون کے مضامین دقیقہ پر مطالعے کے وقت ایسی جلد عبور ہوتا تھا جیسے کوئی اردو لکھا ہوا خط پڑھ لیوے ان سب امور مین آپ عجب علماے نامی کے تھے اگر آپ کو نوبت تدریس کی قرار واقعی آتی تو اپنے عصر مین

آپ کا کوئی نظیر نہ ہوتا۔ راقم نے ابتدا مین کچھ کتابین آپ سے پڑھین اور اخیر مین شرح چغمینی ہیئت کی بھی آپ ہی سے پڑھی اوس وقت آپ ارشاد فرماتے تھے کہ بعد اوس زمانے کے کہ جب آپ نے حضرت جد امجد مغفور سے وہ کتاب پڑھی تھی جس کو چالیس برس کا عرصہ گذرا تھا اوس وقت سے پھر کتاب کو دیکھا بھی نہ تھا۔ اوس کتاب مین ایک مسئلہ مشکل مذکور تھا کہ ۶۶ کے عرض البلد مین طلوع اور غروب بروج کا معکوس ہوتا ہے یعنی پہلے جوزا طلوع کرتا ہے پھر ثور پھر حمل چونکہ میرا ذہن تصور گردش افلاک مین مناسب نہین ہے صرف آپ کی تقریر سے تصویر اوس کی ذہن مین نہ آئی۔ اتفاقاً اوسی وقت جناب چھوٹے چچا صاحب مولوی خلیل الدین خان صاحب بہادر مغفور بھی تشریف لائے جناب ممدوح کو علم ہیئت مین بہت بڑی مداخلت تھی اون کی تقریر سے بھی تصویر اوس کی ذہن مین نہ چڑھی۔ تب کرہ سماوی جو چھوٹے چچا صاحب کے یہان تھا اونھون نے اپنے مکان پر جا کے اوسے بھیج دیا سارے مصطلحات اور علامات اوس مین انگریزی مین لکھے تھے۔ جناب والد ماجد اگرچہ انگریزی بالکل نہین جانتے تھے صرف ہندسے پہچانتے تھے محض قرینے سے اوس کو ۶۶ کے عرض البلد پر قائم کیا اور گردش اوس کو جو دی تو اولٹا طلوع اور غروب آنکھ سے نظر آگیا اوس وقت دلیل ہندسی جو اوس دعوے پر تھی وہ فوراً سمجھ لی۔ ایک نیا امر جناب والد ماجد مغفور مین تھا کہ اور علما مین بہت کمتر دیکھنے مین آیا ہے یعنی ارباب علم جو حکیمانہ طبیعت ہوتے ہین تقوے سے عاری ہوتے ہین آپ نہایت حکیمانہ طبیعت تھے اور تقوے مین بھی کامل تھے اور ایک یہ امر دیکھا ہے کہ اکثر علما کو بسبب عدم توجہ کے امور دنیا کی طرف فہم معاملات مین جیسا چاہیے ذہن رسائی نہین کرتا آپ ہر قسم کے معاملات کے فہم مین ایسے دقایق امور کو پہونچتے تھے کہ کمتر کوئی شخص اون دقایق کو پہونچے گا اور جمیع امور دنیاوی مین عقل رسا رکھتے تھے۔ ایک مختصر قصہ اس فہم معاملات مین آپ کی عقل کی رسائی کا یہ ہے جس عرصے مین آپ قاضی عدالت دائرہ وسائرہ بریلی سے

متعلق اضلاع کے تھے ایک مقدمہ انتساب عزم قتل مین ایک عورت کے اوپر پیش ہوا
کہ اوس کا لڑکا ولد الزنا پیدا ہوا تھا اوس نے اوس لڑکے کو موافق صاحب مجسٹریٹ کے
دعوے کے ایک اندھے کنوین مین جو بہت گہرا تھا پھینک دیا مگر وہ لڑکا زندہ رہا جب
وہ مقدمہ پیش ہوا آپ نے فتوے مین لکھا عزم قتل بہت سخت جرم ہے وہ اوس عورت
پر ثابت نہین ہوتا ہماری راے مین جرم اوس کا لڑکے کا بٹھلانا مقام مخوف پر البتہ
ہوسکتا ہے اور گمان یہ ہوتا ہے کہ اوس لڑکے کو کسی طرح سے اوس مقام پر اوتار دیا ہے
دو قرینے سے ایک یہ کہ ایک دن کا لڑکا اتنی دور دراز راہ سے پھینک دیا جاے۔ اور
زندہ رہے حسب عادت بعید معلوم ہوتا ہے دوسرا قرینہ یہ ہے کہ شفقت مادری بھی
مقتضی نہین معلوم ہوتی کہ اوس کو اتنی دور سے پھینک دے عدالت کے حاکم نے اوس کا
بہت تجسس کیا تب ثابت ہوا کہ ایک ٹوکری مین رکھ کے اوس نے وہان اوتار دیا تھا
الغرض آپ سنہ ۱۸ مین ضلع آگرہ کے مفتی اور صدر امین مقرر ہوئے قریب بیس برس کے
اوس عہدے پر مامور رہے اس مدت مین ایک دفعہ یا شاید دو دفعہ مفتی دایرا ورسایر
اضلاع متعلقہ بریلی کے بطور قائم مقام کے بھی مقرر ہوگئے تھے اور چونکہ مشاہرہ افتا کا
صرف سو روپیہ تھا اور صدر امینی کے مقدمات جس مین رسوم ملتے تھے وہ آگرے مین
اوس عرصہ مین بہت کم دایر ہوتے تھے آپ کی بسر بہت عسرت سے ہوتی تھی اس واسطے
ایک صاحب جو آگرہ مین تھے اور وہان سے بدل کے کلکٹر ضلع اٹاوہ کے مقرر ہوے
جس محکمہ کا مقرر کرنا ان کے اختیار مین تھا اونھون نے آپ سے وعدہ کیا کہ کلکٹری کی دیوانی
جو اوس عرصے مین بہت نامور عہدہ تھا اور اڑھائی سو روپیہ اوس کا درماہہ تھا
آپ کے نام پر مقرر کرین گے اس واسطے آپ نے عہدہ افتا سے ایک برس کی رخصت
لی اور ساتھ گئے لیکن وہان جانے سے معلوم ہوا کہ ریونیو بورڈ کا حکم تھا کہ کوئی شخص
دیوان نہ مقرر کیا جاے جب تلک وہ تحصیلداری کا کام پہندرے انجام نہ کرلیوے اس

واسطے کلکٹر ممدوح نے آپ کو ٹھٹھیا کے پرگنہ کا تحصیلدار مقرر کیا اور قریب چھ مہینے کے وہ کام انجام کیا اس عرصے مین جناب جد امجد مغفور نے آپ کو نہایت اپنی نارضامندی اس امر سے لکھی کہ آپ نے عہدہ شریعت کا جو زیور ہمارے خاندان کا ہے اوس کو چھوڑکے مال کے کام کی تلاش مین پڑے اس نظر سے آپ نے تحصیلداری کے عہدے سے استعفا کیا اور پھر بدستور اپنے قدیم افتا کے عہدے پر معاودت کی سنہ ۱۸۲۴ء مین ہمارے بڑے چچا صاحب ممتاز العلما قاضی سدید الدین خان بہادر مغفور جج قاضی عدالت دایرو سایر اور پراونشل کورٹ اضلاع متعلقہ بریلی کے تھے اون کی ترقی ہوئی وہ ایجنٹ یعنی نائب مختار نواب خوردسال فرخ آباد کے مقرر ہوے تب حاکمون نے آپ کو قاضی اوس عدالت کا مقرر کیا اور ہمارے بڑے بھائی مغفور مولوی رضی الدین خان بہادر آپ کے قدیم عہدے پر مفتی عدالت ضلع آگرہ کے مقرر ہوے جب دایر سایر کی عدالت شکست ہوئی تب آپ گورنر جنرل کے حکم سے صدر امین اول کانپور کے ضلع کے مقرر ہوے اور مشاہرہ عہدہ قضا کا بدستور بحال رہا کئی برس اس عہدے کو آپ نے انجام دیا جب سنہ ۱۸۳۱ء مین نیا بندوبست عدالتون کا ہوا تب حکام نے عہدہ صدر الصدوری کا وہان آپ کے واسطے تجویز کیا مگر چونکہ کانپور مین ہمارے منجھلے چچا صاحب مغفور مولوی حکیم الدین خان بہادر پیشتر سے مفتی عدالت اور صدر امین تھے آپ نے حکام سے عرض کیا کہ اس ضلعے مین استحقاق ترقی کا میرے بڑے بھائی کو ہے اور میرا استحقاق منحصر اسی ضلعے پر نہین ہے مین امیدوار ہون کہ میرے بڑے بھائی یہان صدر الصدور مقرر ہون اور میری پرورش کسی اور ضلعے مین ہو۔ یہ درخواست آپ کی حکام کو جو جج اور کمشنر یہان کے تھے اون کو بہت ناگوار ہوئی اور چونکہ آپ نے صدر الصدوری قبول نہ کی تب اون دونون نے باتفاق صدر الصدوری کا رپوٹ تو جناب چچا صاحب کے واسطے کیا مگر گورنر جنرل سے یہ درخواست کی کہ یہان ان دونون بھائیون مین نہایت اتحاد ہے اس واسطے ہم چاہتے ہین کہ جنھون نے عہدہ یہان کی صدر الصدوری کا

قبول نہ کیا وہ کسی اور ضلع مین مقرر کیے جاوین۔ ایک ضلع مین دونون بھائیون کا رہنا مصلحت نہین ہے۔ غرض اس خلفشار مین ایک برس تک نیا بندوبست کان پور مین ملتوی رہا۔ ایک برس کے بعد گورنر جنرل کے حکم سے جناب چچا صاحب کان پور کے صدر الصدور مقرر ہوے اور جناب والد ماجد مغفور ابھی بندوبست کے وہین صدر امین مقرر ہوے۔ دو تین برس کے بعد راقم کی تدبیر رسا سے جو اوس عرصے مین ممالک مغربیہ کی گورنمنٹ مین دفاتر جوڈیشل اور ریونیو مین منشی تھا آپ اٹاوہ کے صدر الصدور مقرر ہوے شرح اوس کی جو ایک معرکۂ عظیم ہے آیندہ اپنے سوانح کے بیان مین لکھون گا۔ دو تین برس کے بعد اٹاوہ کا ضلع شکست ہو گیا اور جناب والد ماجد مغفور اکبر آباد کے صدر الصدور مقرر ہوئے۔ کئی برس کے بعد آپ کو عارضہ وجع الصدر کا شروع ہوا قریب ایک برس کے اس عارضہ مین مبتلا رہے کہ معالجے سے باوصف عارضہ کے مہلک ہونے کے چونکہ ایام حیات باقی تھے اتنے زمانۂ دراز تک زندہ رہے۔ اخیر مین ایسا معلوم ہوا کہ اوس عارضہ سے صحت ہو گئی مگر دفعتاً اور فجاءۃً ذالحجہ[1] شنبہ کو روح مبارک جسم کی قید سے علیین کی طرف پرواز کر گئی۔ آپ کے اولاد ذکور مین ہم پانچ بھائی تو اپنی عمر دن سے متمتع ہوئے اور ایک بھائی سب سے بڑے شریف الدین نام نہایت حسین اور خوش رو پیدا ہوئے تھے کہ سارا خاندان اون پر عاشق زار تھا مگر تین چار برس سے زیادہ عمر اونھون نے نہ پائی۔ اون سے چھوٹے مولوی رضی الدین خان بہادر مغفور جن کی ولادت سنہ ۱۲۶۱ھ مین ہوئی تھی۔ بعد تحصیل مختصرات کتب عربیہ کے متوسطات تک نوبت پہونچی تھی کہ جناب ممدوح کا تقرر افتا اور عہدۂ صدر امینی ضلع آگرہ مین ہوا۔ فقہ وغیرہ مین البتہ استعداد حاصل ہوئی چھ سات برس تک اوس عہدے کا انجام دیا جب سنہ ۱۸۳۱ء کا بندوبست ہوا حکام نے اون کی ترقی نہ کی لیکن درماہہ سابق کا بدستور باقی رکھا اور افتا کے ساتھ شہر آگرے کی منصفی

حالات مولوی رضی الدین خان بہادر مغفور کے [illegible]

[1] سلہ تاریخ درست مصنف سے رہ گیا۔ ۱۲

ختم کردی قریب سات آٹھ برس کے اوس عہدے پر رہے بعد اوس کے شاہجہان آباد مین صدر امین مقرر ہوئے یہان جناب ممدوح نے جناب مولوی اسحاق صاحب حضرت شاہ عبد العزیز صاحب مغفورین کی صحبت مین تکمیل عربیت کی کی۔ کوئی تفسیر کلام مجید کی اول سے آخر تک پڑھی اور علم ظاہر کلام الٰہی مین بہت اچھی استعداد پیدا کی۔ اور چونکہ جناب ممدوح نے بہت پیشتر سلسلۂ نقشبندیہ مین بیعت حضرت حاجی الحرمین حاجی امین الدین مغفور سے کی تھی جو جناب حضرت جد امجد کے منجھلے بھائی تھے دلّی کی اقامت مین کچھ اوس فن کی بھی وہان کے بزرگون کی صحبت مین تکمیل کی فکر کی اور بہت اچھا مذاق پیدا کیا تھا مگر عمر نے اتمام تکمیل کی فرصت نہ دی وہان سے جناب ممدوح الہ آباد کے صدر الصدور مقرر ہوئے اوس کا ایک مختصر معرکہ ہے جس کو مین اپنے سوانح کے بیان مین لکھون گا۔ وہان سے کئی برس کے بعد اون کی تبدیلی ضلع علی گڈھ کی صدر الصدوری پر ہوئی۔ کئی برس یہان اقامت کی تھی کہ وہان کے ایک صاحب جج سے نہایت مخالفت ہوگئی اوس نے تو حسد اور بغض سے کوئی بری فکر اوٹھا نہین رکھی۔ مگر حکام صدر عدالت پر صاحب جج کے حسد اور بغض کا یقین ہوگیا اس سبب سے اوس کے شر سے محفوظ رہے تاہم حکام نے قومی رعایت نہ چھوڑی بمقتضا عدالت اور انصاف کا یہ تھا کہ جج کی وہان سے بدلی کرتے یہ تو کاہے کو کرتے جناب ممدوح کی بدلی بریلی کے ضلع مین کردی اسی عہدے پر وہ تھے کہ ۱۸۵۷ء کا غدر واقع ہوا جناب ممدوح بڑی دشواری سے وطن مین چلے آئے اسباب وغیرہ سب لٹ گیا یہان دو تین مہینے بھی آسایش نہین پائی کہ تپ محرقہ کے عارضہ سے جنت کی طرف سدھارے جناب ممدوح کی دو شادیان وطن مین ہوئی تھین۔ پہلی شادی سے صرف ایک فرزند مولوی احسن الدین احمد خان سلمہ اللہ تعالے ہے نوشت خواند فارسی مین بہت ہوشیار ہے عربیت مین البتہ قاصر ہے مگر نہایت سعید ہے قریب دس بارہ برس کے نواب ملکہ گیتی امجد علی شاہ کے ایک محل کی رفاقت مین بسر کی اون کی توجہ اور شفقت ایسی تھی جیسی اون کو اپنے بیٹے پر تھی یہان تک

اون کے بیٹے مرزا دارا سطوت کو اون پر حسد تھا اور بعض مخالفت مذہبی کا بعد اپنی
مان کے انتقال کے اون سے نکالا یعنی اون کو خلاف اپنی مان کی وصیت کے اپنی
رفاقت سے جدا کردیا اور اوس کا نتیجہ خود اون کے اپنے واسطے ایسا بد ہوا ہے کہ قریب
ہے کہ دیوالیے ہو جائین۔ الغرض احسن الدین نہایت سعید لڑکا اپنے ہم عمرون مین ہے
جو کچھ ملکہ دکیتی کی شفقت سے کمایا صلہ رحم مین اتنی افراط کی کہ اپنے تئین تباہ کردیا ہزارون
کے قرضدار ہو گئے دو تین برس تلاش مین ادھر اودھر پھرے تقدیر نے کچھ اثر نیک نہ
دکھایا۔ اب قریب ڈیڑھ برس کے ہوا ہے حیدرآباد دکن کا سفر کیا وہان ایک دوست
شفیق کی اعانت سے وہ اور چھوٹا بندہ زادہ مولوی اکرم الدین احمد خان سلمہ اللہ تعالے
کہ وہ بھی اون کے ساتھ گیا تھا دونون معزز عہدون پر نوکر ہو گئے ہین اگرچہ ہنوز زیر بار
ہین کہ اب اونھین دونون کے اوپر مدار مصارف ہمارے سارے خاندان کا ہے لیکن
بہ آسایش بسر کرتے ہین اور امیدوار ترقی کے ہین۔ احسن الدین کی دو شادیان ہوئین پہلی
بی بی اون کی لاولد مر گئی پھر اوسی کی بہن سے دوسری شادی ہوئی اوس سے فضل الٰہی
سے کثیر الاولاد ہین مگر اوس نے بھی انتقال کیا اون کے اولاد ذکور مین دو بیٹے ہین۔
محسن الدین اور انور الدین دوسرا کلام اللہ حفظ کرتا ہے۔ اللہ تعالی دونون کو توفیق علم و عمل
کی عطا کرے۔ بڑا صدمہ بالفعل یہ ہوا کہ اون کی بڑی بیٹی کے ساتھ بڑے بندہ زادے مولوی
فرید الدین خان سلمہ اللہ تعالے کی شادی ہوئی تھی قریب آٹھ نو مہینے کے بخار مین مبتلا رہی
ہرچند بڑی کوشش معالجہ مین کی کچھ نفع نہ ہوا بخار سنجر دق کی طرف ہوا اور وہ لاولد قضا
کر گئی۔ بندہ زادے کے رنج اور صدمہ سے کہ اوس سے وہ نہایت متاثر ہوا ہے اور نیز
احسن الدین کے غم و الم سے راقم پر اس حالت پیری اور خانہ نشینی مین سخت صدمہ ہے خدا
ہر ایک کو صبر جزیل عطا کرے۔ بعد احسن الدین کی مان کے انتقال کے جناب بھائی صاحب
مغفور نے دوسری شادی کی اوس سے کثیر الاولاد ہین مگر ذکور مین صرف ایک بیٹا ہے

سعد الدین اگرچہ نہایت تیز اور ذہین تھا مگر بہت حسرت اور افسوس ہے کہ اب تک اوس نے اپنے ذہن اور ذکا کو علم کی تحصیل کی طرف صرف نہین کیا۔ ایزد تعالے اب بھی اوس کو راہ راست پر لاوے اور توفیق خیر عطا کرے تو کیا تعجب ہے۔ جناب بھائی صاحب مغفور سے چھوٹا راقم روسیاہ ہے جو اپنے سوانح مفصل آیندہ لکھے گا۔ مجھ سے چھوٹے حافظ مولوی

حافظ ریاض الدین خان صاحب چھوٹے بھائی کا ذکر

ریاض الدین خان ہین سلمہ اللہ تعالے خدا نے اون کو علم اور عقل اور استعداد کامل خاندانی عطا فرمائی بعد کلام اللہ کے حفظ کرنے کے کتب درسیہ اونھون نے بہت استعداد سے تحصیل کیے متوسطات سے آگے اگرچہ نوبت تحصیل کی نہین پہونچی لیکن مطالعہ مین اونھون نے نہایت محنت اور مشقت کی اور کچھ کچھ تدریس بھی کرتے رہے اب جمیع علوم درسیہ مین فضل الٰہی سے اون کو استعداد کامل ہو گئی اور کثرت مطالعہ سے ہر علم کی کتابون کے معلومات بھی اون کے بہت ترقی کر گئے۔ فضل الٰہی سے اب اپنے عہد مین نامور علماؤن مین ہین۔ ابتدا مین جب جناب بھائی صاحب مغفور شاہجہان آباد کے صدر امین مقرر ہوئے تب اکبرآباد کے جج نے عہدۂ افتا کی اون کے واسطے رپوٹ کی اوس عہد کے قانون کے بموجب لارڈ آکلینڈ گورنر جنرل نے جو اوس زمانہ مین ممالک مغربیہ کی پریسیڈنسی یعنی ایالت کا بھی کام کرتے تھے کلکتہ کے امتحان کی کمیٹی مین جو ارباب شرع کے امتحان کے واسطے مقرر تھی سپرد کیا۔ وہان سے بارہ سوال فقہی بہت سخت کہ کتب متداولہ مین اکثر یا کل سوالات کا جواب مندرج نہ تھا بھیجے۔ اور اگرچہ اوس وقت کے قاعدے کے بموجب اون جوابات کے لکھنے کے واسطے کتاب کے دیکھنے کی ممانعت نہ تھی مگر اگرے مین صاحب جج نے اپنے سامنے بٹھلا کے حکم کیا کہ بغیر کتاب دیکھنے کے جواب لکھو سب جواب ٹھیک ٹھیک اونھون نے لکھے مگر ایک یا دو جواب مین اون جزئیات مسائل کے کچھ لغزش تھی چنانچہ اوس عرصے مین راقم کوہستان شملے پر گورنر جنرل کے ہمراہ تھا۔ برادر موصوف نے مجھکو اپنے خط مین لکھا۔ چونکہ ایک دو سوال کے جواب مین مجھ سے غلطی

ہوئی ہے اس سبب سے گمان اپنے تقرر کی منظوری کا مجھکو نہین ہے۔ لیکن چونکہ اوس
امتحان کی کمیٹی مین چند علما فقیہ تھے اونھون نے وہ غلط جواب بھی قیاس صحیح سے
لکھے ہوے پائے۔ اور چونکہ انگریزی امتحان مین ایک نئی اصطلاح مقرر ہے کہ ہر سوال
کے جواب کے واسطے ایک عدد مقرر کرتے ہین۔ اعلیٰ دراوسط اور ادنےٰ اور خالی او اعداد
کو جمع کرکے جب ایک معین عدد کو جو ہر امتحان کے واسطے پانسو سے پندرہ سو تک مقرر ہین
پہونچ گئے اوس کا امتحان کامل ہوا۔ ایک دو جگہ کی لغزش اور غلطی کی طرف اعتنا نہین
ہوتی اس نظر سے چونکہ اکثر سوالات کا جواب ٹھیک تھا یقین ہے فقہ کے امتحان کے
واسطے جو عدد معین تھا جوابات کے اعداد اوس سے بڑھ گئے ہونگے۔ الغرض امتحان کی
کمیٹی سے سند تکمیل امتحان کی عطا ہوئی اور اوس کے موجب اون کا تقرر عہدہ افتائے ظلع
ہوا۔ کئی برس کے بعد عہدہ منصفی شہر آگرہ کا اون کو سپرد ہوا اور اوس مین اختیار ڈپٹی مجسٹریٹ
کا بھی عطا ہوا اگرچہ پیشتر سے بھی افتا کے ذریعہ سے فوجداری کا کام کرتے تھے۔ قریب
بیس برس کے اونھون نے بہت نیکنامی سے اور حکام کی رضامندی کے ساتھ عدالت
دیوانی اور فوجداری دونون کا کام انجام کرتے رہے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر مین جب اکبرآباد
مین غدر شروع ہوا تو وہ اپنی جان بچا کے بایک بیبی اور دو گوش وہان سے بھاگے وطن مین
چلے آئے اون کی غیبت مین پہلے سب اسباب منقولہ اون کا اور بہت مالیت کا مال کتب خانہ
جناب والد ماجد مغفور کا جو برادر ممدوح کی حفاظت مین تھا اور ایک مکان پختہ جناب والد
ماجد مغفور کے املاک سے اور ایک مکان انگریزی کوٹھی راقم کی بنوائی ہوئی اور ایک
مکان جناب بھائی صاحب مرحوم کا زرخرید تھا بانتساب اون کے فرار کے نیلام کر ڈالا
حالانکہ وہ خود مریض تھے اور سب صاحب لوگ جو قلعہ مین جا کے ان مین بیٹھے تھے
اون کے پاس عرضی بھی اونھون نے لکھ کے بھیج دی تھی مگر حکام کو نہ غیر کی ملکیت کا تصور
ہوا نہ کچھ تحقیقات کی۔ غدر کے ہنگام مین الم دھوندھون تو تھی ہی کچھ بھی نہ پوچھا گیا ایک

مرزا محمد ہادی رسوا مرحوم
- افسانہ عجائب
- انشائے سرور

امیر مینائی مرحوم
- امیر اللغات نامکمل
- صنم خانہ عشق
- مرآۃ الغیب
- محامد خاتم النبیین
- جواہر سخن
- مکاتیب امیر مینائی

جلال مرحوم
- سرمایہ زبان اردو
- گلشن فیض
- تصور نگارین
- رسالہ تذکیر و تانیث
- افادہ تاریخ
- قواعد المنتخب

مرزا محمد عباس ہوش مرحوم
- افسانہ نادر جہان
- پیاری سہیلی
- دختر مصر
- میمونہ

منشی فضل حسین ثابت
- حیات دبیر
- ...

پنڈت رتن ناتھ سرشار
- فسانہ آزاد چار جلد
- سیر کہسار
- خدائی فوجدار
- جام سرشار
- الف لیلی کا طرز نامہ
- کامنی
- بچھڑی دلہن

منشی سجاد حسین مرحوم
- احمق الذین
- حاجی بغلول
- پیاری دنیا
- کایا پلٹ
- میٹھی چھری
- طرحدار لونڈی
- طلسمی فانوس

منشی جوالا پرشاد برق
- مرزالنی
- مار آستین
- بنگالی دلہن
- معشوقہ فرنگ
- تیر تاب
- زرد ہنی

پریم چند
- پریم پچیسی
- ...

مولانا عبدالحلیم شرر
- جنید بغدادی
- خواجہ معین الدین چشتی
- تذکرہ مشاہیر عالم
- مخدرات
- قیس و لبنی
- مقدس نازنین
- ایام عرب
- فتح اندلس
- ماہ ملک
- حسن کا ڈاکو
- دربار حرام پور
- الفانسو
- مفتوح فاتح
- فلپانا
- زوال بغداد
- لعبت چین
- نیکی کا پھل
- جویائے حق
- بابک خرمی
- طاہرہ
- شوقین ملکہ
- یوسف و نجمہ
- گذشتہ لکھنؤ
- شاعرانہ و عاشقانہ مضامین
- آغاز و ختم سال
- سیر رجال
- تاریخی و جغرافی مضامین
- بابا نزار

حکیم محمد علیخان مرحوم
- رام پیاری کامل
- عبرت کامل
- حسن سرور کامل
- اختر و حسینہ
- دیول دیوی
- جعفر و عباسہ

شوق قدوائی مرحوم
- ترانہ شوق
- قاسم و زہرہ
- نیرنگ جمال
- گنجینہ
- سیکفن اور لوسی

خواجہ عبدالرؤف عشرت
- زبان دانی
- اصلاح زبان اردو
- قواعد میر
- اصول اردو
- جان اردو
- شاعری کی پہلی کتاب
- " دوسری کتاب
- " تیسری کتاب
- لغات اردو

منشی محمد حسن وحشی
- مجموعہ گلگشت
- جانم بہار

مولانا حکیم عبدالحی مرحوم
- یاد ایام
- تذکرہ گل رعنا

حکیم احمد حسین الٰہ آبادی
- تاریخ ابن خلدون جلد اول
- " " دوم
- " " سوم
- " " چہارم
- " " پنجم
- " " ششم
- " " ہفتم
- " " ہشتم
- " " نہم
- " " دہم
- " " یازدہم
- سلطان صلاح الدین
- نور الدین محمود

مولوی محمد حلیم انصاری
- الاسلام والنصرانیہ
- فتح اندلس
- ابو مسلم خراسانی
- تاریخ عرب

مولوی حبیب الرحمن خان شروانی
- سیرۃ الصدیق
- علمائے سلف
- تذکرۃ الشعراء حسین

حافظ اسلم جیراجپوری
- سیرۃ الرسول
- خلافت راشدہ
- خلافت بنی امیہ
- خلافت بنو عباس
- عباسیہ بغداد
- علوم عرب

قاضی محمد سلیمان منصورپوری
- رحمۃ للعالمین
- سفرنامہ حجاز

مولوی خلیل الرحمن
- اخبار الاندلس جلد
- تاریخ مولدین
- مختصر تاریخ اسلامی
- عذرا

مولوی محمد انشاء اللہ
- سیرۃ الرسول
- تاریخ آل عثمان
- حالات طارق بن زیاد
- حالات قسطنطنیہ
- تاریخ ترکی

منشی سید احمد دہلوی
- آثار اکبری
- حیات خسرو
- امراؤ جان

[illegible] ... تاریخی و مذہبی تعلیم نہایت دلکش انداز میں لکھی گئی ہے۔ قیمت صرف ..

ملنے کا پتہ - الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

مولوی عزیز مرزا مرحوم

خیالات عزیز ۶ر
در کرم اردنی عہ

خواجہ عباد اللہ اختر

صدیق اکبر عہ
حضرت زید ۶ر
مشاہیر اسلام عہ
بغداد ۶ر
دمشق ے
دیوان حافظ مع شرح عہ

مفتی انوار الحق ایم اے

تاریخ ابو البشر عہ
تذکرۃ الحبیب عہ
حقایق اسلام ۶ر

سید ولی اللہ بی اے

ہندو[illegible] ۶ر
کاس الکرام ے
لسان الغیب جلد اول ے
" دوم ۶ر
" سوم ۶ر
" چہارم ۶ر

[illegible] مسعود بی اے

نصاب آرزو عہ
علمائے کا تعلیمی نظم ے
نصاب زرین ۶ر

مولانا حسرت موہانی

شرح دیوان غالب ۱ر
کمل دیوان حسرت ۱ر

سید سجاد حیدر بی اے

خیالستان عہ
ثالث بالخیر ۸ر
زہرا ۱۲ر
جلال الدین خوارزم شاہ ۱۲ر

مسٹر ظفر عمر بی اے

جورو کا کلب ۹ر
نیلی چھتری عہ
بہرام کی گرفتاری ۱ر
مستقبل اسلام ۵ر

[illegible] نور الدین [illegible]

تحفہ سائنس ے
بادل کے بچے عہ
خوننابہ عشق عہ

حکیم احمد شجاع بی اے

باپ کا گناہ ۶ر
حسن کی قیمت ۶ر

منشی عبد المجید سالک بی اے

راہ و رسم منزلہا ۸ر
چہار دیگر افسانے عہ
چترا (ٹیگور) ۱۲ر

منشی احمد علی بی اے

تاریخ تمدن ے
شباب لکھنؤ عہ

مولوی عبد الماجد بی اے

فلسفہ جذبات ۱ر
مکالمات برکلے عہ
پیام امن عہ
تصوف اسلام عہ
فلسفیانہ مضامین عہ
زود پشیمان ے

منشی محمد لطیف بی اے

اکبر عہ
اورنگ زیب عہ
رنجیت سنگھ عہ
لارڈ کلایو عہ

پروفیسر نواب علی ایم اے

معارج الدین عہ
تذکرۃ المصطفی عہ
صحف سماوی ے
شمع سخن ۱۰ر

پروفیسر الیاس برنی ایم اے

جذبات فطرت جلد حصہ اول للعہ
معارف ملت للعہ
مناظر قدرت للعہ
علم المعیشت عہ

مولوی سید سلیمان ندوی

ارض القرآن للعہ
سیرۃ عائشہ رض عہ
حیات امام مالک عہ
خلافت عثمانیہ و اسلام
خلافت اور ہندوستان

مولوی عبد السلام ندوی

اسوۂ صحابہ ۲ جلد ے
سیرۃ عمر بن عبد العزیز عہ
انقلاب الامم ۶ر
تاریخ الحرمین الشریفین ۶ر
شعرائے اسلام عہ
فطرت نسوانی عہ
شعر الہند ۲ جلد ے

مولوی عبد الباری ندوی

مبادی علم انسانی عہ
برکلے کا فلسفہ عہ

مولوی سعید انصاری

سیر الصحابہ جلد اول ے
سیر الانصار ۲ جلد ے
سیر الصحابیات عہ

مولوی عبد الرزاق ندوی

اسوۂ حسنہ ۶ر
کتاب الوسیلہ ۶ر
ترکی اور یورپ ۶ر

خواجہ حسن نظامی

قرآن آسان قاعدہ عہ
میلاد نامہ عہ
محرم نامہ عہ
فاطمی دعوت اسلام ے
ذکر غوث پاک ۱۲ر
کرشن جیون عہ
شامی جہاد عہ
سیپارۂ دل ۶ر
کم ٹوموت عہ
چٹکیاں اور گدگدیاں ۱۲ر
آئین خطوط نویسی عہ
روزنامچہ ۶ر
بیوی کی تعلیم عہ
بیوی کی تربیت عہ
اولاد کی شادی عہ
جگ بیتی کہانیاں ۱۰ر
آپ بیتی عہ
تحریکی کہانیاں ۱۲ر
سیر دہلی ۱۲ر
سفرنامہ ممالک اسلامیہ ۶ر
غدر دہلی کے افسانے عہ
یزید نامہ عہ
طمانچہ برخسار یزید عہ
اردو دعائیں ۸ر
تسکین احساس ۸ر
روزنامچہ ہند ۱۲ر
اسلام کا انجام ۶ر
تنفیر مہر و قہر ۱۰ر

مولوی عبد الراشد الخیری

الزہرا ۱۲ر
صبح زندگی عہ
شام زندگی عہ
شب زندگی ۶ر
نوحہ زندگی ۱۲ر
در شہوار ۱ر
منازل السائرہ ۶ر
سراب مغرب ۸ر
بنت الوقت ۸ر
قطرات اشک عہ
جوہر ندامت عہ
عروس کربلا عہ
یاسمین شام عہ
تیغ کمال عہ
ماہ عجم عہ
محبوب خداوند عہ
مودۃ ۸ر

نیاز فتح پوری

گیتان جلی ۶ر
گہوارہ تمدن ۶ر
نگارستان ۶ر
صحابیات ۶ر
تاریخ الدولتین عہ

یاس عظیم آبادی

چراغ سخن عہ
نشتر یاس ۸ر

[illegible] یعنی مرہٹوں کے استقلال مسلمانوں کی شجاعت اور انگریزوں کی حکمت کا آئینہ از خافی خان قیمت ۲ر

ملنے کا پتہ - الناظر بک ایجنسی - لکھنؤ

رجسٹرڈ نمبر — ہو المستعان — لے ۴۷۸

الناظر

ایڈیٹر —— ظفر الملک علوی

الناظر پریس لکھنؤ میں باہتمام اسحاق علی علوی چھپا

قیمت سالانہ للعہ ر

قیمت فی پرچہ ۸ر

بسمہ اللہ

الناظر

فہرست مضامین بابت ماہ دسمبر ۱۹۲۷ء

نمبر ۶ — جلد ۳۳

ظ

سائنس

انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ

جس کا مقصد یہ ہے کہ سائنس کے مسائل اور خیالات کو اردو داں طبقہ میں مقبول بنایا جائے دنیا میں سائنس کے متعلق جو نئی نئی بحثیں یا ایجادیں اور اختراعیں ہو رہی ہیں یا جو جدید انکشافات وقتاً فوقتاً ہوں گے انکو کسی قدر تفصیل سے بیان کیا جائے۔ ان تمام مسائل کو حتی الامکان صاف اور سلیس زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اس سے اردو زبان کی ترقی اور اہل وطن کے خیالات میں روشنی اور وسعت پیدا کرنا مقصود ہے۔

یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ہندوستان کے سائنس دانوں کے علاوہ یورپ کے فضلا نے بھی اس رسالے میں مضمون لکھنا منظور فرمایا ہے۔ چنانچہ پروفیسر اندرید ڈی-ایس سی پی-ایچ ڈی؛ پروفیسر نراسیدلش - پروفیسر برلن یونیورسٹی اور پروفیسر سرا. تقریباً کے مضامین موصول ہو چکے ہیں- جن کے ترجمے اس رسالہ میں شائع ہونگے۔ متعدد بلاک بھی ہوں گے۔

رسالہ ماہ جنوری ۱۹۲۸ء میں شائع ہوگا۔ تقطیع بڑی رسالہ اردو کی ہوگی ۳۰ + ۲۰ / ۸

سالانہ چندہ آٹھ روپیہ سکۂ انگریزی-

امید ہے کہ اردو زبان کے بہی خواہ اور علم کے شائق اسکی سرپرستی فرمائیں گے

المشتہر:- انجمن ترقی اردو- اورنگ آباد دکن

فسانۂ جوش - اردو کے مشہور فسانہ نگار اور ظریف انشا پرداز مسٹر سلطان حیدر جوش کے ان دلچسپ اور موثر فسانوں اور دلآویز و پرکیف مضامین کا مجموعہ جو وقتاً فوقتاً رسالہ الناظر میں شائع ہوئے حجم ۲۰۰ صفحے- قیمت عہ ر

سفرنامہ برہما - جس میں برہما کی اخلاقی، معاشرتی، تجارتی، تعلیمی، سیاسی زندگی کو مفصل تحریر کیا گیا اور عصر موجودہ کے تمام چشم دید حالات و واقعات مندرج ہیں۔ مصنفہ مولانا سید ابوظفر ندوی پروفیسر مہا ودیالے کالج احمد آباد۔ قیمت عہ ر ملنے کا پتہ:- **الناظر بک ایجنسی لکھنؤ**

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الناظر

نمبر ۶ جلد ۳۳ دسمبر ۱۹۲۷ء

ماہیتِ مادّہ

موجودہ زمانے میں طبیعی سائنس کی ترقی حیرت انگیز تیزی کے ساتھ ہو رہی ہے۔ کوئی سال نہیں گزرتا جس میں کوئی نہ کوئی مہتم بالشان ایجاد نہ ہوتی ہو۔ ماہیتِ مادّہ کی تحقیق بھی زمانہ حال کا ایک کارنمایاں ہے۔ اس مضمون میں ہم یہ بیان کریں گے کہ گذشتہ صدی کے محققین کا مادّہ کے متعلق کیا تصور تھا۔ اور پھر ان معلومات کا ذکر کریں گے جن کی بنا پر اُس تصور میں تبدیلی واقع ہوئی ہے۔

اُنیسویں صدی کو مادیت کا زمانہ کہتے ہیں۔ اُس زمانے کے کثیر التعداد علما کا خیال تھا، کہ ہر ایک چیز کی علت مادّہ ہے۔ حتیٰ کہ دماغ کے عمل مثلاً شعور اور تخیل بھی مادّہ کی خاص ترکیب سے ظہور میں آتے ہیں۔ تجربات کے ذریعے مادّے کے متعلق مندرجۂ ذیل باتیں ثابت کی گئی تھیں۔

۱۔ قانون بقائے مادّہ۔ اس قانون کا مفہوم یہ ہے کہ مادّے کی مقدار میں کمی بیشی نہیں ہوسکتی شروع سے جتنا مادّہ موجود ہے، ہمیشہ اُتنا ہی رہیگا۔ ہم نہ کسی طرح مادّہ پیدا کرسکتے ہیں اور نہ اُسے فنا کرسکتے ہیں۔ کیمیائی ترکیب و تجزیے میں مادّی اشیاء کی خاصیات بدل جاتی ہیں، مگر مادّہ کی مقدار میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ مادّہ کی مقدار کا نام کمیت رکھا گیا اس تصور کے مطابق کسی چیز کی کمیت مستقل ہوتی ہے۔ وہ نہ کم ہوسکتی ہے اور نہ زیادہ۔

۲۔ تمام عالم کی مختلف مادّی شکلیں سادہ اکائیوں کی بنی ہوئی ہیں۔ جنکو عنصر کہتے ہیں۔ بہت سی

چیزیں جو ہمارے روزمرہ استعمال میں آتی ہیں، سادہ عناصر ہیں۔ ان مفید عناصر میں دھاتیں، مثلاً لوہا، تانبا، جست، سونا، چاندی شامل ہیں۔ مزید براں کاربن، گندھک، آکسیجن، فاسفورس وغیرہ بھی کارآمد عناصر ہیں۔

لیکن بہت سی اشیا جو ہمارے کام میں آتی ہیں، مرکب ہیں جو دو یا زیادہ کیمیائی عناصر کی ترکیب سے بنی ہوئی ہیں۔ عام اور کثیرالاستعمال مرکب پانی، نمک، شکر، کپڑے، مکانات کا تعمیری مصالحہ، پودے اور حیوانات ہیں۔ ان میں بعض کی ترکیب سادہ ہے، یعنی وہ صرف دو عنصروں کے ملنے سے بنے ہیں۔ مثلاً پانی، آکسیجن اور ہائڈروجن کا مرکب ہے اور نمک ہائڈروجن اور کلورین کا۔ مگر بعض مرکبات کی ترکیب میں بہت سے عناصر شامل ہوتے ہیں۔

مرکب بیشمار ہیں۔ لیکن جن عناصر کی ترکیب سے وہ بنے ہوئے ہیں، اُنکی تعداد محدود ہے۔ جدید تحقیقات کی رُو سے کُل عالم میں ۹۲ عناصر ہوسکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ آئندہ تحقیقات ان دعاوی کو غلط قرار دے مگر جہاں تک ہمارا علم ہے، ہائیڈروجن سب سے ہلکا عنصر ہے اور یورینیم سب سے بھاری۔ ان دو حدود کے درمیان سائنس کا دعویٰ ہے کہ ۹۲ عناصر ممکن ہیں۔ ان سے زیادہ نہیں ہوسکتے۔

سنہ ۱۹۲۶ء تک ۹۲ میں سے ۸۸ عناصر معلوم ہوچکے ہیں۔ سنہ ۱۹۲۵ء میں پروفیسر ناڈک (جرمنی) نے دو اور عنصروں کی دریافت کا اعلان کیا۔ ان کے نام بھی رکھے گئے۔ مگر پروفیسر موصوف کے نتائج کی کُلّی تصدیق نہیں ہوئی۔ اگر تحقیقات سے یہ دو عنصر بھی ثابت ہوگئے تو ہمیں ۲ ملا کے ۹۰ عنصر معلوم ہوں گے۔ باقی دو عنصروں کی تلاش جاری ہے۔ جب وہ دونوں معلوم ہوجائیں گے تو عناصر کی تعداد مکمل ہوجائے گی۔

۳ ۔ عناصر کو کائنات کی تعمیری اینٹیں کہتے ہیں۔ کیونکہ کائنات کی عمارتیں انھیں اینٹوں کی بنی ہوئی ہیں۔ ہر ایک عنصر کے چھوٹے سے چھوٹے ذرے کا نام جوہر یا جزوِ لایتجزیٰ رکھا گیا۔ کیمیائی ترکیب میں ایک عنصر کے ایک یا زیادہ جوہر دوسرے عنصر کے جوہر کے ساتھ پیوست ہوکر مرکب کا ذرہ بن جاتا ہے۔ اس ذرہ کا نام سالمہ رکھا گیا ہے۔ پانی کے ایک قطرہ میں بیشمار سالمات ہوتے ہیں

اُنیسویں صدی کی تحقیقات کے مطابق جوہر ایک ناقابل تقسیم اکائی ہے۔ ہر ایک عنصر کا جوہر دیگر عناصر کے جوہروں سے مختلف ہوتا ہے۔ جوہروں کے باہم ملنے سے مرکب بنتا ہے اور مرکب کے جوہر الگ الگ ہوکر مفرد عنصر بن جاتے ہیں۔ لیکن جوہر میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ ایک عنصر کے جوہر

کو کسی اور عنصر کے جوہر کے ساتھ کوئی مشابہت نہیں۔ ہر ایک قسم کے جوہر کی اپنی اپنی خاصیات ہیں۔ اس تصور کے مطابق قلبِ ماہیت یعنی ایک عنصر کا کسی اور عنصر میں تبدیل ہونا بالکل ناممکن ہے۔

لیکن بیسویں صدی کی تحقیقات نے ان سب خیالات کو بدل دیا ہے:

برقیے ایک شیشے کی نلی لے کر اس کی ہوا خارج کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ ہوا کی نہایت ہی قلیل مقدار اس میں رہ جائے۔ اسکے دونوں سروں میں پلاٹینیم کے تار لگاتے ہیں اور تاروں کے اندر کے سرے چپٹے کر دیتے ہیں۔ پھر تاروں کا تعلق ایک آلۂ برق کے ساتھ کر دیتے ہیں، تو منفی برقیرہ (جو تار برقی موجے کے منفی قطب کے ساتھ ملحق ہوتا ہے) سے شعاعیں نکلتی ہیں۔ یہ شعاعیں خطوط مستقیم پر گذرتی ہیں۔ تجربوں سے ان شعاعوں کی اور خاصیتیں بھی معلوم کی گئی ہیں جن میں سے ایک خاصیت یہ ہے کہ مقناطیسی اثر سے ان شعاعوں کی سمت بدل جاتی ہے۔ مزید براں برقی اثر سے بھی ان کی سمت بدلتی ہے نیز جس جسم پر یہ شعاعیں پڑتی ہیں اس میں منفی برقی قوت بھر جاتی ہے۔ اس وجہ سے انہیں منفی شعاعیں کہتے ہیں۔

برقی اور مقناطیسی اثرات سے شعاعوں کا جو انحراف ہوتا ہے، اسے ناپا گیا اور یہ ثابت کیا گیا کہ شعاعیں فی الواقع نہایت ہی چھوٹے چھوٹے ذرے ہیں۔ جو تیز رفتار کے ساتھ منفی برقیرہ سے خارج ہوتے ہیں۔ اور ان میں منفی برقی قوت ہوتی ہے۔ ان ذرّوں کا نام برقیے رکھا گیا۔ انحراف ناپ کر برقیوں کی کمیت اور رفتار دونوں معلوم کی گئیں۔ برقیے کی کمیت ہائڈروجن کے جوہر کی کمیت کا بھی $\frac{1}{1800}$ حصہ ہے۔

تمام عناصر کے جوہروں میں سے ہائڈروجن کا جوہر سب سے ہلکا ہے۔ لیکن برقیہ کی کمیت ہائڈروجن کے مقابلہ میں بھی بہت ہی قلیل ہے۔ اور چونکہ برقیے منفی برقیرہ میں سے خارج ہوتے ہیں۔ اس لیے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ مادّہ کی ساخت میں برقیے بھی شامل ہیں۔

پروٹان - مذکورۂ بالا نلی میں منفی شعاعوں کے مقابل مثبت برقیرہ میں سے اور قسم کی شعاعیں پیدا ہوتی ہیں۔ ان شعاعوں کا بھی احتیاط سے مطالعہ کیا گیا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ یہ شعاعیں مثبت برقی قوت سے بھرے ہوئے ذرات ہیں۔ ان کی رفتار منفی شعاعوں سے تو کم ہے لیکن اسکے باوجود بہت تیز ہے۔ ان کی کمیت کیمیائی جوہروں کی کمیت کے قریب قریب ہوتی ہے۔ ان کو پروٹان یا مثبت برقیے کہتے ہیں۔ اور چونکہ یہ بھی مادی اجسام میں سے خارج ہوتے ہیں۔ اسلئے ہم قیاس کرتے ہیں کہ مادّہ کی ساخت میں پروٹان بھی شامل ہیں۔

اس قسم کے تجربات سے ہمیں بتدریج یہ علم حاصل ہوا ہے کہ برق دو قسم کی ہوتی ہے منفی برق یعنی برقیہ اور مثبت برق یعنی پروٹان۔ اور کسی قسم کی برق نہیں ہوتی۔ مادی عالم ان دونوں کی ترکیب سے بنا ہوا ہے۔ برقیہ اور پروٹان ایک جوہر سے بھی بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ دونوں کا وزن ہوتا ہے۔ پروٹان کا وزن برقیہ کے وزن سے ۱۸۳۰ گنا ہوتا ہے۔ مگر اسکی جسامت برقیے سے بڑی نہیں ہوتی۔ ہمیں صرف یہ معلوم ہے کہ جس طرح برقیہ منفی برق کی اکائی ہے۔ اسی طرح پروٹان مثبت برق کی اکائی ہے۔ ممکن ہے کہ پروٹان کی ساخت بھی ملتف ہو، مگر اب تک وہ ناقابلِ تجزیہ ثابت ہوا ہے۔ اسی طرح اب تک برقیہ کا تجزیہ بھی نہیں ہو سکا۔

یہ بات یقین کے درجے تک پہونچ چکی ہے کہ برقیہ اور پروٹان دونوں کی ترکیب سے تمام مادہ بنا ہوا ہے۔ ان برقی اکائیوں کا صحیح حجم معلوم ہے۔ مگر ان کی شکل اب تک دریافت نہیں ہوئی۔ قدرتاً انکی شکل کُروی تصور کی جاتی ہے۔ اور یہ بھی قرار دیا جاتا ہے کہ ہر ایک پروٹان کی شکل ایک سی ہے۔ اور اسی طرح ہر ایک برقیے کی شکل ایک سی ہے۔

گو پروٹان کا وزن ہائڈروجن کے جوہر کے وزن کے تقریباً برابر ہوتا ہے۔ لیکن اُسکا حجم ہائڈروجن کے جوہر کے حجم سے بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ برقیے کا حجم پروٹان کے حجم کے قریب قریب برابر ہوتا ہے۔ لیکن اُس کا وزن پروٹان کے وزن کا $\frac{1}{1830}$ حصہ ہے۔

اگر ایک اِنچ کے کروڑ حصے کریں اور پھر ہر ایک حصے کے لاکھ حصے کریں، تو وہ حصہ برقیے کے قُطر کے تقریباً برابر ہوگا۔

چونکہ برقیہ میں برقی اثر ہوتا ہے، اس لیے اسکی کمیت رفتار پر منحصر ہونی چاہیے۔ جب برقیے کی رفتار زیادہ ہو تو برقی اصولوں کے مطابق اُسکی کمیت بھی زیادہ ہونی چاہیے مختلف تیز رفتاروں پر برقیے کی کمیت حساب لگا کر معلوم کی گئی۔ بعد ازاں ریڈیم وغیرہ اجسام سے خارج ہونے والے برقیوں کی رفتاریں اور کمیت دریافت کی گئیں۔ تو نتائج بعینہ وہی نکلے جو حساب لگا کر قرار دیے گئے تھے۔

مقدار مادہ کی رفتار سے زیادتی اصول اضافیت کے مطابق ہے۔ لیکن وہ اصولِ اضافیت دریافت ہونے سے پہلے معلوم ہو چکی تھی۔ نظریۂ اضافیت سے یہ ثابت ہوا ہے کہ ہر ایک قسم کے مادہ کی کمیت رفتار کے بڑھنے سے بڑھتی ہے۔ یہ مزید دلیل اس امر کی ہے کہ ہر ایک قسم کا مادہ برق سے بنا ہوا ہے۔

جب یہ ثابت ہو گیا کہ جوہر برقیوں اور پروٹانوں سے مل کر بنے ہیں، تو یہ سوال پیدا ہوتا
ہے کہ جوہروں کی ساخت کس قسم کی ہے - یعنی برقی اجزا کس طرح ترکیب پا کر جوہر بنتے ہیں- اس
مسئلے کے متعلق قیاس یہ ہے کہ جوہر کی ترکیب نظام شمسی کی سی ہے - جس طرح آفتاب کے گرد سیارے
گھومتے ہیں، اسی طرح جوہر کے مرکز میں پروٹان اور برقیوں کی ایک جماعت ہوتی ہے، جسے قلب
کہتے ہیں- اور اُس قلب کے باہر کچھ فاصلے پر برقیے گھومتے ہیں - قلب کو بمنزلہ آفتاب کے سمجھو
اور برقیوں کو سیارے -

سب سے ہلکا عنصر ہائڈروجن ہے - اسلئے جوہر کے مرکز میں ایک پروٹان ہوتا ہے اور اسکے
گرد ایک تابع برقیہ حرکت کرتا ہے - جس طرح قمر زمین کے گرد گھومتا ہے - گویا ہائڈروجن کا نظام سب
سادہ نظام ہے -

بہت مدت سے یہ معلوم ہے کہ جس وقت ہائڈروجن پیدا ہوتی ہے تو اُس میں ایسی خاصیات
ہوتی ہیں جو بعد میں زائل ہو جاتی ہیں - یہ خاصیتیں ہائڈروجن کے جوہروں کی ہیں- جب ہائڈروجن
پیدا ہوتی ہے تو اسکے جوہر الگ الگ ہوتے ہیں - پھر دو دو جوہر مل کر ہائڈروجن کے سالمے بناتے
ہیں- ان سالموں کا مجموعہ معمولی ہائڈروجن ہے - ہائڈروجن کیمیائی تیزی کے لیے مشہور ہے - ذرا آگ
دکھائی جائے تو بھاپ سے اڑ جاتی ہے - مگر ہائڈروجن کے جوہر اسکے سالموں سے بھی بہت زیادہ
تیز ہوتے ہیں - کافی قوہ کی برقی رو ہائڈروجن کے سالموں کو پھاڑ دیتی ہے - اس طرح سے جوہر کثرت
سے حاصل ہوتے ہیں اور انکی خاصیات کا مطالعہ کیا جاتا ہے -

کسی عنصر کے جوہر میں اندرونی قلب اور برقیوں کے علاوہ اور بھی برقی ذرات ہوتے ہیں-
ان ذرات سے محض جوہر کے وزن میں زیادتی ہوتی ہے، اسکی خاصیات پر مطلق اثر نہیں ہوتا - اس وجہ
سے ان ذرات کو جوہر کا جامد حصہ کہ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے - زیادہ توجہ اُن برقیوں پر ہوتی ہے جو باہر
گھومتے ہیں، اور یا اُن برقی ذرات پر جو اپنی کشش کی وجہ سے نظام قائم رکھتے ہیں -

کسی جوہر کے پروٹانوں کی تعداد فوراً نکل سکتی ہے - یہ تعداد جوہر کے وزن جوہر کے برابر
ہوتی ہے - دلچسپ کام تو یہ معلوم کرنا ہے کہ ان میں سے برقی یا کیمیائی طور پر موثر پروٹان کتنے ہیں اور
بے تاثیر کتنے - خاص تصورات کی بنا پر یہ قرار دیا گیا ہے کہ موثر پروٹان ایک سے ۹۲ تک ہوتے
ہیں - عناصر کا اختلاف اس وجہ سے ہے کہ انکے جوہروں میں پروٹانوں کی تعداد مختلف ہے - مثلاً
آکسیجن کے جوہر میں ۸ پروٹان برقی طور پر متاثر ہیں اور اُن کے گرد ۸ برقیے گھومتے ہیں - اور ...

علاوہ ۸۰ پروٹان جا رہیں۔ ریڈیم میں ۸۸ پروٹان مصروف ہیں اور ۸۸ برقیے انکے گرد گھومتے ہیں۔ سب سے بھاری عنصر یورینیم ہے۔ اس میں ۹۲ مصروف مثبت و منفی برقیے ہیں۔ کسی معلومہ عنصر میں اس سے زیادہ تعداد نہیں ہے۔ ۹۲ ممکن الوجود عناصر میں سے ۹۵ دریافت ہو چکے ہیں۔

پرانا خیال کہ عناصر کی ماہیت ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے، غلط ثابت ہو گیا ہے۔ تمام مادی اشیا کی اصل برقیے اور پروٹان ہیں۔ قلب ماہیت کے متعلق یہ اعتقاد کہ وہ ناممکن ہے، نظریۂ جدید نے متزلزل کر دیا ہے۔ مثال کے طور پر پارے کو لیں۔ اسکے جوہر میں ۸۰ موثر پروٹان اور ۸۰ برقیے ہوتے ہیں۔ اگر کسی طرح سے ایک پروٹان جوہر سے خارج ہو جائے۔ ۷۹ رہ جائیں گے۔ اور سونے کے جوہر میں ۷۹ پروٹان ہوتے ہیں۔ گویا اس صورت میں پارہ سونے میں تبدیل ہو جائیگا۔

اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آیا عناصر میں قلب ماہیت ہوتی بھی ہے یا نہیں۔ اگر اس بات کا ثبوت مل جائے کہ عناصر میں خود بخود تبدیلی ہوتی ہے تو پھر یہ دریافت کرنا ہے کہ ہم کسی طرح سے عناصر میں قلب ماہیت کر سکتے ہیں یا نہیں۔

طیف نما۔ اس مسئلہ کی تحقیق سے پہلے یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ مختلف عناصر کی شناخت کس طرح ہوتی ہے۔ یعنی اگر کوئی عنصر نہایت قلیل مقدار میں کسی مرکب میں موجود ہو تو ہم کس طرح معلوم کر سکتے ہیں کہ وہ عنصر موجود ہے

اگر آفتاب کی روشنی کسی بار ریک شگاف میں سے گزار کر ایک منشور شیشی پر ڈالیں تو شعلے کا رنگ زرد ہو جاتا ہے۔ اس شعلے کو طیف نما میں دیکھیں تو دو زرد خط نظر آتے ہیں۔ نمک کی ترکیب میں سوڈیم شامل ہے۔ یہ دو خط سوڈیم کے متعلق ہیں۔ اگر سوڈیم کے کسی اور مرکب پر تجربہ کیا جائے، تو بھی یہی دو خط نظر آئیں گے۔ جب سوڈیم تیز گرمی سے بخارات بن جاتی ہے تو یہ دو خط ہمیشہ ظاہر ہوتے ہیں۔

اسی طرح دیگر عناصر کے بھی خاص خط ہوتے ہیں۔ جس عنصر کو شعلے میں ڈال کر بخارات میں تبدیل کیا جائے طیف نما میں اسی عنصر کے مخصوص خط نظر آئیں گے۔ اور چونکہ ہر ایک عنصر کے خطوط مختص ہوتے ہیں، اس لیے ہم اگر کسی جسم کو تیز گرم کر کے طیف نما میں معائنہ کریں تو خطوط کو دیکھ کر فوراً معلوم کر لیں گے کہ اس جسم کی ترکیب میں کون کون سے عنصر شامل ہیں۔

نور افشاں اجسام - پروفیسر رانجن نے ۱۸۹۵ء میں شعاع 'لا' معلوم کیں۔ ان شعاعوں کی یہ خاصیت ہے کہ کثیف یعنی غیر شفاف اشیاء میں سے گزر جاتی ہیں۔ شعاعوں کے دریافت ہونے کے بعد یہ شوق پیدا ہوا کہ اس قسم کی شعاعیں کسی اور طرح سے بھی پیدا ہوتی ہیں یا نہیں۔

بکرل نے یورینیم کا ایک مرکب لیا اور اسے سیاہ کاغذ میں لپیٹ کر فوٹوگرافی کی پلیٹ پر رکھ دیا۔ چند دن کے بعد پلیٹ کا انکشاف کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اُس پر شعاعوں کا اثر ہے۔ اس تجربہ کو بار بار کرکے یہ نتیجہ اخذ ہوا کہ یورینیم میں سے "لا" شعاعوں کے مشابہ شعاعیں نکلتی ہیں جو سیاہ کاغذ میں سے گذر جاتی ہیں۔ جس جسم سے اس قسم کی شعاعیں نکلیں اُسے نورافشاں جسم کہتے ہیں۔ اور اس خاصیت کا نام نورافشانی ہے۔ تمام اشیا جن میں یورینیم پائی جاتی ہے نورافشاں ہیں۔ اگر کسی جسم کو سرد یا گرم کیا جائے تو بھی اس خاصیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ان سب باتوں سے پایا جاتا ہے کہ نورافشانی مادہ کے جوہروں کی اندرونی خاصیت ہے۔ کیونکہ طبعی اور کیمیائی تبدیلی سے اثر پذیر نہیں ہوتی۔

ریڈیم ۔ تحقیقات جاری رہی۔ اور کچھ مدت کے بعد میڈم کیوری نے ایک ایسا عنصر قلیل مقدار میں الگ کیا جس کی نورافشانی یورینیم کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے۔ اس عنصر کا نام ریڈیم رکھا گیا۔

ریڈیم میں سے خارج ہونے والی شعاعوں کا غور سے معائنہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ تین قسم کی ہیں۔ انھیں ا۔ ب اور ج شعاعیں کہتے ہیں۔ ان کی خاصیات مختلف ہیں۔ ج شعاعیں مقناطیسی اثر سے بالکل منحرف نہیں ہوتیں، اور اس قدر تیز ہوتی ہیں کہ ٹین کی بہت موٹی تہ میں سے گذر جاتی ہیں۔ ب شعاعیں مقناطیس کے اثر سے ایک طرف کو جھکتی ہیں۔ اُن کے انحراف سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ برقیے ہیں۔ وہ ٹین کی باریک تہ میں سے گذر سکتی ہیں۔

ا شعاعیں مقناطیس کے اثر سے دوسری طرف کو جھکتی ہیں۔ اُن کے جھکاؤ سے پایا جاتا ہے کہ اُن میں مثبت برقی قوت ہے۔ وہ غیر شفاف اشیا میں سے گذر بھی نہیں سکتیں۔ فی الواقع ا شعاعیں مادہ کے ذرات ہیں۔ ا ذرہ بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ریڈیم کی قلیل مقدار میں سے لاکھوں ذرات خارج ہوتے رہتے ہیں۔

رتھرفورڈ نے ا ذرہ کی کمیت معلوم کی تو وہ ہیلیم کے جوہر کی کمیت کے برابر نکلی۔ اس تجربہ کی بنا پر رتھرفورڈ نے قرار دیا کہ ا ذرات ہیلیم کے جوہر ہیں۔ جہاں کہیں نورافشاں جسم ہوتے ہیں وہاں ہیلیم بھی ضرور پائی جاتی ہے۔ یہ دلیل اس بات کی ہے کہ نورافشانی میں اجسام کے جوہروں میں سے ہیلیم کے جوہر خارج ہوتے ہیں۔

اسی شہادت پر اکتفا نہیں کیا گیا۔ بلکہ مزید ثبوت کے لیے ریڈیم کو پانی میں حل کیا گیا، اور پانی کو بخارات بنا کر ایک بند برتن میں جمع کیا گیا۔ معلوم ہوا کہ اُن بخارات میں سے ا۔ ب اور ج تینوں قسم کی شعاعیں نکلتی ہیں۔ گویا پانی کے بخارات کے ساتھ کوئی ایسی چیز برتن میں آگئی ہے جو نورافشاں

ہے۔ اسکو ریڈیم گیس کہتے ہیں۔
جب ریڈیم گیس تیار ہوگئی تو اُسکا طیف معائنہ کیا گیا۔ اُس میں ہیلیم کے مخصوص خطوط بالکل نہ تھے تین چار روز کے بعد طیف کا پھر معائنہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ہیلیم نمودار ہوگئی ہے۔ اس تجربہ سے ثابت ہوگیا کہ ریڈیم گیس کے تجزیہ میں ہیلیم پیدا ہوتی ہے۔

یورینیم، ریڈیم، اور دیگر تمام نورافشاں اجسام میں سے ا ذرات خارج ہوتے ہیں ا ذرات ہیلیم کے جوہر ہیں۔ نورافشاں اجسام کے تجزیہ میں جوہر پھٹ جاتے ہیں اور ہیلیم کے جوہر اُن میں سے نکل آتے ہیں۔ نورافشانی کا عمل ہمارے اختیار سے باہر ہے۔ وہ یا تو خودبخود ہوتا ہے اور یا ہوتا ہی نہیں۔ بہرحال وہ بہت زور کے ساتھ ہوتا ہے۔ جوہر اس طرح پھٹتے ہیں جیسے کہ ایک بم کا گولہ پھٹتا ہے۔ اور کئی ہزار میل فی ثانیہ کی رفتار سے اُن میں سے گولیاں نکلتی ہیں۔

ہیلیم کے ذرات خارج ہونے میں بہت سی حرارت پیدا ہوتی ہے۔ ایک گرام ریڈیم میں سے چار دن میں اتنی حرارت نکلتی ہے جتنی کہ ایک گرام کوئلہ جلانے سے پیدا ہوتی ہے۔ گویا ایک سال میں ایک گرام ریڈیم اتنی حرارت خارج کرتی ہے جتنی ۹۰ گرام کوئلے کے جلنے میں پیدا ہوتی۔ کوئلہ جل کر راکھ ہو جاتا ہے مگر ریڈیم ایک سال کے بعد بھی ویسی ہی رہتی ہے۔ ریڈیم میں توانائی کا بہت بڑا ذخیرہ ہے جو سالہا سال تک ختم نہیں ہوتا۔

ریڈیم کا وزن جوہری ۲۲۶ ہے اور ریڈیم گیس کا ۲۲۲۔ ریڈیم کے ایک جوہر میں سے جب ہیلیم کا ایک جوہر جسکا وزن جوہری ۴ ہے خارج ہو جاتا ہے تو ریڈیم گیس کا جوہر باقی رہ جاتا ہے۔ ریڈیم گیس میں سے ہیلیم کا ایک جوہر نکل کر ریڈیم ا اور پھر اُس سے ریڈیم ب اور ریڈیم ج حاصل ہوتی ہیں۔ ریڈیم ب اور ریڈیم ج کا وزن جوہر برابر یعنی ۲۱۴ ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ ریڈیم ب میں سے ایک برقیہ کے اخراج سے ریڈیم ج بن جاتی ہے۔

ریڈیم ج میں سے ا ذرہ اور کچھ ب اور ج شعاعیں نکل جاتی ہیں تو ریڈیم بنتی ہے۔ ریڈیم س کو پولونیم کہتے ہیں۔ پولونیم کا وزن جوہر $\frac{1}{2}$ ۲۱۰ ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ پولونیم کے بعد کیا چیز بنتی ہے؟ یہ تو معلوم ہے کہ پولونیم میں سے ا ذرات نکلتے ہیں۔ اگر ہیلیم کا ایک جوہر پولونیم کے جوہر میں سے نکل جائے تو باقی حصہ کا وزن جوہر $\frac{1}{2}$ ۲۰۶ ہوگا۔

اگر یہ ایک ایسی چیز ہے جو تبدیل نہیں ہوتی تو بہت مقداریں ریڈیم کے ساتھ جمع ہو چکی ہوں گی۔ سیسے کا وزن جوہر ۲۰۷ ہے جو تقریباً ۲۰۶ کے قریب ہے۔ جہاں جہاں ریڈیم موجود ہے۔ سیسہ بھی

پایا جاتا ہے۔ اس لیے ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ ریڈیم سے ذرات خارج ہو ہو کر آخر میں سیسہ بن جاتا ہے
مذکورۂ بالا بیان سے ظاہر ہے کہ کم از کم نور افشاں اجسام میں قلبِ ماہیت ہو رہی ہے۔

لبرٹری میں قلب ماہیت۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ آیا لبرٹری میں بھی ہم ایک عنصر کو دوسرے عنصر میں بدل سکتے ہیں یا نہیں۔

مدتوں تک کیمیا داں اس کوشش میں رہے کہ کسی معمولی دھات سے سونا بنائیں۔ اُن کا خیال تھا کہ "پارس پتھر" ہر ایک چیز کو سونے میں بدل دیتا ہے۔ پارس پتھر کی بہت تلاش کی گئی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ اسکے بعد جب یہ معلوم ہوا کہ ہر ایک عنصر کا جوہر الگ ہوتا ہے۔ اور ایک عنصر کا دوسرے عنصر میں بدلنا ناممکن ہے۔ تو یہ خیال ترک کر دیا گیا۔

اب ۲۰۰ سال کے بعد یہ ثابت ہو گیا ہے کہ تمام عناصر ایک ہی قسم کے ذرّوں کے بنے ہوئے ہیں۔ اور قلبِ ماہیت ناممکن نہیں ہے۔ اس لیے علمائے سائنس کی توجہ اس کام کی طرف پھر مبذول ہوئی ہے۔

پروفیسر میتھے Miethe (جرمنی) نے اکتوبر ۱۹۲۴ء میں اپنے تجربات شایع کیے۔ کوارٹز کے لیپ میں پارے کے بخارات تھے۔ اُس میں بہت تیز برقی رَو گزاری گئی۔ کچھ دیر کے بعد پروفیسر میتھے نے دیکھا کہ کوارٹز کے اندر ایک باریک سی تہ جم گئی ہے۔ اس کا امتحان کیا گیا تو معلوم ہوا کہ سونا ہے۔ پروفیسر میتھے نے تجربہ کئی بار کیا اور ہر بار سونے کی تہ نمودار ہو گئی۔ ان تجربات سے پروفیسر میتھے نے نتیجہ نکالا کہ تیز برقی رَو کے اثر سے پارے کے کچھ جوہر پھٹ کر سونے کے جوہروں میں تبدیل ہو گئے ہیں

جب یہ تجربات شایع ہوئے تو جاپان کے ایک سائنس داں نے اعلان کیا کہ میں اس سے پہلے پارے کو سونے کے ذرات میں بدل چکا ہوں۔ اس کے باوجود علمائے سائنس نے پروفیسر میتھے کے نتایج کو فوراً تسلیم نہیں کیا۔

امریکہ اور انگلینڈ میں تجربات کا اعادہ کیا گیا تو کامیابی نہیں ہوئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پارے کو سونے میں تبدیل کرنے کے جو اعلانات شایع ہوئے ہیں اُنکی تصدیق باقی ہے۔

ڈاکٹر سمٹس Smits اور ڈاکٹر کارسن Karssen نے اسٹرڈم (ہالینڈ) میں اسی قسم کے تجربوں سے سیسے کو پارے میں تبدیل کیا ہے۔ اُنکے تجربوں کی تصدیق بھی نہیں ہوئی۔

رتھرفورڈ کے تجربات۔ قلب ماہیت کے متعلق رتھرفورڈ کے تجربات ایسے ہیں جنکی صحت میں مطلق شبہہ نہیں ہے۔ ان تجربوں میں نائٹروجن گیس پر ریڈیم کے α ذرات کا عمل مشاہدہ کیا گیا۔

ذرات نہایت تیز رفتار کے ساتھ ریڈیم میں سے خارج ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض نائٹروجن کے جوہروں کے ساتھ ٹکراتے ہیں۔ نائٹروجن کے جوہر کا قلب ہائڈروجن کے جوہر سے ۱۴ گنا بھاری ہے۔ اور ذرہ ہائڈروجن سے ۴ گنا بھاری ہے۔ اس لیے یہ تصادم کوئی معمولی تصادم نہیں ہر ٹکر سے نائٹروجن کا جوہر پھٹ جاتا ہے اُس میں سے دو پروٹان نہایت تیز رفتار کے ساتھ روانہ ہوتے ہیں۔ گویا دو تیز رو ہائڈروجن کے جوہر حاصل ہوتے ہیں۔ اور باقی قلب ہیلیم کے تین جوہر ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ چمٹے رہتے ہیں۔

ان تجربوں سے ثابت ہوتا ہے کہ نائٹروجن کا جوہر ہائڈروجن اور ہیلیم میں تقسیم ہو سکتا ہے۔ تمام تجربات کا ماحصل یہ ہے کہ تمام مادی عالم مثبت برق یعنی پروٹان اور منفی برق یعنی برقیوں کی باہمی ترکیب سے بنا ہوا ہے۔ یعنی مادہ برق کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

مادہ اور توانائی۔ مگر اس سے بھی زیادہ تعجب انگیز بات یہ ہے کہ موجودہ تحقیقات نے مادہ کو توانائی کی ایک قسم قرار دیا ہے۔

اب تک یہ خیال تھا کہ مادہ اور توانائی کا ایک دوسرے کے ساتھ صرف یہ تعلق ہے کہ توانائی مادہ کے ذریعہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن توانائی بذاتِ خود کوئی مادی شے نہیں۔ اسکی بہت سی شکلیں ہیں۔ مثلاً متحرک جسم میں توانائی بالحرکت ہوتی ہے، کمانی میں توانائی بالقوۃ ہوتی ہے، عناصر میں کیمیائی توانائی مخفی ہوتی ہے جو کیمیائی عمل میں ظاہر ہوتی ہے۔ حرارت، نور، آواز، برقی رَو، سب توانائی کی قسمیں ہیں۔ ایک قسم کی توانائی کا دوسری قسم کی توانائی میں استحالہ ہو سکتا ہے۔ مگر توانائی کی مقدار کم و بیش نہیں ہوتی۔

ہم نے بیان کیا ہے کہ برقیہ کی کمیّت اُسکی رفتار پر منحصر ہوتی ہے۔ اگر برقیہ کی رفتار کم ہو تو اُسکی کمیت کم ہوتی ہے، رفتار زیادہ ہو تو کمیت بڑھ جاتی ہے۔ کسی جسم کی توانائی بالحرکت بھی اُسکی حرکت پر منحصر ہوتی ہے۔ حرکت زیادہ ہوگی تو توانائی زیادہ ہوگی۔ برقیہ کی رفتار کی زیادتی سے اسکی توانائی بڑھ جاتی ہے۔ اور تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ اُسکے مادہ کی مقدار بھی بڑھتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ توانائی کی زیادتی سے مادہ کی مقدار کی زیادتی ہوتی ہے۔ یا یوں کہو کہ توانائی ہی کمیت ہے۔

تجربہ سے یہ بھی ثابت ہوا ہے کہ برقیہ کی کل کمیت اس میں برقی قوت اور رفتار کی وجہ سے ہے گویا برقیہ کی مقدار مادہ اُسکی توانائی ہی ہے اور کچھ نہیں۔

تمام مادی اجسام برقیوں سے بنے ہوئے ہیں اور برقیے محض توانائی ہیں۔ اس سے ثابت

ہوتا ہے کہ مادہ بھی توانائی کی ایک قسم ہے۔ ہر عنصر کا جوہر توانائی کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ جوہروں میں توانائی کی مقدار کا اندازہ نورافشاں اجسام کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔ جب نورافشاں جسم کا ایک جوہر پھٹتا ہے تو اُس میں سے توانائی کی ایک بہت بڑی مقدار خارج ہوتی ہے۔ اور وہ جوہر اس عمل میں فنا نہیں ہوتا بلکہ دیگر عناصر کے جوہروں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ایک گرام ریڈیم میں سے سال بھر میں اس قدر توانائی خارج ہوتی ہے جس قدر کہ ۹۰ گرام کوئلہ کے جلنے سے پیدا ہوتی ہے۔

مادہ اور توانائی کو ایک ہی قسم کی ہستیاں تصور رکھنے سے بہت سی باتیں جو گذشتہ صدی میں ناقابل حل معلوم ہوتی تھیں، بالکل واضح ہو جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر قانون بقائے توانائی کو لو۔ جب کوئلہ جلتا ہے تو اُس سے توانائی کی ایک خاص مقدار پیدا ہوتی ہے۔ وہ توانائی کہاں سے آئی؟ اگر احتراق کے عمل میں توانائی پیدا نہیں ہوتی تو جب کوئلہ ٹھنڈا تھا اُسوقت توانائی کہاں تھی؟ اُنیسویں صدی کے حکماء کا یہ جواب تھا کہ توانائی اُسوقت بھی موجود تھی، مگر وہ نظروں سے نہاں تھی۔ ایسی توانائی کا نام اُنھوں نے توانائی بالقوہ رکھا تھا۔ فی الواقع توانائی بالقوہ منطق یا تخیل نے قائم کی ہے۔ اس کا وجود سوائے انسانی دماغ کے اور کہیں نہیں ہے۔

موجودہ اصول کے مطابق توجیہ نہایت آسان ہے۔ جب کوئلہ جلتا ہے تو اُس کوئلہ کی ایک نہایت ہی قلیل مقدار حرارت اور نور کی توانائی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ برعکس اسکے جب سبز پتہ پھلتا ہے تو اُسوقت آفتاب کی توانائی سے مادہ بنتا ہے۔ ان حالات میں مادہ اور توانائی کی قلب ماہیت نہایت قلیل مقدار میں ہوتی ہے کہ ہم اُسکی پیمایش نہیں کر سکتے۔

کوئلہ کے جلنے میں مادہ کی کمی نہایت ہی قلیل ہوتی ہے۔ لیکن اگر ہم تمام دنیا کے کوئلہ کا خرچ ذہن میں رکھیں تو وہ اس قدر قلیل نہیں رہتی۔ تمام دنیا میں جس قدر کوئلہ سال بھر میں جلتا ہے، اُسکے جلنے میں بارہ من کوئلہ فنا ہونا چاہیے۔ پس کوئلہ کے جلنے سے عالم میں مادہ کی مقدار کم ہو رہی ہے۔ یہ پہلے سے معلوم ہے کہ توانائی کا غیر کارآمد شکل یعنی حرارت میں استحالہ ہو رہا ہے۔ اور اب یہ دریافت ہوا ہے کہ مادہ توانائی میں تبدیل ہو کر کم ہو رہا ہے۔ ممکن ہے کہ مادہ کی مقدار میں اسی طرح کمی واقع ہوتی جائے۔ اور آخر کار تمام مادہ فنا ہو کر توانائی بن جائے۔

کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ

منہاج الدین ۔ اسلامیہ کالج ۔ پشاور۔

سوز و ساز

پسِ پردہ کس کا ہے منتظر تو بشوق جلوہ طراز ہو
میں خلیلِ کعبۂ عشق ہوں تو عزیزِ مصرِ حجاب نہ ہو

نہ مرا نیاز نہ بیخودی نہ ترا غرور نہ شوخیاں
کسی خستہ دل کے نصیب سے تری عمرِ حسن دراز ہو

اسی کشمکش میں ہے زندگی اسی دار و گیر میں ہے مزا
کبھی غیظ ہو کبھی لطف ہو کبھی سوز ہو کبھی ساز ہو

وہ غضب کی شانِ جمال جب نظر آئی عالمِ ناز میں
کوئی فرطِ شوق میں کہہ اٹھا کہ تمھیں خدائے مجاز ہو

رہِ عشق کو جو میں طے کروں تو قدم قدم پہ سجود ہوں
ترا نقشِ پا ہو پڑا جہاں وہیں خم جبینِ نیاز ہو

مرے عشق کی ہیں جو عظمتیں نہیں آہ اُن سے وہ باخبر
اُسے امتیازِ نیاز کیا جو اسیرِ عشوہ و ناز ہو

یہ صعوبتیں تو ہیں لذتیں یہ مصیبتیں تو ہیں راحتیں
ہوں کچھ اور دور یہ منزلیں مری راہِ عشق دراز ہو

کوئی رمز ہے تو کچھ اور ہے جو چھپا ہوا ہے شہود میں
اُسے خود نمائی سے کیا غرض جو خود آپ آئینہ ساز ہو

جو محبتوں کا حصول ہے وہی بندگی کا اصول ہے
ترے دل میں کچھ بھی گداز ہو تو نصیب ذوقِ نماز ہو

پھر اسی نوا کی تلاش ہے جو ازل میں شررِ گداز تھی
مری روح جس سے ہے آشنا وہی نغمہ ہو وہی ساز ہو

یہ مقدرات عجیب ہیں یہ محبتیں ازلی سی ہیں
یہ تڑپ نہیں ہے وہ غزنوی جو رہینِ حسنِ ایاز ہو

محمود احسن صدیقی بی اے
(علیگ)

۱۲۶۱ سنہ ہجری میں دہلی کا ایک مشاعرہ

(از جناب مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب بی اے۔ دہلوی)

(بسلسلۂ ماہ گذشتہ)

۳۔ ترتیب

بہ شعر و سخن مجلس آراستند نشستند و گفتند و برخاستند

میں تاریخ ابو الفداء کے ترجمے میں ایسا گتھ گیا کہ ۷، ۸ روز تک گھر سے باہر ہی نہیں نکلا۔ نواب زین العابدین خاں کے شوق کی یہ حالت تھی کہ باوجود کمزوری و نقاہت کے روز صبح ہی سے جو باہر نکلتے تو کہیں رات کے آٹھ نو بجے جا کر اُن کی صورت گھر میں دکھائی دیتی۔ اس لیے اُن سے ملنا نہیں ہوا کہ کچھ حال پوچھتا۔ بہر حال یہ آٹھ دن آنکھ بند کرتے گذر گئے اور مشاعرے کی تاریخ آ ہی گئی۔ ۱۴۔ رجب کو شام کے ساڑھے سات بجے کے قریب میں بھی مشاعرے میں جانے کو تیار ہوا۔ نواب صاحب کو دریافت کیا، تو معلوم ہوا کہ وہ صبح سے جو گئے ہیں تو اب تک واپس نہیں آئے۔ گھر سے جو نکلا تو بازار میں بڑی چہل پہل دیکھی۔ ہر شخص کی زبان پر مشاعرے کا ذکر تھا۔ کوئی کہتا تھا کہ یہ میاں کریم الدین کون ہیں۔ کوئی کہتا کہ بھائی کوئی ہوں، مگر انتظام ایسا کیا ہے کہ دیکھ کر جی خوش ہوتا ہے"۔ میں یہ باتیں سنتا اور دل میں خوش ہوتا ہوا قاضی کے حوض پر آیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ سڑک کے دونوں جانب ٹٹیاں لگا کر اور اُن میں روشنی کے گلاس جما کر رات کو دن کر دیا ہے، سڑک پر خوب چھڑکاؤ ہے، کٹورا بج رہا ہے۔ مبارک النساء بیگم کی حویلی کے بڑے پھاٹک کو گلاسوں، قمقموں اور قندیلوں سے سجا کر گلزار آتشیں کر دیا ہے۔ صدر دروازے سے اندر کی دہلیز تک روشنی کا یہ عالم ہے کہ آنکھوں میں چکا چوند آتی ہے۔ مکان کے اندر جو قدم رکھا تو ہوش جاتے رہے۔ یا اللہ یہ میرا ہی مکان ہے یا کسی شاہی محل میں آ گیا ہوں۔ گھڑی گھڑی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھتا اور کہتا "واہ میاں عارف واہ! تم نے تو کمال کر دیا" کہاں وہ بیچارے کریم الدین کا مکان اور کہاں یہ بادشاہی ٹھاٹھ، واقعی تمھارا کہنا صحیح تھا کہ اگر دو ہزار میں بھی کام نکل جائے تو یہ سمجھو کہ کچھ نہیں اُٹھا"۔ چونے میں ابرک ملا کر مکان میں قلعی کی گئی تھی، جس کی وجہ سے درو دیوار پڑے جگ مگ، جگ مگ کر رہے تھے۔ صحن کو بھروا کر تختوں کے چوکے اس طرح بچھائے تھے کہ چبوترہ اور صحن برابر ہو گئے تھے۔ تختوں پر دری چاندنی کا فرش، اُس پر

قالینوں کا حاشیہ، پیچھے گاؤتکیوں کی قطار، جھاڑوں، فانوسوں، ہانڈیوں، دیوارگیریوں، قمقموں، چینی قندیلوں اور گلاسوں کی بہتات تھی کہ تمام مکان بقعۂ نور بن گیا تھا۔ جو چیز تھی خوبصورت، اور جو شے تھی قرینے سے۔ سامنے کی صف کے بیچوں بیچ چھوٹا سا سبز[÷] مخمل کا کارچوبی شامیانہ، گنگا جمنی چوبوں پر سنہری ریشمی طنابوں سے استادہ تھا۔ اُسکے نیچے سبز مخمل کی کارچوبی مسند، پیچھے سبز کارچوبی گاؤتکیہ، چاروں چوبوں پر چھوٹے چھوٹے آٹھ چاندی کے فانوس نصب تھے، فانوسوں کے کنول بھی سبز۔ چوبوں کے سنہری کلسوں سے لگا کر نیچے تک موٹے موٹے موتیا کے گجرے سہرے کی طرح لٹکتے ہوئے۔ بیچ کی لڑیوں کو سمیٹ کر کلابتونی ڈوریوں سے جس کے کونوں پر مقیش کے گھنے تھے، اس طرح چوبوں پر کس دیا گیا تھا کہ شامیانے کے چاروں طرف پھولوں کے دروازے بنگئے تھے۔ دیواروں میں جہاں کھونٹیاں تھیں وہاں کھونٹیوں پر، اور جہاں کھونٹیاں نہیں تھیں وہاں کیلیں گاڑ کر پھولوں کے ہار لٹکا دیے تھے۔ اس سرے سے لگا کر اُس سرے تک سفید چھت گیری جس کے حاشیے سبز تھے، کھنچی ہوئی تھی۔ چھت گیری کے بیچوں بیچ موتیا کے ہار لٹکا کر لڑیوں کو چاروں طرف اس طرح کھینچ دیا گیا تھا کہ پھولوں کی چھتری بن گئی تھی۔ ایک صحنچی میں پانی کا انتظام تھا؛ کورے کورے گھڑے رکھے تھے اور شورے میں جست کی صراحیاں لگی ہوئی تھیں۔ دوسری صحنچی میں پان بن رہے تھے۔ باورچی خانے میں حقوں کا تمام سامان سلیقے سے جما ہوا تھا۔ جابجا نوکر صاف ستھرا لباس پہنے دست بستہ مودب کھڑے تھے۔ تمام مکان مشک، عنبر، اور اگر کی خوشبو سے پڑا مہک رہا تھا۔ قالینوں کے سامنے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر حقوں کی قطار تھی؛ حقے ایسے صاف ستھرے تھے کہ معلوم ہوتا تھا ابھی دوکان پر سے خرید ہو کر آئے ہیں۔ حقوں کے بیچ میں جو کچھ جگہ چھوٹ گئی تھی وہاں چھوٹی چھوٹی تپائیاں رکھکر اُن پر خاصدان رکھ دیے تھے۔ خاصدانوں میں لال قند کی صافیوں میں لپٹے ہوئے پان۔ گلوریوں کو دانی میں اس طرح جمایا تھا کہ بیچ میں ایک ایک تہ پھولوں کی آگئی تھی۔ خاصدانوں کے برابر چھوٹی چھوٹی کشتیاں، اُن میں الائچیاں، چکنی ڈلیاں اور بن دھنیا۔ مسند کے سامنے چاندی کے دو شمعدان، اندر کافوری بتیاں، اوپر ہلکے سبز رنگ کے چھوٹے کنول، شمعدانوں کے نیچے چاندی کے چھوٹے لگن، لگنوں میں عرقِ کیوڑا۔ غرض کیا کہوں ایک عجیب تماشہ تھا۔ میں طوالف لیلہ کا ابو الحسن ہو گیا۔ جدھر نظر جاتی اُدھر ہی کی ہو رہتی۔ میں اِس

÷ سبز رنگ دہلی کا شاہی رنگ تھا۔ + بزرگوں کی زبانی دیوان عام کے مشاعروں کا جو حال میں نے سنا ہے بجنسہٖ اُسی پر

تماشے میں محو تھا کہ لوگوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

سب سے پہلے مرزا کریم الدین رسا آئے۔ یہ سلاطین زادے ہیں۔ کوئی ستر برس کے پیٹے میں ہیں۔ استعداد علمی تو کم ہے مگر شاعری میں اپنے برابر کسی کو نہیں سمجھتے۔ بہت رحمدل، خوش خلق اور سادہ مزاج ہیں۔ دغل فصل نام کو نہیں ہے۔ ملّاح کہا کرتے ہیں کہ "کشتی میں چڑھے سب سے پہلے اور اترے سب سے پیچھے"۔ انھوں نے اس مقولے کو مشاعرے سے متعلق کر دیا ہے۔ مشاعرے میں سب سے پہلے آتے ہیں اور جب تک ایک ایک کرکے سب نہیں چلے جاتے یہ اُٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ ایک روز کا واقعہ ہے کہ مشاعرہ ہو رہا تھا بڑے زور سے ابر آیا۔ سب نے جلدی جلدی مشاعرہ ختم کیا۔ لوگ اپنے اپنے گھر گئے، لیکن یہ ٹھہرے وضع کے پابند، جب سب نہ جا چلے اپنی جگہ سے نہ اُٹھے۔ ہاں گھڑی گھڑی جھک جھک کر آسمان کی طرف دیکھ لیتے تھے۔ اتنے میں موسلا دھار مینہ برسنا شروع ہوا۔ ایسا برسا ایسا برسا کہ جل تھل بھر گئے۔ کہیں دو گھنٹے کے بعد خدا خدا کرکے ذرا مینہ تھما تو یہ بھی اُٹھے، مگر ایسا اندھیرا گھُپ تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا تھا، مالک مکان نے ایک نوکر کو قندیل دے کر ساتھ کر دیا۔ گلیوں میں ٹخنوں ٹخنوں پانی تھا۔ ان بیچارے کے پاؤں میں زردوزی کا قیمتی جوتا، پاؤں کیچڑ میں رکھیں تو کیسے رکھیں۔ آخر چپکے سے نوکر سے کہا کہ تو اپنا جوتا مجھے دیدے۔ اُس کا جوتا کیا تھا لیترے تھے، وہی گھسیٹتے ہوئے چلے، اپنا جوتا بغل میں دبا لیا۔ قلعے پہونچ کر ایک نیا جوتا نوکر کو دیا اور کہا "میاں تو نے آج میرے ساتھ ایسا احسان کیا ہے کہ تمام عمر نہ بھولوں گا، جب کبھی تجھے کوئی ضرورت ہو تو میرے پاس آجایا کیجیو"۔ آگے چل کر اس بدمعاش نے انکو بہت دق کیا، اول تو اس راز کا ڈھنڈورا پیٹ دیا، دوسرے ہر تیسرے چوتھے اُن سے ایک دو روپے اڑا لاتا۔ مگر انھوں نے کبھی "نا" نہیں کی؛ جب جاتا کچھ نہ کچھ سلوک ضرور کرتے

نواب زین العابدین خاں صاحب نے بڑھ کر لب فرش ان کا استقبال کیا "ہیں صاحب عالم! میاں حیا آپ کے ساتھ نہیں آئے"۔ مرزا رحیم الدین حیا انکے بڑے بیٹے ہیں، لیکن تھوڑے دنوں سے باپ بیٹے میں کچھ صفائی نہیں رہی ہے۔ نواب صاحب کا اتنا کہنا تھا کہ صاحب عالم ناسور کی طرح پھوٹ بہے، کہنے لگے "نواب! وہ بھلا میرے ساتھ کیوں آتے۔ جب سے بنارس ہو کر آئے ہیں اُن کا تو رنگ ہی بدل گیا۔ میں بیچارہ تو کس گنتی میں ہوں وہ کسی کو بھی اب خاطر میں

نہیں لاتے۔ پالا پوسا، بڑا کیا، پڑھایا لکھایا۔ شاعر بنایا، بٹیریں لڑانا سکھایا، اور تخت کی قسم* وہ وہ نسخے بٹیروں کے بتائے ہیں کہ قلعہ تو قلعہ ہندوستان بھر میں کسی کے فرشتے خاں کو بھی معلوم نہ ہوں گے اور اب وہی صاحبزادے صاحب ہیں کہ استاد ماننا تو درکنار، مجھکو باپ بھی کہتے شرماتے ہیں۔ ہائے بھئی کیوں نہ ہو، تیرہویں صدی ہے۔ آدمی کہتا ہے رستے بھیج کریں تو مصیبت میں پڑ گیا، ایک نقصانِ مایہ دوسرے شماتتِ ہمسایہ۔ بیٹا ہاتھ سے گیا تو گیا، دوانہ استاد کی داستان کلکل اور مول لے لی"۔ یہ باتیں کرتے کرتے نواب صاحب نے میاں [illegible] کو لیجا کر ایک جگہ بٹھا دیا۔ ابھی اُن سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ شہزادوں کا ایک گروہ حافظ عبدالرحمٰن خاں کو جھرمٹ میں لیے آپہونچا۔ بھلا دلی شہر میں کون ہے جو "حافظ جیو" کو نہ جانتا ہو، چلت استاد ہیں۔ پہلے تو قلعے کا قلعہ ان کا شاگرد تھا مگر استاد ذوق کے قلعے میں قدم رکھتے ہی ان کا زور ذرا ٹوٹا۔ یہ بھی زمانے کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے اور شاہ نصیر سے ٹکر لڑا چکے تھے، اس بڑھاپے میں بھی خم ٹھونک کر سامنے آگئے اور مرتے دم تک نہ ہٹنا تھا نہ ہٹے۔ کوئی ۹۰ برس کی عمر تھی، کمر دوہری ہونے سے قد کمان بن گیا تھا، اپنے زمانے کے ملہم باعوث تھے۔ لیکن غزل اس کڑاکے سے پڑھتے تھے کہ تمام مشاعرے پر چھا جاتے تھے۔ ان کی استادی کا سکہ زمانے سے تمام دلی پر بیٹھا ہوا تھا۔ پہلے مرزا تپلی کے استاد ہوئے، رفتہ رفتہ شاہ عالم بادشاہ غازی نوّر اللہ مرقدہٗ تک رسائی ہوگئی۔ وہ ان کو "حافظ جیو" کہتے تھے، اس لیے اسی نام سے قلعے میں مشہور رہے۔ مصرعے پر مصرعہ لگانے میں کمال تھا، اور سند ایسی تڑاخ سے دیتے تھے کہ کہ معترض منہ دیکھتے رہ جاتے تھے۔ ایک روز بادشاہ سلامت نے مصرعہ کہا

صبح بھی بوسہ تو دیتا مجھے لے ماہ نہیں

انھوں نے فوراً عرض کی

نامناسب ہے میاں وقت سحرگاہ نہیں

کسی نے "وقت سحرگاہ" کی ترکیب پر اعتراض کیا۔ انھوں نے جھٹ صائب کا یہ شعر پڑھا۔

آدمی پیر چو شد حرص جواں می گردد خواب در وقت سحرگاہ گراں می گردد

اور معترض صاحب اپنا سا منہ لے کر رہ گئے

بڑے دبلے پتلے آدمی تھے، رنگ بہت کالا تھا۔ شاہ نصیر نے اسی رنگ کا خاکہ اس طرح

---

* روز کی خانہ جنگیوں نے ہر شہزادے کے دل میں یہ خیال پیدا کر دیا تھا کہ شاید میں ہی کل بادشاہ ہو جاؤں۔ اسلیے قلعے کے سب لوگ ۲۱۷ وہ شاہزادے ہوں یا سلاطین زادے، ہمیشہ تخت کی قسم کی اور اسی طرح کی قسمیں کھایا کرتے تھے۔

اُڑایا ہے۔

اے خالِ رُخِ یار تجھے ٹھیک بناتا ، پر چھوڑ دیا حافظِ قرآن سمجھ کر

نواب صاحب نے ان سب کو بھی ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنی اپنی جگہ لاکر بٹھایا۔ ابھی انکو بٹھانے سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ منشی محمد علی تشنہ چُم ننگے، نشے میں چور، جھومتے جھامتے اندر آئے۔ نوجوان آدمی ہیں مگر عجب حال ہے۔ کبھی برہنہ پڑے پھرتے ہیں، کبھی کپڑے پہن خاصے بھلے آدمی بن جاتے ہیں۔ کسی کے شاگرد نہیں، اور پھر سب کے شاگرد ہیں۔ کبھی حکیم آغا جان عیش سے اصلاح لینے لگتے ہیں، کبھی اُستاد ذوق کے پاس اصلاح کے لیے غزل لے آتے ہیں۔ ذہن بلا کا پایا ہے؛ لاکھوں شعر زبان کی نوک پر ہیں، شعر سُنا اور یاد ہوا۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی کی غزل سُنی اور یاد کر لی۔ مشاعرے میں خود اپنے نام سے وہ غزل پڑھ ڈالی اور وہ بیچارہ مُنہ دیکھتا رہ گیا۔ نواب صاحب آگے بڑھے، پوچھا "منشی جی یہ کیا رنگ ہے"۔ کہنے لگے "اصلی رنگ، مشاعرہ کب شروع ہوتا ہے"۔ نواب صاحب نے کہا "ابھی شروع ہوتا ہے، آپ بیٹھیے تو سہی"۔ خیر ایک کونے میں جا کر بیٹھ گئے۔ میاں عارف نے اُن پر ایک دوشالا لاکر ڈال دیا، اُنھوں نے اُٹھا کر پھینک دیا۔ غرض جس طرح ننگے آئے تھے اُسی طرح بلا تکلف بیٹھے رہے۔ اسکے بعد تو لوگوں کے آنے کا تانتا بندھ گیا۔ جو آتا اُس کا استقبال نواب صاحب کرتے اور لا لاکر بٹھاتے۔ حکیم مومن خاں آئے، اُن کے ساتھ آزردہ، شیفتہ، صہبائی اور مولوی مملوک العلی تھے۔ مولوی صاحب مدرسہ دہلی میں مدرس اول ہیں۔ عجیب باکمال آدمی ہیں۔ مدرسے میں انکی ذاتِ بابرکات سے وہ فیض ہوا ہے کہ شاید ہی کسی زمانے میں کسی اُستاد سے ہوا ہو۔ بہت پابندِ شرع ہیں اسلیے خود شعر نہیں کہتے، مگر سمجھتے ایسا ہیں کہ ان کا کسی شعر کی تعریف کر دینا گویا اُسکو دوام کی سند دینا ہے کوئی ۶۰ سال کا سن ہے۔ رہنے والے تو نانوتے کے ہیں مگر مدتوں سے دہلی میں آ رہے ہیں۔ دن رات پڑھنے پڑھانے سے کام ہے۔ مشاعروں میں کم جاتے ہیں، یہاں شاید مولانا صہبائی انکو اپنے ساتھ گھسیٹ لائے۔ تھوڑے ہی دن ہوئے بیچارے پابندیِ شرع اور تقوی کی وجہ سے چکر میں آ گئے تھے۔ ہوا یہ کہ رزیڈنٹ بہادر مدرسے کے معائنے کو آئے، انکے علم اور رُتبے کے خیال سے ہاتھ ملایا۔ جب تک صاحب بہادر وہاں رہے انھوں نے ہاتھ کو جسم سے اس طرح الگ رکھا جیسے کوئی نجس چیز کو دُور رکھتا ہے۔ صاحب کے جاتے ہی بہت احتیاط سے ہاتھ کئی بار دھویا۔ کسی نے جا کر صاحب سے یہ بات لگا دی۔ اُنکو بہت غصہ آیا کہ ہم نے تو ہاتھ ملا کر انکی عزت بڑھائی

کی اُنھوں نے اس طرح ہماری توہین کی۔ غرض بڑی مشکل سے یہ معاملہ رفع دفع ہوگیا۔
مولوی صاحب میرے بھی اُستاد تھے۔ میں بھی آگے بڑھا۔ آداب کیا۔ فرمانے لگے "میاں
کریم الدین میں تم کو ایسا نہیں سمجھتا تھا۔ تم نے تو دہلی والوں کو مات کر دیا۔ سبحان اللہ سبحان اللہ!
کیا انتظام ہے، دیکھ کر دل خوش ہوگیا، خدا تمھیں اس سے زیادہ حوصلہ دے"۔ میں نے عرض
کی "مولوی صاحب میں کیا اور میری بساط کیا؛ یہ سب کیا دھرا نواب زین العابدین خاں کا ہے"۔
فرمانے لگے "بھئی یہ بھی اچھی ہوئی، وہ کہیں کہ سارا انتظام کریم الدین کا ہے، تم کہو کہ نواب صاحب
کا ہے۔ چلو، من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو"۔ ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ مرزا نوشہ پالکی میں
سے اُترے۔ نیر، علائی، سالک اور حزیں اُنکے ہمراہ تھے۔ مرزا غالب مومن خاں کی طرف بڑھے،
معانقہ کیا اور کہا "بھئی حکیم صاحب آج محمد ناصر خاں محزوں کا عظیم آباد سے خط آیا تھا، تم کو بہت
بہت سلام کہا ہے؛ معلوم نہیں کہ کیوں اکیلا اکیلی پٹنے چلے گئے۔ خواجہ میر درد کے پوتے ہوکر انکا
دہلی کو چھوڑنا ہم کو تو پسند نہیں آیا، اب یاروں کو روتے ہیں۔ دیکھنا کیا درد بھرا شعر لکھا ہے

نہ تو نامہ ہی نہ پیغامِ زبانی آیا آہ محزوں سبھی یارانِ وطن بھول گئے

ارے بھئی رات تو خاصی آگئی ہے، ابھی تک میاں ابراہیم نہیں آئے۔ آخر یہ مشاعرہ شروع
کب ہوگا"۔ حکیم صاحب کچھ جواب دینے ہی والے تھے کہ دروازے کے پاس سے "السّلام علیکم"
کی آواز آئی۔ مولانا صہبائی نے کہا "اے لیجیے مرزا صاحب وہ اُستاد کے نشان کے ہاتھی حافظ
ویران صاحب آگئے اور وہ آپ کے دوست ہُدہُد بھی ساتھ ہیں؛ دیکھیے آج کس کے چونچ
مارتے ہیں"۔ میاں ہُدہُد کا نام عبدالرحمٰن ہے، پورب کے رہنے والے ہیں، دلّی میں آکر حکیم
آغا خاں عیش کے ہاں ٹھہر گئے ہیں۔ اُنکے بچوں کو پڑھاتے ہیں۔ حکیم صاحب ہی کے مشورہ سے
ہُدہُد تخلص اختیار کیا۔ اُنھی کی تجویز سے چگی ڈاڑھی رکھی۔ سر منڈا کر کو عمامہ باندھا۔ اور اس طرح
خاصے کھٹ ہُدہُد ہوگئے۔ انھی کے ذریعے سے دربار میں پہونچے اور طائرالارکین، شہپر الملک،
ہُدہُد الشعراء، منقار جنگ بہادر خطاب پایا۔ شروع شروع میں تو انکے ظریفانہ کلام سے مشاعرہ
چمک جاتا تھا۔ مگر بعد میں انھوں نے اُستادانِ فن پر حملے شروع کر دیے۔ کہتے تو یہ ہیں کہ حکیم صاحب
کے اشارے سے ایسا کیا، لیکن کچھ بھی ہو، آخر آخر سب کو ان سے نفرت سی ہوگئی اور بجائے
دوسروں کا مذاق اُڑنے کے خود اُن کا مذاق اُڑ جاتا تھا۔ حکیم صاحب علانیہ تو اُنکی مدد کر نہیں
سکتے تھے، خود اِن میں اتنی قابلیت نہ تھی جو دلّی والوں کی پھبتیوں کو سنبھال سکتے، اس لیے

تھوڑی ہی دیر میں ٹھنڈے ہو کر رہ جاتے۔ مرزا نوشہ اور حکیم مومن خاں پر ہمیشہ منہ آتے تھے۔ اسلیے مرزا نوشہ مولانا صہبائی کے منہ سے "آپ کے دوست" کا لفظ سن کر مسکرائے اور کہا "بھئی میں تو انکے منہ کیوں لگنے لگا مگر آج دیکھا جائے گا۔" "ہر فرعونے را موسیٰ" سنتا ہوں کہ ہمارے میر صاحب مولوی ہُدہُد کی شان میں آج کچھ فرمانے والے ہیں۔ انکے سامنے اگر یہ شہباز سخن ٹک گئے تو میں سمجھوں گا کہ بڑا کام کیا۔" غرض یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ اُستاد ذوق بھی اندر آ گئے۔ تمام قلعہ انکے ساتھ آیا تھا۔ صاحب سلامت کرکے سب اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ قلعے والوں اور اُن لوگوں میں جن کا تعلق قلعے سے ہے سلام کرنے کا کچھ عجیب طریقہ ہے۔ سیدھے کھڑے ہو کر دایاں ہاتھ اس طرح کان تک لے جاتے ہیں جس طرح کوئی نماز کی نیت باندھتا ہے اور پھر چھوڑ دیتے ہیں، چلو سلام ہو گیا۔ باقی سب لوگوں سے معمولی طرح سلام کرتے ہیں۔ قلعہ والوں کی صورت کچھ ایسی ہے کہ ایک ہی نظر میں پہچان لیے جاتے ہیں۔ شہزادے ہوں یا سلاطین زادے سب کی وضع قطع ایک سی ہے۔ وہی لمبی گردن، وہی پتلی اونچی ناک، ابا کتابی چہرہ، بڑی بڑی لمبوتری آنکھیں، بڑا دہانہ، اونچا چوکا، آنکھوں کے نیچے کی اُبھری ہوئی ہڈیاں، گہرا سانولا رنگ۔ ڈاڑھی گالوں پر ہلکی، ٹھوڑی پر زیادہ۔ غرض جیسی مشابہت اُن لوگوں میں ہے شاید ہی کسی خاندان والوں میں ہوگی۔ امیر تیمور سے لگا کر اسوقت تک انکی شکل میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ پہلے تو قلعے بھر کا ایک ہی لباس تھا* مگر اب کچھ دو رنگی ہو گئی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جب سے سلیمان شکوہ کا دودھ کے

---

* اس مضمون میں جابجا دہلی والوں کے لباس کا ذکر آیا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ذرا وضاحت سے اس لباس کو بتا دوں تاکہ پڑھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے اس محفل کا نقشہ اور اچھی طرح پھر جائے۔ مرزا نوشہ کا تو ذکر جانے دو۔ وہ تو ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بناتے ہیں۔ انکی ٹوپی دنیا بھر سے جدا تھی۔ نہ ترکی تھی نہ تاتاری۔ کھال کو (خواہ وہ سمور ہو یا برہ) اس طرح سی لیا جاتا تھا کہ نیچے کا گھیرا اوپر کے چندوے سے ذرا بڑا رہے۔ اس کے بعد چار کنگرے قائم کرکے کھال کو ٹوپی کی آدھی لمبان تک اس طرح کاٹ لیا کہ ٹوپی کرگج کی شکل بن گئی۔ بیچ میں چندوے کی جگہ مخمل یا گہرے رنگ کی بانات کنگروں کے کناروں سے ملا کر سی لی، اندر استر دے لیا، چلو مرزا نوشہ کی ٹوپی ہو گئی۔ شہر میں کلاہ تتری کا بہت استعمال ہے، جسکو اصطلاح میں چوگوشیہ ٹوپی کہتے ہیں۔ یہ بھی کئی وضع کی ہوتی ہے اور کئی طرح پہنی جاتی ہیں۔ جو ٹوپی شرفا استعمال کرتے ہیں اُن کا دمہ (گوٹ) ذرا اونچا ہوتا ہے۔ دمے کے اوپر چار پاکھے، پاکھے کی وضع بالکل شاہجہانی محراب کی سی ہوتی ہے۔ چاروں کو اس طرح ملا کر سیتے ہیں کہ چاروں کونے [illegible] کے نوکیلے ہو جائیں۔ بعض لوگوں نے اس میں ذرا جدت بھی کی ہے۔ وہ یہ کہ دمے کو اونچا کرکے (دیکھیے نمونہ ۲)

دربار میں رسوخ ہوا خاندان کے کچھ لوگ تو وہیں جا رہے ہیں اور کچھ ایسے ہیں کہ برابر آتے جاتے رہتے ہیں۔ جو وہاں جا کر آتا ہے لباس میں نئی تراش خراش کرتا ہے۔ اس طرح کا لباس آدھا تیتر آدھا بٹیر ہو کر نہ لکھنؤ کا رہتا ہے نہ دہلی کا۔ اب جو لوگ یہاں بیٹھے ہیں ان ہی کو دیکھ لیجئے۔ جو شاہزادے لکھنؤ جا کر آئے ہیں اُنکے سر پر لکھنؤ کی دو پلڑی ٹوپی ہے، اونچی چولی کا انگرکھا ہے، نیچے باریک شربتی ململ کا کُرتا، اور تنگ مُہری کا پیجامہ ہے۔ جنھوں نے قلعہ کبھی نہیں چھوڑا اُنکے جسم پر وہی پرانا لباس ہے۔ سر پر چوگوشیہ ٹوپی، جسم پر نیچی چولی کا انگرکھا، اُسکے اوپر مخمل یا جامہ وار کی خفتانی، پاؤں میں گلبدنی یا غلطے کا ایک برکا پیجامہ۔ جو لوگ لکھنؤ ہو آئے ہیں اُنھوں نے دہلی کے لباس کے ساتھ ڈاڑھی کو بھی خیرباد کہہ دیا ہے، چہرے کی ساخت سے تو انکو دہلی کا شہزادہ کہہ دو تو کہہ دو مگر لباس اور وضع قطع ہو تو یہ ٹھیٹھ لکھنؤ والے معلوم ہوتے ہیں۔

اُستاد ذوقؔ سب سے مل ملا کر شامیانے کی دائیں طرف بیٹھ گئے۔ مشاعرے میں شعرا کو

پلکوں کی لمبان کو چوڑان سے کسی قدر بڑھا دیا ہے اور انکے سل جانے کے بعد جو پہل پیدا ہوئے ہیں اُنکو پھر کاٹ کر کلیاں ڈال دی ہیں۔ اس طرح بجائے چار پہل کے ٹوپی کے آٹھ پہل ہو گئے ہیں۔ خوبصورتی کے لیے دموں کے کنارے پر تیلی لیس اور گوشوں کے کناروں پر باریک قیطون لگاتے ہیں۔ بادشاہ سلامت کی ٹوپی ہوتی تو اسی نمونے کی ہے مگر سلمے ستارے کے کام سے لپی ہوئی اور جا بجا موتی اور نگینے ٹکے ہوئے۔ اس قسم کی ٹوپی کئی طرح پہنی جاتی تھی۔ قلعے والے تو پلکوں کو کھڑا رکھتے ہیں، باقی لوگ انکو کسی قدر دبا لیتے ہیں۔ جو ٹوپی آٹھ پہل کی ہوتی ہے اُس کے پلکوں کو تو اتنا دباتے ہیں کہ گوشے دمے کے باہر پھیل کر کنول کی شکل بنجاتے ہیں۔ اس قسم کی ٹوپی ہمیشہ آڑی پہنی جاتی ہے اور وہ بھی اس طرح کہ اسکا ایک کونہ بائیں بھوں کو دبائے۔ اس ٹوپی کے علاوہ ارخ چین کی ٹوپی کا بھی بہت رواج ہے۔ اس کا بنانا کچھ مشکل کام نہیں۔ ایک مستطیل کپڑے کے کناروں کو سر کی ناپ کے برابر سی لیا، نیچے پتلی سی گوٹ دیدی اور اوپر کے حصے میں چُنٹ دیکر چھوٹا سا گول گتہ لگا دیا۔ دہلی کی دو پلڑی ٹوپی اور لکھنؤ کی ٹوپی میں صرف یہ فرق ہے کہ یہاں یہ ٹوپی اتنی بڑی بناتے تھے کہ سر پر منڈھ جائے بخلاف اسکے لکھنؤ کی ٹوپی صرف بالوں پر دھری رہتی ہے۔ ان ٹوپیوں کے علاوہ بعض بعض لوگ پنج گوشیہ ٹوپی بھی پہنتے ہیں۔ اس ٹوپی میں پانچ گوشے ہوتے ہیں، لیکن اسکی کاٹ چوگوشیہ ٹوپی سے ذرا مختلف ہے۔ گوشوں کے اوپر کے حصے نوکدار ہوتے ہیں۔ بس سمجھ لو کہ جیسے فصیل کے کنگرے۔ نیچے دمے کی بجائے پتلی سی گوٹ ہوتی ہے۔ یہ ٹوپی قالب چڑھا کر پہنی جاتی ہے۔ قالب چڑھ کر بس ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے ہمایوں کے مقبرے کا گنبد۔ عام لوگوں میں پشے گول چندوے کی ٹوپی کا بھی بہت استعمال تھا۔ بعض تو بالکل سادی ہوتی ہیں (دیکھیے صفحہ آیندہ)

سلسلے سے بٹھانا بھی ایک فن ہے - نواب زین العابدین خاں کی تعریف کروں گا کہ جسکو جہاں چاہا

اور بعض سوزنی کے کام یا فیتے کے کام کی ہوتی ہیں - اس ٹوپی کو بھی قالب چڑھاکر پہنتے ہیں۔

لباس میں انگرکھا بہت پسند کیا جاتا ہے - انگرکھے کی چولی اتنی نیچی ہوتی ہے کہ ناف تک آتی ہے - چونکہ ہر شخص کو کسرت کا شوق ہے ، اس لیے جسم کی خوبصورتی دکھانے کے لیے آستینیں بہت چُست رکھتے ہیں - اور بعض شوقین آستینوں کو آگے سے کاٹ کر اُلٹ لیتے ہیں - انگرکھے کے نیچے کُرتا بہت کم لوگ پہنتے ہیں - قلعے والوں کے انگرکھے کے اوپر جامہ وار یا مخمل کی خفتان ہوتی ہے - بہت تکلف کیا تو اُس کے حاشیوں پر سمور لگا لیا ، نہیں تو عموماً پتلی لیس لگاتے ہیں - بٹنوں کی بجائے صرف ایک تکمہ اور گھنڈی ہوتی ہے ، جس کو "عاشق معشوق یا چشمے" کہتے ہیں - اسکی آستینیں ہمیشہ آدھی ہوتی ہیں - قلعے میں تو اس کو خفتان کہا جاتا ہے ، مگر شہر والے اس کھلے ہوئے نیمہ آستین کو "شیروانی" کہتے ہیں - انگرکھے کے اوپر چوکور شامی رومال سموسہ کرکے پیٹھ پر ڈال لیتے ہیں - اس رومال کو عام اصطلاح میں "ارخ چین" کہتے ہیں - کمر میں بھی بچی کرکے رومال لپیٹنے کا رواج ہے ، مگر بہت کم -

پائجامہ ہمیشہ قیمتی کپڑے کا ہوتا ہے - اکثر گلبدنی ، غلطے ، مشروع ، سوُسے ، اطلس یا گورنٹ کا ہوتا ہے - پُرانی وضع کے جو لوگ ہیں وہ تو اب بھی ایک بر ہی کا پائجامہ پہنتے ہیں ، مگر تنگ موریوں کے پائجامے بھی چل نکلے ہیں - سلیم شاہی جوتی کا استعمال شروع ہو گیا ہے ، پھر بھی دہلی کے شرفا گھیتلی جوتی زیادہ پسند کرتے ہیں - شاید ہی شہر بھر میں کوئی ہو گا جس کے ہاتھ میں بانس کی لکڑی اور گز بھر کا لٹھے کا چوکور رومال نہ ہو - ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لمبی پور کا ٹھوس بھاری بانس لیتے ، تیل پلاتے ، مینڈھی مل کر باورچی خانے میں لٹکاتے ، یہاں تک کہ اُس کی رنگت بدلتے بدلتے سیاہ ہو جاتی ، اور وزن تو ایسا ہو جاتا گویا سیسہ پلا دیا ہے - جو نکلتا ہے اینٹھتا ہوا نکلتا ہے - جس کا دیکھو ، چوڑا سینہ ، پتلی کمر ، بنے ہوئے ڈنڈ - شرفا میں تو شاید ڈھونڈے سے ایک بھی نہ نکلے گا جس کو کسرت کا شوق نہ ہو ، اور بانک ، بنوٹ ، اور لکڑی نہ جانتا ہو - بچپن ہی سے ان فنوں کی تعلیم دی جاتی ہے ، مقابلے ہوتے ہیں ، واہ واہ سے بچوں اور نوجوانوں کا دل بڑھاتے ہیں ، اور فنونِ سپاہ گری کو شرافت کا تمغہ سمجھتے ہیں -

بٹھا دیا اور پھر اس طرح کہ کسی کو نہ کوئی شکوہ نہ شکایت۔ اگر کوئی ایسی جگہ بیٹھ جاتا جہاں اُنکے خیال میں اُسکو نہ بیٹھنا چاہیے تھا تو بجائے اسکے کہ اُسکو وہاں سے اُٹھاتے خود ایسی جگہ جا بیٹھتے جہاں اُسکو بٹھانا چاہتے، تھوڑی دیر کے بعد کہتے "ارے بھئی ذرا ایک بات تو سننا" وہ آکر اُن کے پاس بیٹھ جاتا، اُس سے باتیں کرتے رہتے: اتنے میں کوئی ایسا شخص آجاتا جسکو وہ خالی جگہ کے لیے موزوں سمجھتے اُس سے کہتے "تشریف رکھیے، وہ جگہ خالی ہے" جب وہ جگہ بھر جاتی تو کسی بہانے سے اُٹھ جاتے اور اس طرح دو نشستوں کا انتظام ہو جاتا۔ شہزادوں کا سلسلے سے بٹھانا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر بگڑ کر اُٹھ جاتے ہیں کہ واہ ہم اور یہاں بیٹھیں۔ پھر لاکھ منائیے وہ بھلا کیا ماننے والے ہیں۔ ان جھگڑوں کو اُستاد ذوق خوب سمجھتے تھے اس لیے اپنے ساتھ والوں کا انتظام انھوں نے خود کر لیا۔ مگر اس طرح کہ کسی کو یہ خیال ہی نہیں ہوا کہ یہ محفل کا بندوبست کر رہے ہیں کسی سے کہتے "صاحب عالم، ادھر آئیے"۔ کسی سے، کسی خاص جگہ کی طرف اشارہ کرتے "کہتے "بیٹھو، بھئی بیٹھو"۔ غرض تھوڑی دیر میں پوری مجلس جم گئی۔ نشست کا یہ انتظام تھا کہ میر مشاعرہ کے دائیں جانب وہ لوگ تھے جنکا تعلق قلعے سے تھا اور بائیں طرف شہر کے دوسرے اُستاد اور اُنکے شاگرد۔ ایک چیز جو مجھے عجیب معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ قلعے والے جتنے آئے تھے سب ہاتھوں میں بٹیریں دبائے ہوئے تھے۔ یہ بٹیر بازی اور مرغ بازی کا مرض قلعے میں بہت ہے۔ روز تیتروں، بٹیروں اور مرغوں کی پالیاں ہوتی تھیں۔ ایک شہزادے صاحب نے تو کمال کیا ہے ایک بڑے چھکڑے پر ٹھاٹھر لگا کر چھوٹا سا گھر بنا لیا ہے اور چھت پر مٹی ڈال کر کنگنی بو دی ہے۔ ٹھاٹھر میں خدا جھوٹ نہ بلوائے تو لاکھوں ہی چڑیاں ہیں۔ جہاں چاہا چھکڑا لیگئے اور چڑیاں اُڑا دیں، ایسی سدھی ہوئی تھیں کہ چھکڑے سے ایک بھی چھٹ کر نہیں جاتی، انھوں نے جھنڈی ہلائی اور وہ اڑ گئیں، انھوں نے آواز دی اور وہ آکر چھت پر بیٹھ گئیں۔

اُستاد ذوق کو آئے ہوئے چند ہی منٹ ہوئے ہونگے کہ مرزا فتح الملک بہادر بھی آپہونچے اُنکے ساتھ نواب مرزا خاں داغ تھے۔ میاں داغ کی کوئی سولہ سترہ برس کی عمر ہوگی۔ رنگت تو بہت کالی ہے مگر چہرے پر غضب کی نرماہٹ ہے۔ بڑی بڑی غلافی آنکھیں، ستواں ناک، کشادہ پیشانی، سر پر سیاہ مخمل کی لیس لگی ہوئی چوگوشیہ ٹوپی۔ جسم میں ماسلیٹ کا انگرکھا، سبز گلبدن کا پاجامہ، ہاتھ میں ریشمی رومال۔ ہیں تو ابھی نو عمر مگر شعر ایسا کہتے ہیں کہ سبحان اللہ۔ شہر بھر میں انکی غزلیں گائی جاتی ہیں۔ غرض بوا اور فرش سے ملا دیا گیا۔ پہلے میاں داغ

اُترے، اور اُتر کر ایک طرف کھڑے ہوگئے۔ انکے بعد مرزا فتح الملک اُترے، اُنکا نیچے قدم رکھنا تھا کہ سب سروقد کھڑے ہوگئے۔ چار چوبدار سبز کھڑکی دار پگڑیاں باندھے، نیچی نیچی سبز بانات کی چپکنیں پہنے، سرخ شالی رومال کمر سے لپیٹے، ہاتھوں میں گنگا جمنی عصا اور مورچھل لیے ہوادار کے پیچھے تھے۔ ادھر مرزا فخرو نے فرش پر قدم رکھا اُدھر عصا بردار تو اُنکے سامنے آگئے اور مورچھل بردار پیچھے ہولیے۔ اس سلیقے سے یہ جلوس آہستہ آہستہ شامیانے تک آیا۔ مرزا فخرو نے شامیانے کے قریب کھڑے ہو کر سب کا سلام لیا۔ پھر چاروں طرف نظر ڈال کر کہا "اجازت ہے"۔ سب نے کہا "بسم اللہ بسم اللہ"۔ اجازت پا کر یہ شامیانے میں گئے اور سب کو سلام کر کے بیٹھ گئے۔ دوسرے سب لوگ بیٹھنے کی اجازت کے انتظار میں کھڑے تھے۔ ان سب کی طرف نظر ڈال کر کہا "تشریف رکھیے، تشریف رکھیے"۔ سب لوگ سلام کر کے اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ اُستاد ذوق نے داغ کو اپنے قریب ہی ایک جگہ بیٹھنے کا اشارہ کیا، وہ وہاں جا بیٹھے۔ مورچھل بردار شامیانے کے پیچھے اور عصا بردار سامنے کی صف کی پشت پر جا کھڑے ہوئے۔ جب یہ سب انتظام ہوگیا تو نواب زین العابدین آگے بڑھے۔ شامیانے کے پاس جا کر تسلیمات بجا لائے اور دوزانو ہو کر وہیں بیٹھ گئے۔ چپکے چپکے صاحب عالم سے کچھ باتیں کیں، اور پھر اُٹھ کر اپنی جگہ جا بیٹھے۔ اُنکے اُٹھ کر چلے جانے کے بعد نواب فتح الملک ☆ نے دونوں ہاتھ فاتحہ کو اُٹھائے۔ ساتھ ہی اہل مجلس نے ہاتھ اُٹھائے۔ فاتحۂ خیر کے بعد صاحب عالم نے فرمایا "اے خوشنوایانِ چمنِ دہلی! میری کیا بساط ہے جو آپ جیسے اُستادانِ فن کے ہوتے ہوئے میر مشاعرہ بننے کا خیال بھی دل میں لا سکوں۔ حضرت پیر و مرشد کے فرمان کی تعمیل میں حاضر خدمت ہوگیا ہوں، ورنہ کہاں میں اور کہاں ایسے بڑے مشاعرہ کی میرمجلسی۔ محبو! اس مشاعرے کی ایک خصوصیت تو آپ کو معلوم ہے کہ اسکے لیے کوئی "طرح" نہیں دی گئی۔ اسکی دوسری خصوصیت آپ یہ پائیں گے کہ بجائے ایک شمع کے دو شمعیں گردش کریں گی۔ جس طرح "طرح" کے نکل جانے نے ایک دوسرے کے مقابلہ میں فخر و مباہات کا دروازہ

---

† مرزا فخرو کے ساتھ نواب مرزا خاں داغ کے آنے کی یہ وجہ تھی کہ نواب شمس الدین خاں کے پھانسی پانے کے بعد اُن کی بیوی یعنی داغ کی والدہ کا نکاح مرزا فخرو سے ہوگیا تھا۔ اور اسی نسبت سے داغ قلعے میں رہتے تھے (نواب فتح الملک کا عرف مرزا فخرو تھا۔)

☆ نواب فتح الملک بڑے کٹّے مسلمان تھے، کوئی کام بغیر فاتحۂ خیر کے شروع نہیں کرتے تھے۔ اسی لیے سب قلعہ والے انکو "متقی" یا "مقتدا" کہا کرتے تھے۔

بند کر دیا ہے، اسی طرح دو شمعوں کے پڑھنے کی وجہ سے جو تقدیم و تاخیر سے جو خیالات طبیعتوں کو مکدر کرتے تھے وہ بھی رفع ہو جائیں گے۔ مشاعرے کی ابتدا کرنے اور ختم کا خیال بھی اکثر دلوں میں فرق ڈالتا ہے، لیکن اس مشاعرے میں میں نے انتہا کو ابتدا کر دیا ہے۔ چنانچہ حضرت ظل سبحانی کے کلام معجز نظام سے مشاعرے کی ابتدا ہو گی اور اسکے بعد میں اپنی غزل عرض کر کے ابتدا اور انتہا کے فرق کو مٹا دوں گا۔" یہ کہ کر مرزا فخرو نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ دونوں چوبدار جو سامنے کھڑے تھے دونوں شمعیں اُٹھا کر اُنکے سامنے لائے۔ انھوں نے بسم اللہ کہکر فانوس اُتارے اور شمعیں جلا کر فانوس چڑھا دیے۔ چوبداروں نے شمعوں کو اٹھا کر لگنوں میں رکھ دیا اور سیدھے کھڑے ہو کر مرزا فخرو کی طرف دیکھا۔ انھوں نے گردن سے اشارہ کیا۔ اشارہ پاتے ہی دونوں چوبداروں نے باواز بلند کہا "حضرات! مشاعرہ شروع ہوتا ہے"۔

اس آواز کا سُننا تھا کہ ایک سناٹا سا ہو گیا۔ قلعے والوں نے شیریں تھیلیوں میں بند کر تکیوں کے پیچھے رکھ دیں، نوکروں نے جھٹ پٹ حُقّے سامنے سے ہٹا دیے اور اُنکی جگہ سب کے سامنے اُگال دان، خاصدان، اور پن ڈبیے کی طشتریاں رکھ اپنی اپنی جگہ جا کھڑے ہوئے۔ اتنے میں بارگاہِ جہاں پناہی کا خواص بادشاہ سلامت کی غزل لیے ہوئے قلعے سے آیا۔ اسکے ساتھ کئی نقیب تھے وہ خود شمع کے قریب آکر تسلیمات بجا لایا اور غزل پڑھنے کی اجازت چاہی۔ مرزا فخرو نے گردن کے اشارے سے اجازت دی۔ وہ وہیں بیٹھ گیا۔ نقیبوں نے آواز لگائی "حاضرین! حضرت ظل سبحانی صاحبقران ثانی خلّد اللہ مُلکہٗ وسلطنتہٗ کا کلام معجز نظام پڑھا جاتا ہے۔ نہایت ادب کے ساتھ گوشِ دل سے سماعت فرمائیے"۔

تکمیل

حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آزمائش ہے
چمن میں خوشنوایانِ چمن کی آزمائش ہے

نقیب کی آواز کے ساتھ ہی سب اہلِ محفل دوزانو ہو سنبھل کر بیٹھ گئے اور پاسِ ادب سے گردنیں جھکا لیں۔ خواصی نے بادشاہ سلامت کی غزل خریطے سے نکالی۔ بوسہ دیا، آنکھوں سے لگایا اور بلند آواز سے سوہنی کے سُروں میں پڑھنا شروع کیا۔ الفاظ کی نشست، زبان کی خوبی مضمون کی آمد اور سب سے زیادہ پڑھنے والے کے گلے نے ایک سماں باندھ دیا۔ ایک کیفیت تھی کہ ذہن

سے آسمان تک چھائی ہوئی تھی۔ کسی کو تعریف کرنے کا بھی ہوش نہ تھا۔ اُستادانِ فن ہر شعر پر جھومتے تھے۔ کبھی کبھی کسی کے مُنہ سے سبحان اللہ سبحان اللہ کے الفاظ بیت نیچی آواز میں نکل گئے تو نکل گئے ورنہ ساری مجلس پر ایک عالم بیخودی طاری تھا۔ مقطع پر تو یہ حال ہوا جیسے کسی نے سب پر جادو کر دیا۔ ہر شخص وجد میں جھوم رہا تھا۔ باصرار تمام کئی کئی دفعہ مقطع پڑھوایا اور مضمون اور زبان کی چاشنی کا لطف اُٹھایا۔ لیجیے آپ بھی پڑھیے اور زبان کے مزے لیجیے :-

نہیں عشق میں اسکا تو رنج ہمیں کہ قرار و شکیب ذرا نہ رہا
غمِ عشق تو اپنا رفیق رہا، کوئی اور بلا سے رہا نہ رہا

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی بُرائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی بُرا نہ رہا

ہمیں ساغرِ بادہ کے دینے میں اب کرے دیر جو ساقی تو ہائے غضب
کہ یہ عہدِ نشاط، یہ دورِ طرب، نہ رہے گا جہاں میں سدا نہ رہا

لگے یوں تو ہزاروں ہی تیرِ ستم، کہ تڑپتے رہے پڑے خاک پہ ہم
ولے ناز و کرشمہ کی تیغِ دودم لگی ایسی کہ تسمہ لگا نہ رہا

ظفرؔ آدمی اُسکو نہ جانیے گا وہ ہو کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

غزل پڑھ چکنے کے بعد خواص نے کاغذ مرزا فخرو کے ہاتھ میں دیا۔ زرافشاں کاغذ پر خود حضرت ظل اللہ کے قلم کی لکھی ہوئی غزل تھی۔ خط ایسا پاکیزہ تھا کہ آنکھوں میں کُھبا جاتا تھا۔ مرزا فخرو نے کاغذ لے کر ادھر اُدھر دیکھا۔ ملوک الملک نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا "صاحبِ عالم! ہمارا کیا منہ ہے جو ہم حضرت ظلِ سبحانی کی غزل کی جیسی چاہیے ویسی تعریف کر سکیں، البتہ اُن نوازشاتِ شاہی کا شکریہ ادا کرتے ہیں جو حضرت پیر و مرشد نے غزل بھیج کر شرکائے مشاعرہ پر مبذول فرمائی ہیں۔ بارگاہِ جہاں پناہی میں ہمارا ناچیز شکریہ پیش کر کے ہماری عزت افزائی فرمائی جائے۔" مرزا فخرو نے خواص کی طرف دیکھا، اُس نے عرض کی "قبلۂ عالم! یہ پیام جاتے ہی پیشگاہِ عالی میں پہونچا دوں گا۔" خواص آداب کر کے جانے والا ہی تھا کہ مرزا فخرو نے روکا اور کہا "جانے سے پہلے صاحبِ عالم و عالمیان حضرت ولیعہد بہادر کی غزل بھی پڑھتے جاؤ۔ چلتے چلتے مجھے عنایت کی تھی اور فرمایا تھا کہ کسی خوش گلو شخص سے پڑھوانا۔ بھلا تم سے زیادہ موزوں

اور کون شخص مل سکتا ہے۔" یہ کہہ کر جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک کاغذ نکال کر خواص کو دیا، اُس نے آداب کرکے کاغذ لیا اور وہیں بیٹھ کر یہ غزل سُنائی

دل سے لطف و مہربانی اور ہے مہربانی کی نشانی اور ہے
قصۂ فرہاد و مجنوں اور ہے عشق کی میرے کہانی اور ہے
وہ کئے سے کب مرے رُکتے ہیں اشک ایکہ ہوتی خوں نشانی اور ہے
ہم سے اے دل آرا وہ کب چھُٹتے ہیں صاف اُنکے دل میں بدگمانی اور ہے

غزل تو بہت پھیکی پھیکی تھی مگر ولیعہد بہادر کی غزل تھی، بھلا کس کا جگرا تھا جو تعریف نہ کرتا، البتہ غالب اور مومن بالکل چُپ بیٹھے رہے۔ بعض قلعے والوں کو بُرا بھی معلوم ہوا مگر ان دونوں کو خوب سمجھتے تھے کہ یہ سچی تعریف کرنے والے لوگ ہیں۔ ولیعہد تو ولیعہد اگر بادشاہ سلامت کی بھی کمزور غزل ہو تو گردن تک نہ ہلائیں۔ القصہ خواص تو غزل پڑھ کر رخصت ہوا اور اب حاضرین جلسہ کے پڑھنے کی نوبت آئی۔

مرزا فخرو نے چوبدار کو اشارہ کیا، اُس نے دونوں شمعیں لا کر میاں نے کے سامنے رکھدیں صاحب عالم نے اپنی غزل نکالی اور ادھر اُدھر نظر ڈال کر اور گردن کو ذرا جھکا کر کہا "بھلا میری کیا مجال ہے کہ آپ جیسے کاملین فن کے مقابلے میں کچھ پڑھنے کا دعویٰ کروں۔ البتہ جو کچھ بُرا بھلا کہا ہے وہ بنظر اصلاح عرض کرتا ہوں"۔

۱۔ غم وہ کیا ہے جو جاں گزا نہ ہوا درد وہ کیا جو لا دوا نہ ہوا
۲۔ حال کھل جائیں غیر کے سامنے پر کروں کیا کہ تو مرا نہ ہوا
۳۔ درد کیا جس میں کچھ نہ ہو تاثیر بات کیا جسمیں کچھ مزا نہ ہوا
۴۔ وہ تو مانا پر اے دلِ کمظرف تجھ کو ملنے کا حوصلہ نہ ہوا
۵۔ شکوۂ یار اور زبانِ رقیب کھیل ٹھیرا کوئی گلا نہ ہوا
۶۔ تم رہو اور مجمع اغیار میرا کیا ہے، ہوا ہوا، نہ ہوا
۷۔ پھر تمہارے ستم اُٹھانے کو رمز اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

مرزا فخرو کی آواز تو اونچی نہ تھی، مگر پڑھنے میں ایسا درد تھا کہ سُن کر دل بے قابو ہو جاتا تھا سارا مشاعرہ واہ واہ اور سبحان اللہ کے شور سے گونج رہا تھا۔ تیسرے شعر پر مرزا غالب نے اور پانچویں پر حکیم مومن خاں نے ایسے جوش سے واہ واہ کی کہ صف سے آگے نکل آئے۔ مرزا فخرو

اپنی غزل پڑھتے رہے، مگر ان دونوں کو انہی دونوں شعروں کی رٹ لگی رہی۔ پڑھتے اور وجد میں آکر جھومتے۔ جب غزل ختم ہوئی تو مرزا نوشہ نے کہا "سبحان اللہ! صاحب عالم! سبحان اللہ! واہ کیا کہنا ہے، شعر یوں کہتے ہیں، مزا آگیا۔" اُستاد ذوق بھی مسکرائے کہ چلو اس بہانے سے میری تعریف ہو رہی ہے۔ مرزا فخرو نے اُٹھ کر سلام کیا اور کہا "یہ آپ اصحاب کی بزرگانہ شفقت ہے جو اس طرح ارشاد ہوا ہے ورنہ من آنم کہ من دانم۔" وہ جدھر نظر ڈالتے لوگ تعریفیں کرتے اور وہ جھک جھک کر سلام کرتے۔ جب محفل میں ذرا سکون ہوا تو مرزا فخرو نے چوبدار کو اشارہ کیا۔ اُس نے شامیانے کے سامنے ایک شمع اُٹھا، سامنے کی صف میں میاں یلؔ* کے آگے رکھدی۔ نام تو انکا عبد القادر تھا، مگر شہر کا بچہ بچہ اُنکو میاں یلؔ کہتا تھا۔ انکو اپنی طاقت پر اتنا غرور تھا کہ کسی پہلوان کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ جس اکھاڑے میں جاتے وہاں خم ٹھونک آتے، اور کسی کو انکے سامنے خم ٹھونکنے کی ہمت نہ ہوتی، پہلوانی کی نسبت سے یلؔ تخلص رکھا تھا۔

---

* اس غرور ہی نے آخر ان کو نیچا دکھایا۔ ان کا روز روز آکر اکھاڑے میں خم ٹھونکنا لوگوں کو ناگوار گذرا۔ شیخو والوں کے اُستاد حاجی علی جان نے ایک پٹھا تیار کیا۔ بدن میں تو کچھ ایسا زیادہ نہ تھا، مگر داؤ پیچ میں طاق تھا۔ اور پھرتی اس بلا کی تھی کہ کیا کہوں۔ ایک دن جو میاں یلؔ نے حسب معمول شیخو والوں کے ہاں آکر خم ٹھونکے تو لونڈا کپڑے اُتار، پھیتر اپیل سامنے آگیا۔ اور خم ٹھونک کر ہاتھ ملانا چاہا۔ میاں یلؔ کو ہنسی آگئی کہ بھلا یہ پدونا میرا کیا مقابلہ کرے گا۔ ہاتھ ملانے میں تامل کیا۔ اُستاد علی جان نے کہا "کیوں بھئی ہاتھ کیوں نہیں ملاتے۔ یا تو ہاتھ ملاؤ یا پھر کبھی اِس اکھاڑے میں آکر خم نہ ٹھونکنا۔" کہنے لگے "اُستاد! جوڑ تو دیکھ لو، خواہ مخواہ اس لونڈے کو پسوانے سے حاصل؟" اُستاد نے کہا "میاں جو جیسی کرے گا ویسی بھرے گا، دنگل میں تم اسے کچل ڈالنا۔ یہی ہوگا نا کہ ہڈی پسلی ٹوٹ جائے گی اور آئندہ کو کان ہو جائیں گے۔" بہر حال دونوں ہاتھ مل گئے، تاریخ مقرر ہو گئی۔ اس مشاعرے کے دو ہی چار دن بعد شاہی دنگل میں کشتی قرار پائی۔ عیدگاہ کے پاس ہی یہ دنگل ہے۔ دس پندرہ ہزار آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ ہے۔ مگر اُس روز وہاں تل رکھنے کو جگہ نہ تھی۔ جدھر نظر جاتی سر ہی سر دکھائی دیتے۔ میاں یلؔ کی بیہودگیوں کی وجہ سے ساری دہلی اُس لونڈے کی طرف تھی۔ چلتے چھوٹی موٹی کشتیاں ہوتی رہیں۔ ٹھیک چار بجے یہ دونوں جانگھیے باندھ (دیکھیے صفحہ ۴۳)

مضمون بھی رندانہ باندھتے ہیں۔ پڑھتے اس طرح تھے کہ گویا میدانِ کارزار میں رجز پڑھ رہے ہیں۔ اس سے غرض نہ تھی کہ کوئی تعریف کرتا ہے یا نہیں کرتا۔ انکو اپنے شعر پڑھنے سے کام تھا۔ غزل لکھی تھی:

کہہ دو رقیب سے کہ وہ باز آئے جنگ سے
ہرگز نہیں ہیں یار بھی کم اس دبنگ سے

دل اپنے بے طرح سے پھنسا زلفِ یار میں
نکلے یہ کیونکہ دیکھیے قید فرنگ سے

لب کا بڑھا دیا ہے مزا سبز رنگ نے
ساقی نے پشت دی ہے ساقی کو رنگ سے

آ جائیو نہ پیچ میں ظالم کے دیکھنا
یاری تو تم نے کی ہے تپل اس شوخ و شنگ سے

انکی غزل ختم ہونے کے ساتھ ہی چوبدار نے دوسری شمع اٹھا، مرزا علی بیگ کے سامنے رکھدی۔ یہ بڑے گوڑے چٹے نوجوان آدمی ہیں۔ کسرت کا بھی شوق ہے۔ نازنین تخلص کرتے ہیں۔ دہلی میں بس یہی ایک ریختی گو ہیں۔ ادھر شمع رکھی گئی اُدھر نواب زین العابدین خاں نے

چادریں پھینک دنگل میں اُترے۔ اُترتے ہی دونوں نے "یا علی" کا نعرہ مارا، دو چار ڈھیکلیاں کھائیں، کچھ بڑھ کر مٹی سینے پر ڈالی اور رخم ٹھونک آمنے سامنے آ گئے۔ دونوں کے جسموں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ہاتھی اور چیونٹی کا مقابلہ تھا۔ تمام دنگل میں سناٹا تھا۔ سوئی بھی گرے تو آواز سن لو۔ ہاں آواز تھی تو یا علی کی یا خم ٹھونکنے کی۔ میاں تپل نے لونڈے کا ہاتھ پکڑ جھٹکا دیا۔ وہ آگے کو جھکا، یہ کمر پر آ گئے۔ وہ چپٹ غوطہ مار، ہاتھوں کو چیر نکل گیا۔ انھوں نے اُس کا سیدھا ہاتھ پکڑ دھوبی پاٹ پر کسنا چاہا، وہ توڑ کر کے الگ جا کھڑا ہوا۔ یہ گاودی کرکے اُس کو دبا تو لیتے، لیکن وہ اپنی پھرتی کی وجہ سے ذرا سی دیر میں صاف نکل جاتا۔ آخر ایک دفعہ یہ اُس کو دبا ہی بیٹھے۔ وہ چپکا پڑا رہا۔ انھوں نے ہفتے کس لیے۔ تھوڑی دیر تک اُسکو خوب رگڑا، وہ سہے چلا گیا۔ انھوں نے پہلو میں آ کسکر اُس کا سینہ کھولنا چاہا۔ وہ بھی موقع تاک رہا تھا، یہ کھینچنے میں ذرا غافل ہوئے، اُس نے ٹانگ پر باندھ چوا اڑایا، تو میاں چاروں شانے چت جا پڑے۔ لونڈا آ چک سینے پر سوار ہو گیا۔ "وہ مارا، وہ مارا" کی آوازوں سے دنگل ہل گیا۔ لوگوں نے دوڑ، لونڈے کو گود میں اُٹھا لیا۔ کسی نے یہ بھی پھر کر نہ دیکھا کہ میاں تپل کہاں پڑے ہیں۔ یہ بھی چپکے سے اُٹھ، چادر اوڑھ، منہ لپیٹ ایسے غائب ہوئے کہ پھر کسی نے اُنکی صورت نہ دیکھی۔ دنگل سے کیا گئے ہمیشہ کے لیے دہلی سے گئے۔ تھے بڑے غیرتمند، وہ دن اور آج کا دن، پھر اُنکی صورت نظر نہ آئی۔ خدا جانے کہاں مرکھپ گئے۔

آواز دی "اوڑھنی لاؤ" ایک نوکر فوراً تاروں بھری گہرے سرخ رنگ کی اوڑھنی لیکر حاضر ہوا۔ نازنین نے لے بڑے ناز و انداز سے اس کو اوڑھا، ایک پلو کا بکل مارا دوسرا پلو سامنے پھیلایا اور خاصی بھلی چنگی عورت معلوم ہونے لگے۔ غزل ایسی لڑلڑ کر اور اڑ اڑ کر پڑھی کہ سارا مشاعرہ عش عش کرنے لگا۔ زنت ایسا پیار اکرتے تھے کہ کوئی بیسوا ابھی کیا کرے گی۔ دوسرا شعر تو اس طرح پڑھا کہ گویا "باجی کو جلانے کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہیں۔ قلعے والوں کو تو اس غزل میں بڑا مزہ آیا مگر جو ریختے کے استاد تھے وہ خاموش بیٹھے سنتے رہے۔ غزل یہ تھی

ہوئی عشاق میں مشہور یوسف سا جو ان تا کا — ہوا ہم عورتوں میں تھا بڑا دیدہ زلیخا کا
مجھے کہتی ہیں باجی تو نے تا کا چھوٹے دیور کو — نہیں ڈرنے کی میں بھی ہاں تھیں تاکا تو اب تاکا
اگر اے نازنیں تو دُبلی پتلی کامنی سی ہے — چھریرا سا بدن نام خدا ہے تیرے دولہا کا

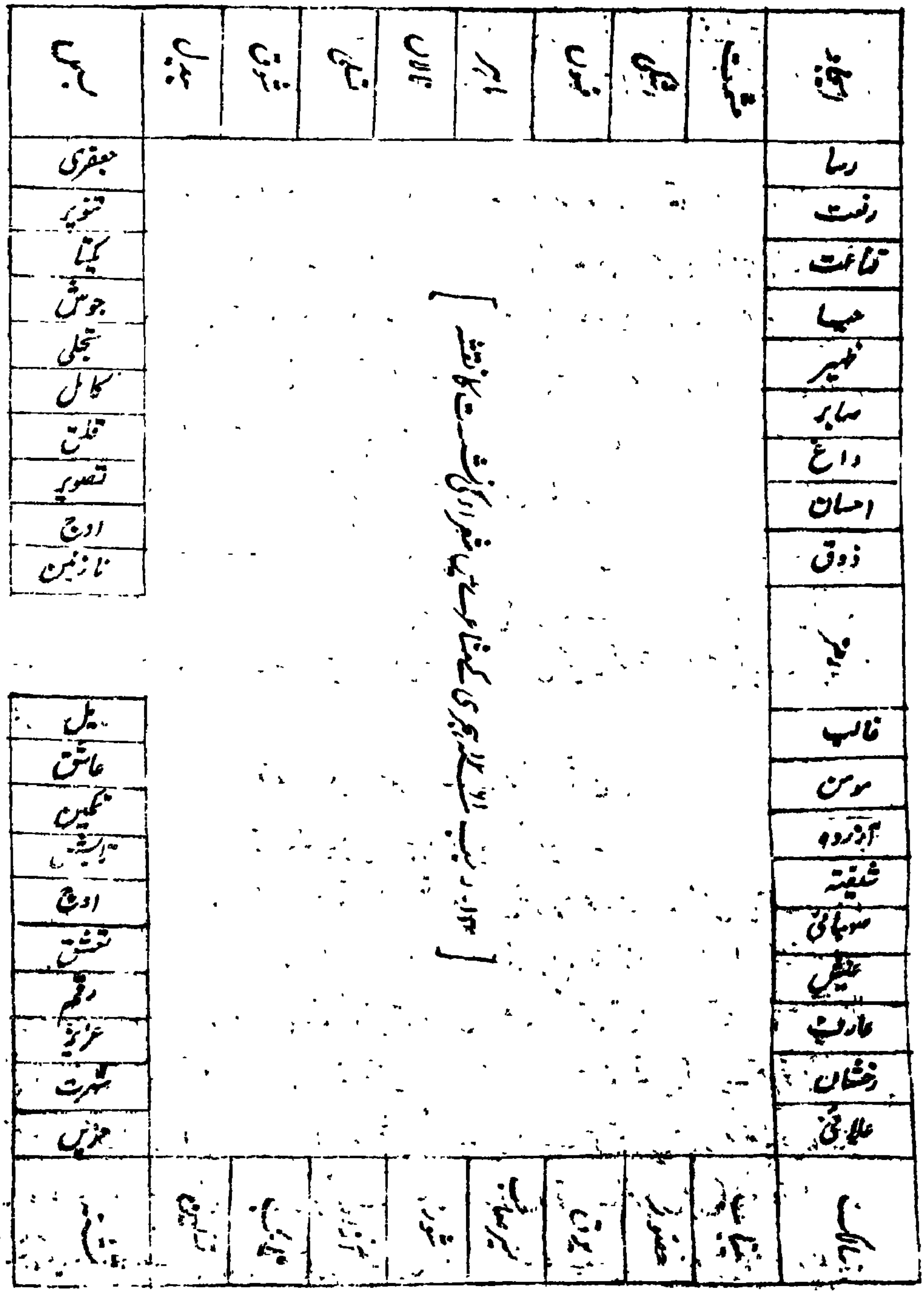
اب دونوں شمعیں اس طرح گردش کرنے لگیں کہ پہلی صف کے سیدھی جانب کا ایک شخص غزل پڑھتا تھا اور پھر اسی طرف کا نیچے ایک نقشہ دیتا ہوں اس سے نشست کی کیفیت پڑھنے والوں کا سلسلہ اور مشاعرے کا انتظام اچھی طرح سمجھ میں آجائیگا (ملاحظہ ہو صفحہ ۳۰)

نازنین کے پڑھنے کے بعد دائیں جانب کی شمع ہٹ کر میاں عاشق کے سامنے آئی۔ یہ بیچارے ایک مزدور پیشہ آدمی ہیں، لکھنا پڑھنا بالکل نہیں جانتے، نہ کسی کے شاگرد ہیں نہ کسی کے استاد۔ شعر خاصہ اچھا کہتے ہیں۔ اس مشاعرے میں ایک شعر تو ایسا نکل گیا ہے کہ سبحان اللہ لکھا ہے:-

فقط تو ہی نہ میرا اے بتِ خونخوار دشمن ہے
ترے کوچے میں اپنا ہر در و دیوار دشمن ہے

غزل میں باقی سارے اشعار تو بھرتی کے تھے مگر اس شعر پر ہر طرف سے بڑی دیر تک واہ واہ ہوتی رہی۔ انکے غزل ختم کرنے پر بائیں طرف کی شمع اٹھا کر عبداللہ خاں آوج کے سامنے رکھدی گئی۔ یہ بڑے پرانے ۴۰، ۴۵ برس کے مشاق شاعر ہیں۔ مضمون کی تلاش میں ہر وقت سرگرداں رہتے ہیں، لیکن ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسے بلند مضامین اور نازک خیالات لاتے ہیں کہ ایک شعر تو کیا ایک قطعہ میں بھی انکی سمائی مشکل ہے، اور کوشش یہ کرتے ہیں کہ ایک ہی شعر میں مضمون کو کھپا دیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مطلب کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ بھلا دوسروں کو تو انکے شعروں میں کیا مزا آئے اور کوئی کیا واہ وا دے، ہاں یہ خود ہی پڑھتے ہیں، خود ہی مزے لیتے ہیں اور خود ہی اپنی تعریف

کردیتے ہیں۔ غزل اس زور شور سے پڑھتے ہیں کہ زور میں آکر صفِ مجلس سے گز دو گز آگے نکل جاتے ہیں۔ اِنکے شاگرد تو دو چار ہی ہیں مگر استاد بھی انکو استاد مانتے ہیں۔ بھلا کس کا بل ہوتا ہے جو انکو استادِ شہ کو کرامت کی لڑائی مول لے۔ ادھر انھوں نے شعر پڑھا اُدھر استاد ذوق یا مرزا غالب



سے نے داد دی۔ داد دینے میں ذرا دیر ہوئی اور انکے تیور بدلے۔ انکے غصے کی بھلا کون تاب لا سکتا ہے چار و ناچار تعریف کرنی پڑتی۔ تب کہیں جا کر یہ ٹھنڈے پڑتے۔ غزل ہوئی تھی

دم کا جو دمدمہ یہ باندھے خیال اپنا — بے پل صراط اتریں یہ ہے کمال اپنا
طفلی ہی سے ہے مجھکو وحشت سرائے نفرت — سُم میں گڑا ہوا ہے آہو کے نال اپنا
کسب شہادت اپنا ہے یاد کس کو قاتل — سانچے میں تیغ کے سر لیتے ہیں ڈھال اپنا
چیچک کے آبلوں کی میں باگ توڑتا ہوں — (رکھ کے) دیوی کے آستاں پر سیمیں ہلال اپنا

آخری شعر پر تو مرزا غالب اُچھل پڑے۔ کہنے لگے واہ میاں اوج اس شعر کے دوسرے مصرعے نے تو غضب ڈھا دیا ہے۔ بھئی واللہ "الفاظ" "رکھ کے" کیا خوب کھپا لئے ہیں۔ یہ سب کا فر ہیں جو تمھیں اُستاد کہتے ہیں، میاں تم تو شعر کے خدا ہو خدا۔" غرض سب اُستادوں نے تعریفوں کے پُل باندھ دیے اور میاں اوج ہیں کہ پھول کر کُپا ہوے جاتے ہیں۔ جب ذرا سکون ہوا تو سیدھی طرف شمع کھسک کر محمد یوسف تمکین کے سامنے آئی۔ اُنکی عمر کوئی ۱۵، ۱۶ سال کی ہوگی۔ مدرسہ دہلی میں طالب علم ہیں۔ غضب کی ظریفانہ طبیعت پائی ہے۔ بات کرنے میں مُنہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ نازک نازک نقشہ، سانولا رنگ، بھرے بھرے ہاتھ پاؤں، جوان ہونگے تو بڑے خوبصورت آدمی نکلیں گے۔ غزل کہی تھی

دوزخ بھی جس سے مانگتا ہر دم پناہ تھا — کس دل جلے کی بار خدایا یہ آہ تھی
خانہ خراب ہو جو ترا عشق بے حیا — ق آئین کونسا تھا یہ کیا رسم و راہ تھی
تو نے جو دل کو میرے صنم خانہ کر دیا — رہتا خدا تھا جس میں یہ وہ بارگاہ تھی
تمکیں کو اک نگاہ میں دیوانہ کر دیا — جادو فریب آہ یہ کس کی نگاہ تھی

میاں تمکین کا دل بڑھانے کو سب نے تعریف کی۔ قطعہ کو کئی کئی دفعہ پڑھوایا۔ اُستاد احسان نے کہا "میاں یوسف! کیا کہنا ہے، خوب کہتے ہو، کوشش کیے جاؤ، ایک نہ ایک دن اُستاد ہو جاؤ گے۔ مگر میاں کسی کے شاگرد ہو جاؤ، بے اُستاد رہے تو بھٹک نکلو گے۔" میاں تمکین نے مسکرا کر کہا "اُستاد! میں کہیں آپ کے حکم سے باہر ہو سکتا ہوں۔ کل ہی انشاء اللہ اُستاد ذوق کی خدمت میں حاضر ہو جاتا ہوں"۔ اُستاد ذوق نے کہا "ہاں بھئی ہاں خوب انتخاب کیا۔ بس یہ سمجھو کہ چند ہی دن میں بیڑا پار ہے"۔ یہاں یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ دوسری شمع غلام احمد تصویر کے سامنے پہونچ گئی۔ ان کو میاں بتن بھی کہتے ہیں۔ الف کے نام بے نہیں جانتے۔ مگر طبیعت

غضب کی پائی ہے۔ پہلے میاں شوق کے شاگرد تھے، بعد میں اُن سے ٹوٹ کر اُستاد ذوق سے آملے
بھاری بدن، مُنڈی ہوئی ڈاڑھی، چھوٹی چھوٹی مونچھیں، گہرا سانولا رنگ۔ جسم پر سوسی کا تنگ
موہری کا پائجامہ، اوپر سوسی ہی کا کرتا، کندھے پر انگوچھے کا رومال، سر پر سوزنی کے کام کی گول ٹوپی،
بیچارے ٹیچہ بندی پر گذر اوقات کرتے ہیں۔ بڑے پُرگو شاعر ہیں، لکھنا پڑھنا تو جانتے ہی نہیں،
اس لیے جو کچھ کہتے ہیں دل و دماغ میں ٹھونستے جاتے ہیں۔ یا واس بلا کی ہے کہ ذرا چھیڑ دو تو
ارگن کی طرح بجنے لگتے ہیں، اور ختم کرنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ کلام ایسا پاکیزہ ہے کہ بڑے بڑے
اُستادوں کے سر ہل جاتے ہیں۔ انکو سنو تو یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ایک اُمّی پڑھ رہا ہے۔ بس یہ
سمجھ لو کہ "الشعراء تلامیذ الرحمن" کی بہترین مثال ہیں۔ غزل کہی تھی

ہجر کی شب تو سحر ہو یا رب — وہ نہ آیا تو قیامت ہی سہی
جان بیکار تو اپنی نہ گئی — اے ستمگر تری شہرت ہی سہی
مجھ سے اتنا تو نہ کھنچیے صاحب — آپ پر میری طبیعت ہی سہی
جذبۂ دل نہیں لایا تم کو — آپ کی نیر عنایت ہی سہی

ہر شعر پر واہ واہ، سبحان اللہ، کے شور سے محفل گونج جاتی تھی۔ غزل تمام ہوئی تو اُستاد ذوق نے حکیم مومن خاں کی طرف دیکھکر کہا "خاں صاحب! یہ میاں تبن بھی غضب کی طبیعت لے کر آئے ہیں۔ کہنے کو تو میرے شاگرد ہیں مگر اب تک انکے کسی شعر میں اصلاح دینے کی مجھے تو ضرورت نہیں ہوئی۔ کل ایک غزل سنائی تھی، میں تو پھڑک گیا۔ ایک شعر تو ایسا بیاختہ نکل گیا ہے کہ تعریف نہیں ہوسکتی۔ ہاں میاں تبن وہ شعر کیا تھا؟" میاں تبن نے ذرا دماغ پر زور ڈالا اور شعر دماغ سے پھسل کر زبان پر آگیا۔ مطلع تھا

برچھی تری نگاہ کی پہلو میں آ لگی — پہلو سے دل میں، دل سے کلیجے میں جا لگی

اور شعر یہ تھا :-

دامن پہ وہ رکھے نہ رکھے دل رُبا لگی — لیکن ہماری خاک ٹھکانے سے آ لگی

حکیم صاحب نے بہت تعریف کی اور کہا "میاں تبن! یہ خدا کی دین ہے، یہ بات پڑھنے پڑھانے سے پیدا نہیں ہوتی۔ میاں خوش رہو، اسوقت دل خوش کر دیا"۔

اسکے بعد شمع محمد جعفر آتش کے سامنے آئی۔ یہ الہ آباد کے رہنے والے ہیں، کچھ عرصہ سے دلی میں آ رہے ہیں۔ بیچارے گوشہ نشین آدمی ہیں۔ شاعری سے دلی لگاؤ ہے۔ کوئی مشاعرہ نہیں

ہوتا جہاں نہ پہونچتے ہوں - غزل میں دو شعر بہت اچھے تھے وہی لکھتا ہوں :-

کبھی بن بادہ رہ نہیں سکتے　　　　تو یہ کچھ ہم کو سازگار نہیں

دل میں خوش ہیں عدو، پہلے تابش　　　　وہ ستمگر کسی کا یار نہیں

مقطع کی کچھ ایسی پیاری بندش بن پڑی ہے کہ سب کے منہ سے بیساختہ واہ، واہ نکلی - مفتی صدر الدین صاحب کی تو یہ حالت تھی کہ پڑھتے تھے اور جھومتے تھے -

تابش کے بعد اُلٹی جانب کی شمع میاں قلق کے آگے گئی - خدا ان سے محفوظ رکھے، بڑے چالاک آدمی ہیں - عبد العلی نام ہے - مدراس کے رہنے والے ہیں، کوئی ۳۰ برس کی عمر ہے، بچپن ہی میں گھر سے نکل کھڑے ہوے، حیدرآباد ہوتے ہوے دہلی آئے - ہزاروں کو تعویذوں کے جال میں پھنسا کر بیڑا کر دیا - انکی شکل سے لوگ گھبراتے ہیں - شاہ صاحب بنے پھرتے ہیں مگر دل کا خدا مالک ہے، شعر خاصہ کہتے ہیں - لکھا تھا

خم شراب سے خم گردوں تو بن گیا　　　　ساقی بنادے ماہ پیالہ اُچھال کے

ہم مشربوں میں چل کے قلق میکشی کرو　　　　جھگڑے وہاں نہیں ہیں حرام و حلال کے

یہ پڑھ چکے تو شمع منشی محمود جان اَوج کے سامنے گئی - انکی غزل میں دو ہی شعر ایسے تھے جنکی تھوڑی بہت تعریف ہوئی، باقی تو سب بھرتی کے تھے :

آنے میں اُس جان جاں کے دیر ہے　　　　کچھ مقدر کا ہمارے پھیر ہے

ہے یقیں وہ جانِ جاں آتا نہیں　　　　موت کے آنے میں پھر کیوں دیر ہے

انکے بعد مرزا کامل بیگ کی باری آئی - یہ سپاہی پیشہ آدمی ہیں، کامل تخلص کرتے ہیں - مشاعرہ میں بھی اونچی بنکر آئے ہیں - غزل اس طرح پڑھی گویا فوج کی کمان کر رہے ہیں - دیکھو لو مضمون میں بھی وہی سپاہیانہ رنگ کی جھلک ہے - انکی غزل میں قطعہ بڑے مزے کا تھا، وہی لکھتا ہوں

مژگاں سے گر بچے دل، ابرو کرے ہے ٹکڑے　　　　یہ بات میں نے کہکر جب اُس سے داد چاہی

کہنے لگا کہ ترکش جسوقت ہو وے خالی　　　　تلوار پھر نہ کھینچے تو کیا کرے سپاہی

اب حکیم محمد نشتق کے پڑھنے کا نمبر آیا - یہ بڑے پایہ کے ادیب ہیں - ۶۳، ۶۴ برس کی عمر ہے - حکمت میں اپنا جواب نہیں رکھتے - غرض کیا کہوں، ایک جامع کمالات شخص ہیں - مگر اپنے

٭ آیندہ یہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں کہ سیدھی طرف کی شمع بڑھی یا اُلٹی طرف کی - بس یہ سمجھ لیجیے کہ پہلے دائیں طرف کا ایک شاعر پڑھتا تھا اور پھر بائیں طرف کا -

آپ کو بہت دور کھینچتے ہیں، اچھا شعر سنتے ہیں تو بیتاب ہو جاتے ہیں، چاہتے ہیں کہ جس طرح میں تعریف کرتا ہوں اسی طرح دوسرے بھی میرے شعر کی تعریف کریں۔ شعر برا نہیں کہتے مگر ایسا بھی نہیں ہوتا کہ مشاعرہ چونک اٹھے اور ہر شخص کے منہ سے بیساختہ واہ واہ نکل جائے۔ اب خود ہی انکا کلام دیکھ لیجیے:

تجھ کو اس میری آہ و زاری پر رحم اے فتنہ گر نہیں آتا
وعدۂ شام تو کیا لیکن کچھ وہ آتا نظر نہیں آتا
تیرے بیمار کا ہے یہ عالم ہوش دو دو پہر نہیں آتا

تعریف تو ہوئی مگر کچھ انکے دل کو نہ لگی، اس لیے ذرا آزردہ ہو گئے۔

انکے بعد شمع میر حسین تجلی کے سامنے آئی۔ یہ میر تقی میر کے پوتے ہیں۔ بڑے ظریف اور نکتہ سنج آدمی ہیں۔ کلام میں وہی میر صاحب کا رنگ جھلکتا ہے۔ زبان پر جان دیتے ہیں۔ غزل تو چھوٹی سی ہوتی ہے مگر جو کچھ کہتے ہیں اچھا کہتے ہیں۔ کیوں نہ ہو، آخر کس کے پوتے ہیں

مری و نا پہ تجھے روز شک تھا اے ظالم یہ سر یہ تیغ ہے، لے اب تو اعتبار آیا
یہ شوق دیکھو پس مرگ بھی تجلی نے کفن میں کھول دیں آنکھیں سنا جو یار آیا

دوسرے شعر پر وہ وہ تعریفیں ہوئیں کہ میاں تجلی کی باچھیں کھل گئیں۔

میاں تجلی پڑھ چکے تو حکیم سکھا نند رقم کی باری آئی۔ انکو میں حکیم مومن خاں صاحب کے مکان پر دیکھ چکا تھا۔ کلام تو ایسا اچھا نہیں ہوتا مگر پڑھتے خوب ہیں۔ جہاں کسی نے ذرا بھی تعریف کی اور انھوں نے سلام کا تانتا باندھ دیا۔ غزل لکھی تھی

بجھاتا آتش دل کا بھی کچھ حقیقت ہے ذرا سا کام تجھے چشم تر نہیں آتا
عدم سے کوچۂ قاتل کی راہ ملحق ہے گیا ادھر جو گزر پھر ادھر نہیں آتا
ہو خاک چارہ گری اس مریض کی تیرے نظر میں تجھ سا کوئی چارہ گر نہیں آتا

تیسرا شعر حکیم مومن خاں صاحب کے رنگ کا تھا، اسکی انھوں نے بہت تعریف کی۔ مگر اسکے ساتھ یہ بھی کہا "میاں رقم! یا تو تم حکمت ہی کرو یا شعر ہی کہو، دونوں چیزوں کا ملا کر چلانا ذرا مشکل کام ہے۔"

شمع کا شیخ نیاز احمد جوش کے سامنے جانا تھا کہ شاگردان ذوق ذرا سنبھل بیٹھے۔ جوش کو استاد ذوق بہت عزیز رکھتے ہیں۔ انکی عمر ۱۸، ۱۹ سال کی ہے مگر بلا کے طباع اور ذہین ہیں۔ انکی سخن گوئی

اور سخن فہمی کی قلعے بھر میں دھوم ہے۔ گر مشاعرے میں انھوں نے جو غزل پڑھی وہ تو مجھے کچھ پسند نہ آئی ہاں قلعے والوں نے واہ واہ کے شور سے مکان سر پر اٹھا لیا۔ اُستاد ذوق نے بھی سبحان اللہ سبحان اللہ کہہ کہہ کر شاگرد کا دل بڑھایا۔ غزل دیکھ لیجیے۔ ممکن ہے کہ میں نے ہی غلط اندازہ لگایا ہو:—

کیونکر وہ ہاتھ آئے کہ یاں زور و زر نہیں
لے دے کے ہے اک آہ سو اُس میں اثر نہیں

قسمت سے درد بھی تو ہوا وہ ہمیں نصیب
جس درد کا کہ چارہ نہیں چارہ گر نہیں

قسمت ہی میں نہیں ہے شہادت وگرنہ یاں
وہ زخم کونسا ہے کہ جو کارگر نہیں

سجدے میں کیوں پڑے ارے اُٹھ شراب پی
لے جوش میکدہ ہے خدا کا یہ گھر نہیں

آپ نے غزل بلاحظہ کر لی۔ میں تو اب بھی یہی کہوں گا کہ کوئی شعر بھی ایسا نہیں جو تعریف کے قابل ہو۔ اب زبردستی کی تعریفیں کرنا دوسری بات ہے۔

اسکے بعد مولوی امام بخش صہبائی کے بڑے فرزند محمد عبدالعزیز کا نمبر آیا۔ یہ عزیز تخلص کرتے ہیں۔ غزل خوب کہتے ہیں۔ کیوں نہ ہو، بڑے باپ کے بیٹے ہیں۔ ہائے! کیا کیا شعر نکالے ہیں۔ کہتے ہیں:—

جوں شمع شغل تیرے سے پایا نیاز کا
جلنا جو سوز کا ہے تو رونا گداز کا

کج فہمیوں سے خلق کی دیکھا کہ کیا ہوا
منصور کو حریف ہونا تھا راز کا

ہم عابدوں کا یار کے آگے جھکانے سر
اور خلق کو گمان ہے ہم پہ نماز کا

مغرور تھا ہی اور وہ مغرور ہو گیا
ان میں گلہ نہیں مجھے آئینہ ساز کا

اوروں کے ساتھ لطف سے تھا صورتِ نیاز
یاں بڑھ گیا دماغ تغافل سے ناز کا

ذرا سچ کہیے گا۔ ساری کی ساری غزل مرصع ہے یا نہیں۔ ہاں اس غزل کی جو تعریف ہوئی وہ بجا ہوئی۔ اُستاد ذوق نے بھی کہا "بھئی صہبائی، تمہارا یہ لڑکا غضب کا نکلا ہے، خدا اسکی عمر میں برکت دے، ایک دن بڑا نام پیدا کرے گا۔ واہ میاں صاحبزادے واہ! کیا کہنا ہے! دل خوش ہو گیا۔ کیوں نہ ہو، ایسوں کے ایسے ہی ہوتے ہیں۔" میاں عزیز نے اُٹھ کر سلام کیا اور بیٹھ گئے۔

میاں عزیز کے بعد شمع خواجہ معین الدین یکتا کے سامنے آئی۔ ان کا کیا کہنا۔ کیا رتبہ پایا ہے۔ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ کبھی کسی کے شاگرد ہوتے ہیں کبھی کسی کے۔ پہلے احسان سے تلمذ تھا، آجکل مرزا غالب کی طرف ڈھلک گئے ہیں۔ سنیے تلون مزاجوں کو نہ کبھی کچھ

کہنا آیا ہے وہ آئیگا - میرا تو بڑا دل خوش ہوا کہ کسی نے تعریف نہیں کی - بڑے چلے ہونگے - بھلا ایسے شعروں کی کوئی خاک تعریف کرتا

اے آہِ شعلہ زا یہ خس و خار بھی نہیں | تو آسماں ہیں وہ بھی نہیں چار بھی نہیں
ہے کس کو تابِ شکوۂ دشمن کہ ضعف سے | لب پر ہمارے تذکرۂ یار بھی نہیں
جینا فراقِ یار میں وعدے کی لاگ پر | آساں اگر نہیں ہے تو دشوار بھی نہیں

ہاں اب جسکے سامنے شمع آئی ہے وہ شاعر ہے - یہ کون ہیں؟ مرزا حاجی بیگ شہرت - گورا رنگ، میانہ قد، کوئی ۳۰، ۳۲ برس کی عمر بڑے بنے سنورے رہتے ہیں - پہلے انہی کے مکان پر مشاعرہ ہوتا تھا، اب تھوڑے عرصہ سے بند ہے - مفتی صدرالدین صاحب کے شاگرد رشید ہیں - کہتے بھی خوب ہیں اور پڑھتے بھی خوب ہیں - بڑی پاٹ دار آواز ہے، پڑھنے کا ڈھنگ ایسا ہے کہ ایک ایک لفظ دل میں اُتر جاتا ہے - ہر شعر پر تعریفیں ہوتیں اور کیوں نہ ہوتیں، ہر شعر تعریف کے قابل تھا - غزل یہ ہے :-

ایک دن وہ دن کہاں تک تو بھی کچھ نقصان کر | یہ تو جلنا روز کا اے سوزِ ہجراں ہو گیا
ہے ترقی جوہرِ قابل ہی کے شایاں کہ میں | خاک کا پتلا بنا، پتلے سے انساں ہو گیا
کفر و دیں میں تھا کچھ عقدہ بجز بندِ نقاب | اسکے کھلتے ہی یہ کارِ مشکل آساں ہو گیا
پہلے دعوے خدائی اُس بتِ کافر کو تھا | کچھ درستی پر جو آج آیا تو انساں ہو گیا

آخری شعر پر تو مرزا غالب کی یہ حالت تھی کہ گویا بالکل مست ہوگئے ہیں، رانوں پر ہاتھ مارتے اور کہتے " واہ میاں شہرت واہ! کمال کردیا، شعر کیا ہے اعجاز ہے - یہ ایک شعر بڑے بڑے دیوانوں پر بھاری ہے - ہاں کیا کہا ہے، سبحان اللہ! پہلے دعوے خدائی اُس بتِ کافر کو تھا
کچھ درستی پر جو آج آیا تو انساں ہوگیا" - غرض اس شعر نے ایک عجیب کیفیت محفل میں پیدا کردی تھی - لوگ خود پڑھتے، ایک دوسرے کو سناتے، مزے لے لے کر جھومتے اور جوش میں واہ واہ اور سبحان اللہ کے نعرے مارتے - بڑی دیر میں جا کر محفل میں ذرا سکون ہوا تو شمع نوازش حسین خاں تنویر کے سامنے گئی - یہ نوجوان آدمی ہیں کوئی ۳۲، ۳۳ برس کے ہونگے - بادشاہ سلامت انکو بہت عزیز رکھتے ہیں - میاں شہرت کے شعر نے وہ جوش پیدا کردیا تھا کہ انکی غزل کسی نے بھی غور سے نہیں سنی - غزل بھی معمولی تھی - صرف یہ قطعہ خاصہ تھا :-

جان کر دل میں مجھے اپنا مریضِ تپِ غم | کہتا لوگوں سے پھرا ہر بتِ عیار ہے کیا

رنگِ رخ زرد ہے، تر چشم ہے، اب پر دمِ سرد
پوچھنا اس سے کہ اس شخص کو آزار ہے کیا

یہ پڑھ چکے تو شمع میر بہادر علی حزیں کے سامنے رکھی گئی۔ یہ بڑے سنجیدہ، متین اور وضعدار آدمی ہیں۔ عارف کے شاگرد ہیں۔ ان کا ایک شعر بڑے مزے کا ہے

سبو سے منہ لگائینگے اب اتنا صبر ہے کس کو
کہ بھرنے خم سے مے شیشے میں اور شیشے سے ساغر میں

جو غزل انھوں نے اس روز مشاعرے میں پڑھی تھی اسکے یہ دو تین شعر اچھے تھے:-

دنیا کی وسعتیں ترے گوشے میں آگئیں
اللہ ری وسعتیں تری اے تنگنائے دل

جل جل کے آخرش تپشِ غم کے ہاتھ سے
اک داغ رہ گیا مرے پہلو میں جائے دل

دکھیا وہ اپنی آنکھ سے جو کچھ سنا نہ تھا
اور دیکھیے حزیں ابھی کیا کیا دکھائے دل

مقطع کو سب نے پسند کیا اور واقعی ہے بھی اچھا۔

اسکے بعد شمع ایسے شخص کے سامنے آئی جو خود شاعر، جس کا باپ شاعر، جسکا بھائی شاعر، جسکا سارا خاندان شاعر۔ یہ کون؟ میاں باقر علی جعفری، فخر الشعراء نظام الدین ممنون کے چھوٹے بھائی، ملک الشعراء قمر الدین منت کے چھوٹے بیٹے۔ انکی غزل میں زور نہ ہوگا تو اور کس کی غزل میں ہوگا۔ دو شعر لکھے ہیں:-

تیغ یوں دل میں خیالِ نگہِ یار نہ کھینچ
ناخدا ترس تو کعبے میں تو تلوار نہ کھینچ

ہے سراپا چمن و دشت میں عالم کے نہ پھر
نازِ ہر گل نہ اٹھا منتِ ہر خار نہ کھینچ

غزل کی جیسی چاہیے ویسی تعریف نہیں ہوئی۔ وجہ یہ ہے کہ یہ رنگ اب دلی سے اٹھتا جاتا ہے۔ اب تو روزمرہ پر لوگ جان دیتے ہیں۔ اس میں اگر مضمون پیدا ہو گیا تو سبحان اللہ۔ مرزا غالب اس رنگ کے بڑے دلدادہ تھے، وہ بھی اسکو اب چھوڑتے جاتے ہیں۔

اسکے بعد منشی محمد علی تشنہ کے پڑھنے کی باری تھی۔ چوبدار انکے سامنے شمع رکھنے میں ذرا ہچکچایا۔ یہ ننگ دھڑنگ مزے میں دو زانو بیٹھے جھوم رہے۔ چوبدار نے مرزا فخرو کی طرف دیکھا۔ انھوں نے آنکھ سے اشارہ کیا کہ رکھ دے۔ اس نے شمع رکھ دی۔ جب شمع کی روشنی آنکھوں پر پڑی تو میاں تشنہ نے بھی آنکھیں کھولیں۔ کچھ سمجھ کر پھونک مار شمع گل کر دی۔ اور کہا "میں بھی کچھ عرض کروں"۔ سب نے کہا "ضرور فرمائیے"۔ انھوں نے نہایت آزادانہ لہجے میں کچھ گاتے ہوئے، کچھ پڑھتے ہوئے یہ غزل سنائی:-

آنکھ پڑتی ہے کہیں، پاؤں کہیں پڑتا ہے
سب کی ہے تم کو خبر اپنی خبر کچھ بھی نہیں

شمع بھی گل بھی ہے، بلبل بھی ہے، پروانہ بھی — رات کی رات یہ سب کچھ ہے، سحر کچھ بھی نہیں
حشر کی دھوم ہے سب کہتے ہیں یوں ہے یوں ہے — فتنہ ہے اک تری ٹھوکر کا مگر کچھ بھی نہیں
نیستی کی ہے مجھے کوچۂ ہستی میں تلاش — سیر کرتا ہوں اُدھر کی کہ جدھر کچھ بھی نہیں
ایک آنسو بھی اثر جب نہ کرے اے تشنہ — فائدہ رونے سے اے دیدۂ تر کچھ بھی نہیں

میں کیا بتاؤں کہ اس غزل کا کیا اثر ہوا - ایک سناٹا تھا کہ زمین سے آسمان تک چھایا ہوا تھا - غزل کا مضمون، آدھی رات کی کیفیت پڑھنے والے کی حالت، غرض یہ معلوم ہوتا تھا کہ ساری محفل کو سانپ سونگھ گیا ہے - ادھر یہ عالم طاری تھا، اُدھر میاں تشنہ ہاتھ جھٹکتے ہوئے، اور "کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں" کہتے ہوئے اُٹھے اور اُسی عالم بیخودی میں دروازے سے باہر نکل گئے انکی "کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں" کی آواز بڑی دیر تک کانوں میں گونجتی رہی جب ذرا طبیعتیں سنبھلیں تو سب کے منہ سے بے اختیار یہی نکلا کہ واقعی کچھ بھی نہیں -

مرزا فخرو نے شمع منگا کر روشن کی اور کہا "ہاں صاحب پھر شروع کیجیے" - شمع حافظ محمد حسن تبسم کے سامنے رکھی گئی - بھلا تشنہ کے بعد انکا کیا رنگ جمتا - اول تو یہ نومشق ہیں، مرزا قادر بخش صابر سے اصلاح لیتے ہیں - دوسرے غزل میں بھی کوئی خاص بات نہ تھی، البتہ مقطع اچھا تھا، غزل ملاحظہ ہو:

دل تو نے ہم سے اوبتِ کافر اُٹھا لیا — اس نازکی پہ بوجھ یہ کیونکر اُٹھا لیا
بارِ گرانِ عشق فلک سے نہ اُٹھ سکا — کیا جانے میرے دل نے یہ کیونکر اُٹھا لیا
پیر مغاں نے تبسمِ میکش کو دیکھکر — شیشہ بغل میں ہاتھ میں ساغر اُٹھا لیا

بہر حال کسی نے سُنا کسی نے نہیں سُنا - کچھ تھوڑی بہت تعریف بھی ہوئی اور شمع میر حسین تسکین کے پاس پہونچ گئی - انکی کوئی ۳۰ برس کی عمر ہوگی - صہبائی کے شاگرد ہیں، مومن سے بھی اصلاح لی ہے - انکا خاندان دہلی میں بہت مشہور ہے، انہی کے دادا میر حیدر نے میر حسن علی وزیر فرخ سیر کو مارا تھا - سپاہی پیشہ آدمی ہیں - شعر بھی برا نہیں کہتے - لکھا تھا: -

۱- ہزار طرح سے کی ہے بڑی تسلیِ دل — کسی کے جانے سے گو تو نہیں قرار مجھے
۲- شبِ وصال میں سننا پڑا فسانۂ غیر — سمجھتے کاش نہ اپنا وہ رازدار مجھے
۳- وہ اپنے وعدہ پہ محشر میں جلوہ فرما ہیں — نہیں ہے ضعف سے انبوہ میں گزر مجھے
۴- مرے تصور سے دیدار میں ہوئی تاخیر — نہ دیکھنا تھا تماشائے روزگار مجھے
۵ مزے یہ دیکھے میں امجازِ عشق میں تسکین — کہ سوجھتا نہیں اپنا مآل کار مجھے

غرض اس غزل نے مشاعرے کا رنگ پھر درست کر دیا اور لوگ ذرا سنبھل کر ہو بیٹھے۔ اُستاد احسان کے شاگرد خواجہ غلام حسین بیدل کے سامنے شمع آئی، اُنھوں نے یہ غزل پڑھی:-

نگہ کی، چشم کی، زلفِ دوتا کی — ہے اک دل جفا کش کس بلا کی
کب اُس گل کی گلی تک جا سکے ہے — ہوا باندھی ہے یاروں نے ہوا کی
بتوں سے ملتے ہو راتوں کو بیدل — تمھیں بھی دن لگے قدرت خدا کی

ساری کی ساری غزل پھسپھسی تھی، بھلا اسکی کون تعریف کرتا - ہاں اسکے بعد جو غزل محمد حسین تائب نے پڑھی اُس میں مزا آ گیا - میاں تائب مولانا شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کے بھتیجے ہیں، اور فخر الشعراء نظام الدین ممنون کے شاگرد - چھوٹی بحر میں ایسی غزل لکھتے ہیں کہ سبحان اللہ - اور پڑھنا تو ایسا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی - غزل تھی

پھر کہاں وار جگر چاک ہوا — پھر کوئی ماہ لقا یاد آیا
کہیے اُس بت کو مشابہ کس کے — دیکھ کر جسکو خدا یاد آیا
عہد پیری میں جوانی کی اُمنگ — آہ کس وقت میں کیا یاد آیا

دوسرے اور تیسرے شعر پر تو یہ حال تھا کہ لوگ تعریفیں کرتے کرتے اور میاں تائب سلام کرتے کرتے جھکے جاتے تھے - جب ذرا جوش کم ہوا تو شمع اُستاد ذوق کے اُستاد غلام رسول شوق کے سامنے آئی - بیچارے بڈھے آدمی ہیں، شاہ نصیر کے شاگرد ہیں، مسجد عزیز آبادی میں امامت کرتے ہیں۔ شروع شروع میں اُستاد ذوق نے انکو اپنا کلام دکھایا تھا - اسی برتے پر یہ اپنے آپ کو اُن کا اُستاد کہا کرتے ہیں - اور اب بھی چاہتے ہیں کہ ذوق اُسی طرح آکر مجھ سے اصلاح لیا کریں - مجھے تو کچھ سٹھیائے ہوئے سے معلوم ہوتے ہیں - غزل جو پڑھی تو واقعی اُس کا مطلع بڑے زور کا تھا - باقی اللہ اللہ خیر صلاح

لکھا ہوا ہے یہ اُس مہ جبیں کے پردے میں — نہیں ہے کوئی اب ایسا زمیں کے پردے میں

اُستاد ذوق کے چھیڑنے کو غالب، مومن، آزردہ، صہبائی غرض جتنے اُستادانِ فن تھے سب نے میاں شوق کی بڑی واہ واہ کی - وہ سمجھے کہ میرے کلام کی تعریف ہو رہی ہے یہ نہ سمجھے کہ بنا رہے ہیں - ذرا کسی نے واہ واہ کی، اور اُنھوں نے اُستاد ذوق کی طرف دیکھ کر کہا "دیکھا! شعر یوں کہتے ہیں" - وہ بیچارے ہنس کر خاموش ہو جاتے - اُنکے ایک آدھ شاگرد نے جواب دینا بھی چاہا، مگر انھوں نے روک دیا -

خدا خدا کر کے ان سے فراغت ہوئی تو شمع آزاد کے سامنے آئی - انکا نام الگزنڈر ہیڈلے؟

قوم کے فرانسیسی ہیں۔ دہلی میں پیدا ہوئے، یہیں تربیت پائی اور یہیں سے توپ خانے کے کپتان ہوکر اور گئے۔ کوئی ۶۲ سال کی عمر ہے، ڈاکٹری بھی جانتے ہیں، شعر و سخن کا بہت شوق ہے۔ عارف کے شاگرد ہیں۔ جہاں مشاعرے کی خبر سنی اور دہلی میں آموجود ہوئے، لباس تو وہی فوجی ہے مگر بات چیت اُردو میں کرتے ہیں۔ ایسی صاف اُردو بولتے ہیں جیسے کوئی دہلی والا بول رہا ہے۔ شعر بھی کچھ بُرے نہیں ہوتے۔ ایک فرانسیسی کا اُردو میں ایسے شعر کہنا واقعی کمال ہے۔ غزل ملاحظہ ہو:-

وہ گرم رو راہِ معاصی ہوں جہاں میں — دھوکا ہے رہا نام نہ اُن میں تری کا

کچھ پاؤں میں طاقت ہو تو گردشت نوردی — ہاتھوں سے مزا دیکھ لو ذرا جیب دری کا

چہلم کو عیادت کیلیے وہ مری آئے — آزاد ٹھکانا بھی ہے اس بے خبری کا

آزاد کے بعد شمع دوسری طرف میر شجاعت علی آسلی کے پاس آئی۔ بیچارے غریب صورت۔ فرسودہ لباس۔ کوئی ۶۴، ۶۵ برس کے آدمی ہیں۔ شاہ نصیر کے بڑے چہیتے شاگردوں میں تھے۔ اپنے زمانہ کے جرأت سمجھے جاتے تھے۔ اب بہت دنوں سے دنیا سے کنارہ کشی کر لی ہے قدم شریف میں رہتے ہیں۔ مشاعرے کی کشش کبھی کبھی انکو دہلی میں کھینچ لاتی ہے۔ پڑھنے کا انداز کچھ ایسا ہے اس طرح پڑھتے ہیں جیسے کوئی باتیں کرتا ہو۔ غزل دیکھ لیجیے۔ معلوم ہوتا ہے کہ عاشق و معشوق میں سوال جواب ہو رہے ہیں۔

کیسی ٹھوکر چڑھی ہے حضرتِ دل — پاؤں پر آ لگے سہرو دہ تو سہی

جب کہا میں نے تیرا مرتا ہوں — ق — قد تم سے مرے اٹھو تو سہی

بولے وہ کیا مزے کی باتیں ہیں — نیز ہے کچھ پہ ہو تو سہی

غیر کی کل وہ لگ کے چھاتی سے — ق — سے کہنے لگے سنو تو سہی

اس لیے ہنس کے ہم گلے سے لگے — کہ ذرا جی میں تم جلو تو سہی

اس غزل کی جیسی تعریف ہونی چاہیے تھی ویسی نہیں ہوئی کیونکہ اب وہ وقت آگیا تھا کہ نیند کے خمار سے سر میں چکر آنے لگے تھے اور بُرے بھلے کی تمیز دشوار ہوگئی تھی۔ اسکے بعد جو دو غزلیں ہوئیں وہ یوں ہی ہو گئیں، نہ کسی نے شوق سے سُنا اور نہ مزہ آیا۔

میر شجاعت علی آسلی کے بعد شور نے غزل پڑھی۔ یہ کوئل کے رہنے والے ہیں۔ قوم کے عیسائی ہیں اور نام جان پیج پیرن ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ کس کے شاگرد ہیں، ہاں اکثر دہلی آتے جاتے رہتے ہیں جو کچھ ہے ہم بہت خفیف سے ہے۔ غزل

عاجز تھا اپنی [illegible] سے دنیا [illegible] [illegible] [illegible] سے [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] ۔۔۔ کھلا دیا [illegible] [illegible] [illegible] زندگی [illegible] لوادتھی
[illegible] [illegible] دے [illegible] [illegible] [illegible] طرف [illegible] [illegible] سجدہ [illegible] تھی

[illegible] [illegible] کی [illegible] [illegible] [illegible] آتے [illegible] کے بڑھنے کی آواز نیند کے
[illegible] [illegible] مصحفی [illegible] سے پہلے شاگرد [illegible] [illegible] انکو [illegible] [illegible] بھی [illegible] کے وقت [illegible] ہیں۔

[illegible] کو خیال [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] آتا [illegible]

[illegible] [illegible] [illegible] شمع [illegible] [illegible] کہ ہر شخص
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] آنکھوں [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] اس سے [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] میر صاحب کے نام
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] پر بیٹھے [illegible] انہوں نے کبھی [illegible] استادوں
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] میر صاحب بھی صف سے
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] آج میں [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] میر صاحب بھی اپنی
[illegible] [illegible] کے سامنے [illegible] [illegible] [illegible] میر صاحب [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] چھپا نہیں [illegible] [illegible] جہاں اٹھے [illegible] [illegible]
[illegible] نہیں آتا [illegible] نام تو شاید کتنی [illegible] جانتے ہوں [illegible] تو جب سنا انکا
نام میر صاحب [illegible] [illegible] ستر برس کی عمر ہے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
طوطے کی چونچ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] اونچا
قد [illegible] [illegible] دہلی کے کسی بچے سے کبھی [illegible] [illegible] [illegible] نہایت صاف
[illegible] سفید [illegible] کا پیجامہ، سفید کرتا، اس پر سفید انگرکھا، سر پر [illegible] ٹوپی
[illegible] [illegible] [illegible] غصہ آتا تھا تو پھر کسی کے سنبھالے نہ سنبھلتے تھے۔ چھوٹا ہو یا
[illegible] کوئی ان سے بغیر مذاق کے بات نہیں کرتا تھا، اور یہ کبھی [illegible] وہ جواب [illegible] کہ منہ
پھیر جائے۔ اس سے انکو غرض نہ تھی کہ جواب ہو بھی گیا یا نہیں۔ شاعر [illegible] سلامت

سے لیکر میاں تمکین تک انکو چھیڑتے تھے۔ انھوں نے نہ انکا بُرا مانا نہ اُن کا۔ جواب دینے میں نہ ان سے رُکے نہ اُن سے۔ غزل ہمیشہ فی البدیہ پڑھتے تھے۔ لکھ کر لانے کی کبھی تکلیف گوارا نہیں کی۔ غزل میں مصرعوں کے توازن کی ضرورت ہی نہ تھی، صرف قافیہ اور ردیف سے کام تھا۔ جو کچھ کہنا ہوا نہایت اطمینان سے نثر میں بیان کرنا شروع کر دیا۔ بیچ میں دوسروں کے اعتراضوں کا جواب بھی دیتے رہے جب کہتے کہتے تھک گئے تو ردیف و قافیہ لا شعر کو ختم کر دیا۔ اُنھوں نے شعر پڑھنا شروع کیا اور چاروں طرف سے اعتراضوں کی بوچھار ہوئی۔ یہ بھلا کب دبنے والے اسامی ہیں، چوگڑا لڑتے؛ جب زبان سے نہ دبا سکتے تو زور میں آکر کھڑے ہو جاتے۔ یہ کھڑے ہوئے اور کسی نہ کسی نے انکو بٹھا دیا، معترض کو ڈانٹا۔ میر صاحب کا دل بڑھایا اور پھر وہی اعتراضوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور تو اور مولوی مملوک العلی صاحب کو ان سے اُلجھنے میں مزا آتا تھا۔ نہ کبھی مولوی صاحب کی وہ خبر لیتے تھے کہ اگر انکا کوئی شاگرد سُن لیتا تو مدرسہ سے مولوی صاحب کا سارا رعب وداب رخصت ہو جاتا۔

میر صاحب نے شمع کے سامنے بیٹھتے ہی سارے محفل پر ایک نظر ڈالی اور کہا "حضرات! میں آج میاں ہُدہُد کی شان میں ایک قصیدہ سناؤں گا! اپنے مُنہ میاں مٹھو، یہ اپنی تعریف خود تو بہت کچھ کر چکے ہیں، اب ذرا دل لگا کر اپنی ہجو بھی سُن لیں"۔

میاں ہُدہُد سے سب جلے بیٹھے تھے، اب جو سُنا کہ اُنکی ہجو ہو رہی ہے اور پھر وہ بھی میر صاحب کے منہ سے، سب نے کہا "ہاں میر صاحب ضرور فرمائیے" میاں ہُدہُد حکیم آغا جان عیش کے پٹھو تھے اور انھیں کے بل پر پُھدکتے تھے۔ اب جو سنا کہ میر صاحب ہُدہُد کی ہجو پر اُتر آئے ہیں تو بہت پریشان ہوئے۔ ڈر تھا کہ کہیں مجھکو بھی نہ لپیٹ لیں۔ دوسرا کوئی ہوتا تو جواب بھی دیا جاتا لیکن میر صاحب کی ہجو ہوئی کا کون جواب دے سکتا ہے۔ اور تو کچھ بن نہ پڑا، میاں ہُدہُد کو گاؤ تکیہ کے پیچھے غائب کر دیا۔ اب جو میر صاحب ادھر نظر کرتے ہیں تو ہُدہُد ندارد، وہیں بہت گھبرائے۔ ادھر دیکھا اُدھر دیکھا، جب کسی طرف نظر نہ آئے تو کہا "ہجو ملتوی کرکے اب میں غزل پڑھتا ہوں" سب نے کہا "ہیں ہاں میر صاحب یہ آپ نے ارادہ کیوں تبدیل فرما دیا، پڑھیے میر صاحب! خدا کے لیے پڑھیے

---

* غدر کے بہت بعد میر صاحب کا انتقال ہوا ہے۔ میاں کالے صاحب کے فرزند میاں نظام الدین صاحب کے مکان پر جو مشاعرہ ہوتا تھا اُسمیں بھی یہ شریک ہوتے تھے۔ اس مشاعرہ کے دیکھنے والے اب بھی دہلی میں بہت سے موجود ہیں۔ انھی لوگوں کی زبانی میر صاحب کے حالات معلوم ہوئے اور درج کیے گئے۔ تذکروں میں تو ان بیچارے کا کہیں ذکر آتا نہیں۔

سودا کے بعد ہجو تو اردو زبان سے اٹھ ہی گئی۔ اگر آپ بھی اس طرف توجہ نہ کریں گے تو غضب ہو جائیگا، زبان ادھوری رہ جائیگی"۔ میر صاحب نے کہا "نا بھئی نا، میاں منھ پر ہوتے تو ہم کو جو کچھ کہنا تھا انکے منہ پر کہتے، انکے پیٹھ پیچھے انکو کچھ کہنا ہجو نہیں، غیبت ہے اور میں غیبت کرنے والوں پر لعنت بھیجتا ہوں"۔ جب میر صاحب کا یہ رنگ دیکھا تو حکیم آغا جان کے دم میں دم آیا۔ انھوں نے بھی اس ہجو اور غیبت کے فرق کے متعلق چند مناسب الفاظ کہے، اور خدا خدا کر کے یہ آفت ٹلی۔

اب میر صاحب نے غزل شروع کی۔ کیا پڑھا، خدا ہی بہتر جانتا ہے، بس اتنا تو معلوم ہوا کہ تیر، پیر، کھیر قافیہ اور "ہے" ردیف ہے۔ اسکے علاوہ ہم تو کیا، خود میر صاحب بھی نہیں بتا سکتے کہ انھوں نے کیا پڑھا اور مضمون کیا تھا۔ جہاں قافیہ اور ردیف آئی لوگوں نے سمجھ لیا کہ شعر پورا ہو گیا، اور تعریفیں شروع ہو گئیں۔ کسی نے ایک آدھ اعتراض بھی جڑ دیا۔ اعتراض ہوا اور میر صاحب بگڑے۔ انکے بگڑنے میں سب کو مزا آتا تھا۔ اعتراضوں اور میر صاحب کے جوابوں کا رنگ بھی دیکھ لیجیے۔ غزل میں میر صاحب نے جو ایک مصرعے کو کھینچنا شروع کیا، تو اتنا کھینچا، اتنا کھینچا کہ شیطان کی آنت ہو گیا۔ مولوی ملوک العلی صاحب نے کہا "اجی میر صاحب! یہ مصرعہ بحر طویل میں جا پڑا"۔ میر صاحب نے کہا "مولوی صاحب کبھی بحر طویل دیکھی بھی ہے یا یوں ہی سنی سنائی باتوں پر اعتراض ٹھونک دیا۔ پہلے مطول پڑھیے، مطول[1]، جب معلوم ہوگا کہ بحر طویل کس کو کہتے ہیں"۔ مولوی صاحب بڑے چکرائے، کہنے لگے "میر صاحب بھلا مطول کو بحر طویل سے کیا واسطہ، اور اس گھڑنا کہنے آنکھ، آپ کا جو جی چاہتا ہے کہہ جاتے ہیں"۔ میر صاحب کو اب کسی حمایتی کی تلاش ہوئی۔ مولانا صہبائی کی طرف دیکھا۔ انھوں نے کہا "مولوی صاحب! مطول میں بحر طویل کی بحریں نہیں تو اور کیا ہے، آپ بھی ہمارے میر صاحب کو اپنی علمیت کے داؤ سے خاموش کر دینا چاہتے ہیں"۔ بس اتنی مدد ملنی تھی کہ میر صاحب شیر ہو گئے۔ کہنے لگے، "جی ہاں مولوی صاحب آپ سمجھے ہونگے کہ آپ کے سوا کسی نے مطول پڑھی ہی نہیں۔ اجی حضرت میں تھوڑے زمانہ اسکے دو دو ورق روز پڑھ ڈالا، کل ہی اس کی ایک بحر میں غزل لکھنے بیٹھا تھا، لکھتے لکھتے تھک گیا، ایک مصرعہ کوئی پونے دو سو صفحے پر لکھا، وہ تو کہو کہ بیاض کے صفحے ہی ختم ہو گئے، جو مصرعہ ختم ہوا، ورنہ خدا معلوم اور کتنے صفحے جاتا"۔ ... نے کہا "میر صاحب! آپ

---

[1] علم کلام پر حضرت امام غزالی کی ایک مشہور تصنیف کا نام مطول ہے۔

[illegible] مولوی صاحب نے بحر طویل تو ماں دیکھی۔ مجھ سے پوچھو میر سے۔ کھینچے [illegible] فرما دیا۔ [illegible] مولوی صاحب [illegible] خواجہ امان کو [illegible] نے ایک کتاب داستان خیال لکھی ہے یہ بڑی اور یہ موٹی بارہ جلدیں [illegible] ساری جلدیں ختم ہو گئی ہیں۔ آپ کا مصرعہ بحر طویل میں نہیں، [illegible] بحر طویل [illegible] میر صاحب نے بڑے زور سے "ہیں" کی اور بگڑ کر کہا "واہ مرزا صاحب [illegible] چلتے چلتے بھول گئے۔ رباعی کی بحریں آپ کو معلوم بھی ہیں؟ بھلا بتائیے تو سہی کونسی [illegible]" مرزا غالب ذرا چپ ہوئے تو خود میر صاحب نے کہا۔ [illegible] یہ تو پہلے ہی جانتا تھا کہ آپ نے [illegible] اعتراض کر دیا ہے۔ مرزا صاحب! اربعین* پڑھیے جب معلوم ہو گا کہ رباعی کی بحریں کون کون سی ہیں۔"

غرض اسی طرح کی خوش مذاقی میں کوئی گھنٹہ بھر گزر گیا۔ ہنستے ہنستے جو آنسو نکلے انھوں نے نیند کے خمار سے آنکھیں صاف کر دیں [illegible] ایسا معلوم ہونے لگا گویا مشاعرے کا [illegible] شروع ہو رہا ہے اور سب لوگ تازہ دم ہو کر آ بیٹھے ہیں۔ جب لوگ اعتراض کرتے [illegible] اور میر صاحب جواب دیتے دیتے تھک گئے تو ایک [illegible] میر صاحب نے کہا "حضرات! غزل ختم ہو گئی" سب نے کہا "میر صاحب! ابھی مقطع تو آیا ہی نہیں۔ [illegible] غزل۔" میر صاحب نے فرمایا "مقطع کی اس شاعر کو ضرورت ہے جو پہچانا چاہے [illegible] مجھے [illegible] ضرورت نہیں، ہماری غزل کی یہی پہچان ہے، جہاں شروع کی [illegible] معلوم ہو گیا کہ یہ میر صاحب [illegible] کسی کی نہیں ہو سکتی۔" یہ کہتے کہتے انھوں نے اپنا جزدان گردانا اور اپنی جگہ آ بیٹھے۔ ایک شمع اٹھا کر میر صاحب کے عین مقابل کے شاعر مرزا [illegible] شاہ آہر کے سامنے رکھ دی گئی۔ یہ شاہ عالم بادشاہ غازی انار اللہ برہانہ کے پوتے اور [illegible] کے شاگرد ہیں۔ کلام صاف اور زبان بڑی میٹھی ہے۔ لکھا تھا:

ہم بھی ضرور کعبے کو چلتے پر اب تو شیخ	قسمت سے بتکدے ہی میں دیدار ہو گیا
ناصح کی بات سننے کا کس کو یہاں دماغ	تیرا ہی ذکر تھا کہ میں ناچار ہو گیا
اے ہمنشیں وہ حضرت [illegible] ہوں کہیں	اک پارسا سنا ہے کہ میخوار ہو گیا

میر صاحب کے کلام نے [illegible] آنکھوں سے نیند کا خمار اتار دیا تھا۔ اس لیے اس

---

* اربعین فی اصول الدین حضرت امام غزالی (رح) کی ایک مشہور تصنیف ہے۔ جس کو میر صاحب نے رباعیوں کی بحروں سے متعلق کر دیا۔

غزل کی جیسی چاہیے ویسی تعریف ہوئی اور میاں ماہر کو محنت کا پورا پورا صلہ مل گیا۔
انکے بعد شمع قاضی نجم الدین برق کے سامنے آئی ۔ یہ سکندر آباد کے رہنے والے ہیں۔ کوئی ۲۰، ۲۲ برس کی عمر ہے ۔ سر پر لمبے لمبے بال، سانولی رنگت، اس میں سنہری جھلکتی ہوئی، اونچا قد، وجیہ صورت، سفید غرارے دار پائجامہ، سفید انگرکھا، دو پلڑی ٹوپی، بڑے خوش مزاج، شیریں کلام، ہنس مکھ، بذلہ سنج، وارستہ مزاج، رند مشرب آدمی ہیں۔ پہلے مومن خاں کے شاگرد تھے، پھر انکے ایما سے میاں تسکین کو کلام دکھانے لگے۔ آواز بڑی دلکش اور طرز ادا خوب ہے غزل بھی ایسی پڑھی کہ واہ واہ کہتے ہیں

بزم اغیار رہے، ڈر ہے نہ خفا تو ہو جائے ورنہ اک آہ میں کھینچوں تو ابھی ہُو، ہو جائے
حرم و دیر کے جھگڑے ترے چھپنے سے پڑے ورنہ تو پردہ اُٹھا دے تو تو ہی تو ہو جائے
کچھ مزہ ہے یہ ترے روٹھ کے من جانے کا چاہتا ہوں یوں ہی ہر روز خفا تو ہو جائے
تو تو جس خاک کو چاہے وہ بت بندۂ پاک میں خدا اسکو بناؤں جو خفا تو ہو جائے
آپ انکار کریں وصل سے میں درگزرا کچھ تو ہو جس سے طبیعت مری یکسو ہو جائے
ہو نہ ہو بس میں کوئی کچھ نہیں اس کی پروا دل جتا ہے یہ اے برق جو قابو ہو جائے

اللہ اللہ! در و دیوار سے بیخودی برس رہی تھی۔ جب یہ مصرعہ پڑھا" میں خدا اُس کو بناؤں جو خفا تو ہو جائے" تو ساری محفل پر ایک مستی سی چھا گئی۔ اور تو اور اُستادان فن کی بھی یہ حالت تھی کہ بار بار شعر پڑھواتے، خود پڑھتے اور مزے لیتے تھے۔
ابھی انکی تعریفیں ختم نہ ہوئی تھیں کہ شمع مرزا منجھلے المتخلص بہ فسوں کے سامنے رکھی گئی۔ یہ نوجوان آدمی ہیں۔ مرزا کریم بخش مرحوم کے فرزند اور حضرت ظل سبحانی کے نواسے ہیں۔ ان کا کیا کہنا۔ زبان تو انکے گھر کی لونڈی ہے۔ گا کر غزل پڑھتے ہیں، پڑھتے کیا ہیں جادو کرتے ہیں۔ انکی غزل کے دو شعر لکھتا ہوں۔

اللہ رے جذبۂ دل مضطر کہ تیر کا باہر ہمارے پہلو کے سوفار بھی نہیں
کچھ آپ ہی آپ یہ مرا دل بیٹھا جائے ہے ظاہر میں تو الٰہی میں بیمار بھی نہیں

دوسرے شعر میں الفاظ کیا بٹھائے ہیں، نگینے جڑ دیے ہیں۔ آخر کیوں نہ ہو، قلعہ کے رہنے والے ہیں۔
انکے بعد سیدھی جانب سے شمع سرک کر لالہ بالکند حضور کے سامنے آئی۔ یہ ذات کے کھتری اور خواجہ میر درد کے شاگرد ہیں۔ کوئی ۷۰، ۸۰ برس کا سن ہے۔ سفید نورانی چہرہ، اُس پر سفید

لباس، بغل میں انگوچھا، کندھوں پر سفید کشمیری رومال۔ بس جی چاہتا تھا کہ انکو دیکھے جائیے۔ شمع سامنے آئی تو انھوں نے عذر کیا کہ میں اب سنانے کے قابل نہیں رہا، سننے کے قابل رہ گیا ہوں۔ جب سبھوں نے اصرار کیا تو انھوں نے یہ قطعہ پڑھا۔

نہ پاؤں میں جنبش نہ ہاتھوں میں طاقت ــــ جو اٹھ کھینچیں دامن ہم اُس دلربا کا
سرِ راہ بیٹھے ہیں اور یہ صدا ہے ــــ کہ اللہ والی ہے بے دست و پا کا

قطعہ اس طرح پڑھا کہ خود تصویر ہو گئے۔ "نہ پاؤں میں طاقت" کہتے ہوئے اُٹھے مگر پاؤں نے یاری نہ کی، لڑکھڑا کر بیٹھ گئے۔ "نہ ہاتھوں میں طاقت" کہہ کر ہاتھ اٹھائے مگر ضعف سے وہ بھی کچھ یوں سے اُٹھ کر رہ گئے۔ دوسرا مصرعہ ذرا تیز پڑھا تیسرا مصرعہ پڑھتے وقت اس طرح بیٹھ گئے جیسے کوئی بے دست و پا سرِ راہ بیٹھ کر صدا لگاتا ہے۔ اور ایک دفعہ ہی دونوں آنکھوں کو آسمان کی طرف اٹھا کر چوتھا مصرعہ پڑھا تو یہ معلوم ہوتا تھا گویا ساری مجلس پر جادو کر دیا۔ ہر ایک کے منہ سے تعریف کے بجائے بیاختہ یہی نکل گیا "کہ اللہ والی ہے بے دست و پا کا"۔ استاد ذوق نے کہا "استاد یہ خدا کی دین اور خواجہ میر درد کا فیض ہے۔ سبحان اللہ! کیا موثر کلام ہے۔ ہم دنیاداروں میں یہ اثر پیدا ہونے کے لیے میر درد ہی جیسا استاد چاہیے۔"

اس کلام کے بعد مرزا غلام محی الدین عشقی کی غزل بھلا کون سنتا۔ یہ شاہ عالم بادشاہ غازی کے پوتے ہیں، کوئی ۴۰ سال کی عمر ہے۔ اونچا قد، سفید پوش، ثقہ صورت آدمی ہیں۔ پہلے نظام الدین ممنون سے اصلاح لیتے تھے، اب مفتی صدرالدین کے شاگرد ہو گئے ہیں۔ لکھا تھا:

کچھ وجد نہیں نغمۂ مطرب ہی پہ موقوف ــــ کافی ہے یہاں نالۂ بے ربط درا کا
سجدے میں گرے دیکھ کے تصویرِ بت عشقی ــــ معلوم ہوا آپ کا خرقہ تھا ریا کا

انکے بعد شمع صاحبزادہ عباس علی خاں بیتاب کے سامنے آئی۔ ۳۰-۳۲ کا سن ہوگا۔ رامپور کے رہنے والے اور مومن خاں کے شاگرد ہیں۔ نواب مصطفٰے خاں شیفتہ سے بڑی دوستی ہے۔ انھی کے ساتھ مشاعرے میں آگئے تھے۔ بڑی اونچی آواز میں غزل پڑھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تحت اللفظ پڑھ رہے ہیں۔ غزل تو کچھ اچھی نہ تھی مگر قطعہ ایسا تھا کہ تعریف نہیں ہوسکتی۔ میخانے کی تقسیم اس خوبی سے کی تھی کہ سبحان اللہ۔ ہائے لکھا ہے

معمور ہے خدا کی عنایت سے میکدہ ــــ ساقی اگر نہیں ہے نہ ہو، مے سے کام ہے
بیتاب پی، خدا نے تجھے بھی دیے ہیں ہاتھ ــــ یہ خم ہے، یہ سبو ہے، یہ شیشہ، یہ جام ہے

بھلا ایسے مشاعرے میں مرزا فخرالدین حشمت کو پڑھنا کیا ضرور تھا۔ نہ کلام اچھا ہے نہ پڑھنے کی طرز ہی اچھی۔ مگر انکو کون روک سکتا تھا۔ شہزادے تھے اور وہ بھی شاہ عالم بادشاہ کے پوتے۔ خیر پڑھ لیا اور بھائی بندوں نے تعریفیں بھی کر دیں۔ خوش ہو گئے۔ غزل یہ تھی

ترے بیمار ہجراں کا ترے بن　　یہ عالم ہے کہ عالم نوحہ گر ہے

مجھے روتے جو دیکھا ہنس کے بولے　　مرے حشمت بتا کیوں چشم تر ہے

ہاں انکے بعد جسکے سامنے شمع آئی وہ نوجوان سہی مگر شاعر ہے! اور ایسا شاعر ہوگا کہ ہندوستان بھر میں نام پیدا کرے گا۔ بھلا کونسا مشاعرہ ہے جس میں مرزا قربان علی بیگ سالک کی غزل شوق سے نہیں سنی جاتی۔ اور کونسا شعر ہوتا ہے جو بار بار نہیں پڑھوایا جاتا۔ جو ایک دفعہ بھی کسی مشاعرہ میں گیا ہے وہ انکو دور سے پہچان لے گا۔ چھوٹا سا قد، دبلے پتلے ہاتھ پاؤں، موٹی سی ناک، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، موٹی جلد، گندمی رنگ، اس پر چیچک کے داغ، چھدری چھوٹی سی ڈاڑھی، گلوں پر کم، ٹھوڑی پر ذرا زیادہ۔ سر پر خشخاشی بال۔ کوئی ۳۰ سال کی عمر، بس بخارا کے ترک معلوم ہوتے ہیں، ہاں لباس ان لوگوں سے مختلف ہے۔ نیچی چولی کا انگرکھا، تنگ موہری کا پائجامہ، سر پر سفید گول ٹوپی، ہاتھ میں سفید لٹھے کا رومال۔ شمع کا انکے سامنے آنا تھا کہ سب سنبھل کر بیٹھ گئے۔ انھوں نے بھی انگرکھے کی آستین الٹ، ٹوپی کو اچھی طرح جما، اپنے استاد مرزا غالب کی طرف دیکھا۔ ادھر سے مسکرا کر کچھ اشارہ ہوا تو انھوں نے صاحب عالم کی طرف دیکھ کر عرض کی "اجازت ہے؟" مرزا فخرو نے کہا "ہاں میاں سالک پڑھو آخر اس میں اجازت کی ضرورت ہی کیا ہے"۔ سالک نے جیب میں سے کاغذ نکالا، کچھ الٹا پلٹا، پھر ایک بار سنبھل کر کہا، "عرض کیا ہے"

۱۔ انتہائے صبر آزمائی کی　　ہے درازی شب جدائی کی

۲۔ ہے برائی نصیب کی کہ مجھے　　تم سے امید ہے بھلائی کی

۳۔ نقش ہے سنگ آستاں پہ ترے　　داستاں اپنی جبہہ سائی کی

۴۔ ہے فغاں بعد امتحان فغاں　　پھر شکایت ہے نارسائی کی

۵۔ کیا نہ کرتا وصال شادی مرگ　　تم نے کیوں مجھ سے بیوفائی کی

۶۔ راز کھلتے گئے مرے سب پر　　جسقدر تُو نے خود نمائی کی

۷۔ کتنے عاجز ہیں ہم کہ پاتے ہیں　　بندہ بندوں میں بو خدائی کی

۸۔ رہ گئیں دل میں حسرتیں سالک　　آگئی عمر پارسائی کی

ایک ایک شعر پر یہ عالم تھا کہ مجلس لوٹی جاتی تھی - ایک ایک شعر بار بار پڑھوایا جاتا تھا۔ ایک ایک لفظ پر تعریفیں ہوتیں اور ایک ایک بندش کی داد ملتی - اُستاد ذوق نے تیسرے شعر پر کہا "واہ میاں سالک کیا کہنا ہے، سب ہی جبہہ سائی باندھتے آئے ہیں، تمہاری داستاں کو کوئی نہیں پہونچا - کیا کلام ہے، کیا روانی ہے، سبحان اللہ"۔ حکیم مومن خاں نے کہا "میاں سالک یہ جوانی اور مقطع میں یہ بوڑھا مضمون، تمہاری عمر یار سائی" کو بہت دن پڑے ہیں، ابھی سے تو بڈھوں کی باتیں نہ کیا کرو"۔ میاں سالک نے جواب دیا" اُستاد میں تو جوانی ہی میں بوڑھا ہوگیا، دیکھیے بڑھاپا دیکھنا عیب بھی ہوتا ہے یا نہیں، پھر دل میں آئے ہوئے مضمون کو کیوں چھوڑ دوں، بعد میں یہ کون دیکھتا پھرے گا کہ یہ شعر بڈھے نے کہا تھا یا جوان نے - ہم نہ رہیں گے مضمون رہ جائیگا"۔

جب تعریفوں کا سلسلہ ذرا رکا تو شمع مرزا رحیم الدین ایجاد کے سامنے آئی - یہ شہزادے مرزا حسین بخش کے صاحبزادے اور مولانا صہبائی کے شاگرد ہیں - کوئی ۲۴، ۲۵ سال کی عمر ہے - شعر کہتے ہیں مگر پھیکے ہاں پڑھتے بڑی اچھی طرح ہیں - گانا خوب جانتے ہیں - انکی آواز شعر کی کمزوری ظاہر ہونے نہیں دیتی

بتخانے میں تھا یا کہ میں کعبے کے قریں تھا — اے زاہد ناداں تجھے کیا ہے میں کہیں تھا
ہر چند کہ میں دوست کے ہمراہ نہیں تھا — پر دل تو ملا ہے، وہ جہاں تھا وہیں تھا
توڑا ہے یہ کچھ آپ کو میں نے کہ جہاں میں — ثابت نہ رہا نام کا جو میرے نگیں تھا

غزل میں تو کیا خاک مزا آتا، ہاں اسکے گانے میں مزا آگیا - گا کر پڑھنے کا یہ نیا رنگ دلی سے چلا ہے، مگر اُستادانِ فن اسکو پسند نہیں کرتے -

اسکے بعد شمع نواب علاؤ الدین خاں علائی کے سامنے آئی - اُنھوں نے بہت اونچی آواز میں اپنی غزل سنائی - علائی مرزا غالب کے بڑے چہیتے شاگرد ہیں، ابھی نو عمر ہیں، بڑے ہوکر اچھے شاعر نکلیں گے -

شمع کا سامنے رکھنا تھا کہ مرزا کریم الدین رسا سنبھل کر بیٹھ گئے - ایک بڑی لمبی غزل پڑھی، مگر ساری کی ساری بے مزا - نہ الفاظ کی بندش اچھی نہ مضامین میں کوئی خوبی - تعقید ہوں سے اُلجھن پیدا ہوتی تھی اور رعایت لفظی سے جی گھبراتا تھا انکے بس دو ہی شعر نمونے کے طور پر لکھ دینا کافی سمجھتا ہوں

باز آ، ستا تو مجھ کو بہت عشوہ گر نہیں — کرتا کسی پہ ظلم کوئی اس قدر نہیں

گو نزع میں ہوں میں ترے بن آئے جان من کرنے کی جان بھی مرے تن سے سفر نہیں

یہ پڑھ چکے تو نواب ضیاء الدین خاں نیّر ودرخشاں کے پڑھنے کی باری آئی۔ فارسی کے شعر خوب کہتے ہیں، اُردو کی غزلیں ذرا پھیکی ہوتی ہیں، لکھا تھا۔

پی کے گرنے کا ہے خیال ہمیں ساقیا لیجیو سنبھال ہمیں
شب نہ آئے جو اپنے وعدے پر گزرے کیا کیا نہ احتمال ہمیں
دل میں مضمر ہیں سینے باقی کسی صورت نہیں زوال ہمیں
تیرے غصے نے ایک دم میں کیا مردہ؛ نہ ہزار سال ہمیں
طالع بد سے نیّر رخشاں اپنے ہی گھر میں ہے وبال ہمیں

انکے بعد شمع مرزا پیارے رفعت کے سامنے آئی۔ یہ سلاطین زادے ہیں۔ شیریں پڑھنے کا بڑا شوق ہے۔ شعر بھی خوب کہتے ہیں، پڑھتے بھی خوب ہیں۔ پہلے احسان کے شاگرد تھے اب مولانا صہبائی سے تلمذ ہے۔ کوئی ۴۰ سال کی عمر ہوگی؛ لکھا تھا:-

بیانِ طائرِ رنگِ پریدہ وحشت سے کسے دماغ ہے اب آشیاں بنانے کا
نہ عذر تھا ہمیں ہونے میں خاک کے، گر ہم یہ جانتے کہ وہ دامن نہیں بچانے کا
گندھی تھی کون سی بہشت تشنہ لب کی وہ خاک کہ جس سے خُم یہ بنا ہے شراب خانے کا
یہ ذوق یار کو دے رخصتِ جفا کہ یہاں ہمیں بھی عزم ہے طاقت کے آزمانے کا
ہیں ایک وہ بھی کہ تم سے ہے جنکو راز و نیاز اور ایک ہم ہیں کہ تکتے ہیں منہ زمانے کا

آخری شعر میں مایوسی کی جو تصویر کھینچی ہے اُسکی تعریف نہیں ہوسکتی۔ کوئی نہ تھا جو اس شعر کے دوسرے مصرعہ کو پڑھ پڑھ کر نہ جھومتا ہو، اور واہ واہ سبحان اللہ نہ کہتا ہو۔ ہوتے ہوتے میاں عارف کا نمبر آ ہی گیا۔ بھلا انکو مشاعرے کے انتظام سے کب فرصت تھی جو غزل لکھتے پھر بھی چلتے پھرتے کچھ لکھ ہی لیا تھا، وہی پڑھ دیا۔ اس دن رات کی گردش کے بعد اتنا بھی لکھ لینا کمال ہے۔ غزل تھی

اُٹھتا قدم جو آگے کو لے نامہ بر نہیں پیچھے تو چھوڑ آئے کہیں اُسکا گھر نہیں
اوروں کو ہو تو ہو، ہمیں مرنے سے ڈر نہیں خط لیکے ہم ہی جاتے ہیں گر نامہ بر نہیں
بے التفاتیوں کا تری شکوہ کیا کریں اپنے ہی جب کہ نالہ دل میں اثر نہیں

مقطع کی سب نے تعریف کی۔ اُستاد احسان نے کہا "میاں عارف! تم بھی شعر کہنے لگے

بڈھا ہوگیا ہوں، لاکھوں شعر سُنے، لاکھوں سُنائے، مگر یہ مضمون بالکل نیا ہے، اور کس خوبی سے ادا کیا ہے کہ دل خوش ہوگیا۔"

میاں عارف کے بعد شمع مرزا غلام نصیر الدین عرف مرزا منجھلے کے سامنے آئی۔ یہ شہزادے ہیں احسان کے شاگرد ہیں، اور قناعت تخلص کرتے ہیں۔ غزل خاصی کہتے ہیں۔ میں تو یہی کہوں گا کہ شہزادوں میں بہت کم ایسے شاعر ہونگے۔ غزل تھی۔

شوق کو کثرتِ نظارہ پہ رشک آتا ہے
حشر سے پہلے میسر ہو وہ دیدار مجھے

کعبے تک جانے میں تھی خاطرِ زاہد ورنہ
دیر میں بھی تھی سدا رخصتِ دیدار مجھے

جنس دزدیدہ کی مانند ہے اُلجھاؤ میں جان
کہ نہ لیتا ہے نہ پھیرے ہے خریدار مجھے

رازِ دل لب پہ نہ لاتا کبھی منصور کہ یاں
کر دیا بات کے کہنے نے گنہگار مجھے

شمع کا حکیم آغا جان عیش کے سامنے آنا تھا کہ لوگوں میں سرگوشیاں شروع ہوئیں۔ حکیم صاحب بادشاہی اور خاندانی طبیب ہیں۔ زیورِ علم سے آراستہ اور لباسِ کمال سے پیراستہ، صاحب اخلاق، خوش مزاج، شیریں کلام، شگفتہ صورت، جب دیکھو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسکرا رہے ہیں۔ طبیعت ایسی ظریف و لطیف اور لطیفہ سنج پائی ہے کہ سبحان اللہ۔ میانہ قد، خوش اندام۔ سر پہ ایک ایک انگل بال سفید۔ ایسی ہی ڈاڑھی، اس گوری سرخ و سفید رنگت پر کیا بھلی معلوم ہوتی ہے۔ گلے میں ململ کا کُرتا، جیسے چنبیلی کا ڈھیر پڑا ہنس رہا ہے۔ مگر کچھ دنوں سے اُنکے دوست بھی اُن سے ذرا کھنچ گئے تھے۔ میاں ہُد ہُد کو پال کر انھوں نے سب سے لگا ڈلی۔ شروع شروع میں تو اسکی واہی تباہی باتوں پر کسی نے دھیان نہیں کیا، لیکن جب اس نے اُستادوں پر حملے شروع کیے اُس وقت سے ہُد ہُد کے ساتھ ہی حکیم صاحب سے بھی لوگوں کو کچھ نفرت سی ہوگئی۔ غضب یہ کیا کہ اجمیری دروازہ والے مشاعرے میں خود انھوں نے مرزا نوشہ پر کھُلا ہوا حملہ کر دیا۔ ایک قطعہ لکھا تھا

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا ہے جب اک کہے اور دوسرا سمجھے

کلامِ میر سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے
مگر اپنا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

مولوی ملوک علی نے کہا "حکیم صاحب، شعر کے سمجھ میں نہ آنے کی دو ہی صورتیں ہیں، یا تو شعر ہی بے معنی ہے، یا سمجھنے والے کے دماغ کا قصور ہے۔ ہم سب تو اُنکے شعر سمجھتے ہیں، پھر آپ نے ہم غریبوں کو کیوں لپیٹ لیا"۔ مومن خاں نے کہا "بھئی مجھے تو اس قطعے کے تیسرے مصرعہ میں بھی شاعرانہ تعلّی معلوم ہوتی ہے۔ بہر حال بڑی مشکل سے معاملہ رفع دفع ہوا۔ اس معرکے کے بعد

یہ دوسرا موقعہ تھا کہ حکیم صاحب مشاعرے میں تشریف لائے۔ میر صاحب نے ہُدہُد کے مقابلہ میں جو اعلان جنگ کیا تھا وہ سُن چکے تھے، اب لوگوں میں جو کانا پھوسی ہونے لگی اس سے اور بھی پریشان ہوے۔ پڑھنے میں تامل کیا۔ آخر مرزا فخرو کے اصرار پر غزل پڑھی۔

صلح اُن سے ہمیں کیسے ہی بنی — دل پہ جھگڑا تھا دل دیے ہی بنی
زہد و تقوی دھرے رہے سارے — ہاتھ سے اُسکے مے پیے ہی بنی
لائے وہ ساتھ غیر کو، ناچار — پاس اپنے بٹھا لیے ہی بنی
کس کا تھا پاس شوق ظلم اے عیش — ان جفاؤں پہ بھی جیے ہی بنی

جب ایسی غزل ہو تو بھلا کون تعریف نہ کرے۔ صل علیٰ کے شور اور سبحان اللہ کی آوازوں نے پڑھنے والے اور سننے والوں دونوں کے دلوں سے غبار کدورت دور کر دیا۔ اور حکیم صاحب وہی حکیم صاحب ہو گئے جو پہلے تھے۔ نہ اُن سے کسی کو رنج رہا اور نہ اُن کو کسی سے ملال۔ ہاں اگر کہیں پہلے میاں ہُدہُد کچھ چُڑک جاتے تو خدا معلوم مشاعرے کا کیا رنگ ہو جاتا۔ وہ تو خدا بھلا کرے ہمارے میر صاحب کا، اُنھوں نے پہلے ہی اُس بکھیڑے کی زبان بند کر دی۔ خیر، رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت۔

حکیم صاحب کے بعد مرزا رحیم الدین حیا کا نمبر آیا۔ یہ وہی میاں حیا ہیں جن کی تعریف مشاعرہ میں آتے ہی اُنکے والد صاحب قبلہ مرزا کریم الدین رسا نے فرمائی تھی۔ بڑے خوش طبع، ذہین، نیک فطرت، بدیہہ گو، اور ظریف آدمی ہیں۔ کوئی ۳۵، ۳۶ سال کی عمر ہے، اکثر بنارس میں رہتے ہیں، کبھی کبھی دہلی میں چلے آتے ہیں۔ شکل تو بالکل شاہزادوں کی ہے مگر ڈاڑھی منڈی ہوئی، اور لباس لکھنؤ والوں کا ہے۔ پہلے اپنے والد کے شاگرد ہوے، پھر شاہ نصیر سے اصلاح لی۔ اب اپنا کلام اُستاد ذوق کو دکھاتے ہیں۔ شطرنج بے مثل کھیلتے ہیں۔ پہلے حکیم شرافت علی خاں سے سیکھی اب مومن خاں کو گھیرے رہتے ہیں۔ ستار ایسا بجاتے ہیں کہ سبحان اللہ۔ شاعر بھی اچھے ہیں، مگر محنت نہیں کرتے، زبان کی چاشنی پہ مضمون کو نثار کر دیتے ہیں۔ یہ غزل لکھ کر لائے تھے

موت ہی چارہ ساز فرقت ہے — رنج مرنے کا مجھکو راحت ہے
ہو چکا وصل، وقت رخصت ہے — اے اجل جلد آ کہ فرصت ہے
روز کی داد کون دیوے گا — ظلم کرنا تمھاری عادت ہے
کارواں عمر کا ہے رخت بدوش — ہر نفس بانگ کوس رحلت ہے
سانس اک پھانس سی کھٹکتی ہے — دم نکلتا نہیں مصیبت ہے

تم بھی اپنے حیا کو دیکھ آؤ   آج اُس کی کچھ اور حالت ہے

اس شعر پر انکے والد نے ٹوکا اور کہا "میاں حیا! لکھنؤ جاکر اپنی شکل تو بدل آئے تھے اب زبان بھی بدلی۔ سانس کو مؤنث باندھ گئے"۔ حیا نے جواب دیا "جی نہیں قبلہ میں نے تو اُستاد ذوق کی تقلید کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں "سینے میں سانس ہوگی اڑی دو گھڑی کے بعد"۔ بھلا صاحبعالم* کب چوکنے والے تھے۔ کہنے لگے "بھلا ہمارے مقابلہ میں آپ کے اُستاد کا کلام کہیں سند ہو سکتا ہے" وہ جو چاہیں لکھیں۔ بتاؤ قلعے میں سانس مذکر ہے یا مؤنث"۔ بیچارے حیا مسکرا کر خاموش ہو گئے۔

اب شمع مولانا صہبائی کے سامنے آئی۔ انکی علمیت کا ڈنکا تمام ہندوستان میں بج رہا ہے۔ ایسے جامع کمال آدمی کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ ہزاروں شاگرد ہیں۔ اکثر ریختہ کہنے والوں کو اصلاح دیتے ہیں، اور خوب دیتے ہیں۔ مگر خود انکا کلام تمام و کمال فارسی ہے۔ میں نے تو سنتے میں نہ کبھی انکی کوئی غزل دیکھی نہ سنی۔ اور مشاعرہ میں بھی فارسی ہی کی غزل پڑھی۔ خوب خوب تعریفیں ہوئیں۔ مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ لوگوں کو مزہ نہ آیا۔

ہمچو شبنم خویش را فارغ ز عالم ساختم   محرم خورشید گشتم با خساں کم ساختم
مردم دو دو چشم مردم عالمے تاریک گشت   من گر شمعم چو رفتم بزم برہم ساختم
کفر در کیشم سپاس نعمت دیدار اوست   جلوہ در ہر رنگ دیدم گردنے خم ساختم
جرم عشقم را جزا شد حور و من از ہجر دوست   داغ بر دل بردم و خلدش جہنم ساختم
نیست صہبائی چو جام جم نصیبم گو مباد   مے ز خونِ دل کشیدم خویش را جم ساختم

مقطع پر تو اتنی تعریفیں ہوئیں کہ بیان سے باہر ہے۔ مگر جو بیچارے فارسی نہیں سمجھتے تھے وہ بیٹھے منہ دیکھا کیے۔ صاف بات تو یہ ہے کہ اُردو کے مشاعرے میں فارسی کا ٹھونسنا کچھ مجھے بھی پسند نہ آیا۔

ہا ہا ہا! زبان کا لطف اُٹھانا ہے تو اب سید ظہیرالدین حسین خاں ظہیر کو سنیے۔ ابھی ۳۰، ۳۲ سال کی عمر ہے، مگر کلام میں خدا نے وہ اثر دیا ہے کہ واہ واہ۔ اُستاد ذوق کی اصلاح نے اور سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے۔ شکل و صورت سے یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ انکی طبیعت اس بلا کی ہے۔ قد خاصا اونچا، چھریرا بدن، کشادہ سینہ، سانولی رنگت، کشادہ دہن، اونچی ستواں ناک، آنکھیں نہ بہت بڑی نہ بہت چھوٹی مگر روشن، گول ڈاڑھی نہ بہت گھنی نہ بہت چھدری۔

---

* قلعے والوں کو خواہ وہ شہزادے ہوں یا سلاطین زادے، صاحب عالم کہا جاتا تھا۔

سر پہ پٹے، لباس میں انگرکھا، تنگ موہری کا سفید پائجامہ، سر پر سفید گول ٹوپی۔ خوش مزاج اور لطیفہ سنج ایسے کہ منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ پڑھنے کا بھی ایک خاص طرز ہے۔ لکھنؤ والے کے تحت اللفظ پڑھنے سے ملتا جلتا ہے۔ ساتھ ہی اشاروں سے ایک ایک لفظ کو سمجھاتے جاتے ہیں۔ غزل ہوئی تھی۔

جبیں اور شوقِ اس کے آستاں کا　　　ارادہ اور ارادہ بھی کہاں کا
لٹا ہے قافلہ تاب و تواں کا　　　خدا حافظ ہے دل کے کارواں کا
مری واماندگی منزل رساں ہے　　　سراغِ نقشِ پا ہوں کارواں کا
رہے پابند ول کے دل میں ارماں　　　قدم منزل نے پکڑا کارواں کا
اٹھا سکتے نہیں سر آستاں سے　　　غضب ہے بارِ منت پاسباں کا
ہمیشہ موردِ برق و بلا ہوں　　　ئے جھگڑا الٰہی آشیاں کا
دل بیتاب نے وہ بھی مٹایا　　　کسی کو کچھ جو دھوکا تھا نشاں کا
ظہیر آؤ چلو اب میکدے کو　　　نکالا زہد و تقوے نے کہاں کا

اور تو اور استادانِ فن نے اس غزل کی ایسی داد دی کہ میاں ظہیر کا دل غنچے کی طرح کھل گیا۔ تیسرے شعر پہ یہ حالت تھی کہ تعریفوں کا سلسلہ ختم ہی نہ ہوتا تھا۔ سلام کرتے کرتے بیچارے کے ہاتھ دُکھ گئے ہوں گے۔ جب ذرا سکون ہوا تو سیدھی جانب کی شمع نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے سامنے آئی۔ ان کا کیا کہنا، یہ اُستادانِ فن میں شمار کیے جاتے ہیں۔ مومن کے شاگرد ہیں مگر خود استاد ہیں۔ انھوں نے کسی شعر کی تعریف کی اور اُس کی وقعت بڑھی۔ یہ سن کر ذرا خاموش ہوئے اور شعر دوسروں کی نظروں سے بھی گر گیا۔ زبان کے ساتھ مضمون کو ترتیب دینا ایسے ہی لوگوں کا کام ہے۔ پڑھتے بھی ہیں تو ایک ایک لفظ سمجھا سمجھا کر، آواز ایسی اونچی کہ دور اور پاس سب کو صاف سنائی دے۔ غزل پڑھنے سے پہلے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ذرا انگرکھا درست کیا۔ ٹوپی درست کی، انگرکھے کی آستینوں کو چڑھایا اور یہ غزل پڑھی

آرام سے ہے کون جہانِ خراب میں　　　گُل سینہ چاک اور صبا اضطراب میں
سب اس میں محو اور یہ سب سے علیحدہ　　　آئینے میں ہے آب نہ آئینہ آب میں
معنی کی فکر چاہیے صورت سے کیا حصول　　　کیا فائدہ ہے موج اگر ہے شراب میں
ذات و صفات میں بھی یہی ربط چاہیے　　　جوں آفتاب و روشنی آفتاب میں
وہ قطرہ ہوں کہ موجۂ دریا میں گم ہوا　　　وہ سایہ ہوں کہ محو ہوا آفتاب میں

بیباک شیوہ، شوخ طبیعت، زباں دراز — ملزم ہوا ہوں پر نہیں عاجز جواب میں
تکلیف شنیدہ ہوئی تم کو۔ مگر حضور — اسوقت اتفاق سے وہ ہیں عتاب میں

غزل تو ایسی ہے کہ بھلا کس کا منہ ہے جو تعریف کا حق ادا کر سکے۔ مگر تعریف بڑی سنبھل سنبھل کر کی گئی۔ بڑے مشاعروں میں میں نے ہمیشہ یہ دیکھا کہ نو مشقوں کے دل تو تعریفوں سے خوب بڑھاتے ہیں۔ مگر جب استادوں کے پڑھنے کی نوبت آتی ہے تو وہ جوش و خروش نہیں رہتا۔ بلکہ جوش کے بجائے متانت زیادہ آجاتی ہے۔ استادوں کے ان ہی شعروں کی تعریف ہوتی ہے جو واقعی قابل تعریف ہوں۔ اگر کسی شعر کی ذرا بھی بیجا تعریف کردی جائے تو اس سے انکو تکلیف ہوتی ہے یہ صرف اسی کلام کی تعریف چاہتے ہیں جسکو یہ خود سمجھتے ہیں کہ اسکی تعریف ہونی چاہیے۔ شعر پڑھکر اگر دیکھتے بھی ہیں تو اپنے برابر والوں کی طرف۔ اور وہی داد بھی دیتے ہیں۔ مشاعرہ کے باقی لوگ انکے کلام سے لطف ہی نہیں اٹھاتے، کچھ حاصل بھی کر لیتے ہیں۔ انکے لیے یہ غزلیں کسی طرح استا کی اصلاح سے کم نہیں ہوتیں۔

انکے بعد شہزادہ مرزا آغا و رخشں صابر کی باری آئی۔ یہ کوئی ۴۰ برس کے ہونگے۔ ان کی شاعری کی قلعے میں بڑی دھوم ہے۔ خود انکو بھی اپنے کلام پر ناز ہے۔ شعرائے دہلی کا ایک تذکرہ لکھ رہے ہیں مگر مشہور یہ ہے کہ الف سے لیکر یے تک مولانا صہبائی کا قلم ہے۔ یہ سچ ہے یا جھوٹ خدا بہتر جانتا ہے۔ خود انھوں نے اپنے حالات ایک قطعے میں لکھے ہیں۔ وہ نقل کرتا ہوں۔

قطعہ

پہلے استاد تھے احسان و نصیر و مومن — ہوئی احساں سے پھر اصلاح طبیعت میری
پھر ہوا حضرتِ صہبائی کی اصلاح کا فیض — طبع بارآیت ہوئی انکی بدولت میری
اور ہم بزم رہے مومن و ذوق و غالب — اوستادوں ہی سے ہر دم رہی صحبت میری
ہند کا فضل و ہنر ذات پہ ہے جن کی تمام — مانتے ہیں وہی اشخاص فضیلت میری
منعقد ہوتی ہے جب شہر میں بزم انشا — کرتے ہیں اہل سخن وقعت و عزت میری

اب اس کلام پر انکو استاد کہو یا جو بھی چاہے کہو۔ غزل میں بھی یہی پھیکا رنگ ہے مضمون بھی کچھ بلند پایہ نہیں ہیں، مگر سارا شہر انکو استاد مانتا ہے تو ہونگے، ممکن ہے میری ہی سمجھ کا پھیر ہو۔ غزل کہی تھی

نظارہ برق حسن کا دشوار ہوگیا — جلوہ حجاب دیدۂ بیدار ہوگیا

محفل میں، میں تو اُس لب میگوں کے سامنے / نامِ شراب لے کے گنہگار ہو گیا
حائل ہوئی نقاب تو ٹھیری نگاہِ شوق / پردہ ہی جلوہ گاہِ رخِ یار ہو گیا
معلوم یہ ہوا کہ ہے پرسش گناہ کی / عاصی گنہ نکردہ گنہگار ہو گیا
اُسکی گلی میں آن کے کیا کیا اُٹھائے رنج / خاکِ شفا ملی تو میں بیمار ہو گیا
پیری میں ہم کو قطع تعلق ہوا نصیب / قامت خمیدہ ہوتے ہی تلوار ہو گیا

یہ پڑھ چکے تو شمع مفتی صدرالدین صاحب آزردہ کے سامنے آئی۔ اس پایہ کے عالم شاعر نہیں ہوتے اور ہوتے ہیں تو اُستاد ہو جاتے ہیں۔ مفتی صاحب کے جتنے شاگرد جید عالم ہیں اُن سے کہیں زیادہ اُنکے تلامذہ شاعر ہیں۔ اور شاعر بھی کیسے، کہ بڑے پایے کے۔ مفتی صاحب کہتے تو خوب ہیں، مگر پڑھتے اس طرح ہیں گویا طالبعلموں کو سبق دے رہے ہیں۔ آواز بھی ذرا نیچی ہے۔ لیکن انکی وجاہت کا یہ اثر ہے کہ مشاعرے میں سناٹا ہوتا ہے اور تعریف بھی ہوتی ہے تو خاص خاص شعروں پر اور بہت نیچی آواز میں۔ ہاں مرزا نوشہ ان سے مذاق کرنے میں نہیں چوکتے۔ کبھی کبھی اعتراض بھی کر بیٹھتے ہیں اور مزے مزے کی نوک جھونک ہو جاتی ہے۔ غزل ملاحظہ ہو۔ کیا پختہ کلام ہے۔

نالوں سے میرے کب تہ و بالا جہاں نہیں / کب آسماں زمین و زمیں آسماں نہیں
افسردہ دل نہ ہو درِ رحمت نہیں ہے بند / کس دن کھلا ہوا درِ پیرِ مغاں نہیں
شب اُسکو حال دل نے جتایا کچھ اس طرح / ہیں لب تو کیا نگہ بھی ہوئی ترجماں نہیں
اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں / اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں
کٹتی کسی طرح بھی نہیں یہ شبِ فراق / شاید کہ گردش آج تجھے آسماں نہیں
کہتا ہوں اُس سے کچھ میں نکلتا ہے منہ سے کچھ / کہنے کو یوں تو ہیگی زباں اور زباں نہیں
آزردہ ہونٹ تک نہ ہلے اُس کے روبرو / مانا کہ آپ سا کوئی جادو بیاں نہیں

آزردہ جیسے اُستاد کے بعد نواب مرزا خاں داغؔ کا پڑھنا ایک عجیب سی چیز ہے، مگر بات یہ ہے کہ اول تو داغؔ کو سب چاہتے ہیں، دل بڑھاتے ہیں، اور جانتے ہیں کہ کسی دن یہی داغؔ ہندوستان کا چراغ ہوگا؛ دوسرے مرزا فخرو کے خیال سے انکو اُستادوں میں جگہ ملی تھی، مگر انھوں نے غزل بھی ایسی پڑھی کہ اُستاد بھی قائل ہو گئے۔ ۱۷، ۱۸ برس کے لڑکے کا اس قیامت کی غزل اور اس جرأت سے پڑھنا واقعی کمال ہے۔ میری تو یہ رائے ہے کہ جو زبان داغؔ نے لکھی ہے وہ شاید ہی کسی کو نصیب ہوگی۔ ذرا زبان کی شوخی، مضمون کی رنگینی اور طبیعت کی روانی ملاحظہ

یکھیے اور داد دیجیے :-

ساز یہ کینہ ساز کیا جانیں | ناز والے نیاز کیا جانیں
شمع رو آپ گو ہوے لیکن | لطفِ سوز و گداز کیا جانیں
کب کسی در کی جبہ سائی کی | شیخ صاحب نماز کیا جانیں
جو رہِ عشق میں قدم رکھیں | وہ نشیب و فراز کیا جانیں
پوچھیے میکشوں سے لطفِ شراب | یہ مزا پاکباز کیا جانیں
جنکو اپنی خبر نہیں اب تک | وہ مرے دل کا راز کیا جانیں
حضرتِ خضر جب شہید نہ ہوں | لطفِ عمرِ دراز کیا جانیں
جو گزرتے ہیں داغ پر صدمے | آپ بندہ نواز کیا جانیں

اللہ اللہ! وہ سہانا وقت، وہ چھوٹی سی آواز، وہ دلکش سُر، وہ الفاظ کی نشست، وہ بندش کی خوبصورتی، اور سب سے زیادہ یہ کہ وہ داغ کی بھولی بھالی شکل، ایک عجیب لطف دے رہی تھی۔ ساری محفل میں کوئی نہ تھا جو محوِ حیرت نہ ہو گیا ہو اور کوئی نہ تھا جسکے منہ سے جزاک اللہ، سبحان اللہ اور صلِّ علیٰ کے الفاظ بیساختہ نہ نکل رہے ہوں۔ مرزا فخرو کی تو یہ حالت تھی کہ گھڑی گھڑی پہلو بدلتے تھے اور دل ہی دل میں خوش ہوتے تھے۔ غزل ختم ہوئی اور کسی کو معلوم نہ ہوا کہ کب ختم ہو گئی۔ جب شمع حکیم مومن خاں مومن کے سامنے پہنچی، اُس وقت لوگوں کا جوش کم ہوا اور اس ریختہ کے اُستاد کا کلام سننے کے لیے سب ہمہ تن گوش ہو گئے۔ انھوں نے شمع کو اُٹھا کر ذرا آگے رکھا، ذرا سنبھل کر بیٹھے، بالوں میں اُنگلیوں سے کنگھی کی، ٹوپی کو کچھ ترچھا کیا، آستینوں کی چُنّٹ کو صاف کیا اور بڑی درد انگیز آواز میں دلپذیر ترنم کے ساتھ یہ غزل پڑھی :-

اُلٹے وہ شکوے کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ | بے طاقتی کے طعنے ہیں عذرِ جفا کے ساتھ
بہرِ عیادت آئے وہ لیکن قضا کے ساتھ | دم ہی نکل گیا مرا آوازِ پا کے ساتھ
مانگا کریں گے اب سے دعا ہجرِ یار کی | آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ
ہے کس کا انتظار کہ خوابِ عدم سے بھی | ہر بار چونک پڑتے ہیں آوازِ پا کے ساتھ
سو زندگی نثار کروں ایسی موت پر | یوں روئے زار زار تو اہلِ عزا کے ساتھ
بے پردہ غیر پاس اُسے بیٹھا نہ دیکھتے | اُٹھ جاتے کاش ہم بھی جہاں سے حیا کے ساتھ
اُس کی گلی کہاں، یہ تو کچھ باغِ خلد ہے | کس جا ہے مجھکو چھوڑ گئی موت، لا کے ساتھ

اللہ ری گمرہی بُت و بتخانہ چھوڑ کر مومن چلا ہے کعبے کو اک پارسا کے ساتھ

شاعری کیا تھی جادو تھا۔ تمام لوگ ایک عالم محویت میں بیٹھے تھے۔ وہ خود بھی اپنے کلام کا مزا لے رہے تھے۔ جس شعر میں انکو زیادہ لطف آتا تھا اُسکے پڑھتے وقت انکی انگلیاں زیادہ تیزی سے بالوں میں چلنے لگتی تھیں۔ بہت جوش ہوا تو کاکلوں کو انگلیوں میں بل دیکر مروڑنے لگے۔ کسی نے تعریف کی تو گردن جھکا کر ذرا مسکرا دیے۔ پڑھنے کا طرز بھی سب سے جدا تھا، ہاتھ بہت کم ہلاتے تھے اور ہلاتے بھی کیسے ہاتھوں کو بالوں سے کب فرصت تھی۔ ہاں آواز کے زیر و بم اور آنکھوں کے اشاروں سے جادو سا کر جاتے تھے۔ غزل ختم ہوئی تو تمام شعرا نے تعریف کی۔ سُن کر مسکرائے اور کہا "آپ لوگوں کی یہی عنایت تو ہماری ساری محنت کا صلہ ہے۔ میں تو عرض کر چکا ہوں

ہم داد کے خواہاں ہیں نہیں طالبِ زر کچھ تحسینِ سخن فہم ہے مومن صلہ اپنا"

اسکے بعد شمع استاد ذوق کے سامنے آئی۔ میں سمجھا تھا کہ انکی آواز کیا خاک نکلے گی۔ مگر شمع کے سامنے پہنچتے ہی تو بجلی سی بھر گئی کچھ سے کچھ ہوگئے اور اتنی بلند آواز سے غزل پڑھی کہ تمام مجلس پر چھا گئے۔ کسی شعر پر مومن خاں کو متوجہ کرتے، کسی پر مرزا نوشہ کو، کسی پر استاد ذوق کو، انکی عظمت لوگوں کے دلوں پر کچھ ایسی چھائی ہوئی تھی کہ جسکو انھوں نے متوجہ کیا اُسکو تعریف ہی کرتے بن پڑی۔ ردیف سخت اور قافیہ مشکل تھا، مگر انکی استادی کی داد دینی چاہیے کہ ان مشکلوں پر بھی ساری کی ساری غزل مرصع کہہ گئے ہیں۔ ہاے، لکھتے ہیں

تو کیوں ہے آہ یہ کتاں سے مرے دلِ محزوں نہ رو نہ رو کہ نہ تجھ کو کبھی رلائے خدا
بتو! بتاؤ تو، کیا تم خدا کو دوگے جواب خدا کے بندوں پہ یہ ظلم، بندہ ہاے خدا
رضا پہ تیری بتوں دن رات اے صنم مصروف جو اس پہ تو نہیں راضی نہ ہو رضائے خدا
بتوں کے کوچہ میں کہتا تھا کل یہی احساں یہاں کسی کا نہیں ہے کوئی سوائے خدا

جب یہ پڑھ چکے تو مرزا غالب کی باری آئی۔ یہ رنگ ہی دوسرا تھا۔ صبح ہو چلی تھی۔ شمع سامنے آتے ہی فرمانے لگے "صاحبو! میں بھی اپنی بھیرویں الاپتا ہوں"۔ یہ کہہ کر ایسے دلکش اور موثر لہجے میں غزل پڑھی کہ ساری محفل محو ہو گئی۔ آواز بہت اونچی اور ... معلوم ہوتا تھا کہ گویا مجلس میں کسی کو اپنا قدرداں نہیں پاتے اور اسلیے غزل خوانی ... کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ غزل تھی۔

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے — آخر اس درد کی دوا کیا ہے
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار — یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے
میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں — کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے
جبکہ تجھ بن کوئی نہیں موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں — غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے — نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں — ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے
ہم کو ان سے وفا کی ہے امید — جو نہیں جانتے وفا کیا ہے
ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا — اور درویش کی صدا کیا ہے
جان تم پر نثار کرتا ہوں — میں نہیں جانتا دعا کیا ہے
میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب — مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

غزل پڑھ کر مسکرائے اور کہا کہ "اس پر بھی نہ سمجھیں وہ تو پھر ان سے خدا سمجھے"۔ حکیم آغا جان سمجھ گئے اور کہنے لگے "غنیمت ہے کہ تم اس رنگ کو آخر ذرا سمجھے"۔ غرض تعریفوں کے ساتھ ساتھ مذاق بھی ہوتا رہا۔ اور شمع استاد ذوق کے سامنے پہونچ گئی۔ استاد نے مرزا فخرو کی طرف دیکھ کر کہا "صاحب عالم غزل پڑھوں یا کل جو قطعہ ہوا ہے وہ عرض کروں؟ کل رات خدا جانے کیا بات تھی کہ کسی طرح نیند ہی نہ آتی تھی۔ لوٹتے لوٹتے صبح ہو گئی، شبِ ہجر کا مزا آ گیا۔ اسی کشمکش میں ایک قطعہ ہو گیا ہے، اجازت ہو تو عرض کروں"۔ مرزا فخرو نے کہا "استاد آج کا مشاعرہ سب بندوں سے آزاد ہے؛ غزل پڑھیے، رباعی پڑھیے، قصیدہ پڑھیے، قطعہ پڑھیے، غرض جو دل چاہے پڑھیے، ہاں کچھ نہ کچھ پڑھیے ضرور" استاد ذوق سنبھل کر بیٹھ گئے اور یہ قطعہ ایسی بلند اور خوش آیند آواز میں پڑھا کہ محفل گونج گئی اور انکے پڑھنے کے انداز نے کلام کی تاثیر میں اور زیادہ زور پیدا کر دیا۔

کہوں کیا ذوق احوالِ شبِ ہجر — کہ تھی اک اک گھڑی سو سو مہینے
نہ تھی شب ڈال رکھا تھا اندھیر — مرے بختِ سیہ کی تیرگی نے
تبِ غم شمع ساں ہوتی نہ تھی کم — اور آتے تھے پسینوں پر پسینے
یہی کہتا تھا گھبرا کر فلک سے — کہ او بے مہر بد اختر کمینے

کہاں میں اور کہاں یہ شب، مگر تھے
مری جانب سے تیرے دل میں کینے

سو اس ظلمت کے پردے میں کیے ظلم
ارے ظالم تری کینہ وری نے

ہوش بس نہ رہا خوشی کے مجھے آج
پڑے یہ زہر کے سے گھونٹ پینے

حواس و ہوش جو کچھ تھے قرین تھے
قرینے سے ہوئے سب بے قرینے

مرے سینہ زنی کا شور سن کر
پھٹے جاتے تھے ہمسایوں کے سینے

اٹھایا تکیہ اور گاہے بٹھایا
مجھے بیتابی و بے طاقتی نے

کہا جب دل نے تو کچھ کھا کے سو رہ
بہت الماس کے توڑے نگینے

نہ ٹوٹا جان کا قالب سے رشتہ
بہت سی جان توڑی جاں کنی نے

بہت دیکھا نہ دکھلایا ذرا بھی
طلوع صبح سے مہر روشنی نے

کہا جی نے مجھے یہ تیری رات
یقیں ہے صبح تک دیگی نہ جینے

لگے پانی چوانے منہ میں آنسو
پڑھی یٰسیں سرہانے بیکسی نے

مگر دن عمر کے تھوڑے سے باقی
لگا رکھے تھے میری زندگی نے

کہ قسمت سے قریب تھا نہ میرے
اذاں مسجد میں دی بارے کسی نے

بشارت مجھ کو صبح وصل کی دی
اذاں کے ساتھ میمن و فرخی نے

ہوئی ایسی خوشی اللہ اکبر
کہا خوش ہو کر اتنا یہ خود خوشی نے

مؤذن مرحبا بروقت بولا
تری آواز مکے اور مدینے

آخری شعر پر پہنچے تھے کہ برابر کی مسجد سے آواز آئی "اللہ اکبر! اللہ اکبر! اللہ اکبر! اللہ اکبر!" اس کے ساتھ ہی سب کے منہ سے نکلا "تری آواز مکے اور مدینے"۔ اذان ختم ہوئی تو سب نے دعا کو ہاتھ اٹھائے۔ دعا سے فارغ ہو کر مرزا فخرو نے کہا "صاحبو! کچھ عجب اتفاق ہے کہ فاتحہ خیر ہی سے یہ مشاعرہ شروع ہوا تھا اور اب فاتحہ خیر ہی پر ختم ہوتا ہے۔" یہ کہہ کر انھوں نے دونوں شمعوں کو جو چکر کھا کر ان کے سامنے آگئی تھیں بجھا دیا۔ شمعوں کے گل ہوتے ہی نقیبوں نے آواز دی "حضرات مشاعرہ ختم ہوا"۔ یہ سننا تھا کہ چلنے کو سب کھڑے ہو گئے۔ سب سے پہلے مرزا فخرو سوار ہوئے۔ اور پھر ایک ایک کرکے سب رخصت ہوئے۔ آخر میں میں اور نواب زین العابدین خاں رہ گئے۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ کہنے لگے "میاں کریم الدین یہ تمہاری نیک نیتی تھی جو اتنا بڑا مشاعرہ بخیر و خوبی ختم ہوا۔ تمہارا کام بھی بن گیا اور میرا کام بھی نکل گیا۔ اچھا خدا حافظ۔"

تقدیر

درماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا

دوسرے روز سب سامان اُٹھ گیا۔ اور پھر وہی چھاپے خانے کی گھڑگھڑ اور پریسمینوں کی گڑبڑ شروع ہو گئی۔ دوسرے مہینے میں پھر مشاعرے کا اعلان کیا۔ اشتہار بھی تقسیم ہوئے مگر گنتی کے آدمی آئے، آخر یہ مجلس بند کرنی پڑی۔ کچھ تو مطبع کے کام میں نقصان ہوا، کچھ ملازمین پیشگی رقمیں دبا بیٹھے۔ غرض تھوڑے ہی دنوں بعد میرے دو چار جاہل شرکاء نے مجھ سے فریب کر کے مطبع چھین لیا۔ ہر چند کہ میں نے سوچا تھا کہ اگر دعویٰ کروں، عالم بیشک میرا انصاف کرے گا لیکن چند صدمات پڑ جانے کی وجہ سے وہ ارادہ بھی پورا نہ ہوا۔ اُس مشاعرے کی کیفیت کے مسودات پڑے رہ گئے ہیں، دیکھیے کب چھپتے ہیں۔ اور کون چھپاتا ہے۔

(منقول از رسالہ اُردو)

حسن میں ناز نہ انداز و ادا دیکھتے ہیں
آنکھ میں اہلِ نظر شرم و حیا دیکھتے ہیں

داغِ چیچک ترے اعجاز نما دیکھتے ہیں
مصحفِ رُخ میں ہم آیاتِ شفا دیکھتے ہیں

وصل بھی تیرا زمانے سے جُدا دیکھتے ہیں
تیرے ہر ناز میں انداز نیا دیکھتے ہیں

تھی جنھیں تذکرۂ زلف سے اُلجھن کل تک
آج اُن کو بھی گرفتارِ بلا دیکھتے ہیں

بہرِ تفریح وہ آئے ہیں عیادت کیسی
کس طرح جان نکلتی ہے ذرا دیکھتے ہیں

ہاتھ رکھ کر دلِ مضطر کی تو حالت دیکھیں
نبضِ بیمارِ محبت کی وہ کیا دیکھتے ہیں

اے بتو تم سے تو کچھ کام نکلتا ہی نہیں
کر کے اللہ تعالےٰ سے دعا دیکھتے ہیں

بند ہو جائے درِ توبہ اگر اے واعظ
اب نہیں تاب کہ مینا نہ کھلا دیکھتے ہیں

اور بڑھ جاتی ہے پژمردگیِ غنچۂ دل
کھلتے پھولوں کو جو اے بادِ صبا دیکھتے ہیں

کر چکو قتل خدا کے لیے جھگڑا تو مٹے
تیغ کی طرح تمھیں روز کھنچا دیکھتے ہیں

جس مہینے پہ مہِ عید بھی قرباں ہے رقمؔ
دلرُبا رُخ ترا ماہ لقا دیکھتے ہیں

امیر علی رقمؔ لکھنوی

نظرے خوش گزرے

دارالمصنفین کے کارکنوں نے سنہ ۲۶ء کے خاتمہ اور سنہ ۲۷ء کے آغاز میں علم دوست طبقہ سے درخواست کی تھی کہ دارالمصنفین کے تصنیفی کام کی ترقی کے لیے جس مالی امداد کی ضرورت ہے اسکی تکمیل یہاں طرح کی جائے کہ پانچسو اصحاب دارالمصنفین کے رکن بن جائیں۔ دارالمصنفین کا ماہوار رسالہ معارف جو اردو کے تمام علمی پرچوں میں سب سے اونچے پایہ کا ہے اور سال بھر میں جو کتابیں دارالمصنفین نے شائع کی ہوں وہ ہر رکن کی خدمت میں پیش کی جاتی ہیں اس لیے درحقیقت یہ امداد کسی قسم کا چندہ نہیں، بلکہ خریداری کے لیے پیشگی رقم کی حیثیت رکھتی ہے

اس تحریک پر دو سو اصحاب بیس بیس روپے ادا کرکے رکن بنے اور ساڑھے سترہ روپے [illegible] سال میں اس تفصیل سے وصول ہوگئے:

[illegible]	[illegible]
نفسیات ترغیب	[illegible]
نقشے	[illegible]
خلفائے راشدین	[illegible]
تاریخ فقہ اسلامی	[illegible]
مصارف ڈاک	[illegible]
میزان	[illegible]

تاریخ فقہ اسلامی ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہے [illegible] ماہ [illegible] میں تیار ہو جائے گی اور جملہ ارکان کو بھیجی جائیگی۔ باقی [illegible] کے بارے میں [illegible] دارالمصنفین نے اعلان کر دیا ہے کہ کتب موجودہ دفتر [illegible] جو کتاب [illegible] طلب [illegible] درخواست یہ بھی ہے کہ گذشتہ سال جن شائقین علم نے دارالمصنفین کی [illegible] فرمائی وہ آئندہ سال کے لیے بھی اپنی رکنیت قائم رکھیں اور [illegible] امید ہے کہ علم دوست اصحاب انکی اس دعوت کو ضرور قبول فرمائیں گے اور جو اصحاب [illegible] سے دارالمصنفین کے رکن نہیں بن سکے تھے وہ اب توجہ فرمائیں گے۔

شذرے

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے طلبا کی ایک بزم انجمن اتحاد نے ایک تحریری مقابلہ کا اعلان کیا ہے۔ عنوان حسب ذیل ہے:-

"۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانان ہند کی تعلیمی جد و جہد اور اس کے نتائج"

شرائط مقابلہ یہ ہیں:-

(۱) مضمون تقریباً ۵۰ صفحات پر مشتمل ہو

(۲) ۳۱ - مارچ تک ناظم انجمن اتحاد جامعہ ملیہ اسلامیہ قرول باغ دہلی کے پتہ پر بھیجدیا جائے

(۳) طلبہ اور دیگر تمام حضرات اس میں حصہ لے سکتے ہیں

اصحاب ذیل مضامین کی جانچ فرمائیں گے:-

(۱) مولوی عبدالحق بی اے ناظم انجمن ترقی اردو

(۲) مولوی عبدالماجد بی اے - مدیر سچ

(۳) ڈاکٹر ذاکر حسین خاں پرنسپل جامعہ ملیہ

اور بہترین مضمون نویس کو جناب عبدالعزیز انصاری وکیل بارہ بنکی کی جانب سے انکے مرحوم دوست اور انگریزی کے مشہور انشا پرداز شیخ ولایت علی قدوائی (بمبوق) کی یادگار میں ایک پچاس روپے کا طلائی تمغہ دیا جائے گا۔ عنوان دلچسپ اور مفید ہے، امید ہے کہ جو اصحاب قلم وقت نکال سکتے ہیں، انجمن اتحاد کی اس دعوت پر ضرور لبیک کہیں گے۔

"دہلی کے مشاعرہ" نے اب کی بھی تقریباً سارا پرچہ گھیر لیا۔ مگر امید ہے کہ ناظرین کرام اس سے لطف اندوز ہونے کے بعد محسوس کرینگے کہ اگر اس جزو کے بھی دو ٹکڑے کر دیے جاتے تو سخت بے لطفی پیدا ہو جاتی، اور اس بنا پر بھول جائیں گے کہ اس پرچے میں دوسرے مضامین نہیں ہیں۔

گزشتہ سال لکھنؤ سے ایک نیا رسالہ خیاباں جاری ہوا تھا، تو ہم نے الناظر میں کسی موقع پر اس کا خیر مقدم کرتے ہوئے یہ توقع ظاہر کی تھی کہ مسٹر شہنشاہ حسین رضوی مدیر خیاباں شہر کے ذی علم حضرات اور نوجوان تعلیم یافتہ طبقے کو اردو کی خدمت پر آمادہ کر لینے میں کامیاب ہونگے۔ مگر افسوس ہے کہ زندگی کے پہلے ہی سال میں خیاباں کے صرف چند پرچے شائع ہو سکے۔ اور غالباً گزشتہ پانچ ماہ میں اس کا کوئی نمبر نہیں نکلا۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!

قصور البتہ برادر ممدوح سے ہوا کہ بعد امن کے اور غدر کے موقوف ہونے کے وہ خود اکبرآباد مین نہ چلے گئے۔ اگر جاتے تو بلاشبہ عہدے پر بھی بحال ہوتے اور اب تک بہت ترقی ہوجاتی اور مکانات وغیرہ کا نیلام بھی مسترد ہوتا۔ مگر ہرگز اونھون نے قدم باہر نہ نکالا اور گویا توکل کرکے بیٹھ رہے۔ جب راقم لندن سے پھر کے آیا تب نہایت اصرار سے اون کو یہان سے اوٹھا یا اکبرآباد مین لیگیا۔ آنریبل درمین صاحب اسکاٹ لینڈ کے ایک امیرزادون مین وہان کے کمشنر تھے اور وہ اون کے آگرہ کے برخاست سے نہایت ملول تھے اونھون نے نواب محمد علیخان ٹونک کے نواب کو سپرد کیا وہان دو سو روپیہ مشاہرے کا ایک عہدہ نواب نے اونکے تفویض کیا قریب ایک برس کے وہان وہ رہے جب نواب محمد علی خان ریاست سے معزول ہوئے تب وہ بھی بعضے مصالح سے مستعفی ہوے۔ درمین صاحب ممدوح اون دنون بریلی کے کمشنر تھے وہان گئے وہان رامپور کے نواب نے سو روپیہ مہینا مقرر کردیا اور نہایت پاسداری اور اخلاق کرتے ہین اور کوئی عدالت اون کے تفویض کی ہے دو برس سے زیادہ ہوے کہ وہین ہین خوش اور خرم بسر کرتے ہین۔ صرف ایک بیٹا اون کا حافظ نفیس الدین ہے کلام اللہ تو حفظ کیا تھا وہ بھی ظاہرا خوب یاد نہین رہا کچھ لکھ پڑھ بھی لیتا ہے رامپور کے نواب نے بہت اصرار کرکے اون کے والد سے وہان اوس کو بھی طلب کرلیا ہے اور اوس کے نام بھی کچھ مقرر کردیا ہے۔ حافظ ریاض الدین خان سے چھوٹے ہمارے بھائی حافظ وجیہ الدین خان نہایت ہوشیار اور لایق اور باہمہ اور بے ہمہ اور نہایت عالی ہمت ہین جس طرف توجہ کیا اوس کو کرہی کے چھوڑا اس امر مین صرف دو حکایتین اون کی لکھنا کافی ہین۔ ایک یہ ہے کہ چھبین دن مین کلام اللہ کو حفظ کرلیا اور اب بخوبی یاد ہے حالانکہ کثرت اورا د اور اشغال سے سال بھر اون کو فرصت نہین ہوتی صرف شعبان کے مہینے سے کچھ دور کرلیا کرتے ہین اور سال بھر کلام اللہ کے دیکھنے کی نوبت نہین آتی مگر رمضان شریف مین دو تین ہمیشہ ختم کیا کرتے ہین دوسری حکایت

حافظ وجیہ الدین خان صاحب راقم کے چھوٹے بھائی کا ذکر

اون کی علو شان کی یہ ہے کہ جناب حضرت شاہ تراب علی قلندر ابن شاہ کاظم قلندر قدس
سرہما نے جنکے ہاتھ مین اونھون نے بیعت کی تھی اون کو خرقہ عطا کیا اور اجازت مرید کرنے کی
جو اون سے رجوع کرے دی ہے مختصرات عربی کی کتابین اونھون نے پڑھین اگرچہ
تکمیل کی نوبت نہین آئی لیکن فقہ وغیرہ مین بہت بخوبی استعداد ہو گئی کچھ ہیئت کے دو ایک
رسالے جناب چھوٹے چچا صاحب سے بھی پڑھے عمل بالاصطرلاب پر خوب مشق ہو گئی ہے
فارسیت مین نظم اور نثر پر بخوبی قادر ہین مگر شوق شعر کہنے کا نہین ہے ایک مثنوی اپنے
پیر کے اور درگاہ کے سوانح مین اونھون نے البتہ لکھی ہے تلاش معاش کے واسطے کہین
باہر نکلنے کا کبھی ارادہ نہین کیا اور سارا انتظام خانگی ہم سب بھائیون کا اونھین کے ہاتھ مین
ہے بادشاہی عہد مین کچھ دیہات ہاتھ آ گئے تھے ہزار بارہ سو روپیہ سال کی آمدنی تھی اوس
سے بخوبی اوقات بسر ہوتی تھی انگریزی مین وہ دیہات بھی نکل گئے اب البتہ محض
توکل پر بسر اوقات ہے کثیر الاولاد ہین چار بیٹے اولاد ذکور ہین ظہور الدین نظام الدین
قیام الدین صمصام الدین۔ اللہ تعالے سب کو زندہ رکھے اور توفیق علم و عمل کی عطا کرے اولاد
دختری ہین دو نواسے کمسن بھی ہین۔ اون سے چھوٹے ہمارے بھائی حافظ مولوی نذیر الدین
خان ہین کمسنی مین اون کو عارضہ صرع کا ہو گیا مگر اوس وقت دیر دیر مین دورہ ہوتا
تھا یہان تک کہ اپنے شوق سے کلام اللہ بھی حفظ کیا اور مختصرات کتابین بھی پڑھین ذہن بہت
اچھا تھا شادی بھی ہوئی دو بیٹے پیدا ہوے بعد اوس کے جو عارضہ نے زور کیا تو اکثر
ہونے لگا اور منجر بجنون ہو گیا اب اکثر ازخود رفتہ رہتے ہین بہت کم کبھی حواس بھی
درست ہو جاتے ہین عارضہ کا بھی دسوین پانچوین دورہ ہوا کرتا ہے۔ چھوٹا بیٹا پانچ چھ برس
کی عمر مین قضا کر گیا اور بڑا بیٹا مولوی زکی الدین خان نام نہایت لائق اور سعید ہوا فارسیت
مین تو اوس کو فی الجملہ کمال حاصل ہوا نظم اور نثر دونون بہت اچھی لکھنے لگا عربیت مین
مختصرات کتابین پڑھ کے متوسطات کی نوبت آئی تھی فی الجملہ استعداد بھی ہو گئی مگر

حافظ نذیر الدین خان صاحب سے چھوٹے بھائی کا ذکر

زمانہ نے تکمیل کی فرصت نہ دی پھر اپنے شوق سے انگریزی شروع کی اگرچہ کچھ جہالت اوس زبان سے جاتی رہی لیکن اوس مین بھی اب تک ناقص رہے حیدرآباد دکن مین گئے وہان کچھ تھوڑا۔ التعلق ہوگیا ہے اگرچہ مواجب کم ہے مگر عہدہ معزز ہے اللہ تعالے موافق حوصلہ کے دین اور دنیا کی ترقی نصیب کرے۔ اب جو موضوع اس خاتمہ کا ہے یعنی ذکر سوانح اور کوایف راقم کے اپنے ابتدائے ولادت سے آج تک کہ عمر اپنی ہفتاد سالگی مین ضایع کی اوسکے صفحات اخیر اس کتاب کے سیاہ کرتا ہے۔ بزرگون سے مسموع ہوا کہ راقم پندرھوین یا سولھوین شب کو شعبان کے مہینے کی ۱۲۱۹ھ مین پیدا ہوا ہمارے بڑے چچا جناب ممتاز العلما بہادر مغفور نے تاریخ میری ولادت کی بیدار بخت بے کم وکاست پائی اور اوسکو اس قطعہ مین موضوع کیا

قطعہ
چو آن نیک طالع بعرش وجود | شدہ جلوہ آرائے چون شہ بتخت
بتاریخ میلادِ او از سعید | بدیہہ خرد گفت بیدار بخت

اور جس زمانہ مین راقم کوہستان ہمالیہ یعنی شملہ مین گورنر جنرل ہندوستان کے ساتھ سنہ ۱۸۳۰ء مین مقیم تھا اور گورنر جنرل نے خطاب خانی اور بہادری کا مجھکو عطا کیا اوس وقت مین جناب والد ماجد مغفور کے خط سے اس مضمون سے مطلع ہوا کہ جب جناب عم اکرم ممدوح نے وہ تاریخ میری ولادت کی پائی تب حضرت جد امجد مغفور نے یہ تفاول فرمایا کہ یہ لڑکا بالضرور بخت بیدار ہوگا چنانچہ جناب والد ماجد مغفور نے اوس خط مین لکھا کہ عطا اس خطاب کا اس نہج پر کہ کلکتہ کے گیازٹ مین اور اور اخبارون مین حکم اوس کے طبع کا ہوا یہ امر مختص رؤسا صاحبان ملک کے واسطے ہے ہم لوگون مین جو روزگار پیشہ ہین ابتدائے عملداری سرکار سے آج تک کسی کے واسطے سننے مین نہین آیا تو لا محالہ یہ نشان اوسی تفاول کا ہے جو جناب والد ماجد مغفور نے تیری ولادت کے وقت مین فرمایا تھا جناب باری سے مجھکو امید ہے کہ روز بروز ترقیات دینی و دنیوی تیری مین اپنی حالت حیات مین دیکھون گا۔ الغرض جب میرا سن نو کا ہوا تب بزرگون نے مکتب مین سپرد کیا

اور آخوند شیخ قیام الدین مرحوم قصبۂ سوہان کے رہنے والے جو ایک بڑے جہاندیدہ آدمی تھے اور صرف معلم نہین بلکہ ایسے عمدہ اتالیق تھے کہ کمتر مثل اون کے کوئی معلم ہوگا اس واسطے کہ وہ نواب حیدر بیگ خان جو مدار المہام آصف الدولہ کی سرکار کے تھے مدت تک اون کی مصاحبت مین اور اون کے کتب خانے کے داروغہ رہے تھے اون کو جناب جد امجد مغفور نے ہمارے بھائیون کی اور سب بنی اعمام کی تعلیم کے واسطے مقرر فرمایا۔ اون کی خدمت مین حروف تہجی سے لیکر سارا قرآن شریف اور رسائل متداولہ فارسی کے کریما مقیمان آمدنامہ گلستان بوستان بہار دانش ابوالفضل دیوان غنی اور بعضے رسائل نظم و نثر کے راقم نے پڑھے کہ فی الجملہ طاقت لکھنے پڑھنے کی حاصل ہوئی۔ تب ۱۲۲۹ھ مین میزان الصرف جناب حضرت حاجی الحرمین حاجی امین الدین ہمارے جد امجد مغفور کے بھائی سے شروع کی ساری وہ کتاب اور منشعب اور پنج گنج جس کو تصریف بھی کہتے ہین جناب ممدوح سے پڑھی اور آخوند شیخ قیام الدین کے اہتمام سے اوس کی مشق ہوا کی۔ اس عرصہ مین جناب والد ماجد مغفور اور جناب عم والا مقام مولوی حکیم الدین خان بہادر مغفور نے باہم بندوبست کرکے مولوی حسن بخش سنامی کو کہ جو بڑے عالم اور طبیب بھی تھے اور اسی قصبۂ کاکوری کے رؤسا مین جناب جد امجد مغفور کے تلامذہ مین سے تھے ہماری اور ہمارے بنی اعمام کی تعلیم کے واسطے مقرر کیا اون کی خدمت مین راقم نے زبدة الصرف اور صرف میر اور مأتہ عامل فارسی نظم اور شرح مأتہ عامل عربی اور مصباح اور ضریری اور کافیہ اور ضوء شرح مصباح کی اور کافیہ کی شرح ملا جامی کی جو شرح ملا مشہور ہے قریب نصف کے یعنے سارے اسم کی بحث تک پڑھی پس عرصے مین جناب والد ماجد مغفور نے ہم سب بھائیون کو اکبرآباد مین طلب کیا قریب چار برس کے وہان اتفاق رہنے کا ہوا۔ جناب والد ماجد مغفور سے اور

آخوند شیخ قیام الدین سوہان کے رہنے والے ہماری تعلیم کے واسطے مقرر ہوئے

۱۲۲۹ھ مین میزان الصرف شروع کی اور مولوی حسن بخش سنامی ہماری تعلیم کے واسطے مقرر ہوئے

۱۲۳۳ھ مین سب بھائیون کو جناب والد ماجد مغفور نے اکبرآباد مین طلب کیا

جناب مولوی امیر علی مرحوم سے جو سادات صحیح النسب بارہے سے تھے اور جناب والد ماجد
مغفور کے شاگرد رشید تھے نصف شرح ملا جامی کی یعنی بحث فعل اور بحث حرف کی۔ اور
مختصر معانی اور شرح تہذیب المنطق اور قطبی مع میر کے حاشیے کے اور عبادات شرح وقایہ کے
اور شرح عقاید نسفی اور شافیہ اور خلاصۃ الحساب اور چند اشکال تحریر اقلیدس کے اول مقالے
کے اور فارسی مین صرف قصائد عرفی کے پڑھے جس مین صرف شرح ملا کی مولوی امیر علی مرحوم
سے پڑھی تھی باقی سب کتابین جناب والد مغفور سے پڑھین مگر آپ کی عدیم الفرصتی کے سبب سے ہرج
اکثر واقع ہو جاتا تھا یعنی ہفتہ مین دو تین روز کبھی سارا ہفتہ ناغہ ہو جایا کرتا تھا سنہ مین
جناب والد ماجد مغفور ہم سب بھائیون کو وطن مین لے آئے دو ایک مہینے کے بعد آپ نے
اکبر آباد مین معاودت کی اور یہان ہم لوگون کی تعلیم کے واسطے جناب مولوی فضل اللہ صاحب
کو جو نوتنی کے رہنے والے بہت بڑے نامی علما مین تھے اور خود جناب والد ماجد
مغفور کو اور ہمارے اعمام کو اون سے تلمذ تھا مقرر کیا اون سے راقم نے جلدین اولین
شرح وقایہ کی تکمیل کی اور میبذی شرح ہدایت حکمت کی اور تصورات سلم کے متن اور
شرح سلم تصدیقات مولوی حمد اللہ کے اور میر زاہد رسالہ اور میر زاہد ملا جلال اور نور الانوار
اور دایر اصول فقہ کے اور چند مقامے مقامات حریری کے اور فرایض شریفی تحصیل کی
اور اس وقت کچھ شبہ واقع ہوا ہے کہ شرح عقاید نسفی کی اکبر آباد مین جناب والد ماجد
سے پڑھی تھی یا وطن مین مولوی فضل اللہ صاحب مغفور سے پڑھی غالبا ایسا واقع
ہوا ہے کہ اکبر آباد مین شروع کی تھی اور مولوی صاحب ممدوح سے آ کے ختم کی لیکن باقتضای
سن شباب کے اور توجہ کلی کے ملاہی اور ملاعب کی طرف بسبب فی الجملہ تنعم اور فراغت کے
جو بدولت والدین مغفورین کے حاصل تھی تحصیل ان سب کتب کی محنت اور شفقت طالبعلمانہ
سے جیسی چاہیے نہین ہوئی اور نفس امارہ حیلہ جو نے دل مین یہ کھٹکا ڈالنا شروع کیا کہ
جناب مولوی فضل اللہ صاحب مغفور جو بڑے عالم متبحر اور بابرکت تھے کتب مطولات کے

ہم کو نہین پڑھا سکتے اور اس عرصے مین ایک تفرقہ بھی اجتماع مین سب بھائیون کے
واقع ہو گیا کہ بڑے بھائی صاحب مولوی رضی الدین خان بہادر مغفور کو جناب
والد ماجد مغفور نے اکبرآباد مین طلب کر لیا اور بنی اعمام ہمارے بھی اپنے والد ماجد کے
پاس روانہ ہوئے وطن مین صرف راقم رہا کہ جناب مولوی فضل اللہ صاحب کی خدمت
مین تحصیل کرتا تھا۔ جناب ممدوح نے میرا توجہ زیادہ ملاہی اور ملاعب کی طرف دیکھا
اور میرے خطرۂ شیطانی کے متفرس ہوئے۔ بزرگون کو اطلاع کی کہ اس روسیاہ نے
فضل الٰہی سے استعداد کلی حاصل کی ہے اب مناسب ہے کہ لکھنؤ کے علما اور
مدرسین نامی کے پاس مطولات کی تحصیل کرین اور از خود اپنے وطن کو یہان کا تعلق چھوڑ کے
تشریف لے گئے۔ اسی عرصے مین جب راقم جناب مولوی فضل اللہ صاحب مغفور سے
درس کتب کرتا تھا ایک شب کو خواب مین زیارت بابرکت حضرت جناب رسالتمآب
سے مشرف ہوا اور بموجب مضمون صداقت مشحون مَنْ رَآنِی فَقَدْ رَآنِی فَاِنَّ
الشَّیْطَانَ لَا یَتَمَثَّلُ بِیْ عزت اور برکت حاصل کی اس صورت سے کہ آپ ہمارے
گھر کی مسجد مین نماز جماعت کی پڑھاتے ہین اور مین اسی مسجد کی سفیل پر بیٹھا ہوا وضو کر رہا ہون
اور بہت جلدی کر رہا ہون کہ جماعت کی نماز مین شریک ہو جاؤن لیکن اس قدر مجھے
محرومی حاصل ہوئی کہ جب مین جماعت کے قریب پہونچا تو آپ نے سلام پھیر دیا اور جماعت
کی طرف منھ پھیر کے دعا مانگنا شروع کی اوس مین مین بھی شریک ہوا لیکن چہرۂ مبارک پر
ایک برقعہ تھا کہ چہرہ کی زیارت بھی نہین نصیب ہوئی اونھین دنون مین کچھ قبل یا بعد
ایک شب کو حضرت باری تعالے جل شانہ کو خواب مین دیکھا ایک بہت بڑے
سانپ کی صورت پر مابین الجو طیران مین ہین۔ اس سے نہایت وحشت اور خوف
اوس وقت مجھے حاصل ہوا۔ خداوند تعالے مجھکو اپنے ثمرات اور نتائج قہر سے محفوظ
رکھے اور نتیجہ زیارت قدم مبارک کا اور کئی دفعہ اپنی حضوری کا خواب مین جس کو آگے

نقل کرونگا اور شاہدہ مظہر جمال باجلال حضرت بے مثال تعالےٰ شانہ وعم نوالہ کا مجھکو عقیدہ واثق یہی تھا دیکے کہ ساری ناموری اور ترقی دنیوی جسکی مجھکو لیاقت نہ تھی اور اپنے امثال مین کمتر کسی کو ہوئی ہوگی مجھکو حاصل ہوئی۔ امید یہ ہے اور رات دن دعا کرتا ہون کہ اوس کے برکات سے عاقبت بخیر ہو اور وہ سب ترقی نمونہ اوس ترقی کا ہو جو ایزد تعالےٰ محض اپنے لطف و کرم سے اوس عالم مین عطا کرے۔ غرض اس عرصے سے کئی برس متصل بالکل میرے درس مین ہرج رہا مگر اوسی عرصے مین جناب مولوی مستعان صاحب مغفور ہمارے وطن کے بزرگون مین صدیقی نسب تھے اور بہت بڑے علماے نامی مین سر نکالے ہوئے تھے ارادہ ہوا کہ اون سے کچھ درس کیجیے چنانچہ مطول مین نے اون سے جا کے شروع کی لیکن اس عرصے مین وہ نہایت کبرسنی سے قریب پراگندگی حواس مین آگئے تھے اور تقریر مین بھی نہایت لکنت اور لغزش ہوتی تھی پانچ چار سبق اون سے پڑھے طبیعت خوش نہوئی اور چونکہ نری بے شغلی تھی جناب مولوی حسن بخش صاحب مرحوم سے سدیدی طب کی موجز کی شرح شروع کی دو تین جز پڑھے تھے کہ اتفاق سفر کا اکبرآباد کی طرف بھائی صاحب مغفور مولوی رضی الدین خان صاحب بہادر کے پاس ہوا کئی مہینے وہان ٹھہرنے کا اتفاق ہوا تھا کہ اس عرصے مین جناب والد ماجد مغفور عدالت دایرو سایر کے دورے کے ذریعہ سے فرخ آباد مین تشریف لائے راقم کو اکبرآباد سے طلب کیا دو تین مہینے یہان آپ نے تشریف رکھی وہان سے اوسی تقریب مین کانپور مین تشریف لائے پانچ چھ مہینے یہان قیام ہوا جب آپ وہان سے ضلع مین پوری کے دورے کے واسطے روانہ ہوے تب راقم کو اجازت دی کہ لکھنؤ مین اقامت کر کے کتب درسیہ بقیہ سے فراغت کرون۔ غرض راقم نے جناب چھوٹے چچا صاحب مولوی خلیل الدین خان صاحب بہادر مغفور کے مکان پر لکھنؤ مین اقامت کی اور جناب مرزا حسن علی صاحب مغفور محدث سے کہ ارشد تلامذہ حضرت شاہ عبد العزیز دہلوی سے تھے صدرا قراءت شروع کیا اور بعضے طلبہ مطول پڑھتے تھے اوس کی سماعت کرتا تھا

[illegible]

کئی مہینے اس درس مین اشتغال رہا کہ ایک اور تفرقہ واقع ہوا یعنی جناب چچا صاحب کو عہدہ بادشاہ کی سفارت کا گورنر جنرل کے دربار مین مفوض ہوا وہ کلکتہ کی طرف روانہ ہوئے اور جناب مرزا حسن علی صاحب کو نواب ذوالفقار بہادر نے باندے مین طلب کر کے اون کو اپنے یہان متعلق کر لیا مگر راقم نے وہین لکھنؤ مین اقامت کی اور جناب مولوی ظہور اللہ صاحب مغفور سے کہ فرنگی محل کے علماے نامورین سے اپنے عہد کے تھے درس شروع کیا توضیح تلویح اور ہدایہ جلدین اخیرین اور شمس بازغہ اور دو تین جزمسلم کے پڑھے اوسی عرصے مین مولوی حفیظ اللہ صاحب مرحوم جو جناب مولوی ظہور اللہ صاحب کے خویش تھے ارادہ ہوا کہ کتاب صدرا کی تکمیل اون سے کیجیے چنانچہ کئی سبق پڑھے تھے۔ ایک مقام پر مولوی صاحب ممدوح نے کتاب کے مطلب سمجھنے مین غلطی کی اور راقم اوسکو سمجھ چکا تھا ایک دلیل ہندسی ابطال جزء لایتجزے کے بحث اور مولوی صاحب ممدوح کو ہیئت و ہندسے سے کچھ مناسبت نہ تھی اونھون نے ایک تقریر نری مہمل کی مین نے روکا اور غلطی پر اون کو متنبہ کیا مگر باوصف اس کے یا وہ سمجھے نہین یا وہ اپنے کلام کی کرتے رہے اس سبب سے گفتگو بحث آمیز اون کی طرف سے اور میری طرف سے طول ہوگئی مین اون کے پاس سے اوٹھ آیا اور پڑھنا ترک کیا وہ مقام اور مولوی صاحب کی تقریر اور اصل مطلب کتاب کا سب اب تک مجھے یاد ہے اوس کا لکھنا یہان مجھکو فضول معلوم ہوا غرض مین نے جا کے جناب مولوی ظہور اللہ صاحب مغفور سے وہ سب تقریر اور گفتگو نقل کی مولوی صاحب نے مشفقانہ فرمایا جیسے بزرگ لوگ اپنے لڑکون کو کہتے ہین۔ وہ کودن ہے تم نے کیون اپنی اوقات ضایع کی اوس سے پڑھنا شروع کیا۔ اوس کے بعد راقم نے جناب مولوی قدرت علی صاحب مرحوم مولانا عبد العلی بحر العلوم مرحوم کے نواسے سے صدرا شروع کیا وہ بہت بڑے نامی علماؤن مین تھے درسی کتب گویا اونکو سب حفظ تھے۔ ما یعم الاجسام تک اون سے پڑھا۔ اسی عرصے مین جناب والدین مغفورین نے تقریب شادی راقم کی بڑے طمطراق سے جیسا اب زمانے مین مروج ہے

قرار دی جناب غلام حیدر خان صاحب مغفور کی منجھلی بیٹی کے ساتھ عقد نکاح باندھا گیا اون کے پندرہ بیس دن کے بعد جیبار داج سے شادی ہوئی۔ ایک بزرگ مولوی محمود علی مرحوم حضرت شاہ بدر علی صاحب قدس سرہ کاکوروی الاصل کے بھائی کے داماد تھے اونھون نے مادۂ تاریخ میری شادی کا جو ماہ ربیع الاول ۱۲۳۳ھ مین ہوئی یہ مصرعہ بے کم وکاست پایا ہے ہمایون وصل مہ باشتری باد او سکو ایک قطعہ مین منظوم کیا تھا وہ قطعہ مجھے یاد نہین رہا۔ بعد شادی ہونے کے کئی مہینے متصل وطن مین قیام ہوا اس عرصے مین جناب مرزا حسن علی صاحب محدث مغفور لکھنؤ مین تشریف لائے راقم نے پھر اون سے جاکے میر زاہد شرح مواقف شروع کی۔ کئی جز پڑھے پھر جو وطن مین آنے کا اتفاق ہوا اوس وقت سے کچھ اور درس کی نوبت نہ پہونچی اور نہ کبھی بالاستقلال تدریس کا اتفاق ہوا ساری ہمت تلاش روزگار کی طرف مصروف ہوئی مگر مطالعۂ کتب کا شغل البتہ بعیاناً بے تعلقی مین بھی اور تعلق روزگار مین بھی رہا وہ بھی جم کے اور باستقلال اور بہ ترتیب کہ جو کتاب نظر پڑے اوس کو اول سے آخر تک دیکھ جائیے اس کی نوبت نہین آئی چند مہینے جناب والد ماجد کے دورے کے ہمراہ سفر مین جب عدالت دائرہ سایر کی شکست کے بعد آپ کی اقامت کانپور مین ہوئی تب اکثر آپ کے ہمراہ رہا اوسی عرصے مین شرح چغمنی آپ سے پڑھی۔ اسی عرصے مین جناب بڑے بھائی صاحب نے مجھکو اکبرآباد مین طلب کیا اوس کا سبب یہ تھا کہ جب وہان ۱۸۳۰ء کا بندوبست ہوا تو حکام نے باوصف استحقاق کے اون کو صدر الصدور نہ مقرر کیا۔ گورنر جنرل کے حکم کے بموجب ایک بڑے تعلقہ دار کو اوس عہدے پر مامور کیا اور بھائی مغفور کا عہدہ افتا کا بدستور رکھ کے منصفی آگرے کے شہر کی اوس کے ساتھ ضم کردی او جو درماہہ قدیم تھا وہ بدستور بحال رکھا۔ اوس پر جب بھائی صاحب نے حکام سے شکایت اپنے استحقاق کے فوت ہونے کی کی اور اونھون نے معذرت کی تب بھائی صاحب نے کہا اگر اس مین عذر ہے تو میرے بھائی کی پرورش کسی عہدے پر ہو۔ اس پر وہان کے کمشنر نے مسٹر مکسوین نام جو صاحب اختیار

ذکر میرے اکبرآباد رہنے کا اور [illegible] تلاش روزگار مین اور [illegible] بھائی صاحب کی [illegible]

تھے اونھون نے ایما میری طلب کی کی۔ اس نظر سے جناب والد ماجد مغفور نے راقم کو مجاز اکبرآباد کی روانگی کا کیا قریب تین برس کے وہان اقامت ہوئی اور جناب بھائی صاحب نے بمراتب نہایت میرے اپنی کوشش سے میرے واسطے تعلق پیدا کرنے کے لیئے تدبیر مین مصروف ہوے مگر دس عرصے مین کچھ کشود کار نہ ہوا حالانکہ وہان بہت سے انقلابات واقع ہوے لیکن اثر ومین کے قیام کا اور جناب بھائی صاحب کی طلب کا تھا کہ بعد اوس کے بہت سی ترقی نمایان ظہور مین آئی جس کی شرح آیندہ ہوگی اور وہ دو تین برس اکبرآباد مین نہایت بے شغلی مین اور ملاہی و ملاعب مین بسر ہوے چونکہ اون دنون مین حکام انگریزی نے قوانین جاریہ مین بہت نسخ اور تبدیل کی تھی اور اہل ہند کے واسطے بہ نسبت سابق کے بہت ترقی کی مگر اسی کے ساتھ اس بندوبست کی فکر مین تھے کہ بموجب پچھلے بندوبست کے جو عمال مین اخذ و جر بطریق ارتشا کے بہت شایع تھا اور انگریزی حکومت مثل ہندوستانی حکومت کے بھی جو مدت دراز سے بعد سلطنت کی تباہی کے چلی آتی تھی اوس کو موقوف کرین اس واسطے جمیع عہدون کے واسطے چاہتے تھے کہ اشخاص لایق اور باعلم اور شرفا منتخب ہون اس واسطے کہ البتہ بنظر علے العموم لوگون کے اس جنس کے لوگ مختار رہتے تھے۔ اور مین جو اپنے تصور باطل مین جمیع اشخاص سے جو اوس شہر مین موجود تھے اپنے تئین لایق اور فایق سمجھتا تھا۔ اور ایک حاکم اعلے کی بموجب طلب کے وہان گیا تھا مجھکو یقین تھا کہ عنقریب کوئی صورت عمدہ ظہور مین آویگی عجب کارخانہ قضا و قدر کا ہے کہ سب مزعومات اپنے باطل ہوگئے وہ اشخاص جن کا کچھ بھی رتبہ اور لیاقت نہ تھی وہ حکام کے نزدیک کارکردہ متصور ہوے اون کے واسطے معقول عہدے تجویز ہوئے اور میری طرف سے حکام کے زعم مین ناکردہ کاری ثابت ہوئی یعنہ عَسٰی اَنْ تَکْرَہُوْا شَیْئًا وَّہُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ کا مصداق ہوا مگر جہالت اور ناواقفیت
قریب ہے کہ تم کچھ برا سمجھو اور وہ تمھارے واسطے بہتر ہو
اون امور سے جو واقع ہوئے عدم ظہور اپنے مزعومات کا اوس عرصے مین نہایت موجب رنج والم کا ہوا تھا۔ سبب اس عدم ظہور اپنے مزعومات کا عجیب اور غریب واقع ہوا چونکہ حکام

اوس عرصے مین ایک دوسرے سے ہر شخص کا حال اور بسر بود پوچھا کرتے تھے ایک صاحب
زمانے کے لوگون مین علی العموم ہمارے دوست مشہور تھے۔ اور غائبًا حکام کے اوپر بھی یہی
حالی تھا۔ اوس عرصے مین ایک عہدہ مشترک سررشتہ داری کلکٹری و فوجداری کی ڈیڑھ سو روپیہ
مشاہرہ کی قرار پائی تھی۔ صاحب کمشنر جس نے مجھے طلب کیا تھا اوس نے کلکٹر سے ایما کیا
کہ راقم کو اوس عہدے پر مقرر کرے۔ کلکٹر نے اون بزرگ سے جو وہ خود پیشتر سررشتہ دار کلکٹری کے
تھے اور نئے بندوبست مین اون کو تحصیلدار کر دیا تھا۔ اس نظر سے اون سے پوچھا کہ فلانا
شخص اس عہدے کا انجام کر سکتا ہے۔ اون کو ایسا حسد نے لیا کہ راقم کی بہت علم اور لیاقت
کی تعریف کی مگر از جنس تاکید الذم بما یشبہ المدح۔ یعنی ظاہرًا ایسی تقریر کی وہ ہمارے صاحب زادے
ہین اور بزرگ زادے ہین بڑے عالم فاضل ہین مگر یہ کام بہت مشکل ہے خصوصًا اب فوجداری
کا کام بھی اوس مین ضم ہوا۔ اور مین تو اون کی تعریف ہی کرون گا حضور خود سمجھ لیجیے اونھون نے
اب تک کہین کام نہین کیا ہے۔ غرض کلکٹر نے صاحب کمشنر سے جا کے کہا مین خود نیا کلکٹری
پر مقرر ہوا ہون اگر میرا سررشتہ دار بھی ناکردہ کار ہو تو کام کس طرح سے چلے گا اور اونھین صاحب
کی تقریر دلیل مین نقل کی۔ اگرچہ تفصیل مشرح اس خبر کی نہین معلوم ہوئی کہ اونھون نے کیا
تقریر کی تھی۔ لیکن یہ امر خود صاحب کلکٹر نے بعد اوس کے جب میری کیفیت نالایقی کی اون پر
کھلی اور پھر مدت تک وہین اکبرآباد مین اور بعد اوس کے گورنر جنرل کے ساتھ میرا اور اون کا
سابقہ رہا تو ایک دن اونھون نے ہنس کے ایک حاکم سے میرے سامنے انگریزی مین کہا
کہ عجب اتفاق ہے کہ ان کے ایک خیر طلب دوست کی تقریر سے ہم کو ایسا دھوکا ہو گیا کہ ان کو
مطلق کارکردگی کی لیاقت نہین ہے بڑے ملّا ہین۔ پھر خود ترجمہ کرکے مجھ سے بیان کیا کہ ہم ان سے
یہ کہتے ہین اور دونون صاحب خوب قہقہے مار کے ہنسا کیے۔ غرض کمشنر نے جب یہ امر سنا تو اوس کی
رائے ہوئی کہ اکبرآباد کے مدرسے مین مجھے مدرس مقرر کرے وہان دو مدرس پچاس پچاس
روپیہ درماہہ کے تھے ایک عربیت کی تعلیم کے واسطے اور ایک ریاضی پڑھانے کے لیے اور

ایک ڈاکٹر مدرسہ کا مہتمم تھا اوس کی بدمزاجی کے سبب سے دونون نے استعفا دیا۔ کمشنر نے جب ڈاکٹر سے میرے مقرر کرنے کے واسطے کہا۔ اس تقریر سے کہ تمھاری بدمزاجی کے سبب سے ہمین بہت شبہ ہے کہ وہ قبول نہ کرین گے اگر قبول کرین تو سو روپیہ مشاہرہ اون کا مقرر کرو اور دونون عہدون کا انجام انھین کو سپرد کرو۔ ڈاکٹر نے مجھے طلب کرکے کہا مین نے انکار کیا تب اوس نے بھائی صاحب کو طلب کرکے نہایت اصرار سے اور سماجت سے کہا کہ اپنے بھائی کو سمجھا دیجیے مدرسی قبول کرین اور بموجب بھائی صاحب کے اصرار کے مین اون کے پاس گیا۔ اور مین نے کہا کہ مجھے ہرگز خوف کسی طرح کا آپ سے نہین ہے صرف اس سبب سے کہ سو روپیہ مین میری بسر نہین ہوگی اور محنت اور مشقت بہت ہے مین نہین قبول کرتا۔ اگر آپ کی مرضی ہو تو مین دو آدمی اچھے فاضل آپ کو بلا دون پچھلے دستور کے بموجب ایک کو عربیت کی تعلیم کے واسطے اور ایک کو ریاضی کی تعلیم کے واسطے مقرر کیجیے اوس نے کہا بہت اچھا جلدی بلا دیجیے۔ نام مجھ سے پوچھا اون سے دو صاحب آپ نے تجویز کیے ہین مین نے ایک مولوی بشیر الدین اپنے خالہ زاد بھائی کا نام عربیت کے واسطے بتلایا اور ایک میر اولاد حسین نام شکوہ آباد کے رہنے والے جو مدت تک لکھنؤ مین ہمارے ہم سبق اور ہمخانہ رہے تھے اون کا نام لکھوایا کہ ہیئت تعلیم کرین وہ نہایت ذکی الطبع تھے اور بڑی محنت اور مشقت سے بہت اچھی استعداد حاصل کی تھی اگرچہ مذہب اون کا شیعہ تھا لیکن راقم کو بسبب مدت تک یکجائی کے اون سے بہت محبت ہو گئی تھی۔ اور اوس عرصے مین وہ ہگلی کے مدرسے مین اسی روپیہ مشاہرہ کے نوکر ہو گئے تھے وہان کے تیسرے یا چوتھے مدرس بھی تھے اور وہان کے مسجد کے امام بھی مقرر ہوئے تھے اس سبب سے کہ میر سید محمد مجتہد نے اون کو اجازت امامت یا شاید اجتہاد کی بھی دیدی تھی۔ تو میرا گمان یہ تھا کہ اگرچہ اون کا درماہہ وہان زیادہ ہے لیکن بسبب قرب وطن کے خصوص میرے لکھنے سے وہ ضرور قبول کر لین گے پھر وہ میرے نام بتانے کے اوسی وقت اپنے منشی کو بلا کے دو پروانے لکھوائے اور مجھے

[illegible]

حوالہ کیے کہ جلد دونون صاحبون کو بلوا دیجیے۔ چنانچہ مولوی بشیر الدین تو آئے اور مدرسی
مین اونھون نے پڑھانا شروع کیا اور وہین کی رواداری سے اون کو ترقی ہوئی کہ فتح پور
سیکری کے منصف ہو گئے۔ اور میر اولاد حسین نے پہلے تو قبول کیا اور لکھا مین عنقریب
آتا ہون۔ لیکن کلکتہ کے سارے شیعہ مذہب لوگون نے جو تجار وغیرہ بڑے بڑے دولتمند
ہین نہایت کوشش اور تدبیر کرکے اون کو وہین ہگلی کا مدرس اول یا دوم تین سو روپیہ
مشاہرے کا مقرر کروا دیا۔ الغرض جب اس واقعہ کی خبر جناب والد ماجد مغفور کو ہوئی آپ
بہت ناراض ہوے اور خط بہت عتاب کا مجھکو لکھا کہ ایسا عہدہ عمدہ خانداں تو نے قبول
نہ کیا نہایت خلاف عقل حرکت کی۔ اصل غرض آپ کی یہ تھی وہان مقرر ہونے سے میرے
علم کی تجدید ہوتی اور شغل مطالعہ کا ہمیشہ رہتا۔ الغرض جب حکام کے ذہن مین میری ناتجربہ کاری
منقش ہو گئی حالانکہ بسبب اکثر ہمراہی جناب والد ماجد مغفور کے اور شوق ملاحظہ مقدمات کے
دیوانی اور فوجداری کا کام تو مین لوگون کو بخوبی سکھا دیتا اور چونکہ ہمیشہ قوانین بھی دیکھا کرتا تھا
کلکٹری کا کام بھی دشوار نہین معلوم ہوتا تھا۔ اس نظر سے جناب بھائی صاحب مغفور نے یہ فکر کی
کہ خود رخصت لی اور صاحب جج سے درخواست کرکے مجھکو قائم مقام مقرر کروایا تاکہ بذریعہ اتفاق
کے جب حکام کے سامنے کام کرنے کا اتفاق ہو تو وہ زعم باطل اون کا نکل جاے۔ وہی ہوا کہ
قریب سات آٹھ مہینے کے جناب بھائی صاحب کی غیبت مین جو ہر طرح کا کام پیش آیا حکام
بہت راضی ہوے اور سمجھے کہ وہ زعم اون کا غلط تھا لیکن چونکہ نیا بندوبست سب اوس ضلع
مین ختم ہو گیا تھا کوئی عہدہ خالی نہ تھا کہ مجھے سپرد کرین۔ صاحب کلکٹر مجھ سے مبالغ تھے کہ تم یہان
ٹھہرو جو تحصیلداری خالی ہوگی اوس پر مین تمھین مقرر کرون گا مگر میری طبیعت ایسی منقبض ہوئی
کہ پھر وہان رہنے کا جی نہ چاہا مین وطن مین چلا آیا اور اکبر آباد کے ایام قیام مین دو امر عجیب
اور غریب پیش آئے کہ اون کا ذکر کرنا مصلحت معلوم ہوتا ہے ایک امر یہ ہے کہ ایک مقدمہ
بابت نزاع سرحد اور سواد کے تین برس سے بھائی صاحب کی کچہری مین دایر تھا جس مین

[illegible]

اظہارات طرفین کے گواہون کے اور اسناد جو پیش تھے غالب ہے کہ وہ مثل پانچ سیر سے وزن مین کم نہ ہوگی۔ اس واسطے کہ پچھلے قوانین کے بموجب جیسی اب تخلیص اور تسہیل روبکاری مین ہے وہ نہ تھی۔ فضولیات بہت کاغذات داخل ہوا کرتے تھے غرض میری حالت قائم مقامی مین صدر عدالت سے حکم اوس کے فوراً انفصال کا آیا اور کیفیت التوائی طلب ہوئی اوس کے بموجب صاحب جج نے میرے اوپر نہایت تاکید اور تشدد کیا کہ اسی مہینے مین اوسکو فیصلہ کرو مین نے جو اوس مقدمہ کو روبکار کیا اور متصل قریب ایک ہفتہ کے ہر روز کچہری مین وہ پیش رہتا تھا اور پھر سب مثل کو مین گھر مین لے آتا تھا آدھی رات تک مین تنہائی مین اوس کو غور کرتا رہا مطلق حقیت کسی جانب کی میرے ذہن مین نہ آئی کچھ اور تحقیقات اوس مین ضرور معلوم ہوئی میرا ارادہ تھا کہ اوس کو پنچایت مین سپرد کرون مگر صاحب جج نے نہ مانا اور نہایت تاکید کی جس طرح سے ہو اسی مہینے مین فیصلہ کرو۔ جہان تک ممکن تھا عقل لڑا کے کچھ استخارے کی تائید سے اوس کو مین نے فیصلہ کیا لیکن خود میری بابت بھی اوس فیصلے سے تشفی نہ ہوئی بعد فیصلہ کرنے کے دفعتہً میری حالت متغیر ہوئی اور خودبخود گریہ و بکا میرے اوپر طاری ہوا اور یہ تصور ہوا کہ اس قضا کے باب مین اسلاف کا قول مشہور ہے مَنْ قُلِّدَ الْقَضَاءَ فَقَدْ ذُبِحَ بِلَا سِکِّیْنٍ مین کہ ایک جاہل بحت ہون جو بمضمون حدیث کے اَلْقَاضِیْ جَاهِلٌ بَیْنَ الْعَالِمِیْنَ محض دنیا کی طمع سے اپنے تئین اس بلا مین مبتلا کیا ہے اور ایسی جگہ پر جہان فرصت تحقیقات کی اور غور و تامل کی نہین ملتی جس طرح سے ہو سمجھین یا نہ سمجھین منازعات کا فیصلہ کرنا لازم ہے۔ اس کا مآل عقبے مین کیا ہوگا اور کیفیت ایک اضطرار کی لاحق ہوئی کہ جو باعث اوسی گریہ و بکا کی ہوئی۔ اوسی حالت مین راقم دست بدعا ہوا کہ یا الٰہ العالمین مجھے فاقہ قبول ہے مگر تو مجھکو ایسے عہدے اور نوکری سے محفوظ رکھ۔ یہ میری دعا ایسی تیر بہدف ہوئی کہ اوس کے بعد ہر طرح کی ترقی نمایان حاصل ہوئی اور حالانکہ بعضے ایام بے شغلی مین تجسس اور تلاش مین جنس کے عہدے کی بھی کی مگر آج تک

عنایت الٰہی سے میسر ہوا جناب اقدس الٰہی تعالےٰ شانہ نے اوس بلا سے مجھے محفوظ رکھا
دوسرا امر عجیب یہ ہے کہ ایک شب کو مین نے خواب مین دیکھا کہ میری بائین طرف کی
مونچھ خود بخود جاتی رہی صبح کو جو سو کے اوٹھا آپ ہی آپ میرے دل مین یہ تعبیر
آئی کہ لفظ ہندی بال ہے کے فارسی مین بازو کے معنے ہین معلوم ایسا ہوتا ہے کہ
کوئی اخوان مین سے جو قوت بازو ہوتے ہین اس عالم مین نہ رہا۔ اوسکے تین چار روز کے بعد وطن کے
خط سے معلوم ہوا کہ میری چھوٹی بہن بسعوبت ولادت جنین توام سے قضا کر گئی۔ اور
چونکہ مونچھ مؤنث ہے تو بائین مونچھ کا جانا میری دونون بہنون مین چھوٹی بہن کے قضا کرنے پر جو تعبیر میرے ذہن مین گذری
تھی بعد وقوع کے مثل آفتاب نیمروز کے ظاہر معلوم ہوئی انھین ایام مین قیام اکبرآباد کے چونکہ
اون دنون مین کچھ شوق علم ہیئت کا بہت ہو گیا تھا چنانچہ شرح چغمینی اوسی قریب زمانہ مین
مطالعہ کی تھی وہان بھی اوس کی سیر رہتی تھی تصور یہ ہوا کہ ہیئت جدید انگریزی کی جو نکہ بہت تکمیل
ہوئی ہے اوس کو دیکھا چاہیے اس واسطے انگریزی کے حروف تہجی وغیرہ سیکھنے اور ہاتھ کی لکھی
ہوئی چٹھیان ایک انگریزی دان سے پڑھنا شروع کین غرض یہ تھی کہ پہلے انگریزی کے لکھنے پڑھنے
مین طاقت ہو جائے بعد اوس کے ہیئت کی کتابین دیکھے ایک کتاب قصہ کہانی کی بھی
پڑھنے لگا تاکہ چھاپے کی کتابین بھی پڑھنے کی طاقت ہو جائے اکبرآباد سے روانگی سے تین
چار مہینے پیشتر یہ شغل شروع کیا تھا جب وہان سے روانگی ہوئی تو وہ شغل موقوف ہو گیا۔ اس
عرصے مین کچھ شوق نقل نویسی کی ہو گئی اگرچہ خط خام رہا۔ اور بعض قصہ کہانی کی کتابین کتب لغت
کی اعانت سے سمجھ مین بھی آنے لگین مگر وطن مین پہونچ کے شغل تحصیل کا نہ رہا پھر جب الہ آباد
مین مجھے تعلق گورنمنٹ کے دفترخانے مین ہوا تب بعضے ارباب دفتر سے پھر چند روز کچھ انگریزی
لغات ترجمہ کے یاد گویا کرتا رہا لیکن جیسا چاہیے التزام سے نوبت انگریزی کی تحصیل کی نہ آئی ایسا
کہ جب مین میر منشی گورنر جنرل کے فارسی دفتر کا ہو گیا چونکہ اکثر انگریزی سے فارسی اور فارسی
سے انگریزی کرنے کی وہان نوبت آتی تھی کچھ کچھ مشق ہوا کی۔ جب مین ولایت آمادہ روانگی کا ہوا

[illegible]

[illegible]

اون دنون مین انگریزی کے بولنے اور سمجھنے مین بالکل طاقت نہ تھی مگر ہاتھ کا لکھا ہوا خط اور چھپے
کے اخبار اور کتابین جو بہت سہل سیدھے سیدھے ہوتے تھے وہ کتب لغت کی اعانت سے
سمجھ لیتا تھا اور نقل انگریزی کی ہاتھ سے بہت اچھی طرح سے کرلیتا تھا مگر مضمون چٹھی کا بنانے کی طاقت
نہ تھی - ولایت مین جا کے جب آٹھ برس قیام ہوا اتنی مدت مین باتین انگریزی سمجھنا اور خود باتیں
کرنا تو خوب آگیا اور خط لکھنے پڑھنے مین بھی مشق ہوگئی کتابین ہر قسم کے علوم کی سمجھنے لگا لیکن
چونکہ درس انگریزی کا ترتیب معمولی سے نہین ہوا اور انگریزی زبان بہ نسبت ہم لوگون کے نہایت
عسیر ہے اور زیادہ کمتر مین ہر زبان اور ہر علم کا سیکھنا دشوار ہے اوس مین مجھے کمال نہ حاصل ہوا
ناقص اور ناتمام رہا صرف یہ امر ہوا کہ اوس زبان سے جہالت مطلق رفع ہوگئی اور جناب اقدس
الٰہی سے جو میری تقدیر مین مقرر کیا - یعنی کہ کسی علم مین کمال نہ حاصل ہو اور کسی علم سے علوم متداولہ
مین سے جہالت مطلق بھی نہ رہے بند ہو گیا الغرض راقم نے جب سے مدرسے سے پاؤن نکالا
اور تلاش روزگار کی فکر مین پڑا لکھنؤ اور بریلی اور اکبرآباد اور کانپور سب جگہ مین کچھ نہ کچھ صورت
امیدواری نوکری کے حاصل ہونے کی ہوئی مگر ہر بار یہ کوئی امر بطور حسب رجا کے ظہور مین نہ آیا
یعنی یاس بعد امید کے واقع ہوئی - اکبرآباد کی تلاش کے نتائج کا تو مفصل مین نے ذکر کیا ہے
اور سب جگہون کی امیدواری اور تلاش کی کیفیت مفصل مین لکھون تو بہت طول ہو جائے گا
مگر باجمال بعض کو ایسے مین لکھتا ہون - اور اصل سب کی یہ ہے کہ جناب والد ماجد مغفور کو تہہ دل
سے میرا نوکری کرنا پسند نہ تھا - آپ یہ چاہتے تھے چونکہ تحصیل کتب کی مین نے تازہ تمام کی ہے
صرف درس و تدریس مین بسر کرون - اگر نوکری کرنے کا اتفاق ہوگا تو درس و تدریس اور مطالعہ کتب
کا شغل چھوٹ جائے گا اس واسطے جو سعی اور سفارش اور تلاش میرے واسطے آپ کے اختیار
مین تھی اوس مین آپ توجہ کلی نہین فرماتے تھے بلکہ اکثر ٹال جاتے تھے - اور جو کوئی صورت مین
خود پیدا کرتا تھا یا جناب بھائی صاحب مغفور پیدا کرتے تھے اوس مین نہایت اکراہ طبیعت سے
بنظر میری شفقت کے تلاش مین مجاز کرتے تھے اور نہین کمال وضعداری اور متانت سے کسی کا

پنڈت رتن ناتھ سرشار

- فسانۂ آزاد ۴ جلد
- سیر کہسار
- خدائی فوجدار
- جام سرشار
- الف لیلی کے طرز کا ناول
- کامنی
- بچھڑی دلہن

منشی سجاد حسین مرحوم

- احمق الذین ۸
- حاجی بغلول ۸
- پیاری دنیا ۸
- کایا پلٹ ۸
- میٹھی چھری ۶
- طرحدار لونڈی
- طلسمی فانوس ۸

منشی جوالا پرشاد برق

- مرزا لیلی ۱۲
- مار آستین ۱۲
- بنگالی دلہن ۱۲
- معشوقۂ فرنگ ۱۲
- پرتاب ۸
- ز وہنی ۱۲

پریم چند

- پریم بتیسی
- بازار حسن

مولینا عبد الحلیم شرر

- جنید بغدادی
- خواجہ معین الدین چشتی
- تذکرہ مشاہیر عالم
- مخدرات
- قیس و لبنی
- مقدس نازنین
- ایام عرب
- فتح اندلس
- ماہ ملک
- حسن کا ڈاکو
- دربار حرام پور ۱۰
- الفانسو ۱۲
- مفتوح فاتح
- فلپانا
- زوال بغداد
- لعبت چین
- نیکی کا پھل
- جویائے حق
- بابک خرمی
- طاہرہ
- شوقین ملکہ
- یوسف و نجمہ
- گزشتہ لکھنؤ
- شاعرانہ و عاشقانہ مضامین
- آغاز و ختم سال
- سیر رجال
- تاریخی جغرافی مضامین
- مینا بازار

حکیم محمد علیخان مرحوم

- ارام پیاری کامل
- عبرت کامل
- حسن سرور کامل
- اختر حسینہ
- ڈیول دیوی
- جعفر و عباسہ

شوق قدوائی مرحوم

- ترانۂ شوق
- قاسم و زہرہ
- نیرنگ جمال ۴
- گنجینہ ۱۲
- میکفرن اور لوسی ۲

خواجہ عبد الرؤف عشرت

- زبان دانی ۶
- اصلاح زبان اردو ۶
- قواعد میر ۶
- اصول اردو ۶
- جان اردو ۶
- شاعری کی پہلی کتاب
- دوسری کتاب
- تیسری کتاب
- لغات اردو

منشی محمد حسن وحشی

- مجموعۂ گذشت
- جام مہر

مولینا حکیم عبد الحی مرحوم

- یاد ایام
- تذکرہ گل رعنا

حکیم احمد حسین الہ آبادی

- تاریخ ابن خلدون جلد اول
- 〃 〃 دوم
- 〃 〃 سوم
- 〃 〃 چہارم
- 〃 〃 پنجم
- 〃 〃 ششم
- 〃 〃 ہفتم
- 〃 〃 ہشتم
- 〃 〃 نہم
- 〃 〃 دہم
- 〃 〃 یازدہم
- سلطان صلاح الدین
- نور الدین محمود

مولوی محمد حلیم انصاری

- الاسلام و النصرانیہ ۱۲
- فتح اندلس
- ابو مسلم خراسانی
- تاریخ عرب

مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی

- سیرۃ الصدیق
- علمائے سلف
- تذکرۃ الشعراء میر حسن

حافظ اسلم جیراجپوری

- سیرۃ الرسول
- خلافت راشدہ
- خلافت بنو امیہ
- خلافت بنو عباس
- عباسیہ بغداد
- علوم عرب

قاضی محمد سلیمان منصور پوری

- رحمۃ للعالمین
- سفرنامۂ حجاز

مولوی خلیل الرحمن

- اخبار الاندلس جلد
- تاریخ مولدین
- مختصر تاریخ اسلامی
- عذرا

مولوی محمد انشاء اللہ

- سیرۃ الرسول
- تاریخ آل عثمان
- حالات طرابلس و عثمان
- حالات قسطنطنیہ
- تاریخ مراکش و سفر اقصی

منشی سعید احمد مارہری

- آثار اکبری
- حیات خسرو
- امرائے ہنود

...مختصر سوانح عمری اور ان کی مذہبی تعلیم نہایت دلکش انداز میں لکھی گئی ہے۔ قیمت صرف ..

مولوی عزیز مرزا مرحوم
- نگارشات عزیز
- دوکرما دن

خواجہ عباد اللہ اختر
- صدیق اکبر
- حضرت زید
- مشاہیر اسلام
- بغداد
- دمشق
- دیوان حافظ مع شرح

منشی انوار الحق ایم اے
- تاریخ ابو البشر
- تذکرۃ الحبیب
- حقایق اسلام

میر ولی اللہ شوق بی اے
- سنہ ہجری
- القرآن الکریم
- لسان الغیب جلد اول
- دوم
- سوم
- چہارم

مسعود بی اے
- سحاب آبدار
- جاپان کا تعلیمی نظام
- کتاب زرین

مولانا حسرت موہانی
- شرح دیوان غالب
- کلیات دیوان حسرت

سید سجاد حیدر بی اے
- خیالستان
- ثالث بالخیر
- زہرا
- جلال الدین خوارزم شاہ

مسٹر ظفر عمر بی اے
- جورون کا کلب
- نیلی چھتری
- بہرام کی گرفتاری
- مستقبل اسلام

پروفیسر فیروز الدین مراد
- تحفہ سائنس
- بادل کے بچے
- خونابہ عشق

حکیم احمد شجاع بی اے
- باپ کا گناہ
- حسن کی قیمت

منشی عبد المجید سالک بی اے
- راہ نیم منزلہا
- چمپا و دیگر افسانے
- چترا (ٹیگور)

منشی احمد علی بی اے
- تاریخ تمدن
- شباب لکھنؤ

مولوی عبد الماجد بی اے
- فلسفہ جذبات
- مکالمات برکلے
- پیام امن
- تصوف اسلام
- فلسفیانہ مضامین
- زود پشیمان

منشی محمد لطیف بی اے
- اکبر
- اورنگ زیب
- رنجیت سنگھ
- لارڈ کلایو

پروفیسر نواب علی ایم اے
- معارج الدین
- تذکرۃ المصطفےٰ
- صحف سماوی
- شمع سخن

پروفیسر الیاس برنی ایم اے
- جذبات فطرت چار حصے
- معارف ملت
- مناظر قدرت
- علم المعیشت

مولوی سید سلیمان ندوی
- ارض القرآن
- سیرۃ عائشہ
- حیات امام مالک
- خلافت عثمانیہ اور اسلام
- خلافت اور ہندوستان

مولوی عبد السلام ندوی
- اسوہ صحابہ ۲ جلد
- سیرۃ عمر بن عبد العزیز
- انقلاب الامم
- تاریخ الحرمین الشریفین
- حکمائے اسلام
- فطرت نسوانی
- شعر الہند ۲ جلد

مولوی عبد الباری ندوی
- مبادی علم انسانی
- برکلے کا فلسفہ

مولوی سعید انصاری
- سیر الصحابہ جلد اول
- سیر الانصار ۲ جلد
- سیر الصحابیات

مولوی عبد الرزاق ندوی
- اسوہ حسنہ
- کتاب الوسیلہ
- ترکی اور یورپ

خواجہ حسن نظامی
- قرآن آسان قاعدہ
- میلاد نامہ
- محرم نامہ
- فاطمی دعوت اسلام
- ذکر غوث پاک
- کرشن جیون
- شاہی جہاد
- سیپارۂ دل
- کرم تو موت
- چٹکیاں اور گدگدیاں
- اتالیق خطوط نویسی
- روزنامچہ
- بیوی کی تعلیم
- بیوی کی تربیت
- اولاد کی شادی
- جگ بیتی کہانیاں
- آپ بیتی
- بچوں کی کہانیاں
- سی پولی
- سفرنامہ ممالک اسلامیہ
- غدر دہلی کے افسانے
- یزید نامہ
- طمانچہ بر رخسار یزید
- اردو دعائیں
- تسکین احساس
- روزنامچہ
- اسلام کا انجام
- تسخیر مہر و قمر